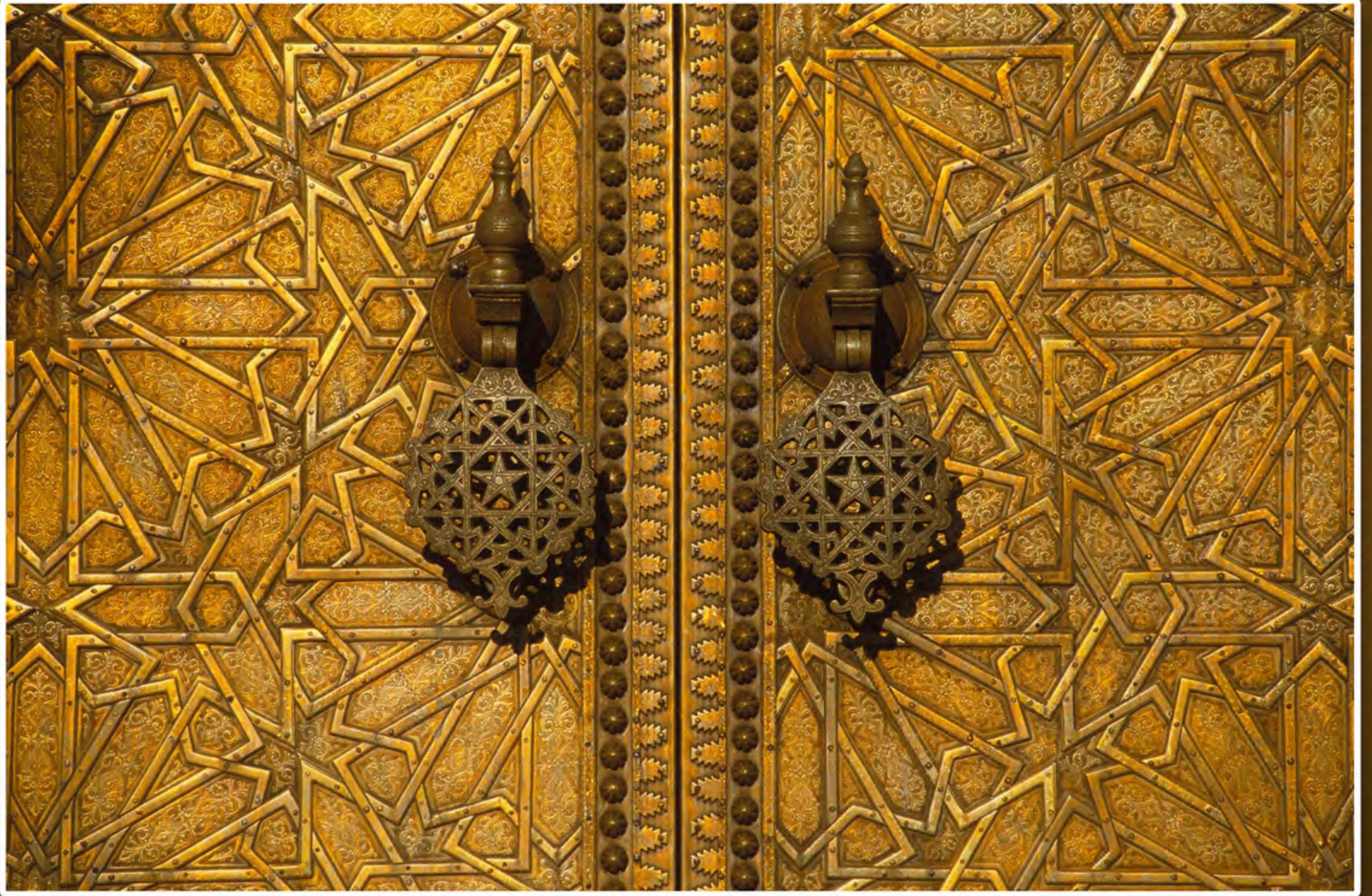
سوال و جواب

معروف دینی اسکالر ڈاکٹر محمود غازیؒ
کی کتب اور لیکچر سے انتخاب



مرتب : ڈاکٹر فیاض عالم

drfaiyaz66@yahoo.com

موضوعات

(فقہ)

سوال: توہین رسالت پرمبنی خاکوں کی اشاعت کے خلاف احتجاج کے دوران مسلمانوں کا اپنے ہی املاک کونقصان پہنچانا کیسا ہے؟

جواب: یہ تو غلط بات ہے۔ ہرشخص کی جان و مال محفوظ ہے۔جن لوگوں نے کسی کے املاک کونقصان پہنچایا انہوں نے قرآن کریم کی اصطلاح میں فساد فی الارض کا ارتکاب کیا۔اگر کسی نے ڈنمارک میں توہین رسالت کا جرم کیا ہےتو لاہور میں رہنے والے کسی شخص کی موٹر کار کوضائع کرنا یا کسی کے مکان اور دکان کوآگ لگانا کیسے درست ہوسکتا ہے۔ یہ شریعت کی رو سے جرم ہے۔اگر یہاں اسلامی قانون نافذالعمل ہوتا تو اس طرح کے جرائم کا ارتکاب کرنے والے کوکڑی سزادی جاتی۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: لفظ عشق جو اپنے بہن بھائیوں اور والدین کے ساتھ بہت زیادہ پیار ہونے کے باوجود ہم استعمال نہیں کرتے ،تو حضور کے ساتھ یہ لفظ کیوں استعمال کرتے ہیں؟

جواب: اصل میں لفظ عشق کے معنی بہت زیادہ اور بہت محبت کے ہیں۔اردو میں یہ لفظ کسی اچھے یا مثبت معنی میں استعمال نہیں ہوتا۔منفی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن فارسی اور صوفیانہ ادبیات میں یہ اصطلاح ذات رسالت مآب اور اللہ تعالیٰ سے محبت کے لئے استعمال ہوئی ہے۔صوفیا اس کا استعمال کرتے آئے ہیں۔مولانا رومی نے اس اصطلاح کواستعمال کیا ہے،علامہ اقبال نے استعمال کیا ہے۔اور بھی بہت سے اکابر صوفیا اس لفظ کواستعمال کرتے آئے ہیں۔اس لئے اس سیاق وسباق میں اس کے استعمال میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہونی چاہئے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: کیا مستشرقین ہمیشہ سے غیر مسلم ہی رہے ہیں؟

جواب: مستشرق تو کہتے ہی اس مغربی پادری یا صاحب علم کو جو مشرقی علوم سے دلچسپی رکھتا ہو۔مسلمان کو مستشرق نہیں کہتے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: آپ نے دور قدیم میں مختلف تقویموں کے رائج ہونے کا تذکرہ کیا اور کہا کہ قریش بھی چار مہینوں کا احترام کرتے تھے۔اس وقت یہ کس تقویم کے تحت تھے؟ کیا یہ وہی مہینے ہیں جو آج بھی اسلام رائج ہیں؟

جواب: یہی مہینے عرب میں بھی رائج تھے۔ یہ اسلامی مہینے ہیں اور یہ بہت طویل زمانے سے، غالباً حضرت ابراہیمؑ کے زمانے سے چلے آرہے ہیں۔لیکن عربوں نے ان مہینوں کے احترام کواپنے مفاد میں استعمال کرنے کی خاطر نسی اور کبیسہ کا سلسلہ شروع کیا تھا جس کے پیش نظر وہ اس میں کمی بیشی کیا کرتے تھے۔رسول اللہ ﷺ نے جب خطبہ حجۃ الوداع ارشاد فرمایا تو اس وقت یہ دونوں کیلینڈر coinscide کر گئے تھے۔حقیقت کے اعتبار سے اس دن 9 ذی الحجہ تھی اور قریش کے جعلی کیلینڈر کے حساب سے بھی نو ذی الحجہ تھی۔تو آپ نے فرمایا کہ **ان الزمان قد استدار کھیئته یوم خلق الله اسماوات و الارض**،آج زمانہ اسی ہیئت میں واپس آگیا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا تھا۔آج کے بعد نہ نسی ہوگی نہ کبیسہ ہوگا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: آپ نے سرسید کے بارے میں اچھی باتیں کہیں، لیکن وہ جہاد میں کیوں شریک نہیں ہوئے؟ کیا وہ مسلمانوں کوانگریز کے خلاف جہاد سے منع کرتے تھے۔

جواب: بھئی میں نے یہ تو نہیں کہا کہ اگر سرسید نے سیرت پر کتاب لکھی ہے تو ان کی ہر بات سے میں متفق ہوں۔انہوں نے سیرت پر کتاب لکھی۔ بہت جذبے سے لکھی۔اس جذبہ کی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔ باقی سرسید نے بہت سے ایسے کام بھی کئے جن سے مجھے اور بہت سے دوسرے حضرات کو اتفاق نہیں ہے۔ مجھے جہاد

کے بارہ میں سرسید کے خیالات سے بھی اتفاق نہیں ہے۔ بہرحال یہ سرسید کی زندگی اور خیالات کا ایک متنازعہ پہلو ہے کہ سرسید نے جہاد کی مخالفت کی تھی۔لیکن یہ ان کی شخصی رائے تھی۔آپ قیامت کے دن ان سے پوچھ لیجئے گا کہ ان کی یہ رائے کیوں تھی؟

(محاضراتِ سیرت)

سوال: اخلاق کی ایک جامع تعریف ارشاد فرمائیں۔نیز یہ بھی بتائیں کہ دنیا کے تمام مسلمانوں کے لئے اخلاق کا ہر پہلو یکساں ہونا چاہئے؟

جواب: اخلاق کی دو سطحیں ہیں۔ایک سطح تو وہ بنیادی اخلاق یا مکارم اخلاق کی سطح ہے جو قرآن پاک میں یا حدیث میں بیان فرمائے گئے ہیں۔مثلاً سچ بولنے کا حکم ہے،لوگوں کی مدد کرنے کا حکم ہے۔اچھائیوں کو فروغ دینے کا حکم ہے۔برائیوں کو مٹانے کا حکم ہے۔یہ ہر جگہ یکساں ہے۔لیکن ان سطحوں کے مظاہر یا ظاہری پہلو، وہ ایک دوسری سطح ہے جو مختلف علاقوں میں مختلف ہوگی۔مثال کے طور پر حدیث میں آیا ہے کہ ایک صاحب ایمان کی ذمہ داری یہ ہے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے۔ **من كان يومن الله اليوم الاخر فليكرم ضيفه**، جو شخص اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے مہمان کی تکریم کرے۔

اب دیہات میں مہمان کی تکریم کا اور مفہوم ہوگا، بڑے شہروں میں اور مفہوم ہوگا۔دیہات میں کوئی جائے تو اس کو لسی بھی پلائیں گے، مکھن بھی کھلائیں گے اور درخت کے سائے میں بٹھا کر سبزی روٹی بھی کھلائیں گے۔شہروں میں اگر کسی مہمان کو لسی پلا دیں تو ممکن ہے کہ وہ شکایت ہی کرے کہ مجھے لسی پر ہی ٹرخا دیا۔لہٰذا مظاہر مختلف ہو سکتے ہیں۔مشرق و مغرب، متمدن اور غیر متمدن میں اختلاف ہو سکتا ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: امام ابوحنیفہ کی جو آرا حکومت کے بارہ میں ہیں ان پر عمل کیا جا رہا ہے۔اسی طرح امام شافعی اور امام احمد کی آرا پر بھی عمل کیا جا سکتا ہے۔لیکن لوگ امام ابوحنیفہ کی رائے کو کیوں ترجیح دیتے ہیں جب کہ وہ اتنی authentic نہیں ہیں؟

جواب: یہ آپ نے کیسے کہا کہ امام ابوحنیفہ کی آرا authentic نہیں ہیں۔امام ابوحنیفہ نے جو آرا ظاہر کی ہیں وہ ان کے براہ راست شاگردوں کے قلم سے مدون ہو کر ہم تک پہنچی ہیں۔امام محمد اور امام ابو یوسف کی کتابوں میں موجود ہیں۔امام شافعی کی اپنی کتاب 'کتاب الام' میں موجود ہیں۔authenticity کا جہاں تک تعلق ہے تو دونوں آرا یکساں ہیں۔دلائل سے بعض فقہا امام ابوحنیفہ کی رائے کو ترجیح دیتے ہیں۔بعض حضرات امام مالک اور بعض امام شافعی کی رائے کو ترجیح دیتے ہیں۔ابھی آپ نے احیاء موات کی مثال میں سنا کہ امام ابوحنیفہ کا موقف زیادہ مبنی برحکمت معلوم ہوتا ہے۔دوسرے معاملات میں کسی ایک فقیہ کا نقطہ نظر درست ہو سکتا ہے۔لیکن اگر کسی علاقہ میں کسی انتظامی سہولت کی خاطر کسی ایک فقیہ کے اجتہادات کو ترجیح دی جائے تو یہ ایک انتظامی فیصلہ ہے جس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: آپ نے فرمایا کہ صحابہ آپؐ کے اشارے کے منتظر ہوتے تھے۔جب آپ نے گوہ کا گوشت پسند نہیں کیا تو صحابہ نے کیوں کھایا؟

جواب: رسول اللہ ﷺ ساتھ ساتھ صحابہ کی ترتیب بھی کرتے تھے اور صحابہ کو یہ بات بتاتے تھے کہ کچھ معاملات میں شریعت کا حکم کیا ہے اور حضور ﷺ کا ذاتی ذوق کیا ہے۔صحابہ کرامؓ کے مختلف مدارج تھے۔بعض صحابہ کرامؓ کا رویہ بڑا عاقلانہ تھا۔بعض کا بڑا عاشقانہ تھا۔ہر ایک اپنے طرز کے مطابق حضور ﷺ کی پیروی کرتا تھا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: کیا دور حاضر کا عدالتی نظام جائز ہے؟

جواب: عدالتوں کا نظام تو جائز ہے۔طریقہ کار میں اصلاح کی البتہ بہت گنجائش ہے۔آج کے دور میں پندرہ بیس سال تک مقدمات چلتے ہیں۔دادا کے دور میں مقدمہ دائر ہوتا ہے تو پوتے کے دور میں انصاف ملتا ہے۔انصاف ملنے کے لئے ہمارے ملک میں صبر ایوب، عمر نوح اور دولت قارون کی ضرورت ہے۔اس صورت حال کو بدلنے کی ضرورت ہے۔.Justice delayed justice denied۔انصاف میں تاخیر بے انصافی کے مترادف ہے۔فی نفسہ عدالتی نظام میں کوئی

قباحت نہیں ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: یہ فرق کیسے کیا جائے گا کہ کوئی حکم نبیﷺ نے بطور نبی، بطور سربراہ یا بطور قاضی فرمایا ہے؟

جواب: اس کی میں نے تھوڑی سی وضاحت تو کی ہے کہ اگر حضورﷺ نے کسی مقدمہ کو سننے کے بعد فیصلہ دیا ہے وہ بطور قاضی کے ہے۔ جو سربراہ ریاست کے طور پر انتظامات کے بارے میں احکام دیئے ہیں وہ بطور سربراہ ریاست کے ہیں اور بقیہ چیزیں بطور نبی کے ہیں۔ صرف آٹھ دس معاملات ہیں جس میں اختلاف ہے۔ اس پر فقہا نے بہت بحث کی ہے اور اس کی تفصیلات بیان کی ہیں۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: حضورﷺ کی عادات میں کھانے پینے اور لباس کے علاوہ اور کون سی چیزیں مراد ہیں؟ کیا داڑھی عادات میں ہے کہ نہیں؟ سنن زوائد کس کو کہتے ہیں؟

جواب: میرے خیال میں داڑھی کا شمار محض عادات میں نہیں ہے داڑھی عادات میں بھی ہے، لیکن یہ سنت بھی ہے۔ رسول اللہﷺ نے اس کی تاکید فرمائی اور اس کو اپنی اور دوسرے انبیاء کی سنت قرار دیا۔ سنت زوائد سے مراد وہ سنت ہے جو حضورﷺ کا اپنا طرز عمل تھا لیکن اس کا حضورﷺ نے دوسروں کو تاکیدی حکم نہیں دیا۔ حضورﷺ کا لباس ایک خاص طریقے کا تھا وہ سنن زوائد میں سے ہے۔ حضورﷺ کے دعائیں مانگنے کے کچھ خاص طریقے تھے۔ وہ بھی سنن زوائد میں سے ہیں۔ حضورﷺ بعض نوافل ادا کرتے تھے۔ وہ بھی سنن زوائد میں سے ہیں۔ وہ چیزیں جن کی حضورﷺ نے دوسروں کو تاکید نہیں فرمائی اور ان پر عمل نہ کرنے پر کسی ناراضگی کا اظہار نہیں فرمایا۔ وہ سنن زوائد میں سے ہیں۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: جیسا کہ آپ نے چیزوں کے پاک اور ناپاک ہونے کے بارے میں بتایا، براہ کرم اس بات کی بھی وضاحت کر دیں کہ جانوروں کے حلال اور حرام ہونے کے بارے میں فقہ میں کیا حکم ہے؟ یعنی مثلاً گھوڑا کیوں حرام ہے اور اونٹ کیوں حلال ہے؟ پانی میں مچھلی حلال اور مینڈک کیوں حرام ہے؟

جواب: آپ کی اطلاع درست نہیں ہے۔ گھوڑا بھی شریعت میں حلال ہے۔ تمام فقہا گھوڑے کے گوشت کو جائز کہتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ مکروہ کہتے ہیں اس لئے کہ ان کا کہنا ہے کہ اگر گھوڑے کے گوشت کو کھانا شروع کر دیا جائے تو جہاد کا ایک بڑا ذریعہ ختم ہو جائے گا۔ جہاد کے ذرائع کے تحفظ کی خاطر امام صاحب نے اس کو مکروہ قرار دیا تھا ورنہ وہ جائز ہے۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک دریائی اور سمندری جانوروں میں وہ جانور حلال ہیں جس کو عرب پاکیزہ اور جائز سمجھتے تھے۔ امام صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ عرب صرف مچھلی کو پاکیزہ سمجھتے تھے۔ مچھلی کے علاوہ بقیہ جانوروں کو ناپسندیدہ سمجھتے تھے۔ اس لئے امام ابوحنیفہ کے نزدیک سمندری جانوروں میں مچھلی کے علاوہ کوئی اور جانور حلال نہیں ہے۔ امام مالک کے نزدیک ہر سمندری جانور جائز ہے اس لئے کہ قرآن پاک میں آیا ہے کہ 'احل لکم صید البحر وطعامه'، تمہارے لئے سمندر کا شکار اور کھانا حلال کیا جاتا ہے۔ لہٰذا سمندر میں پلنے والی جو چیز کھانے کے قابل ہے وہ آپ کھا سکتے ہیں۔

بعض اوقات امام مالک کا نقطہ نظر بڑا ہی غنیمت معلوم ہوتا ہے۔ میں آج سے بارہ پندرہ سال پہلے اسپین گیا۔ میں امریکہ سے ایک طویل سفر کر کے اسپین پہنچا تھا۔ کئی وقت سے کھانے کو کچھ نہیں ملا تھا۔ شدید بھوک لگی ہوئی تھی۔ سوئے اتفاق سے میرے جو میزبان استقبال کے لئے آنے والے تھے، وہ موجود نہیں تھے۔ ایک صاحب ملے جو اسپینش کے علاوہ اور کوئی زبان نہیں جانتے تھے۔ میں نے ان سے اسپینش کے دو ایک چھوٹے موٹے الفاظ میں کہا کہ مجھے کھانا کھانا ہے۔ وہ مجھے ہوٹل لے گئے۔ لیکن جو کچھ انہوں نے ہوٹل والوں سے کہا وہ میری سمجھ میں نہیں آیا اور جو میں بتانا چاہتا تھا وہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر بھی میں نے اتنی سی بات ان کو سمجھا دی کہ مجھے کوئی بھی sea food منگوا دیں۔

وہ تو ہوٹل کے بیرے کو سمجھا کر چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں ہوٹل کا بیرا سی فوڈ لے آیا۔ میں شدید بھوک کے عالم میں منتظر تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ ایک بڑی پلیٹ میں کچھ

لے کر آیا تو میں نے دیکھا کہ اس میں بیسیوں قسم کے سمندری جانور اور کیڑے تھے، کچھ رینگ رہے تھے، کچھ پلکیں جھپکا جھپکا کر دیکھ رہے تھے، کچھ تلے ہوئے تھے۔ کچھ نیم تلے ہوئے۔ اب اگر عام حالات ہوتے تو شاید اس کو دیکھ کر مجھے الٹی ہوجاتی۔ لیکن میں نے بہت احتیاط سے اس انبار میں وہ کیڑے تلاش کر کے پہلے الگ کئے جو تلے جاچکے تھے۔ پھر دل ہی دل میں امام مالک کو دعائیں دیتے ہوئے میں نے وہ چیزیں کھالیں۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: آپ نے معاملات اور عادات کے بارے میں بتایا کہ غیبیات حضور ﷺ کے بتانے سے معلوم ہوسکتے ہیں۔ کیا حضور ﷺ علم غیب جانتے تھے؟

جواب: آپ بار بار یہ سوال کیوں پوچھتے ہیں۔ میں کئی بار کہہ چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو جتنا علم غیب دیا تھا وہ آپؐ جانتے تھے۔ جو غیبیات حضور ﷺ نے ہمیں بتائے ہیں وہ اللہ کے بتانے سے ہی بتائے ہیں۔ جنت، دوزخ، حیات بعد الممات، فرشتے، آسمانی کتابیں، معراج کی کیفیات، یہ سب باتیں حضور ﷺ ہی کے بتانے سے ہمیں معلوم ہوئیں۔ یہ سب باتیں حضور ﷺ کو معلوم تھیں تب ہی آپ نے ہمیں بتائی ہیں۔ رہا یہ سوال کہ اللہ نے حضور ﷺ کو کتنی غیبیات بتائیں، یہ ہمیں نہیں معلوم۔ اللہ تعالیٰ نے ساری غیبیات بتادیں، ہمیں یہ بھی نہیں معلوم۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ بتائیں۔ اور بہت سی باتیں نہیں بتائیں۔ اس کا کوئی پیمانہ کسی کے پاس نہیں ہے۔ کوئی آپ کو نہیں بتا سکتا کہ حضور ﷺ کے پاس غیب کا کتنا علم تھا۔ ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضور ﷺ کے پاس غیب کا اتنا علم تھا جتنا اللہ نے دیا تھا۔

کتنا علم دیا تھا۔ یہ غیر ضروری سوال ہے۔ اس میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ آپ یہ دیکھیں کہ حضور ﷺ کی سیرت کا کون سا عمل میرے لئے اور آپ کے لئے واجب التعمیل ہے۔ پھر اس پر عمل کریں۔ حضور ﷺ کے پاس غیب کا جتنا علم تھا اس کوانٹٹی کے بارے میں قیامت کے دن مجھ سے یا آپ سے کوئی سوال نہیں پوچھا جائے گا۔ جس چیز کے بارے میں دنیا و آخرت میں کوئی سوال نہیں پوچھا جائے گا اس کے بارے میں بحث کرنے کا کیا فائدہ۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: جن معاملات میں فقہا کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے، ان میں کس کی بات کو صحیح مانیں اور کس بنیاد پر؟

جواب: بنیادی بات تو یہ ہے کہ جس بات کو آپ دلیل کی بنیاد پر زیادہ صحیح سمجھیں اس کی پیروی کریں۔ جو چیز قرآن و سنت کے زیادہ قریب ہو اس پر عمل کریں۔ اور جو چیز قرآن و سنت کے حکم سے ہم آہنگ نہ ہو اس پر عمل نہ کریں۔ لیکن اس کام کے لئے بڑے گہرے علم کی ضرورت ہوتی ہے۔ یا تو وہ گہرا اور عمیق علم ہمارے پاس ہو۔ اور اگر ہمارے پاس اس درجہ کا علم نہ ہو تو جس کے علم پر ہمیں اعتماد ہو اس سے پوچھ کر عمل کریں۔ قرآن پاک میں حکم دیا گیا ہے: '**فاسئلوا اھل الذکران کنتم لا تعلمون**'، یا تو میرے پاس اپنا علم ہو یا میں کسی دوسرے صاحب علم کی بات پر عمل کروں۔ ان دو کے علاوہ ہمارے پاس اور تیسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: رسول پاک ﷺ کے وہ فیصلے جو آپ نے بطور قاضی کئے، صرف فریقین مقدمہ پر نافذ ہوتے تھے۔ جب کہ آج سپریم کورٹ کا فیصلہ پورے ملک میں نافذ العمل ہوتا ہے اور اس وقت تک نافذ العمل ہوتا ہے جب تک اس کے برعکس فیصلہ نہیں آتا۔

جواب: سپریم کورٹ کے فیصلہ کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک حصہ تو وہ ہوتا ہے جہاں سپریم کورٹ نے قانون کے کسی پہلو کی وضاحت کی ہو یا کوئی نیا قانون enunciate کیا ہو۔ یہ حصہ تو ہر شخص کے لئے واجب التعمیل ہے اور تمام ماتحت عدالتیں اس کی پابند ہیں۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ کی ان ہدایات اور فیصلوں کا ہر مسلمان پابند ہے جو حضور ﷺ نے بطور نبی کے ارشاد فرمائے۔ لیکن سپریم کورٹ کے فیصلہ میں ججمنٹ کا جو خاص حصہ ہوتا ہے جس میں متعلقہ عرضداشت یا اپیل کے بارے میں رائے دی ہوتی ہے وہ صرف فریقین پر نافذ ہوتا ہے۔ اس لئے جو میں نے عرض کیا اُس میں اور اِس میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: یہ بات کہ قرآن مخلوق ہے یا نہیں، یہ بحث کیوں شروع ہوئی اور اس کی وجوہات کیا تھیں؟

جواب: اصل میں یہ مسئلہ تو بہت طویل فرصت کا متقاضی ہے۔ اصل بحث یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور ذات میں تعلق کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات تو قدیم ہے، ہمیشہ سے تھی اور ہمیشہ رہے گی۔ کیا صفات بھی اسی طرح ہیں۔ جب یہ سوال سامنے آیا تو بالا اتفاق یہ رائے قائم کی گئی کہ اللہ تعالیٰ کی صفات بھی قدیم ہیں۔ جب سے اللہ تعالیٰ کی ذات موجود ہے تو اسی وقت سے وہ خالق بھی ہے، متکلم بھی ہے اور رحیم بھی ہے۔

اس کے بعد یہ سوال اٹھا کہ کیا جب اللہ تعالیٰ کی صفات قدیم ہیں تو کیا ان کے مظاہر بھی اسی طرح قدیم ہیں؟ اگر اللہ تعالیٰ خالق ہے تو کیا مخلوقات بھی ہمیشہ سے ہیں؟ اگر اللہ تعالیٰ متکلم ہے تو کیا کلام بھی ہمیشہ سے ہے؟ اس پر محدثین نے رائے ظاہر کی کہ اللہ تعالیٰ کا کلام بھی ہمیشہ سے ہے۔ انہوں نے کلام نفسی اور کلام لفظی کی دو قسمیں قرار دیں جن پر ہونے والی بحثیں علم کلام کی تاریخ کا حصہ ہیں۔ پھر چونکہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے تو انہوں نے کہا کہ یہ بھی پہلے سے اسی طرح محفوظ تھا۔ کچھ حضرات نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ ان کے ذہن میں یہ خیال راسخ تھا کہ کلام اللہ تو الگ physical چیز ہے۔ اس کو بھی اگر اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرح قدیم مانا جائے تو دو قدیم ذاتوں کا ماننا لازم ہو جائے گا۔ یہ تصور توحید کے خلاف ہے۔ انہوں نے اس سے انکار کیا اور چونکہ حکومت ان لوگوں کے پاس تھی جو اس رائے کے حامل تھے اس لئے انہوں نے اس عقیدہ کو عام کرنے میں زبردستی سے کام لیا۔ اس سے بعض محدثین اور حکومت کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا۔ دونوں طرف سے اپنے اپنے موقف کو بیان کیا گیا۔ حکومت نے بعض لوگوں پر سختی کی جو نہیں کرنی چاہئے تھی۔ یہ سختی معتصم کے زمانے میں زیادہ ہوئی۔ اس کے افسوس ناک مظاہر بعض انتہائی محترم اور بزرگ شخصیات کو آزمائش میں ڈالنے کی صورت میں برآمد ہوئے۔

اس سے حدیث کے مطالعہ میں کلامی رجحان کے نام سے ایک نیا رجحان پیدا ہوا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: معجزات کی بنیادی ضرورت بیان فرمائیں۔ آپ کے بیان کے مطابق جو لوگ ایمان لانا چاہتے ہیں وہ معجزات کے بغیر بھی ایمان لائے۔ جو ایمان لانے والے نہیں تھے وہ معجزات دیکھنے کے باوجود ایمان نہیں لائے۔

جواب: میں نے صرف یہ عرض کیا ہے کہ معجزات ان لوگوں کے لئے ہوتے ہیں جو شک اور تذبذب کا شکار ہوں۔ جو پہلے سے سعید اور نیک بخت روح ہوں اور فطرت سلیمہ رکھتے ہوں ان کو معجزات کی ضرورت نہیں رہتی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے کوئی معجزہ طلب نہیں کیا۔ حضرت علیؓ نے کوئی معجزہ طلب نہیں کیا۔ یہ سب پہلے سے ایک سعادت مندی رکھتے تھے۔ ان کی فطرت سلیم تھی۔ ابوجہل اور ابولہب جیسے لوگ ساری عمر معجزے ہی طلب کرتے رہے، لیکن مسلمان نہیں ہوئے۔ اس لئے کہ ان کے دل میں کھوٹ تھا۔

جو لوگ درمیان میں تھے ان میں سے اگر کسی نے کوئی معجزہ دیکھا تو ان کی کمزوری دور ہو گئی اور شکوک ختم ہو گئے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: قیصر نام رکھنا کیسا ہے؟ بعض لوگ اس کو صحیح نہیں سمجھتے۔

جواب: میرے خیال میں قیصر کے لفظ میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص اس وجہ سے نہ رکھے کہ ایک غیر مسلم کا نام تھا تو اس کو اختیار ہے۔ شرعاً اس نام کے اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ محض ایک لفظ ہے اور اس کو نام کے طور پر پہچان کے لئے استعمال کرنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ اس لفظ میں کوئی مشرکانہ بات نہیں اس لئے اس کو نام کے طور پر رکھا جا سکتا ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: دنیا میں ایسے قبائل ہیں جن تک اسلام کی دعوت نہیں پہنچی۔ ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا؟

جواب: یہ فیصلہ تو اللہ تعالیٰ کرے گا کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا۔ عام طور پر متکلمین اسلام نے لکھا ہے کہ اگر کوئی انسان ایسا ہو جس کو اسلام کی دعوت نہ پہنچی ہو، تو وہ

اگر جزوی طور پر بھی توحید پر ایمان رکھتا ہے تو اس کی نجات کے لئے کافی ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: جادو اور معجزہ میں کیا فرق ہے؟

جواب: جادو اور معجزہ میں وہی فرق ہے جو اصل اور نقل میں ہوتا ہے۔ جادو کا فن جاننے والے جب معجزہ کا مقابلہ کرنے آئے تو انہوں نے فوراً تسلیم کرلیا کہ جادو کے مقابلہ میں جو چیز سامنے آئی ہے یہ جادو نہیں ہے بلکہ اللہ کی نشانی ہے۔ جادو اگر کوئی چیز ہے تو محض نظر کا دھوکا اور کھیل ہے۔ معجزہ حقیقی چیز ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: جیسے یہ حقیقت ہے کہ کفار یا کوئی بھی قرآن یا اس کی ایک آیت جیسی آیت بنانے سے قاصر رہے ہیں۔ اس سے مراد قرآن کی فصاحت و بلاغت ہے یا کچھ اور؟

جواب: اس سے مراد قرآن کی فصاحت اور بلاغت بھی ہے اور بھی بہت کچھ مراد ہے۔ قرآن میں جو کچھ بھی ہے، فصاحت و بلاغت اور معانی و مطالب یہ سب چیزیں اس درجہ کی ہیں کہ ان کا مثل بنانا اور نظیر بنانا کسی کے لئے بھی ممکن نہیں ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: اللہ تعالیٰ نے فرمایا **واللہ یعصمک من الناس**، اس کا ایک مفہوم تو یہ بھی ہے کہ آپ کی جسمانی حفاظت بھی کی گئی لیکن طائف کے موقع پر اور دوسرے غزوات میں آپ زخمی ہوئے اور آپ پر جادو بھی ہوا۔ کیا یہ آیت ان واقعات کے بعد نازل ہوئی تھی یا پہلے؟ کیا ہر رسول نبی ہے؟ ایک روایت سے پتہ چلتا ہے کہ انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے۔ ان میں سے 313 رسول تھے۔ اگر ایسا ہے تو رسولوں کی تعداد 313 ہوئی۔

جواب: اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کا وعدہ کیا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ دشمنان اسلام سے آپ کی جان کی حفاظت کی جائے گی۔ جب رسول اللہ ﷺ میدان جنگ میں تشریف لے جاتے تھے تو آپؐ کی خواہش ہوتی تھی کہ نبوت کے ساتھ ساتھ آپؐ کو شہادت کا منصب بھی حاصل ہو۔ صحیح بخاری کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ '**لو ددت ان اقتل فی سبیل اللہ ثم احیا ثم اقتل ثم احیا ثم اقتل ثم احیا ثم اقتل**'، یعنی میری دلی آرزو ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کردیا جاؤں۔ پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں۔ گویا شہادت ایک ایسا مرتبہ ہے جس کی آرزو نبی بھی کرتا ہے۔ لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف تھا کہ کوئی نبی آخرزماں کی جان لینے کا ذریعہ بنے۔ یہ بات ہوتی تو شاید پوری امت ایک عذاب میں مبتلا ہوجاتی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی خواہش جزوی طور پر پوری کردی کہ حضور ﷺ اللہ کے راستہ میں کئی بار زخمی ہوئے اور پروردگار کے حضور میں اپنا خون بہایا، اور کئی بار ایسا ہوا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: جو لوگ اسلام سے پہلے حج کرتے تھے وہ کس عقیدے اور مذہب کے تحت حج کرتے تھے؟

جواب: وہ ملت ابراہیمی کے طریقے کے مطابق حج کرتے تھے۔ ملت ابراہیمی کے بہت سے آثار عرب میں موجود تھے۔ کچھ چیزیں اس میں غلط شامل ہوگئی تھیں۔ بعض قبائل غلط چیزوں میں زیادہ مبتلا تھے بعض کم مبتلا تھے، لیکن حج کے اکثر و بیشتر مراسم ملت ابراہیمی کے مطابق ہی ادا ہوتے تھے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: کیا رسول اللہ ﷺ کے پاس قیامت کا علم تھا؟ کیا آپ نے قیامت کے آنے کے بارے میں کچھ بتایا ہے؟

جواب: حضور ﷺ کو قیامت کے وقت کا قطعی اور حتمی علم تھا یا نہیں، یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ لیکن مشہور حدیث جبرئیل میں حضور ﷺ نے فرمایا تھا: **ما المسئول عنھا باعلم من السائل**. یعنی میرا علم قیامت کے بارے میں جبرئیل کے علم سے زیادہ نہیں۔ یہ بات بہرحال واضح ہے کہ اس سے زیادہ قیامت کے بارہ میں حضور ﷺ

نے بتایانہیں۔اگرکسی نے پوچھا کہ قیامت کب آئے گی۔مثلاً ایک صحابی نے پوچھا کہ قیامت کب آئے گی۔تو آپؐ نے جواب میں قیامت کا وقت نہیں بتایا، بلکہ سائل سے پوچھا کہ تم نے قیامت کے لئے کیا تیاری کی ہے؟ ان صاحب نے کہا کہ میں نے نماز روزہ زیادہ نہیں کیا لیکن میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہوں۔اس کے جواب میں آپؐ نے فرمایا کہ قیامت کے دن تم اس کے ساتھ ہوں گے جس کے ساتھ تم محبت رکھتے ہو۔

حضورﷺ نے قیامت کے دن یا وقت کا تعین نہیں کیا، کیونکہ یہ اللہ کی حکمت اور سنت کے خلاف تھا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: اہل تشیع نبیﷺ کو معصوم کلی مانتے ہیں۔

جواب: نبیﷺ کو معصوم کلی تو ہر مسلمان مانتا ہے۔ ہر پیغمبر کو معصوم کلی ماننا ایمان کا تقاضا ہے۔اس میں اہل سنت اور کسی اور میں کوئی فرق نہیں ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: فارابی اور ابن سینا نے نبوت وغیرہ کی تشریحات کی ہیں، کیا وہ قرآن مجید کے نصوص سے مطابقت رکھتی ہیں یا یونانی فلسفہ کے زیر اثر ان میں اختراعات اور گمراہیاں ہیں۔

جواب: آپ نے الفاظ بڑے خاصے استعمال کئے ہیں۔میں اس بحث میں نہیں پڑتا کہ فارابی اور ابن سینا یونانی فلسفہ سے کس حد تک متاثر تھے۔میں صرف اس بات کی قدر کرتا ہوں کہ فارابی اور ابن سینا نے یونانی فلسفہ سے سو فیصد متاثر ہوئے بغیر قرآن پاک اور اسلام کے احکام کے بموجب ان مسائل کو بحث کے قابل سمجھا اور یونانی فلسفہ کے دلائل کی روشنی میں نبوت اور وحی کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔ یقیناً ان کا نقطہ نظر مسلمانوں کے روایتی نقطہ نظر سے سو فیصد مطابقت نہیں رکھتا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ نہیں رکھتا۔لیکن ان کی یہ کوشش اور ان کا یہ جذبہ اپنی جگہ بہت قیمتی اور قابل قدر ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: برصغیر پاک وہند میں نبیﷺ کے علم کے بارے میں بحث رہی ہے۔کیا کسی امتی کا یہ منصب اور حیثیت ہو سکتی ہے کہ وہ کہے کہ حضورﷺ کو دیوار کے آگے کا علم ہے، پیچھے کا نہیں؟

جواب: کم سے کم میری یہ حیثیت نہیں ہے کہ میں حضورﷺ کے علم کا وزن کر کے اس کی مقدار بیان کر سکوں۔حضورﷺ کا علم بہت وسیع اور غیر معمولی تھا۔تمام انسانوں سے زیادہ تھا۔تمام انبیاء کے علم سے بڑھ کر تھا۔اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اولین اور آخرین کا علم دیا تھا۔لیکن اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلہ میں حضورﷺ کا علم بہر حال بہت محدود تھا۔اللہ تعالیٰ کا علم لامحدود، بے نہایت، یقینی اور قطعی ہے۔حضورﷺ کو جو علم دیا وہ اپنی ساری وسعتوں اور پنہائیوں کے باوجود علم الٰہی کے مقابلہ میں محدود علم تھا۔اس لئے جب اللہ اور اس کے رسولؐ کے علم کا تقابل ہوگا (جو میری ناچیز رائے میں ایک غیر ضروری اور بے فائدہ مشغلہ ہے) تو اور بات کہی جائے گی اور جب حضورﷺ کے علم کا موازنہ بقیہ انسانوں کے علم سے ہوگا (جو کوئی فضول شخص ہی کرے گا) تو پھر یہی کہا جائے گا کہ حضورﷺ کے علم کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: رسول اللہﷺ کی ایک حدیث مبارکہ کا مفہوم ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جس میں مسلمان ستر سے زائد فرقوں میں تقسیم ہوں گے۔اگر واقعی اسی طرح ہے اور یہی ہونا ہے تو ہمیں فرقوں کو ختم کرنے کی کاوشوں سے کیا فائدہ حاصل ہوگا؟

جواب: جس حدیث میں یہ بات آئی ہے کہ اس کی فنی حیثیت کے بارے میں بہت باتیں ہوئی ہیں۔ان بحثوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک چیز یاد رکھنے کی ہے کہ عربی زبان میں ستر کا لفظ کثرت کو بیان کرنے کے لئے آتا ہے۔ یہاں ستر سے مراد ستر کا عدد نہیں، بلکہ کثرت تعداد مراد ہے۔ بتانا صرف یہ ہے کہ میری امت میں بہت سے فرقے ہوں گے۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ میری امت میں لازماً ستر فرقے ہوں گے۔ بیان یہ کیا گیا ہے کہ طرح طرح کی گمراہیاں پیدا کرنے والے آئیں

گے ۔تم لوگ میرے طریقے پر قائم رہنا۔اسی حدیث میں یہ بھی ہے کہ ما انا علیہ و اصحابی ۔کہ ان تمام گمراہیوں کے سیلاب میں میرا اور میرے صحابہ کا طریقہ ہی حق کا محفوظ راستہ ہوگا۔اسی روایت کے مطابق صحابہ نے پوچھا کہ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہئے،تو آپؐ نے فرمایا کہ میں اور میرے اصحاب جس طریقے پر ہیں تم اس پر قائم رہنا۔حضورﷺ اور حضورﷺ کے صحابہ کے طریقے پر جو رہے گا تو وہ کامیاب رہے گا۔اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ فرقہ پرستی کو ختم کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔فرقہ پرستی کو ختم کرنے کی کوشش ضرور ہونی چاہئے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: رسول اللہﷺ کی ازواج مطہرات جو مسلمانوں کی مائیں قرار دی گئیں تو کیا ان کا اصحاب کرام سے پردہ کرنا لازم نہیں تھا؟

جواب: ازواج مطہرات کے لئے پردہ لازمی تھا۔ازواج مطہرات کو پردے کا حکم تھا۔قرآن مجید میں سخت پردے کا جو حکم ہے وہ براہ راست ازواج مطہرات ہی کے لئے تھا۔بعض فقہا کا یہ کہنا ہے کہ پردہ کے احکام ازواج مطہرات کے لئے نسبتاً زیادہ سخت تھے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: سیدنا معاذؓ کی تحکیم کو کیا حضورﷺ کی تائید حاصل تھی؟ کیا یہ تحکیم کتاب اللہ کے مطابق تھی یا تورات کے؟ کیا قانون سازی کے لئے اس فیصلہ کو ماخذ کے طور پر لیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

جواب: قرآن پاک کا حکم یہ ہے کہ اگر غیر مسلم تمہارے پاس اپنا فیصلہ کرانے کے لئے آئیں تو تمہارے سامنے تین راستے ہیں۔یا تو اس کا فیصلہ قرآن پاک کے مطابق کردو۔یا فیصلہ کرنے سے معذرت کردو اور کہہ دو کہ میں تمہارے جھگڑوں کا فیصلہ نہیں کرسکتا۔یا ان کے اپنے قانون کے مطابق فیصلہ کرو۔تینوں صورتیں درست ہیں۔حضرت سعد بن معاذؓ نے اس واقعہ میں ان کے اپنے یہودی قانون کے مطابق فیصلہ کیا۔یہ فیصلہ تورات کے مطابق تھا اور یہ حکم تورات میں شروع سے چلا آرہا تھا۔آج بھی یہ حکم تورات میں موجود ہے۔اس لئے یہودیوں پر یہودیوں کے قانون کے مطابق فیصلہ کیا گیا۔جو قرآن پاک کے اس حکم کی تعمیل تھی 'فلیحکم علی الانجیل بما انزل اللہ فیہ'، اہل انجیل انجیل کے مطابق فیصلہ کریں۔اہل تورات تورات کے مطابق فیصلہ کریں۔توراتیوں پر تورات کے مطابق فیصلہ کرنا میرے خیال میں مناسب تھا۔پھر یہ معاملہ ثالثی اور تحکیم کا تھا،کوئی عدالتی فیصلہ نہ تھا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: کیا یہ صحیح ہے کہ یہودی صرف وہ ہوتا ہے جس کو یہودی ماں نے جنم دیا ہو؟

جواب: جی ہاں یہ بالکل درست ہے۔لیکن یہودیت کی تاریخ میں بہت سے لوگ ایسے ملتے ہیں جنہوں نے یہودیت اختیار کیا۔عربوں میں کئی قبائل نے یہودیت اختیار کی۔عرب کے علاوہ بھی بعض لوگوں نے یہودیت اختیار کی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ یہودی سمجھے جانے لگے۔آج یہ تعین کرنا کہ سائبیریا سے کر امریکہ تک جتنے یہودی ہیں وہ سارے یہودی ماؤں کی اولاد ہیں، یہ بڑا مشکل ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: احابیش کون تھے اور اس سے کیا مراد ہے؟

جواب: احابیش سے مراد بعض غیر قریشی قبائل کا ایک مجموعہ تھا جو مکہ مکرمہ کے باہر آباد تھا۔قبیلہ قریش سے ان کا معاہدہ تھا۔ان کا سردار ابن الدغنہ قبیلہ قریش میں اثر رسوخ رکھتا تھا۔یہ لوگ احابیش کہلاتے تھے،مکہ کے باشندے تھے،لیکن قریش میں شامل نہیں تھے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: آپ نے فرمایا تھا کہ قادیانی بڑا اگڑ بڑ مسلک ہے کیا یہ حنفی اور شافعی کی طرح مسلمانوں ہی کا ایک مسلک یا فرقہ نہیں ہے؟ یا الگ مذہب ہے؟

جواب: شریعت کی رو سے ہر منکرِ ختم نبوت اور مدعی نبوت دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ قادیانی ایک مدعی نبوت پر ایمان رکھتے ہیں اس لئے وہ دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ یہ تو شریعت کی بات ہوئی۔ پاکستان کا قانون یہ ہے کہ ہمارے ہاں قومی اسمبلی کی متفقہ رائے سے ان کو غیر مسلم قرار دیا جا چکا ہے۔ اور پاکستان میں 1947 سے لے کر آج تک اتنے بڑے پیمانے پر اتفاق رائے کی کوئی اور مثال نہیں ہے۔ نیشنل اسمبلی جب یہ ترمیم کر رہی تھی تو اس میں اس وقت 100 فیصد حاضری تھی۔ میں اس کا چشم دید گواہ ہوں۔ 100 فیصد ووٹ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے حق میں ڈالے گئے۔ سینٹ میں بھی 100 فیصد حاضری اور 100 فیصد ووٹ تھا۔ کوئی ایک ووٹ بھی غیر حاضر نہیں تھا۔ سب نے اتفاق رائے سے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا تھا۔ اس لئے آپ اپنی اصلاح کیجئے۔ ایسا غیر مسلم گروہ حنفی شافعی کی طرح اسلامی مسلک کیسے ہوسکتا ہے؟ اگر اسلامی یونیورسٹی کے ایک طالب علم کو یہ بڑی غلط فہمی ہے تو بڑے افسوس کی بات ہے۔

پاکستان کے علاوہ بہت سے دوسرے ممالک بھی قادیانیوں کو کافر قرار دیتے ہیں۔ پاکستان سے بہت پہلے یہ فیصلہ متعدد دوسرے ممالک میں کیا جا چکا ہے۔ مصر میں 1935 میں یہ فیصلہ کیا جا چکا تھا۔ سعودی عرب میں 1974 کے اوائل میں یہ فیصلہ ہوا تھا۔ کئی اور ممالک میں اس سے بھی پہلے ہو چکا تھا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: آپ نے کہا کہ عرب کے بعض لوگ خاص طور پر یثرب کے نوجوان مدراس میں پڑھنے کے لئے جاتے تھے اور یہودی ہو جاتے تھے۔ جب کہ یہودی صرف اس کو یہودی مانتے ہیں جو نسلاً یہودی ہو۔

جواب: اصل میں یہودی تو وہی مانا جاتا ہے جو نسلاً یہودی ہو۔ یہودی اس کے علاوہ کسی اور کو یہودی نہیں مانتے۔ لیکن یہودی دوسروں کو گمراہ کرنے میں ہمیشہ دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ اگر کوئی عرب اپنے مذہب کو چھوڑ کر اپنے آپ کو یہودی کہلوانا شروع کرتا تھا تو یہودی اس کو نہ روکتے تھے۔ اس لئے کہ اس میں یہودیوں کا فائدہ تھا۔ ان کے ہمدردوں میں اضافہ ہوتا تھا۔ کم سے کم عامۃ الناس کی نظر میں ان کی تعداد بڑھتی تھی۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: مدینہ منورہ میں شادی کی رسومات کے بارے میں کچھ وضاحت فرمائیں۔

جواب: مدینہ منورہ میں شادی بیاہ کی وہی رسومات تھیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھیں۔ ان میں کچھ طریقے اسلام کے نقطہ نظر سے ناجائز تھے، اس لئے اسلام نے ان کی ممانعت کر دی۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسے تمام غیر اخلاقی طریقوں کو منع فرما دیا۔ جو طریقہ اب مسلمانوں میں رائج ہے اس کی آپ نے اجازت دے دی۔ اس لئے نکاح وطلاق کے احکام میں جو اصلاحات آپؐ نے فرمائی ہیں وہ شریعت کا ہر طالب علم جانتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ نکاح رضامندی سے ہونا چاہئے۔ نکاح اعلان کے ساتھ ہونا چاہئے۔ نکاح میں جو شرائط اور قیود رکھنی چاہئیں ان کا ذکر قرآن اور حدیث میں صراحت سے ہوا ہے۔ جو چیزیں سراسر ناجائز تھیں ان کی آپ نے ممانعت فرمائی۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: غیر مسلموں کے بارے میں 'فاقتلوا هم حيث وجد تموا هم' پر اس دور میں کیونکر عمل ہوگا؟

جواب: اگر اس کا یہی مفہوم ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں تو بہت افسوس کی بات ہے۔

دیکھیں قرآن وحدیث کا مطالعہ اور تعبیر وتشریح بہت ذمہ داری کا کام ہے۔ اس طرح سے تھوڑی سی عربی سیکھ کر مفتی نہیں بن بیٹھنا چاہئے۔ '**فاقتلوا هم حيث وجد تموا هم**' کا مفہوم سمجھنے کے لئے اس سیاق وسباق کو سامنے رکھیں جس میں یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ سورۃ بقرہ میں جہاں یہ آیت آئی ہے اس میں کہا گیا ہے کہ جن لوگوں نے تم پر حملہ کیا ہے، تمہیں گھروں سے نکال دیا ہے، تمہارے اوپر بیس سال سے مظالم کر رہے ہیں جب ان کے ساتھ میدان جنگ میں مقابلہ کی نوبت آئے تو پھر بزدلی مت دکھاؤ۔ جہاں پاؤ قتل کرو۔

یہ حکم تمام غیر مسلموں کے لئے نہیں ہے۔ بہت سے غیر مسلموں کے ساتھ تو حضورﷺ نے معاہدے کئے۔ مدینہ میں اور پورے جزیرہ عرب میں غیر مسلم رہتے تھے۔ یہ سارے معاہدات حدیث میں موجود ہیں۔ اس سارے ذخیرے کو نظر انداز کر کے آپ کہیں کہ **فاقتلوا هم حيث وجد تموا هم**، کہ حکم ہر غیر مسلم کے لئے ہے، یہ تفسیر کا صحیح طریقہ نہیں ہے۔ یہ تو تحریف قرآن ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: کاؤنٹر انٹیلی جنٹس جب دشمن کے جاسوسوں کو غلط معلومات دیتے ہیں تو کیا جھوٹ کے زمرے میں آتے ہیں؟

جواب: یہ جھوٹ کے زمرے میں نہیں آتا۔ کسی مسلمان نے جھوٹ نہیں بولا۔ رسول اللہﷺ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا **لعلنا امرنا هم بذالک**، شاید ہم ہی نے انہیں یہ کام کرنے کے لئے کہا ہو۔ حضورﷺ نے کوئی بات غلط نہیں فرمائی۔ لیکن اس سے دشمن نے وہی مفہوم لیا جو حضورﷺ دینا چاہتے تھے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: کل آپ سے سوال کیا گیا تھا کہ جب حضورﷺ پر درود بھیجا جاتا ہے تو کیا آپ کی روح مبارک موجود ہوتی ہے؟ میری ایک درخواست ہے کہ اس بات کی وضاحت فرمائیں۔ اس بات سے بہت لوگ بہت سی بدعات اور خرافات میں مبتلا ہو جاتے ہیں؟

جواب: میری گزارش ہے کہ آپ فرقہ وارانہ بحثیں نہ کریں۔ رسول اللہﷺ کی روح مبارک بہت اونچا مقام رکھتی ہے۔ آپ کی روح مبارکہ کے بارے میں یہ توقع کرنا کہ وہ ہم جیسے لوگوں کی محفل میں موجود ہے، یا ہر کس و ناکس کی مجلس میں آتی ہے، یہ شاید گستاخی ہو۔ لیکن ہمارا درود وسلام حضورﷺ تک پہنچایا جاتا ہے۔ یہ حدیث سے ثابت ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: آج کل جو پولیس encounter ہوتے ہیں، اس سے ہم سب واقف ہیں۔ کیا اس سے معاشرے کو مظالم سے نجات ملتی ہے۔

جواب: میرے خیال میں بغیر عدالتی تحقیق کے کسی کو قتل نہیں کرنا چاہیے۔ جب تک عدالت سے ثابت نہ ہو کہ مجرم مستوجب قتل ہے اس وقت تک اس کے خلاف کوئی یک طرفہ کاروائی کی اجازت کسی بھی قانون میں نہیں ہے۔ اسلام میں بھی نہیں ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: رسول اللہﷺ نے ایک ہی عمل مختلف مواقع پر مختلف طریقوں سے کیا جس کی بنا پر مختلف فقہیں پیدا ہوئیں اور ہر فقہ نے ایک طریقہ کو اپنا لیا۔ وہی طریقے جو رسول اللہﷺ نے اختیار فرمائے وہ سنت کہلاتے ہیں۔ کیا اس کی یہ تاویل درست نہیں ہوگی کہ طریقے سے زیادہ تبدل سنت ہے۔ یعنی ان مخصوص طریقوں کے علاوہ بھی موقع محل کے مطابق دیگر طریقوں کو اختیار کرنا سنت ہی کہلائے گا؟

جواب: نہیں۔ اس بات کو تھوڑا سا کوالیفائی کر لیں۔ جو چیزیں اسلام میں مقصود اصلی ہیں۔ جن کا شریعت میں باقاعدہ حکم ہے۔ اس میں تو شرعی طریقے کے علاوہ کوئی اور طریقہ اختیار کرنا درست نہیں ہے اور کوئی نیا طریقہ اپنایا گیا تو وہ بدعت کہلائے گا۔ لیکن جو طریقے means یا وسیلہ اور ذریعہ کی حیثیت رکھتے ہیں اس میں نئے نئے ذرائع آپ اختیار کر سکتے ہیں۔ رسول اللہﷺ نے اپنے زمانے میں تیروں اور تلواروں کے ذریعے جنگ لڑی۔ آپ بم اور جہاز سے لڑ سکتے ہیں۔ حضورﷺ نے اپنے زمانے میں صفہ کی درسگاہ قائم کی۔ آپ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی بنا دیں۔ حضورﷺ نے گھوڑوں پر سفر کیا آپ جہازوں پر کر سکتے ہیں۔

لیکن جو مقاصد ہیں ان میں ترمیم و اضافہ نہیں ہو سکتا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کہیں کہ میری چار رکعتوں سے تسلی نہیں ہوتی میں چھ پڑھوں گا۔ فجر کے وقت ساری رات آرام کر کے اٹھا ہوتا ہوں تو دو کی بجائے زیادہ رکعت پڑھوں گا۔ یہ بدعت ہے اس کی اجازت نہیں ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: دارالحرب اور دارالاسلام کو دورنبوی میں کس حیثیت سے دیکھا گیا۔

جواب: یہ دونوں اصطلاحات بعد کی ہیں۔حضورﷺ کے زمانے میں یہ اصطلاحات نہیں تھیں۔یہ دوسری صدی ہجری کے اوائل کی اصطلاحات ہیں۔فقہائے اسلام نے اپنے زمانے میں جب صورت حال کا جائزہ لیا تو اپنے اپنے فہم اور تصور کے مطابق اصطلاحات وضع کیں۔اس وقت امام ابوحنیفہ کے نزدیک پوری دنیا دو حصوں یا دو داروں اور کیمپوں میں تقسیم تھی، دارالحرب اور دارالاسلام۔امام شافعی کے نزدیک تین حصوں میں تقسیم تھی، دارالاسلام، دارالحرب اور دارالعہد۔کچھ اور فقہا کے نزدیک چار حصوں میں تقسیم تھی، یعنی دارالصلح، دارالحرب، دارالعہد اور دارالاسلام۔یہ کوئی ایسی متعین اور سخت تقسیم نہیں ہے جس کا ذکر قرآن یا سنت میں آیا ہو۔یہ الفاظ اپنے زمانے کے حالات کے لحاظ سے فقہاء کے فہم کی ترجمانی کرتے ہیں۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: کیا اسلام میں کھڑے ہو کر کھانا پینا جائز ہے؟

جواب: میرے خیال میں تو ضرورت کے وقت جائز ہے۔اگر بیٹھنے کا صحیح انتظام نہ ہو تو کھڑے ہو کر کھانے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ترمذی میں روایت ہے کہ رسول اللہﷺ نے کھڑے ہو کر پانی پیا'شرب قائماً'۔اسی شمائل ترمذی میں جس کا میں نے کئی بار ذکر کیا ہے۔اس میں ذکر ہے کہ حضورﷺ نے کھڑے ہو کر پانی پیا۔جہاں جگہ نہ ہو یا زیادہ لوگ ہوں اور بیٹھنے کا بندوبست نہ ہو سکتا ہو تو وہاں کھڑے ہو کر کھانے پینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: پروگرام کے شروع میں نعت پڑھنے کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر کیا ہے؟

جواب: فتویٰ کی بات تو کسی مفتی سے پوچھیے۔میرے خیال میں نعت پڑھنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔رسول اللہﷺ کی محفل میں صحابہ کرام نعتیہ اشعار پڑھا کرتے تھے۔

میں فتویٰ نہیں دیتا، بلکہ میری ایک ذاتی رائے ہے، اس کا اظہار کر سکتا ہوں۔میں کبھی کبھار سوچتا ہوں کہ ہم تلاوت قرآن کے فوراً بعد نعت خوانی کا التزام کر کے گویا قرآن پاک کو جو سراسر کلام الٰہی اور معجزہ کبریٰ ہے عام انسانوں کے کلام کے برابر کر دیا ہے۔کم از کم مجھے ہر تلاوت کے بعد لازمی طور پر نعت پڑھنے سے، جو بہر حال انسانوں کا کلام ہے، یہی تاثر ہوتا ہے۔اگر ہم تلاوت کے بعد پہلے حمد پڑھیں اور حمد کے بعد نعت ہو تو یہ تاثر نہ ہوگا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: کہا جاتا ہے کہ مسلمان پہلی مرتبہ جنگ میں قافلہ لوٹنے کے لئے نکلے تھے۔کیا یہ مناسب ہے کہ کسی کا قافلہ لوٹ لیا جائے۔

جواب: عام اور پرامن حالات میں کسی تجارتی قافلہ لوٹنا بالکل ناجائز اور حرام ہے۔رسول اللہﷺ از خود تو قافلہ روکنے کے لئے نہیں نکلے تھے۔لیکن رسول اللہﷺ نے قریش اور بعض دشمن قبائل کے تجارتی قافلوں کو روکنے کا حکم دیا تھا۔یہ بالکل صحیح ہے۔وہ حالت جنگ تھی۔جب دشمن کے خلاف اعلان جنگ ہو چکا ہو تو اس کی مدد کے لئے آنے والے سامان کے قافلے روکے جا سکتے ہیں۔آج پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ ہو جائے، تو پاکستان کے لئے بھارت کے تجارتی جہازوں کی نقل وحرکت کو روکنا جائز ہوگا۔یہاں ملک کے قابل احترام امیر البحر تشریف فرما ہیں، ان کی بحریہ بھارت کے لئے پٹرول وغیرہ لے جانے والے جہازوں کو کبھی نہیں چھوڑے گی۔یہ دنیا کے ہر قانون میں جائز ہے۔اسی طرح جب کفار مکہ مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے۔جنگ کی تیاری کر رہے تھے اور اسلحہ جمع کر رہے تھے تو ان وسائل کو روکنا اور ان کو مسلمانوں کے خلاف استعمال ہونے سے منع کرنے میں کوئی چیز غیر اخلاقی یا غیر قانونی نہیں تھی۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: یوم عاشورہ کے روزہ کے بارے میں ابن قیم کی کیا رائے تھی؟

جواب: غالبًاابن قیم کی رائے وہی ہے جو عام جمہور کی رائے ہے۔یعنی اس سے مراد دس محرم ہی کا روزہ ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: کیا شیخ الاسلام علامہ ابن قیم کسی خاص مسلک کے مقلد تھے؟

جواب: شیخ الاسلام علامہ ابن قیم فقہی اعتبار سے حنبلی تھے۔انہوں نے جہاں جہاں فقہی مسائل بیان کئے ہیں اکثر حنبلی نقطہ نظر کے حوالہ سے بیان کئے ہیں۔کہیں کہیں انہوں نے اپنے مسلک سے اختلاف بھی کیا ہےاوردوسری رائے ظاہر کی ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: خلیفہ ہارون رشید کی طرح اب بھی بہت سے لوگ مدینہ کے گردونواح میں زیارت کی جگہوں پر نوافل ادا کرتے ہیں۔کیا یہ عمل درست ہے یا بدعت کے زمرے میں آتا ہے؟

جواب: میرے نزدیک تو یہ عمل درست ہے۔میں تو جب بھی موقع ملتا ہے ایسے بابرکت اور تاریخی مقامات پر نوافل ادا کرتا ہوں۔دوسرے ممالک مثلاً مصر،اردن اور شام وغیرہ میں ایسے مقامات پر نوافل ادا کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔لیکن چونکہ ہمارے سعودی بھائی اس کو بدعت سمجھتے ہیں اس لئے سعودی عرب میں ایسا کرتے وقت شرطہ سے بھی اپنی حفاظت کرنی پڑتی ہے۔یہ ذرا مشکل کام ہے کہ آپ نوافل بھی ادا کریں اور شرطہ سے بھی اپنی حفاظت کریں۔اگر آپ کو موقع ملے تو اس احتیاط کے ساتھ ضرور نوافل ادا کریں۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: کیا دس محرم کو روزہ رکھنا چاہیے؟

جواب: عام طور پر مسلمانوں میں جو رائے موجود ہے وہ یہی ہے کہ عاشورہ دس محرم کو کہتے ہیں۔دس محرم کے اور بھی فضائل بیان ہوئے ہیں۔اس لئے جو آدمی پہلے سے دس محرم کے روزے کا اہتمام کرتا ہے اس کو یہ اہتمام ترک نہیں کرنا چاہئے۔جو حضرات اپنی تحقیق میں دس محرم کو یوم عاشورہ نہیں سمجھتے وہ روزہ نہ رکھیں۔اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ فرض یا واجب نہیں ہے۔محض مستحب ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: ایک صاحب نے پوچھا ہے کہ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی روح مبارک یہاں اس محفل میں موجود ہےاور وہ درود شریف سنتی ہے؟

جواب: میرے خیال میں مسلمانوں کی طرف سے پڑھا اور بھیجا جانے والا درود حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچایا جاتا ہے۔جو آپ درود بھیجتے ہیں وہ حضور ﷺ تک پہنچایا جاتا ہےاور آپؐ کے علم میں آجاتا ہے۔یہ بعض روایات سے ثابت ہے۔میں کوئی سخت لفظ نہیں بولنا چاہتا لیکن دور جدید کے بعض متشدد محققین کو ہر اس بات کی تردید سے دلچسپی ہے جس کا تعلق مسلمانوں کی ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور عقیدت سے ہو۔انہوں نے تحقیق کر کے ان احادیث کو بھی کمزور قرار دیا ہے۔ممکن ہے کہ یہ احادیث واقعی کمزور ہوں،لیکن میں سردست اس بحث میں نہیں جاتا۔اگر کمزور بھی ہوں تو اس طرح احادیث کے بارہ میں ہمیشہ دو رائیں ہوسکتی ہیں۔ایک حدیث ایک کی رائے میں ثابت شدہ اور دوسرے کی رائے میں غیر ثابت شدہ ہوسکتی ہے۔اس لئے اس پر نکیر نہیں کرنی چاہئے۔

ایک بات میں ذرا وضاحت سے کہہ دوں۔نکیر اسلام کی ایک اصطلاح ہے۔اس کا مطلب ہے منکر پر اظہار ناپسندیدگی کرنا۔منکر پر ناپسندیدگی کا حسب استطاعت اظہار کرنا مسلمان کی ذمہ داری ہے۔منکر وہ ہے جو قرآن پاک اور حدیث کی نص قطعی کی رو سے برا کام ہے اور ناجائز ہے۔معروف اور منکر دو اصطلاحات ہیں۔بدکاری منکر ہے،چوری،فحاشی،جھوٹ بولنا،جعل سازی اور توہین انبیا منکر ہیں۔ان چیزوں کے منکرات ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔ان پر نکیر کرنا مسلمان کی ذمہ داری ہے۔'من رآی منکم منکراً فلیغیرہ بیدہ' یہ جو مشہور حدیث ہے۔اس میں منکر سے یہی منکر مراد ہے۔لیکن جو جو چیزیں مختلف فیہ ہوں۔جہاں

قرآن وحدیث کی تعبیر کا مسئلہ ہو۔اوراس تعبیر کی بنیاد احادیث یا قرآن کی آیات پر ہواس رائے سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے،لیکن وہ منکر نہیں ہوتی،اس پر نکیر نہیں کرنی چاہئے۔اگر کوئی اس طرح کی مختلف فیہ بات پر نکیر کرتا ہے تو وہ شریعت کو نہیں سمجھا ہے۔

میں یہ بات پوری ذمہ داری سے کہہ رہا ہوں کہ جو شخص مختلف فیہ چیزوں پر نکیر کرتا ہے وہ شریعت کو نہیں سمجھتا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: آپ نے فرمایا کہ امام مالک نے فرمایا کہ عبدالملک بن مروان سے سرزد ہونے والا کام سنت ہے کیونکہ وہ سنت کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا تھا۔اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے دورحکومت میں بہت سے کام ایسے ہوئے جو سنت کی صریح خلاف ورزی پر مبنی تھے۔مثلاً مکہ مکرمہ پر سنگ باری اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی شہادت۔

جواب: یہ آپ امام مالک سے پوچھئے گا کہ انہوں نے عبدالملک بن مروان کے طرزعمل کو کیوں سنت قرار دیا۔میں نے تو صرف ان کی رائے نقل کی ہے۔یہ رائے موطاامام مالک میں موجود ہے جو حدیث کی مستند ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔اگر عبدالملک کے خلاف کوئی رائے یا شہادت اتنے ہی مستند ماخذ سے آپ کے پاس آئی ہو جتنا مستند موطاامامالک ہے تو آپ کی رائے میں وزن ہوسکتا ہے۔ورنہ علم حدیث اور علم تاریخ دونوں کے اصولوں کے تحت موطاامام مالک ہی کے بیان کو قبول کرنا چاہئے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: آپ نے فرمایا کہ ابوجعفر منصور نے امام مالک سے حدیث اور ابن اسحاق سے سیرت پر کام کرنے کی درخواست کی۔اسلام کے ان دواساسی علوم کے خدمت گزار نے امام ابوحنیفہ کو قضا قبول نہ کرنے پر قید کی سزا دی۔

جواب: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں خلفاء کے مخالفین بہت بیٹھے ہوئے ہیں۔آپ کے خیال میں خلیفہ منصور امام ابوحنیفہ کو قضا قبول نہ کرنے پر کوڑے لگوا تا ہے،قید کروا تا ہے اور جبری مشقت کروا تا ہے۔میرے خیال میں یہ واقعات صحیح نہیں ہیں۔میں ان سے اتفاق نہیں کرتا۔امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے ساتھ زیادتیوں کے جو واقعات بعض کتابوں میں بیان ہوئے ہیں وہ غلط ہیں اور میں تاریخی اعتبار سے ان کو درست نہیں مانتا۔یہ بعد کے مصنفین نے منسوب کئے ہیں۔سختی صرف امام احمد بن حنبل پر ہوئی تھی۔جس زمانے میں فقہی مسالک میں بہت زیادہ مباحثہ چلتا تھا تو امام احمد بن حنبل کے عقیدت منداپنے امام کی بزرگی بیان کرنے کے لئے ان پر ہونے والے مظالم کی داستانیں بھی بیان کرتے ہوں گے۔اس کے ردعمل میں بقیہ اماموں کے معتقدین نے بھی اپنے اماموں پر مظالم کی داستانیں بیان کرنا شروع کردی ہوں گی۔یہی داستانیں بعض متأخر تذکرہ نویسوں نے کتابوں میں نقل کردیں۔قدیم مؤرخین کے بیانات کی روشنی میں پتہ چلتا ہے کہ امام ابوحنیفہ کے ساتھ ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔نہ امام مالک کے ساتھ ہوا۔امام مالک کا تو ان کے معاصر امراء اور خلفاء غیر معمولی احترام کرتے تھے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: آپ نے ظاہری اور باطنی خلافت کا ذکر کرتے ہوئے تمام صحابہ کے بارے میں فرمایا کہ ان کو باطنی خلافت عطا ہوئی۔بعض روایات میں ہے کہ باطنی خلافت حضرت علیؓ کو عطا ہوئی۔

جواب: اگر حضورﷺ نے باطنی خلافت کی کوئی خاص تعلیم حضرت علیؓ کو دی ہواور کچھ اور خاص خاص صحابہ کو بھی دی ہو تو اس میں کوئی چیز مانع نہیں ہے۔حضورﷺ کا طریقہ تھا کہ لوگوں کو ان کی استطاعت اور اہلیت کے مطابق دین کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ظاہر ہے کہ جو تعلیم حضرت ابوبکر صدیقؓ،حضرت عمرؓ فاروق یا حضرت علیؓ کو دی تھی وہ عام بدوی صحابہ کو نہیں دی۔عام بدوی کو چند باتیں بتانے پر اکتفا فرمایا۔خاص صحابہ کو خاص باتیں بتائیں۔کچھ صحابہ کو آئندہ آنے والے فتنوں کے بارے میں بتایا اور ان کی بہت سی تفصیلات سے آگاہ کیا۔جب کہ دوسرے صحابہ کو یہ تفصیلات نہیں بتائیں۔مثال کے طور پر حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کو آپ نے منافقین کے بارے

میں بہت کچھ بتایا تھا۔اسی طرح حضرت ابو ہریرہؓ کے علم میں فتن کی بعض احادیث تھی جو عام لوگوں کے علم میں نہیں تھیں۔اس خصوصی تربیت اور تعلیم سے بقیہ صحابہ کی خلافت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: رسول اللہﷺ کی داڑھی مبارک کے بارے میں وضاحت فرمائیں۔کیا آپ مہندی لگایا کرتے تھے؟

جواب: جی ہاں، حضورﷺ کبھی کبھی، خاص طور پر گرمی کے شدید موسم میں، سر اور داڑھی کے بالوں پر مہندی لگایا کرتے تھے۔رہی یہ بات کہ آپ کی داڑھی کی مقدار کتنی تھی، اس کا کسی روایت میں کوئی متعین سائز نہیں ملتا۔صحابہ کرام صرف اتنی روایت کرتے ہیں کہ 'کان کث اللحیہ' یعنی آپ کی گھنی داڑھی تھی۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: آپ نے فرمایا کہ جو کچھ رسول اللہﷺ نے چاہا وہ قرآن میں بیان ہوا اور جو قرآن نے بیان کیا وہ آپؐ نے کیا۔حضورﷺ کو حضرت ابو طالب کی مغفرت یا ان کے قبول اسلام کی بہت خواہش تھی۔کیا قرآن پاک میں اس کا کوئی بیان ہے کہ حضرت ابو طالب نے اسلام قبول کیا یا نہیں؟

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ نے شاید منطق نہیں پڑھی۔منطق کا اصول یہ ہے کہ موجبہ کلیہ کے نقیض سالبہ کلیہ نہیں ہوتی بلکہ سالبہ جزئیہ ہوتی ہے۔یعنی جب اس طرح کا کوئی بیان دیا جاتا ہے جو عمومی بیان ہو اور اس میں کوئی مثبت بات کہی گئی ہو تو اس کی نقیض میں عمومی منفی بیان ضروری نہیں ہے۔وہ جزوی طور پر بھی اگر منفی ہو تو اس کی نقیض ہو سکتی ہے۔

رسول اللہﷺ کی خواہش تو یہ تھی کہ پوری انسانیت مسلمان ہو جائے۔آپؐ کے بارے میں تو خود قرآن کے اندر یہ گواہی موجود ہے **'لعلک باخع نفسک الا یکونوا مؤمنین'**، یعنی آپؐ اس غم میں اپنے آپ کو فنا کیے دے رہے ہیں کہ لوگ مسلمان نہیں ہو رہے ہیں۔اس لئے اللہ تعالیٰ کی جو عمومی حکمت اور مشیت ہے اس کے حساب سے کوئی اسلام میں داخل ہوتا ہے اور کوئی نہیں ہوتا۔ایک اور جگہ ارشاد ہے کہ **"انک لا تھدی من احببت"** کہ تم جس کو چاہو ہدایت نہیں دے سکتے، کیوں کہ ہدایت تو اللہ کے اختیار میں ہے۔

جناب ابو طالب کے قبول اسلام کے بارے میں مسلمانوں میں دو نقطہ نظر ہیں۔ایک نقطہ نظر کے مطابق انہوں نے اپنی وفات سے چند لمحے قبل اسلام قبول کر لیا تھا۔دوسرے نقطہ نظر کے مطابق انہوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔یہ تاریخ کا مسئلہ ہے عقیدہ یا دین کا مسئلہ نہیں ہے۔

(محاضراتِ سیرتؐ)

سوال: علوم حدیث کے اس تعارف کے بعد اندازہ ہوا کہ ایک مومن مسلمان کو کیا کرنا چاہئے۔ہمارے ہاں جو اختلاف ہیں ان کو ختم کرنا چاہئے......

جواب: اختلافات کو ختم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔اختلاف کوئی بری چیز نہیں ہے۔اس سے خیالات کا تنوع اور ورائٹی سامنے آتی ہے۔جتنی ورائٹی ہوگی اتنا خیالات اور افکار پھیلیں گے اور تعلیمی سطح بلند ہوگی۔لیکن ان خیالات کو ایک دوسرے سے جھگڑنے کا ذریعہ نہیں بنانا چاہئے۔امام بخاری اور امام مسلم میں کئی معاملات پر اختلاف ہے۔لیکن امام مسلم امام بخاری کا اتنا احترام کرتے ہیں کہ انہوں نے امام بخاری سے کہا کہ آپ اجازت دیں کہ میں آپ کے پاؤں چوم لوں۔لیکن امام مسلم نے خود اسی صحیح مسلم کے مقدمہ میں امام بخاری پر اتنے احترام کے باوجود تنقید کی ہے۔تو احترام اپنی جگہ اور اختلاف اپنی جگہ۔دونوں ہو سکتے ہیں۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: کیا عورت اور مرد کی نماز میں فرق ہے؟

جواب: یہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ نماز میں کوئی فرق نہیں ہے۔ایک ہی طرح کی ہے سارے احکام ایک جیسے ہیں۔لیکن بعض فقہا کا کہنا یہ ہے کہ جب خاتون سجدہ یا رکوع کی حالت میں جائے تو سجدہ ایسے کرے کہ اس کے جسم کے لئے زیادہ سے زیادہ ساتر ہو، اور جسم کے جو خدوخال ہیں وہ نمایاں نہ ہوں۔یہ بھی ایک

حدیث سے استدلال کی بنیاد پر ہے۔بعض لوگ کہتے ہیں کوئی ضرورت نہیں اسی طرح کرنی چاہئے۔جیسے آپ کا جی چاہے ویسے کرلیں۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: اگر ہرایک کو اپنی پسند کے امام کے مسلک پر چلنے کی کھلی چھٹی دے دی جائے تو کیا اس سے فرقہ بننے کی گنجائش پیدا نہیں ہوتی؟

جواب: اس سے اور بھی بہت سی خرابیاں پیدا ہوں گی اس لئے ہر شخص کو جو علم نہ رکھتا ہوں اپنی پسند کے مطابق فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔امام شافعی کہتے ہیں کہ یہ حکم بالشریعہ نہیں ہوگا بلکہ حکم بالتشہی ہوگی،اپنی شہوت کے مطابق آدمی پیروی کرے گا،جو چیز کاروبار میں مفید ہوگی تو تاجر کہے گا کہ یہ رائے اختیار کریں،جس کو کسی اور چیز میں فائدہ ہوگا تو وہ کہے گا اس چیز کو اختیار کریں۔تو اس سے بڑی قباحت پیدا ہوگی۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: آپ نے بیان کیا کہ اگر ضعیف احادیث پر عمل کرنے والوں کا عمل غیر شرعی نہیں ہے تو ان کو کرنے دیا جائے،مثلاً کسی رات کو نفل پڑھنا جیسے شب معراج اور شب برات کو،تو براہ مہربانی اس بات کو واضح کریں کہ پھر بدعت کی شناخت کیسے کی جائے؟

جواب: دیکھئے بدعت وہ ہے جس کی کسی حدیث یا سنت یا حدیث میں یا حدیث کی تعبیر وتشریح میں کوئی اساس نہ ہو۔لیکن اگر کوئی عمل کسی حدیث کی تعبیر کی وجہ سے ہے وہ تعبیر تو کمزور ہوسکتی ہے اور آپ اس تعبیر کو غلط بھی کہہ سکتے ہیں لیکن اس عمل کو بدعت نہیں کہہ سکتے۔اس لئے اگر کوئی حدیث ایسی ہے جو کمزور ہے،مثلاً اسی ترمذی میں ہے جو میرے سامنے ہے جس میں پندرہ شعبان کو عبادت کرنے کا ذکر ہے لیکن ضعیف حدیث ہے۔اکثر محدثین اس کو ضعیف سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔اس لئے کہ حدیث ضعیف ہے اور اس کا ضعف بڑے کمزور درجہ کا ہے۔جو حضرات سمجھتے ہیں کہ اس کا ضعف کمزور درجہ کا نہیں وہ اس پر عمل کرنے کو جائز سمجھتے ہیں۔اس لئے جو حدیث پر عمل کرنے کی نیت سے اس کام کو کررہے ہیں،وہ بدعت نہیں ہے۔لہٰذا اگر کوئی پندرہ شعبان کی رات کو عبادت کرتا ہے یا دن کو روزہ رکھتا ہے تو وہ نعوذ باللہ بدعت نہیں ہے۔لیکن جو پندرہ شعبان کو پھلجھڑی چلاتا ہے وہ یقیناً بدعت ہے۔جو سمجھتا ہے کہ پندرہ شعبان کو حلوہ بنانا ضروری ہے وہ یقیناً بدعت ہے،جو پندرہ شعبان کو چراغاں کرتا ہے وہ یقیناً بدعت ہے کیونکہ اس کو کوئی براہ راست یا بالواسطہ کسی حدیث میں،کسی ضعیف میں بھی کہیں نہیں آیا۔یہ فرق ہے بدعت اور غیر بدعت میں۔کسی چیز کا صحیح ہونا،سنت ہونا یا نہ ہونا یہ الگ چیز ہے اور اس کا بدعت ہونا یا نہ ہونا الگ چیز ہے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: آج کل دم یا قرآن پڑھ کر جادو یا سحر کا علاج کیا جاتا ہے اور اس کے پیسے وصول کئے جاتے ہیں اس بارے میں کچھ بتادیں۔سورۃ فاتحہ سے ایک سردار کے علاج وغیرہ کا سن کر رقم لینے کی اجازت ہے؟اگر اس کی اجازت واقعی ہے تو کیا ہم اپنی کلاس سے پیسے وصول کرکے لوگوں کے لئے اس طرح کی کلینک کھول سکتے ہیں؟

جواب: میرے خیال میں تو کلینک کھولنے کا راستہ تو بڑا خطرناک ہوگا۔نہ کلینک کھولیں نہ پیسے لیں۔صحابہ نے کوئی کلینک نہیں کھولا تھا وہ بعد میں بھی سو سال تک رہے۔110ھ تک صحابہ کرامؓ کا زمانہ ہے کسی نے کلینک نہیں کھولا،اس لئے کلینک کھولنا صحابہ کے مزاج کے خلاف ہوگا۔کلینک تو میڈیکل سائنس کی بنیاد پر کھولتے ہیں۔یہ تو ایک صحابیؓ نے اس یقین سے کہ اللہ کی کتاب میں شفا ہے،قرآن پاک میں اس کو شفا کہا گیا کہ فیہ شفاء لما فی الصدور،تو اس یقین سے اس کو پڑھ کر پھونک دیا اور اس قبیلہ کے سردار نے ہدیہ کے طور پر کچھ پیسے بھی دے دیئے اور انہوں نے لے لئے۔وہ معاوضہ کی بات نہیں تھی کہ انہوں نے پہلے فیس مقرر کی ہو کہ پانچ سو روپے لیں گے اور پانچ سو روپے لے کر پھونک دیا۔یہ کسی صحابیؓ یا تابعی نے نہیں کیا اس لئے دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: نماز عصر کا وقت کیسے معلوم کرسکتے ہیں؟حدیث میں تو ہے جب کسی چیز کا سایہ برابر ہوجائے تو اس کے عصر کا وقت ممکن ہوجاتا ہے۔

جواب: کچھ لوگوں نے اس کی مستقل جنتریاں بنا رکھی ہیں جس میں ہر علاقہ کے اوقات درج ہیں کہ سورج کا سایہ دوگنا کب ہوتا ہے اور ایک گنا کب ہوتا ہے۔

میرے پاس ایک ایسی جنتری ہے جس میں ہر شہر کی الگ الگ بنی ہوئی ہے۔اس طرح کی کوئی جنتری آپ کو مل جائے تو اس سے آسان ہو جائے گا۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: حدیث میں آیا ہے کہ اسلام میں عورت ولی کے بغیر شادی نہیں کر سکتی ،لیکن علماء نے گھر والوں کے راضی نہ ہونے کی صورت میں کورٹ میں شادی کو جائز قرار دیا ہے۔

جواب: دیکھئے کچھ احادیث ایسی ہیں جن میں حضورؐ نے فرمایا کہ اپنی اولاد سے پوچھے بغیر اس کا نکاح نہ کرو۔الفاظ مجھے یاد نہیں لیکن مفہوم یہ ہے۔ایک اور حدیث میں ہے کہ جب تم کسی بیٹی کی شادی کرو تو اس سے اجازت لےلو۔ 'واذنھا سماتھا اس کی خاموشی اس کی اجازت ہے۔اور ایک ایسی مثال ہے کہ کسی صاحب نے اپنی زیر کفالت خاتون یا بیٹی کا نکاح کر دیا اور اس نے اعتراض کیا تو حضورؐ نے اس نکاح کو ختم کروادیا۔اور ان سے پوچھ کے ان کا نکاح کروایا۔اور ایسی بھی مثالیں ہیں کہ 'ایھا امرت نکحت بغیر اذن ولیھا فنکا حھا باطل باطل باطل' کہ جو کوئی خاتون اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرے تو وہ باطل ہے باطل ہے۔اب بظاہر یہ دو احادیث ہیں اور ان میں تعارض ہے۔میں نے اس سے پہلے بتایا تھا کہ علماء نے تعارض کو حل کرنے کے کم سے کم پچاس اصول مقرر کئے ہیں۔ان اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ جن احادیث میں ولی کی اجازت کے بغیر نکاح نہ کرنے کا ذکر ہے،ان احادیث کو ترجیح دی جائے گی اور ولی کی اجازت کے بغیر جو نکاح ہو گا وہ باطل ہو گا۔

امام ابوحنیفہ نے ان دونوں کو ایک دوسرے سے تطبیق دینے کی کوشش کی ہے۔وہ یہ کہتے ہیں کہ جہاں ولی کی اجازت کے بغیر نکاح نہ کرنے کا ذکر ہے وہاں اس کے اخلاقی پہلو کو حضورؐ نے بیان کیا ہے کہ اخلاقی طور پر ایک مسلمان خاتون کو یہ زیب نہیں دیتا کہ باپ سے پوچھے بغیر جہاں چاہے نکاح کر لے اور باپ کو بعد میں پتہ چلے وہ بیچارہ پریشان ہو۔اس طرح نہیں کرنا چاہئے۔یہ بہت مضبوط اخلاقی ہدایت ہے۔لیکن کیا اگر کوئی خاتون نکاح کرے تو کیا وہ نکاح Legally Valid ہوا کہ نہیں ہوا؟

یہ بڑا نازک سا معاملہ ہے۔فرض کریں ایک خاتون نے نکاح کر لیا اور گھر والوں کو اطلاع نہیں دی۔ان کو دس سال بعد پتہ چلا۔میں ایک مثال دیتا ہوں۔ایک لڑکی یہاں سے پڑھنے کے لئے انگلستان گئی۔وہاں اپنے کلاس فیلو سے شادی کر لی۔ماں باپ کو پتہ نہیں چلا۔دس سال بعد آئی تو شوہر صاحب بھی ساتھ آئے اور تین بچے بھی ساتھ تھے۔اب بتایئے کہ جو فقہا کہتے ہیں کہ نکاح جائز نہیں ہے ان بچوں کو کیا کہیں گے؟

امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ یہ نکاح قانوناً جائز ہے لیکن ان کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ان کو آپ سزا دیں، جرمانہ کریں، قید میں بھی ڈال دیں، تھپڑ بھی لگا دیں اس لئے کہ اس نے ایک ایسا کام کیا ہے جس کی اجازت حدیث میں نہیں دی گئی ہے۔لیکن قانوناً جو اس کا تیکنیکی لیگل حصہ ہے اس کو آپ منسوخ نہیں کر سکتے۔یہ ایک لمبی بحث ہے لیکن دونوں کے بیانات کا خلاصہ یہ ہے۔پاکستان میں عدالتیں اکثر امام ابوحنیفہ کے نکتہ نظر کے مطابق فیصلہ کرتی ہیں۔اس میں بھی عدالتوں کے بعض فیصلوں کے بارے میں مجھے بھی تامل ہے۔اس میں فیصلہ اس طرح نہیں ہوا جس طرح ہونا چاہئے تھا۔میرا کہنا یہ ہے کہ اس موضوع پر ایک مفصل مرتب قانون ہونا چاہئے۔

جب میں اسلامی نظریاتی کونسل کا رکن تھا تو وہاں میں نے یہ مسئلہ اٹھایا تھا اور اس ضرورت کا اظہار کیا تھا کہ ایک مکمل اور جامع مسلم فیملی لاء پاکستان میں تیار ہونا چاہئے جس میں اس طرح کے سارے مسائل کو مکمل طریقے سے بیان کر دیا جائے۔اور جو کمزور پہلو (Loop holes) ہیں یا چھوٹے چھوٹے راستے ہیں ان کو بند کر دیا جائے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: کیا امام ابوحنیفہ نے براہ راست حضرت انسؓ کو دیکھا تھا؟

جواب: جی ہاں! امام صاحب نے حضرت انسؓ کو دیکھا تھا امام ابوحنیفہ اپنے والد کے ساتھ حج کیلئے گئے تھے اس وقت ان کی عمر 14, 13 سال تھی۔حضرت انسؓ مکہ مکرمہ میں تشریف لائے ہوئے تھے اور امام ابوحنیفہؒ بیان کرتے ہیں کہ جب میں حج کیلئے گیا تو مسجد حرام کے باہر ہجوم تھا۔بہت سے لوگ جمع تھے۔ہر شخص لپک کر اس

ہجوم کے مرکز تک پہنچنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ انہوں نے کسی سے پوچھ کر بتایا کہ صحابی رسول ﷺ حضرت انسؓ آئے ہوئے ہیں اور لوگ ان کو دیکھنے کیلئے جمع ہو رہے ہیں تو امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ میں بھی لوگوں کے درمیان سے نکل کر ان تک پہنچ گیا اور میں نے ان کی زیارت کی۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: کیا استخارے میں خواب کا آنا ضروری ہے؟

جواب: نہیں استخارے میں خواب کا آنا ضروری نہیں ہے۔ استخارے کے معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے طلب خیر کیا جائے۔ استخارہ کا مطلب ہے خیر طلب کرنا۔ جب آپ کے سامنے دو کام ہوں، دونوں جائز ہوں، یہ نہیں کہ ایک جائز ہو اور ایک ناجائز کہ سود کھاؤں کہ نہ کھاؤں، اور استخارہ کرنے لگے، یہ استخارہ نہیں ہوگا۔ استخارہ وہاں ہوگا جہاں دو جائز کام درپیش ہوں اور انتخاب میں مشکل پیش آ رہی ہو۔ مثلاً مکان خریدنے کا پروگرام ہے۔ دو مکان مل رہے ہیں اور آپ کے لئے دونوں میں سے ایک منتخب کرنا ہے کہ اچھا کونسا ہے تو استخارہ کر لیں۔ تو پھر اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کریں کہ میرے لئے جو اچھا ہو میرے لئے اس کو آسان کر دے۔ تو جو خیر ہو گی اللہ تعالیٰ اس کو آسان کر دے گا۔ خواب واب کا آنا کوئی ضروری نہیں ہے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: چہرے کا پردہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک نہیں ہے۔ باقی ائمہ کرام کا اس بارے میں کیا خیال ہے۔

جواب: دیکھئے، چہرے کے پردے کے بارے میں شروع سے ایک گفتگو چلی آ رہی ہے جس میں صحابہ اور تابعین کے زمانے سے یہ بحث ہو رہی ہے۔ قرآن پاک کی جس آیت میں آیا ہے کہ پردہ کرو، اس میں آیا ہے کہ 'الا ماظھر منھا' سوائے اس کے کہ جو ظاہر ہو۔ فقہا، محدثین، صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کی ایک بہت بڑی تعداد کا کہنا یہ ہے کہ الا ماظھر منھا یعنی سوائے اس کے کہ جو ظاہر ہو جائے، اس میں جسم کی ساخت اور قد و قامت شامل ہے جس کو نہیں چھپایا جا سکتا۔ جب ایک خاتون نکل کر کہیں جائے گی تو لوگ دیکھ لیں گے کہ دبلی ہے، پتلی ہے، موٹی ہے بھاری ہے تو یہ ظاہر ہو جائے گا اور جسم کی ساخت کا بھی اندازہ ہو جائے گا تو یہ تو نہیں چھپایا جا سکتا۔ اس لئے اس میں یہ شامل ہے باقی سب چیزیں چھپانی چاہئیں۔

کچھ اور حضرات کا کہنا ہے کہ اس میں جسم کے وہ اعضاء بھی شامل ہیں جن کو بعض اوقات کھولنا ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً کسی کام کے لئے خاتون جا رہی ہے، سفر پر جا رہی ہے تو ہاتھ کھلا ہوگا، پاؤں کھلے ہوں گے، کسی مزدوری کے لئے ضرورت پڑ گئی تو ہاتھ کھولنا پڑے گا۔ اس میں کچھ لوگ چہرہ کھولنے کو بھی شامل سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ چہرہ کا پردہ واجب ہے کہ نہیں اس میں تو اختلاف شروع سے چلا آ رہا ہے۔ اس لئے کچھ لوگ جو چہرے کے پردے کو لازمی سمجھتے ہیں ان میں امام احمد بن حنبلؒ اور سعودی علماء شامل ہیں۔ وہ ہر حال میں چہرے کے پردے کو لازمی سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ چہرے کا پردہ عام حالات میں تو کرنا چاہئے لیکن اگر کسی خاتون کو کوئی ناگزیر ضرورت ایسی پیش آ جائے جس میں وہ وقتی یا مستقل طور پر چہرہ کھولنے پر مجبور ہو تو چہرہ، ہاتھ اور پاؤں کھولنے کی اجازت ہے۔

تیسرا نقطہ نظر یہ ہے جو مجھے بھی ذاتی طور پر دلائل وغیرہ دیکھ کر درست معلوم ہوتا ہے لیکن آپ کا جو جی چاہے وہ آپ اختیار کریں۔ وہ ہے کہ چہرے کا ڈھکنا تو افضل اور عزیمت ہے لیکن کھولنے کی اجازت ہے۔ چہرہ کھولنا رخصت ہے۔ اگر وہ خاتون یہ سمجھتی ہیں کہ چہرہ نہ کھولنے سے اس کے لئے مشکلات ہیں تو وہ کھول سکتی ہیں۔ اور یہ مسائل بعض اوقات یورپ اور دیگر مغربی ممالک میں پیش آتے ہیں۔ جہاں ہماری بہت سی بہنوں کو نوکری کرنے کی ضرورت پڑتی ہے اور باہر جانا پڑتا ہے۔ وہاں کے ماحول میں ان کو سر ڈھانکنے کی اجازت بھی بڑی مشکل سے ملتی ہے تو چہرے کے ڈھانکنے کی پابندی بھی اگر لازم کر دی جائے تو ان کے لئے شاید مشکل ہو جائے۔ اس لئے جہاں حالات ناگزیر یا مشکل ہوں تو وہ میرے خیال میں چہرہ کھول سکتی ہیں۔

(محاضراتِ حدیث)

مسلکوں کے حوالہ سے کئی سوالات ایک ساتھ آئے ہیں۔

(ا) ہم لوگ اپنے آپ کو حنفی، مالکی یا شافعی کہتے ہیں۔ تو یہ امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی اپنے آپ کو کیا کہتے تھے۔ مسلم کہتے تھے یا کچھ اور۔

(۲) لوگ ایک حدیث بیان کرتے ہیں کہ جو جماعت سے باہر ہو وہ دین سے باہر ہوا۔ کیا اس کا مطلب کسی امام کی پیروی کرنے کے حوالے سے ہے۔ ہمارے معاشرہ میں کسی امام کی پیروی کے حوالے جو رویہ پایا جاتا ہے اس کا سبب کیا چیز بنی؟ کیا یہ کہنا کہ جس کو صحیح سمجھیں اس کی پیروی کریں، درست رویہ ہوگا۔

(۳) کیا ہم ایک ہی کام کے حوالہ سے کئی طریقے اپنا سکتے ہیں۔ اگر نہیں تو پھر کیا کریں۔ کیا کسی ایک ہی امام کی پیروی ضروری ہے؟

(۴) اماموں کے درمیان احادیث کے حوالہ سے جو اختلافات پائے جاتے ہیں وہ اختلافات ہمارے روزمرہ کے معاملات میں ہمارے اعمال کو کس حد تک متاثر کر سکتے ہیں۔



جواب: دراصل ہم جس چیز کے پابند ہیں تو وہ اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول کی سنت ہے۔ اور یہی شریعت کہلاتی ہے۔ اس کے علاوہ قرآن اور سنت نے کسی اور شخص یا کسی اور چیز کی پیروی کرنے کی پابندی نہیں لگائی ہے۔ لہٰذا شرعاً نہ امام ابوحنیفہ کی پیروی لازم ہے نہ امام بخاری کی، نہ امام مسلم کی، نہ کسی اہل حدیث کے فقہ کی پیروی شرعاً لازم ہے۔ قرآن وسنت کی پیروی لازم ہے۔ لیکن ہر شخص قرآن وحدیث کا اتنا علم نہیں رکھتا کہ وہ ان کی صحیح پیروی کر سکے۔ اس لئے جو شخص علم نہیں رکھتا وہ مجبور ہے کہ وہ جاننے والوں سے پوچھے۔ علم جاننے والوں میں جس کے علم اور تقویٰ پر سب سے زیادہ اعتماد ہو، جس کا علم اور تقویٰ اس درجے کا ہو کہ آپ آنکھیں بند کر کے اس کی بات مان لیں۔ جب ان ائمہ فقہ اور ائمہ حدیث نے اپنے اپنے یہ اجتہادات مرتب کئے تو بعض حضرات کے ارشادات کتابی شکل میں مرتب ہو گئے۔ ان کے شاگردوں نے بڑی تعداد میں ان کے ارشادات اور فتاویٰ کو پھیلا دیا۔ اس لئے ان کی بات پر عمل کرنا آسان ہو گیا۔ بقیہ فقہا کے اجتہادات اور اقوال مرتب نہیں ہوئے اس لئے ہم تک نہیں آئے۔ مثلاً امام بقی بن مخلد بہت بڑے محدث تھے۔ ان کے خیالات کیا تھے وہ حدیث کی کیسے تعبیر کرتے تھے، وہ آج ہمارے سامنے موجود نہیں ہیں۔ اس لئے ہم آج امام بقی بن مخلد کے اجتہادات پر عمل نہیں کر سکتے کہ وہ کیا مفہوم بیان کرتے تھے۔ لیکن امام مالک کے اقوال ہمارے سامنے ہیں۔ امام بخاری کے فتاویٰ ہمارے سامنے ہیں۔ اس لئے ان کے بارے میں یقین سے یہ کہنا آسان ہے کہ وہ کس حدیث کی کیا تعبیر کرتے تھے۔ اس لئے جس کے علم اور تقویٰ پر آپ کو اعتماد ہو آپ اختیار کر لیں۔ لیکن یہ بات کہ ہر آدمی کو یہ حق ہو کہ جزوی مسائل میں پہلے یہ دیکھے کہ کیا چیز میرے لئے آسان ہے۔ اس سے گمراہی اور افراتفری کا راستہ کھلتا ہے۔ اگر صاحب علم دلائل کی بنیاد پر ثابت کرے تو وہ جائز ہے اور ہمیشہ ہوتا رہا ہے اور آج بھی ہو رہا ہے۔ آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔ لیکن جو عام آدمی قرآن و حدیث کا علم نہیں رکھتا وہ صرف آسانیاں تلاش کرنا چاہتا ہے کہ کتاب کھول کر جو چیز آسان لگے اس کو اختیار کر لے۔ اس سے شریعت کے تقاضے ٹوٹتے ہیں اور متاثر ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر صاحب علم دلائل سامنے لا کر ایسا کرتا ہے تو وہ واقعی ایسا کر سکتا ہے۔ ایک عام آدمی جس کو نہیں معلوم کہ حدیث ضعیف کیا ہے، حدیث موضوع کیا ہے۔ جس کو یہ نہیں معلوم کہ قرآن مجید کی کس آیت کا کیا مفہوم ہے۔ کون سی آیت پہلے نازل ہوئی کونسی بعد میں نازل ہوئی۔ وہ اگر اپنی مرضی سے عمل کرنا شروع کر دے تو شاید غلطی کا شکار ہو جائے۔ اس لئے غلطی سے بچنے کے لئے معتبر اور معتمد اصحاب علم پر اعتماد کرنا چاہئے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: حجۃ اللہ البالغہ پر جو کتاب میرے پاس ہے اس کی اردو مشکل ہے۔

جواب: ظاہر ہے کتاب مشکل ہے تو اردو بھی مشکل ہے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ ایک بزرگ تھے مولانا عبدالحق حقانی، ان کا ترجمہ نسبتاً آسان ہے۔ یہ ترجمہ دو جلدوں میں کراچی سے نور محمد کارخانہ تجارت سے غالباً 56-1955 میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد دوبارہ بھی شائع ہوا ہے اگر مل جائے تو یہ آسان ہے۔ ابھی حال ہی میں ادارہ تحقیقات اسلامی (آئی آر آئی) نے اس کا انگریزی ترجمہ شائع کیا ہے۔ اس کے ایک حصہ کا انگریزی ترجمہ میرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر غزالی صاحب نے کیا تھا، وہ بھی مطبوعہ موجود ہے لیکن ایک مکمل ترجمہ دو جلدوں میں ایک امریکی نومسلم خاتون، جن کا اصل نام مارسیہ ہرمنسن ہے، انہوں نے دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ وہ انگریزی ترجمہ بہت اچھا ہے اور یہاں ملتا ہے۔ اردو پڑھنا چاہیں تو مولانا عبدالحق حقانی کا ترجمہ پڑھ لیں۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: جولوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم اہل حدیث ہیں تو اس سے کیا مراد ہے؟

جواب: ایک اعتبار سے تو ہر مسلمان اہل حدیث ہے۔ کیا ہم سب مسلمان جو ایک ارب بیس کروڑ کی تعداد میں دنیا میں بستے ہیں کیا ہم حدیث رسول پر عمل نہیں کرتے؟ سب حدیث پر عمل کرتے ہیں۔ اس لئے ہم سب اس مفہوم میں اہل حدیث ہیں۔ لیکن اہل حدیث کے نام سے جو حضرات برصغیر میں مشہور و معروف ہیں، یہ اصل میں وہ حضرات ہیں، (اس پر تفصیل سے بات تو کل ہوگی)، جو حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے زمانے میں، اور ان کے بعض فتاویٰ کی روشنی میں کچھ احادیث پر عمل کرنے لگے تھے اور ان احادیث پر عمل کرنے کی وجہ سے باقی لوگوں سے ان کا تھوڑا ا اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ یہ لوگ شروع میں تو کسی خاص نام سے مشہور نہیں تھے۔ لیکن جب حضرت سید احمد شہید کی سربراہی میں تحریک جہاد شروع ہوئی اور مولانا اسمٰعیل شہید اس میں شریک ہوئے تو وہ سارے کے سارے لوگ انگریزوں کی تحریروں میں وہابی کہلانے لگے۔ انگریزوں نے ان کو وہابی کے نام سے مشہور کر دیا اور ایک طرح سے ان کا نِک نام وہابی پڑ گیا۔ وہابی کے لفظ کو انگریزوں اور کچھ دوسرے لوگوں نے غلط معنوں میں استعمال کیا تو جب یہ لوگ وہابی کے نام سے مشہور ہوئے تو ان کو بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ انگریزوں نے ان کو بڑا persecute کیا اور اس persecution کے بہت قصے مشہور ہیں اور بڑے دردناک اور سبق آموز ہیں۔ جب یہ سلسلہ بہت آگے بڑھا تو کچھ لوگوں نے یہ چاہا کہ ہم وہابی کے بجائے کسی اور نام سے جانے جائیں تو شاید اچھا ہو۔ انہوں نے یہ طے کیا کہ ہمارا نام اہل حدیث ہونا چاہیئے۔ انہوں نے اہل حدیث کے لفظ کو رواج دے دیا تو وہ اہل حدیث کے نام سے مشہور ہو گئے۔ اس میں وہ حضرات بھی شامل ہیں جو مولانا شاہ اسمٰعیل شہید کے فتاویٰ پر عمل کرتے تھے اور زیادہ تر وہ حضرات شامل ہیں جن کا سلسلہ تلمذ حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلوی سے ملتا ہے، جو بعد میں حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلویؒ کے ارشادات اور طریقہ کار پر چلتے تھے۔ میاں صاحب اتنے بڑے انسان ہیں کہ اپنے زمانے میں وہ شیخ الکل کہلاتے تھے، یعنی سب کے استاد، پورے ہندوستان کے استاد۔ اور واقعی وہ علم حدیث میں شیخ الکل تھے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: جب تمام احادیث آپ ﷺ کی ہیں اور سب مانتے ہیں تو پھر مسلکوں کی بنیاد کیسے پڑی؟ لوگ صرف ایک ہی منتخب کردہ امام کی بات مانتے ہیں اور باقیوں کی بات نہیں مانتے حالانکہ ساری احادیث آپؐ کی ہیں۔

جواب: میں کئی بار عرض کر چکا ہوں کہ بعض احادیث کی تعبیر و تشریح میں اور قرآن پاک کی آیات کی تعبیر و تشریح میں بھی ایک سے زائد رائے کا امکان موجود ہے جس کی مثال میں نے صحابہ کے زمانے سے دی کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کی ایک سے زائد تعبیروں اور ایک سے زائد توضیحات کو درست بتایا اور دونوں کو بیک وقت قابل قبول قرار دیا۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ اسلام میں بعض احکام ایسے دیئے گئے ہیں، قرآن پاک میں بھی اور احادیث میں بھی، جن کی مختلف تفسیریں اور تشریحات کی جاسکتی ہیں۔ یہ اجازت اس لئے دی گئی کہ مختلف حالات کے لحاظ سے، مختلف زمانے کے متنوع تقاضوں اور لوگوں کی ضروریات کے لحاظ سے اور علماء اور فقہا اور محدثین اس کی نئے نئے انداز سے تشریح کر سکیں۔

میں نے مثال دی تھی قرآن پاک کی آیات میں کہ 'علی الموسع قدرہ و علی المقترہ قدرہ'، کہ جب شوہر بیوی کا نفقہ ادا کرے گا تو دولت مند اپنی استطاعت کے لحاظ سے اور غریب اور نادار اپنی استطاعت کے لحاظ سے ادا کرے گا۔ حالانکہ مثال کے طور پر قرآن پاک کہہ سکتا تھا کہ شوہر سو درہم نفقہ دیا کرے گا، یا ایک من گندم دیا کرے گا، اس حکم کو بیان کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن قرآن مجید میں اس طرح سے کوئی معین مقدار یا quantify کر کے نہیں بتایا بلکہ ایک عمومی بات بتائی جس کو اپنے اپنے زمانے کے لحاظ سے لوگ سمجھیں اور اس کی تعبیر کر دیں۔ چونکہ تعبیروں کا اختلاف اسلام کی بنیادی خصوصیات میں شامل ہے اس لئے حضورؐ نے اس اجازت دی۔ قرآن پاک میں اس کی گنجائش رکھی گئی۔ مختلف اہل علم نے مختلف تعبیریں کیں اور جو شخص جس فقیہ کے علم اور تقویٰ پر اعتماد کرتا ہے اس کی بات مان لیتا ہے۔ اس زمانے میں جب یہ سارے محدثین اور فقہا موجود تھے اس وقت جن حضرات کو امام شافعیؒ کے علم اور تقویٰ پر اعتماد تھا وہ امام شافعی کے اجتہادات کو سر آنکھوں پر تسلیم کرتے تھے۔ امام شافعی اتنے اونچے درجہ کے انسان تھے کہ اگر آج وہ آ ئیں اور ہم میں سے کوئی ان کے پاؤں چومنے کی کوشش نہ کرے تو بڑا بد بخت ہوگا۔

امام احمد بن حنبلؒ سے ہر مسلمان کو محبت اور عقیدت ہے۔ لیکن امام احمد بن حنبل کے اجتہادات کو دنیائے اسلام میں بہت تھوڑے لوگ قبول کرتے ہیں۔ مسلمانوں میں مشکل سے ایک فیصد لوگ ہوں گے جو فقہی معاملات میں امام احمد کی رائے اور اجتہاد پر عمل کرتے ہیں۔ بقیہ ننانوے فیصد دوسرے فقہا کی پیروی کرتے ہیں۔ لیکن امام احمد کے احترام میں وہ کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ تقلید سے مراد صرف یہ ہے کہ کسی شخص کے علم اور تقویٰ کی بنیاد پر اس کی بات مان کر اس پر عمل کر لیا جائے۔ اس کو تقلید کہتے ہیں۔ امام احمد کی تقلید تو تھوڑے لوگوں نے کی۔ لیکن احترام سب کرتے ہیں۔ تقلید کا تعلق احترام سے نہیں ہے۔ احترام تو ہر صاحب علم کا ہوتا ہے۔ صحیح بخاری دنیائے اسلام میں ہر جگہ پڑھائی جاتی ہے۔ اس وقت دنیائے اسلام میں امام ابوحنیفہ کی پیروی کرنے والے کم وبیش پینسٹھ فیصد مسلمان ہیں۔ پورا وسط ایشیا، پورا افغانستان، پورا ترکی، پورا مشرقی یورپ، پورا ہندوستان، پورا پاکستان، پورا بنگلہ دیش، پورا چین۔ یہ دنیائے اسلام کے تقریباً ساٹھ پینسٹھ فیصد بنتے ہیں اور امام ابوحنیفہ کی تقلید کرتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی امام بخاری کے احترام اور عقیدت میں کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ امام بخاری نے کم سے کم بیس مقامات پر امام ابوحنیفہ پر تنقید کی ہے جو بعض مقامات پر خاصی سخت ہے۔ سر آنکھوں پر۔ اگر باپ اور چچا میں اختلاف ہو تو بچوں کا یہ حق نہیں کہ وہ باپ کا ساتھ دے کر چچا کے خلاف کچھ آواز اٹھائیں۔ دادا اور دادا کے بھائی میں اختلاف ہو تو پوتوں اور نواسوں کا یہ کام نہیں کہ وہ ایک کی حمایت میں اٹھیں اور دوسرے کی مخالفت کریں۔ ہم امام بخاری کا بھی احترام کرتے ہیں اور امام ابوحنیفہ کا بھی احترام کرتے ہیں۔ ان کا ایک علمی اختلاف ہے۔ جس کو امام بخاری کے دلائل زیادہ مضبوط معلوم ہوں وہ ان کی پیروی کرے اور جس کو امام ابوحنیفہ کے دلائل مضبوط معلوم ہوتے ہیں وہ ان کی پیروی کرے اور احترام دونوں کا کرے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: ابھی تک سنے گئے لیکچرز سے میں نے اندازہ لگایا کہ استاد اور شاگرد کی رائے میں بھی فرق ہوسکتا ہے۔ confusion پیدا ہوتی ہے کہ کس کی رائے پر عمل کیا جائے، کیونکہ دونوں نے تحقیق کے بعد ہی بات کی ہوگی۔

جواب: اصل اور آئیڈیل بات تو یہ تھی کہ ہر شخص اپنی تحقیق پر عمل کرے۔ آئیڈیل بات تو یہی ہے۔ لیکن ہر شخص کے پاس اتنا وقت نہیں کہ خود تحقیق کرے۔ اس لئے مسلمانوں میں رواج یہ پیدا ہوگیا کہ یا تو آپ خود تحقیق کریں اور خود ہی اس درجہ پر پہنچ جائیں کہ حدیث کی ہر روایت کی تحقیق کر کے خود فیصلہ کریں۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو اور ہر شخص کے ساتھ ایسا نہیں ہوسکتا تو پھر قرآن پاک نے نہایت مفید، آسان اور عملی اصول عطا کیا ہے کہ 'فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون'، اگر تم نہیں جانتے تو جاننے والے ہیں ان سے پوچھو، ان کی رائے پر عمل کرو۔ اس لئے مسلمانوں میں پہلے دن سے یہ طریقہ ہے کہ جس شخص کی دو باتوں پر اعتماد ہو، صرف دو، بقیہ کچھ نہیں۔ جس کی ان دو چیزوں پر آپ کو اعتماد ہو، اس کی رائے پر عمل کریں، اس اعتماد کے ساتھ کہ یہ رائے صحیح ہوگی اور اللہ تعالیٰ آپ سے باز پرس نہیں کرے گا۔ ایک اعتماد اس کے علم پر اور دوسرا اعتماد اس کے تقویٰ پر ہو۔ علم کے بغیر صرف تقویٰ کافی نہیں اور تقویٰ کے بغیر علم کافی نہیں۔ ابھی میں امام مالکؒ کا ذکر کر چکا ہوں کہ انہوں نے ایسے لوگوں کی احادیث قبول نہیں کیں جو تقویٰ میں تو اونچے درجہ کے تھے لیکن ان کی علمی پختگی میں امام مالک کو تأمل تھا۔ اس لئے علم بھی اونچے درجہ کا ہونا چاہئے اور تقویٰ بھی کامل ہونا چاہئے جس کی رائے اور اجتہاد پر آپ عمل کرنے کا فیصلہ کریں تو پہلے یہ یقین کر لیں کہ اس کا تقویٰ بھی اونچے درجہ کا ہو اور علم بھی راسخ ہو۔ یہ فیصلہ آپ کو خود ہی کرنا پڑے گا اس میں کوئی اور آپ کا ساتھ نہیں دے گا کہ آپ کو کس کے علم اور تقویٰ پر اعتماد ہے۔ تقویٰ آپ خود جج کریں، کوئی آدمی نہیں بتا سکتا۔ میں اپنے بارے میں فیصلہ کروں گا، آپ اپنے بارے میں فیصلہ کریں گے۔ اگر آپ میری رائے جاننا چاہیں کہ فلاں فلاں معاملہ میں میں کس کے علم و تقویٰ کو بھروسہ کے قابل سمجھتا ہوں تو میں انفرادی طور پر آپ کو بتا سکتا ہوں۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: کیا وہ لوگ بھی صحابہ ہوں گے جنہوں نے نبی کو تو دیکھا لیکن اس وقت ایمان نہیں لائے تھے۔

جواب: یہ بات تو میں کہہ چکا ہوں کہ جو بعد میں ایمان لائے اور انہوں نے حالت ایمان میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت نہیں کی وہ صحابیؓ شمار نہیں ہوتے۔ صحابیؓ وہ خوش نصیب حضرات شمار ہوتے ہیں۔ جنہوں نے حضورؐ کو حالت ایمان میں دیکھا اور بعد میں اسلام نہیں لائے بلکہ حضورؐ کے زمانے ہی میں اسلام لائے۔ ایک مشہور بزرگ

تھے کعب الاحبار، یہ حضورؐ کے زمانہ میں مدینہ میں موجود تھے۔ یہودی تھے انہوں نے حضورؐ کے زمانے میں اسلام قبول نہیں کیا۔ حضورؐ کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ یا حضرت عمرؓ فاروق کے زمانے میں اسلام لائے۔ اس لئے ان کا شمار تابعین میں ہوتا ہے، صحابہ میں نہیں۔ حالانکہ وہ مدینہ میں رہتے تھے اس لئے حضورؐ کو بارہا دیکھا۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: شش کلمات یا چھ کلموں کی سند کیا ہے جو ہمارے معاشرہ میں گویا ایک جزو ایمان بن گئے ہیں؟

جواب: مجھے ان چھ کلموں کی سند کے بارے میں تو کوئی علم نہیں، تاہم مختلف احادیث میں مختلف طریقوں سے ان کلمات کا تذکرہ ملتا ہے۔ قرآن وحدیث میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جس کے مطابق یہ کلمے پڑھنا یا ان کو یاد کرنا ایمان یا عقیدہ کا کوئی جز ہو۔ میرے خیال میں یہ بعض علماء نے عام لوگوں کی سہولت کے لئے ترتیب دیئے ہیں، تاکہ ایمان سے متعلق بنیادی چیزوں کا حفظ کرنا آسان ہو جائے۔ اس کے علاوہ ان کی کوئی سند نہیں ہے۔ یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ اگر کسی نے یہ چھ کلمے یاد کر لئے تو وہ اچھا مسلمان ہوگا اور جس نے یاد نہیں کئے اس کے ایمان پر کوئی حرف آئے گا۔ یہ صرف سہولت کے لئے ہیں، فرض عین قسم کی کوئی چیز نہیں ہے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: میں حج پر جانا چاہتی ہوں میرا محرم نہیں ہے......

جواب: جب محرم نہیں ہے تو آپ پر حج بھی فرض نہیں ہے۔ آپ محرم کے ساتھ حج کریں تو زیادہ بہتر ہے۔ میرا مشورہ یہی ہے۔ آپ کسی کے مشورہ پر نہ جائیں اور اسی مسلک پر عمل کریں کہ بغیر محرم کے حج نہیں ہوتا۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: شب برات کے حوالہ سے لوگوں کے جو عقائد ہیں ان کو کیسے درست کیا جائے؟

جواب: لوگوں سے ان کے عقائد کے بارے میں لڑنا جھگڑنا نہیں چاہئے۔ لوگ عقائد کے معاملہ میں خاصے متشدد ہوتے ہیں، ایک مرتبہ اختلاف میں شدت پیدا ہو جائے تو پھر کوئی آپ کی بات نہیں سنتا۔ آپ آہستہ آہستہ نرمی سے بیان کریں۔ جو لوگ شب برات پر کچھ عبادت وغیرہ کرتے ہیں وہ بھی یہ سمجھ کر کرتے ہیں کہ حدیث میں شب برات کی عبادت کا ذکر آیا ہے۔ حالانکہ کسی صحیح حدیث میں تو نہیں آیا ہے۔ اس لئے آہستہ آہستہ ان کو قائل کریں۔ اگر پہلے ہی دن تنقید میں شدت آ گئی تو پھر مناسب نہیں ہوگا۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: حدیث میں مردوں کے لئے سونا، چاندی اور پلاٹینیم کی انگوٹھیاں استعمال کرنے کا کیا بیان ہے؟

جواب: مردوں کے لئے صرف سونے کی انگوٹھی کی ممانعت ہے۔ چاندی کی انگوٹھی اگر کسی مقصد کی خاطر ہو تو جائز ہے اور بقیہ چیزوں کی انگوٹھی پہننا مردوں کے لئے حرام نہیں ہے جائز ہے، صرف سونے کی انگوٹھی جائز نہیں ہے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: کیا ہم حضورﷺ کو بانئ اسلام کہہ سکتے ہیں؟

جواب: میرے خیال میں تو نہیں کہنا چاہئے۔ دین تو اللہ تعالیٰ کا ہے، ان الدین عنداللہ الاسلام، رسول اللہﷺ اس کے پہنچانے والے اور داعی ہیں۔ میرے خیال میں بانی کہنا درست نہیں ہے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: بیہقی اور ترمذی کے حوالہ سے شعبان کی پندرھویں کی روایت کا بیان ہے۔

جواب: محدثین میں جو ذمہ دار حضرات ہیں ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے اس لئے اس سے کوئی چیز ثابت نہیں ہوتی۔لیکن چونکہ حدیث ترمذی اور بیہقی میں آئی ہے اس لئے اگر کچھ لوگ اس پر عمل کرتے ہیں تو ان سے نہ اختلاف کرنا چاہئے اور نہ خواہ مخواہ الجھنا چاہئے۔ کیونکہ وہ اپنی دانست میں تو حدیث پر ہی عمل کر رہے ہیں، چاہے وہ ضعیف ہی ہو۔اور حدیث ضعیف کی تحقیق میں اختلاف ہوسکتا ہے۔ایک محقق کے نزدیک وہ ضعیف ہوگی تو دوسرے کے نزدیک وہ حسن لغیرہ ہوگی، تیسرے کے نزدیک حسن لعینہ ہوگی۔تو چونکہ اس طرح کا اختلاف ہوسکتا ہے اس لئے اس میں زیادہ سختی سے کام نہیں لینا چاہئے۔امام بیہقی کا مقام بہت ہی اونچا ہے۔ ان کا مقام اتنا اونچا ہے کہ وہ سند کے ساتھ احادیث بیان کرنے والوں کے سلسلہ کے آخری محدث ہیں۔لیکن ان کی کتابوں میں بعض احادیث ضعاف بھی ہیں، بعض کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ موضوعات بھی ہیں۔لیکن کسی کی غلطی سے اس کے مقام پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔غلطی سے مبرا ذات تو بس ایک ہی ہے وہ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: شب برات کے متعلق وضاحت کریں؟

جواب: بھئی لوگوں کو شب برات کرنے دیجئے۔اگر لوگ آپ سے پوچھیں تو آپ صرف اتنا بتا دیجئے کہ شب برات کی کوئی باقاعدہ عبادت صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔لٹھ لے کر پیچھے پڑ جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ جا کر ریڈیو اور ٹی وی والوں سے لڑیں، یہ صحیح نہیں ہے۔اس سے مسائل بگڑتے ہیں اور خیالات میں شدت پیدا ہوتی ہے۔نرمی سے کام لیں۔سختی وہاں کرنی چاہئے جہاں واضح طور پر کوئی چیز دین میں حرام اور ممنوع ہو، اور منکر کی حیثیت رکھتی ہو۔ جہاں اختلافی چیز ہو وہاں شدت نہیں کرنی چاہئے۔صحابہ کرامؓ میں بھی اختلاف تھا۔ایک کے نزدیک ایک عمل سنت تھا۔دوسرے کے نزدیک دوسرا عمل سنت تھا۔ایک صحابیؓ نے بیان کیا کہ اگر آپ پر پکی ہوئی کوئی چیز کھالی جائے تو اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔یہ بات حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے سامنے بیان ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ اگر میں سر میں گرم تیل لگاؤں تو کیا مجھے دوبارہ وضو کرنا پڑے گا؟ کیا اگر میں گرم پانی سے وضو کروں تو دوبارہ وضو کرنا پڑے گا؟ گویا انہوں نے اس کو قبول نہیں کیا۔اگر صحابہ میں اختلاف ہوسکتا ہے اور وہ ایک دوسرے کے خلاف لٹھ لے کر نہیں نکلے تو ہم کیوں نکلیں؟ آپ شب برات پر عبادت کرنے والوں کو عبادت کرنے دیجئے۔اس طرح کے معاملات میں زیادہ سختی نہیں کرنی چاہئے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: ایک عالم اور محدث جو یہ جانتے ہیں کہ جو شخص حضور ﷺ سے جھوٹ منسوب کرے وہ دوزخ میں اپنا ٹھکانہ بنالے، پھر وہ ضعیف حدیث کیوں بیان کرتے ہیں؟

جواب: دیکھئے ضعیف حدیث ایک درجہ میں تو حدیث ہے۔محدثین کا کہنا ہے کہ اس کو بیان کرتے وقت اس کے ضعف کا حوالہ دے دینا چاہئے کہ ایک ضعیف حدیث میں یہ بات آئی ہے۔کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر ضعیف حدیث میں کوئی ایسی بات آئی ہو کہ جو ویسے خود اپنی جگہ ٹھیک ہو اور ثابت ہو، اس کو بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔مثال کے طور پر ایک ضعیف حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا کو صلوٰۃ التسبیح سکھائی۔اس کا ضعف بھی کم درجے کا ہے اور اس میں ایک نماز کی تلقین ہے۔اب اگر کوئی اس پر عمل کرنا چاہے تو کر لے، اچھی بات ہے اور اگر نہ کرنا چاہے تو بھی کوئی حرج نہیں۔کسی ضعیف حدیث کی بنیاد پر مسلمانوں میں کوئی اختلاف پیدا کرنا میرے خیال میں مناسب نہیں ہے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال......(سوال پڑھا نہیں گیا ہے اس لئے کیسٹ میں موجود نہیں ہے)۔

جواب: لیکچر کے شروع میں قطعی الدلالت اور قطعی الثبوت تو کل میں نے بتا دیا تھا۔کل میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن مجید یا حدیث یا سنت میں جو کچھ لکھا ہوا ہے اس کو

اصطلاح میں نص کہتے ہیں۔مثلاً یہ ایک حدیث کی عبارت ہے،حضورؐ نے فرمایا کہ 'انما لاعمال بالنیات'۔ یہ ایک نص ہے۔قرآن کریم کی کوئی آیت بھی نص ہے۔'یوصیکم الله فی اولادکم لذکر مثل حظ الأنثییس' بھی نص ہے۔جتنی نصوص ہیں وہ قرآن پاک میں آئی ہوں یا احادیث میں آئی ہوں ان کی دو قسمیں ہیں۔ایک قسم ہے قطعی الثبوت،جس کا ثبوت قطعی اور یقینی طور پر ہمارے پاس موجود ہے کہ یہ نص قطعی ہے۔پورا قرآن پاک قطعی الثبوت ہے۔اور احادیث متواترہ اور سنن ثابۃ قطعی الثبوت ہیں۔تواتر کی پانچوں قسموں کے ساتھ ان کے ثابت ہونے میں کوئی شک نہیں۔اس کے علاوہ جو احادیث ہیں جو خبر واحد ہیں وہ ظنی الثبوت ہیں۔یعنی اس بات کا اگر ایک فی ہزار بھی امکان ہے کہ بیان کرنے میں کس سے کوئی بھول چوک ہوگئی ہو،تو قطعیت ختم ہوگئی اور ظنیت آ گئی۔تو کچھ احادیث ظنی الثبوت ہیں اور کچھ احادیث اور پورا قرآن مجید قطعی الثبوت ہے۔

اس کے بعد یہ جو ساری احادیث اور آیات قرآن ہیں،ان دونوں قسموں کے ساتھ ملا کر ان کے معانی اور مطالب میں کچھ آیات اور احادیث ہیں جن کے معانی اور مطالب قطعی ہیں اور یقینی ہیں۔قرآن مجید میں ہے کہ اھدنا الصراط المستقیم،ہر ایک کو پتہ ہے کہ صراط مستقیم سے کیا مراد ہے۔شریعت کا بتایا ہوا راستہ صراط مستقیم ہے۔اس میں کوئی دو راستے مراد نہیں ہوسکتے۔اگر کوئی کہے کہ جدّہ سے مکہ کو جو سڑک جاتی ہے وہ صراط مستقیم ہے،تو یہ گمراہی ہوگی،اس لئے کہ سب کو پتہ ہے کہ صراط مستقیم کیا ہے۔اسی طرح احادیث میں،مثلاً ان الشیطان یحضر احدکم ،کہ شیطان تم میں سے ہر ایک کے پاس جاتا ہے اور گمراہ کرتا ہے۔ شیطان سے کیا مراد ہے ہر ایک کو معلوم ہے۔اگر کوئی کہے کہ نہیں شیطان سے مراد تو فلاں آدمی ہے جو امریکہ یا فلاں ملک میں بیٹھا ہوا ہے،تو یہ غلط ہوگا۔ سب کو پتہ ہے کہ شیطان سے کیا مراد ہے۔یہ جو دلالت ہے،یہ قطعی کہلاتی ہے۔اس لئے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ شیطان اور صراط مستقیم سے کیا مراد ہے۔اس میں کوئی دوسری رائے نہیں ہوسکتی۔جو دوسری رائے پیش کرے گا وہ گمراہی پھیلائے گا اور غلط کرے گا۔لیکن کچھ آیات قرآنی اور احادیث ایسی ہیں کہ جن کے ایک سے زائد مفہوم نکل سکتے ہیں۔مثلاً الماْ الکثیر لا ینجس ،زیادہ پانی ناپاک نہیں ہوتا۔اب ایک مطلب یہ ہے کہ اتنا بڑا تالاب ہو جتنا یہ کمرہ ہے،دوسرا مطلب یہ ہے کہ دو بڑے مٹکے مراد ہیں،ایک مطلب یہ کہ اتنا زیادہ پانی ہو جتنا راول ڈیم میں بھرا ہوا ہے۔یہ سارے مفہوم ممکن ہیں،لیکن ان میں سے کوئی ایک مفہوم قطعی نہیں ہے۔آپ کہیں کہ میرا بیان کردہ یہ ایک سو فیصد درست ہے اور باقی سب غلط ہیں تو ایسا نہیں ہے۔یہ بھی صحیح ہوسکتا ہے،وہ بھی صحیح ہوسکتا ہے۔اس طرح کے مفہوم کو ظنی الثبوت کہتے ہیں۔

قرآن پاک میں کئی جگہ ایسے الفاظ آئے ہیں کہ ایک مفسر نے اس کا ایک مطلب لیا ہے،اور دوسرے نے دوسرا مفہوم سمجھا،اس لئے کہ قرآن پاک کے الفاظ میں دونوں کی گنجائش ہے۔یہ ظنی الثبوت ہے۔اس لئے کسی ایک مفہوم کے بارے میں قطعیت کا وہ معیار اختیار نہیں کیا جاسکتا جو مثلاً صراط مستیم کے بارے میں ہے،جو مثلاً صلوٰۃ،زکوٰۃ اور حج کے بارے میں ہے۔تو یہ چیزیں ظنی الثبوت کہلاتی ہیں۔تو نصوص کی چار قسمیں ہیں۔سب سے اونچا درجہ ان نصوص کا ہے جو قطعی الدلالت اور قطعی الثبوت دونوں ہیں۔دوسرا درجہ وہ ہے جو قطعی الثبوت اور ظنی الدلالت ہیں۔تیسرا درجہ ان کا ہے جو ظنی الثبوت اور قطعی الدلالت ہے اور آخری درجہ اس نص کا ہے جو ظنی الدلالت اور ظنی الثبوت ہے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: ہمارے اسلاف نے دین کو درست انداز میں پہنچانے کے لئے کتنی کوشش کی،انہوں نے اپنی ساری زندگیاں اس میں کھپائی،ذہن میں سوال آتا ہے کہ زندگی کی دیگر ذمہ داریاں رزق حلال کا حصول،گھریلو اور خانگی ذمہ داریوں کی ادائیگی کس طرح ہوتی تھی؟

جواب: واقعی یہ ایک بنیادی سوال ہے۔اس سلسلہ میں ایک مثال میں آپ کو دیتا ہوں۔امام ربیعۃ الرائے،یعنی امام ربیعہ بن عبدالرحمٰن ایک بڑے مشہور امام ہیں، امام مالکؒ کے استاد ہیں،علم حدیث اور علم فقہ دونوں میں بڑا اونچا درجہ رکھتے ہیں۔ان کے والد بہت بڑے تاجر تھے۔انہوں نے بہت دولت اپنے گھر والوں کو دی اور تجارت کی خاطر کسی دوسرے ملک میں چلے گئے۔وہاں حالات کچھ ایسے رہے کہ وہ وقت پر واپس نہ آسکے اور آنے میں بیس پچیس سال لگ گئے۔جب جا رہے تھے تو ایک ننھا بچہ چھوڑ کر گئے تھے جو گھر میں رہتا تھا اور ابھی پڑھنا شروع نہیں کیا تھا۔ان کی اہلیہ نے ان کے جانے کے بعد اس پیسے کو کسی کاروبار میں لگانے یا محفوظ رکھنے کے بجائے بچے کو جگہ جگہ بھیجا جہاں سے اس نے علم حاصل کیا اور اتنا علم حاصل کیا کہ مدینہ منورہ کے سب سے بڑے امام اور سب سے بڑے عالم ہوگئے۔ان کی رائے اتنی قابل احترام تھی کہ لوگ دور دور سے سننے کے لئے آتے تھے اور ان کا لقب ہی ہوگیا،ربیعۃ الرائے۔بیس پچیس سال کے بعد ان کے والد واپس آئے۔پرانے

زمانے میں دستور تھا اور سنت بھی ہے کہ جب آدمی سفر سے واپس آئے تو پہلے مسجد میں جا کر دو رکعت نفل ادا کر کے پھر گھر میں آئے۔ صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں یہ سنت رائج تھی۔ افسوس ہے کہ اب لوگوں نے چھوڑ دی ہے۔ چنانچہ امام ربیعۃ الرائے کے والد پہلے مسجد میں گئے اور نوافل ادا کئے۔ وہاں دیکھا کہ ایک بڑا خوبصورت اور صحت مند نوجوان بیٹھا ہوا ہے اور علم حدیث بیان کر رہا ہے اور لوگ سن رہے ہیں۔ یہ بڑے متاثر ہوئے کہ بڑا خوبصورت نوجوان ہے اور عالم فاضل ہے۔ جب گھر واپس آئے، گھر والوں سے ملے، بیٹے کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ کہیں گیا ہوا ہے، تھوڑی دیر میں آئے گا۔ انہوں نے کہا اچھا۔ پھر پوچھا تو یہی کہا کہ تھوڑی دیر میں آجائے گا۔ اس دوران انہوں نے اپنے پیسوں کے بارے میں پوچھا تو اہلیہ نے بتایا کہ وہ تو میں نے بڑے مفید کاروبار اور بڑی اچھی تجارت میں لگا دیئے ہیں۔ اسی اثنا میں والد صاحب اس منظر کی کئی بار تعریف کر چکے تھے جو وہ مسجد میں دیکھ کر آرہے تھے کہ مسجد میں ایک نوجوان حدیث کا درس دے رہے ہیں۔ جب انہوں نے تھوڑی دیر میں رقم کا حساب پوچھا تو پتہ چلا کہ گھر میں تو کچھ بھی نہیں ہے سب ختم ہو گیا ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ وہ پیسہ کہاں خرچ ہو گیا تو انہیں بتایا گیا کہ ایسے کاروبار میں لگا دیا گیا ہے جو مفید کاروبار تھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ مفید کاروبار کہاں ہے، اس کے اثرات تو کہیں نظر نہیں آرہے ہیں۔ گھر میں تو فقر و فاقہ کا منظر نظر آرہا ہے تو جواب دیا کہ وہ آپ کا ہی بیٹا ہے جو مسجد میں درس دے رہا ہے۔ وہ آپ ہی کا صاحبزادہ ہے اور میں نے سارا پیسہ اس کی تعلیم پر خرچ کر دیا ہے۔

اس طرح سے لوگ اپنی عمر بھر کی کمائی علم پر خرچ کر دیا کرتے تھے۔ لیکن ایسے حضرات بھی تھے جو ایک سال تجارت کرتے تھے اور ایک سال علم حدیث کے لئے سفر کیا کرتے تھے۔ کچھ لوگ یہ کرتے تھے کہ ایک بھائی نے کاروبار کیا اور دوسرے بھائی کو حدیث کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ ابتدائی دس بارہ سال علم حدیث میں لگائے پھر چند سال کاروبار میں لگائے، پھر علم حدیث میں چند سال لگائے۔ اس لئے کہ علم حدیث کے لئے طویل طویل سفر کرنے پڑتے تھے، اور یہ کام پیسے کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ پیسہ حاصل کرنے کے لئے محنت کرنی پڑتی تھی۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: حدیث میں آیا ہے کہ اپنا جسم نماز میں کتے کی طرح نہ بچھاؤ اس میں جسم خود بخود اوپر ہو جاتا ہے، اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب: کتے کی طرح بچھانے سے مراد یہ ہے کہ دونوں بازو زیادہ نہ پھیلائے جائیں بلکہ کہنیاں اوپر رکھی جائی۔ کتا جب بیٹھتا ہے دونوں بازو پورے رکھ کر بیٹھتا ہے تو اس کی ممانعت ہے لیکن خواتین اگر جسم کو سمیٹ لیں اور کہنیاں زمین پر پھیلا کر نہ رکھیں تو دونوں پر عمل ہو جاتا ہے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: عورتوں کی نماز کے طریقے میں کیا فرق ہے؟ کیا دونوں کی نماز ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے؟

جواب: بہت مختلف تو بالکل نہیں ہے۔ جو اختلاف ہے وہ بہت ہلکی قسم کا ہے۔ آپ کا جیسے جی چاہے نماز پڑھیں آپ کی نماز ہو جائے گی، آپ اس اختلاف کی تفصیلات میں نہ جائیں۔

ایک روایت میں ہے کہ خواتین کو نماز کے وقت پردے اور حجاب کا اہتمام کرنا چاہیئے۔ ایک حدیث سے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ اب اس کی تعبیر کیسے ہو اور اس پر عمل درآمد کیسے ہو۔ بعض فقہا یہ کہتے ہیں کہ جب خواتین نماز پڑھیں تو خاص طور پر جب سجدے میں جائیں تو اس طرح نہ جائیں کہ ان کے جسم کی ساخت ظاہر ہو کیونکہ سجدے میں لباس جسم سے چمٹ جاتا ہے اور کھڑے رہنے میں ڈھیلا رہتا ہے۔ سجدے کے وقت لباس کمر اور جسم پر چپک جاتا ہے اور جسم کی ساخت ظاہر ہو جاتی ہے۔ تو پردے کا جو معیار ہے وہ برقرار نہیں رہتا۔ اس لئے بعض فقہا نے کہا ہے کہ جب خواتین سجدہ میں جائیں تو یہ اہتمام کریں کہ لباس جسم سے نہ چپکے اور وہ اپنے جسم کو سمٹ لیں۔ بعض نے کہا کہ حجاب کا اہتمام تو کر لیں لیکن جسم کو سمیٹنے کی ضرورت نہیں۔ یہ محض ایک تعبیر کی بات ہے۔ آپ کا جیسے جی چاہے کریں۔ اس طرح کی چیزوں پر غیر ضروری اور طویل بحث نہیں کرنی چاہیئے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: اگر عورتوں کا محرم نہ ہو تو وہ گروپ کی شکل میں حج یا عمرہ کے لئے جا سکتی ہیں؟

جواب: یہ تو آپ کسی مفتی سے پوچھیں۔ لیکن فقہائے احناف کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر کوئی خاتون معمر ہیں اور اس کی حد انہوں نے پچاس سال مقرر کی ہے وہ بغیر محرم کے اس شرط کے ساتھ حج پر جاسکتی ہیں کہ ان کے ساتھ خواتین کی ایک بڑی تعداد ہو اور ان خواتین کے ساتھ ان کے محرم موجود ہیں۔ یہ تو فقہی جواب ہے۔ لیکن سعودی قانون کی رو سے بغیر محرم کے کوئی خاتون حج کے لئے نہیں جاسکتی اور ہمیں اس قانون کی پابندی کرنی چاہئے۔ میں تین سال حج کے انتظامات سے وابستہ رہا ہوں۔ میں نے حج کے انتظامات کو براہ راست دیکھا ہے۔ اس تجربہ کی روشنی میں میرا مشورہ یہ ہے کہ بغیر محرم کے کوئی خاتون کبھی حج پر نہ جائے۔ چاہے اس کی عمر کتنی ہی ہو اور شرعاً فقہا میں سے کسی نے اجازت دی ہو یا نہ دی ہو۔ بہتر یہی ہے کہ وہ محرم کے ساتھ جائے۔ میں نے ایسے ایسے واقعات اور مثالیں دیکھی ہیں کہ محرم نہ ہونے کی وجہ سے خواتین کو کتنی مشکلات پیش آئیں۔ یہ شریعت کا حکم ہے اور بہت رحمت وشفقت پر مبنی ہے۔ فقہائے اسلام میں سب نے لکھا ہے کہ اگر کسی خاتون کے ساتھ محرم نہ ہو یا اس کے پاس اتنے پیسے نہ ہوں کہ وہ محرم کو بھی ساتھ لے جاسکے تو اس پر حج فرض نہیں ہے۔ اپنے پاس پیسے موجود ہوں لیکن محرم موجود نہ ہو تو بھی خواتین پر حج فرض نہیں ہے۔ حج فرض تب ہوتا ہے جب محرم بھی ہو اور اس کے لئے بھی پیسے ہوں۔ اپنے پاس پیسے ہوں اور محرم جانے کے لئے تیار ہو یا خاتون کے پاس پیسے ہوں کہ محرم کو لے جاسکے تبھی حج فرض ہوتا ہے۔ اس لئے اس اجازت سے فائدہ اٹھایئے اور اگر محرم ہو تو پھر جایئے اس کے بغیر بڑی مشکل پیش آتی ہے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: حنفی مسلک کے کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ جس نے کسی شافعی امام کے پیچھے نماز پڑھی اس کی نماز نہیں ہوئی اور اس کو نماز دہرانی چاہئے۔

جواب: فقہ اسلامی میں ایسا کوئی حکم یا اصول نہیں ہے۔ جس نے بھی ایسا کہا ہے فضول بات کہی ہے اور بالکل غلط کہی ہے۔ جس مسلک کا امام نماز پڑھا رہا ہو، آپ اس کے پیچھے بلا تکلف اور بلا تامل نماز پڑھ لیں۔ اگر آج امام شافعی یہاں تشریف لے آئیں تو میں کسی آدمی کو نماز پڑھانے نہیں دوں گا۔ خود بھی امام شافعی کے پیچھے نماز پڑھوں گا اور دوسروں سے بھی یہی کہوں گا کہ وہ امام صاحب کے پیچھے نماز پڑھیں۔ یہ کہنا کہ امام شافعی کے پیچھے میں نماز نہیں پڑھوں گا یہ انتہائی بدنصیبی ہے۔ امام شافعی کے اجتہادات حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے اجتہادات پر مبنی ہیں تو اگر عبداللہ بن عباسؓ یہاں تشریف لائیں تو کون ایسا بدتمیز اور گستاخ ہوگا جو کہے کہ میں آپؓ کے پیچھے نماز نہیں پڑھتا۔ میرے خیال میں یہ ایک فضول بات ہے۔ فقہ حنفی کے پیروکار کی نماز فقہ شافعی کے پیروکار کے پیچھے ہوتی ہے اس طرح شافعی کی نماز حنفی کے پیچھے ہوتی ہے۔ جو شخص کہتا ہے کہ دوسرے مسلک کے امام کی اقتداء میں نماز نہیں ہوتی ہو جاہل بھی ہے، نالائق بھی ہے اور بدذوق بھی۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: جہاں تک مجھے یہ بات سمجھ میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ انسان کو زندگی گزارنے کے لئے لازماً کسی نہ کسی مسلک کو اپنانا پڑتا ہے۔ کیا یہ درست ہے؟ اگر نہیں تو پھر صحیح کیا ہے؟ آخر ان مسلکوں کے ماننے والے ایک دوسرے کے دشمن کیوں ہیں؟

جواب: مجھے اس سے اختلاف ہے کہ مسلکوں کے چاہنے والے ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ میری تو کسی مالکی، یا شافعی یا حنبلی سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ میں تو سب کا احترام کرتا ہوں۔ اور یہی دیکھتا ہوں کہ سب ہی ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں۔ میں نے کبھی نہیں سنا کہ کوئی شافعی عالم پاکستان آیا ہو اور لوگوں نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا ہو۔ یا کوئی مالکی صاحب علم ہمارے ہاں آیا ہو اور اس کو مسجد میں گھسنے نہ دیا گیا ہوا۔ ہمارے ہاں فیصل مسجد میں ہر جمعہ کو نیا خطیب نماز پڑھاتا ہے۔ کبھی کوئی شافعی ہوتا ہے، کبھی حنبلی ہوتا ہے اور کبھی مالکی یا حنفی۔ وہاں ہر جمعہ کو کم از کم بیس پچیس ہزار نمازی ایک نئے امام کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں اور کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ میرے خیال میں مسالک کے درمیان کوئی دشمنی نہیں ہے اور اگر کوئی دشمنی ہے تو جاہلوں میں ہوگی۔ اس دشمنی کا حل یہ ہے کہ جہل کو دور کر کے علم کو عام کیا جائے۔

کل بھی کسی نے اس طرح کا سوال کیا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ جواب تک کرتی آرہی ہیں وہی جاری رکھیں۔ اگر اب تک آپ کا کوئی مسلک نہیں تھا تو اسی طرح چلیں اور اگر اب تک کوئی مسلک تھا تو اب بھی اسی کے مطابق عمل جاری رکھیں۔ اور اگر مسلک کو چھوڑنا ہو تو پہلے اتنا علم حاصل کر لیں کہ آپ کو یہ پتہ چل جائے کہ اب تک آپ جس مسلک کی پیروی کررہی تھیں اس کے دلائل کیا ہیں اور جس مسلک کو اختیار کرنا چاہتی ہیں اس کے دلائل کیا ہیں۔ جب اس حد تک علم حاصل ہو جائے تو پھر جس طرح کا فیصلہ کرنا ہو کر لیں۔

(محاضراتِ فقہ)

What is Maslak in Fiqh?

جواب: مسلک سے مراد وہ ہے جس کو آپ انگریزی میں school of thought یعنی مکتب فکر کہہ سکتے ہیں۔ یعنی امام ابوحنیفہ نے جب اجتہاد سے کام لیا تو انہوں نے اجتہاد کے کچھ اصول وضع کئے۔ ان اصولوں کو ایک سائنٹفک اور منظم یا سسٹیمیٹک انداز میں مرتب کیا۔ اس سسٹیمیٹک اور مرتب انداز کی وجہ سے ایک اسکول آف تھاٹ وجود میں آ گیا۔ امام احمد نے جب یہ کام کیا تو ایک اور مسلک وجود میں آیا۔ جب بھی کوئی بڑا مفکر اور بڑا عالم کسی علمی مسئلہ پر سوچے گا تو وہ چھوٹے چھوٹے مسائل پر نہیں سوچے گا بلکہ وہ بڑے بڑے مسائل کو اپنے غور وفکر کا موضوع بنائے گا اور گویا ایک وسیع اور Macro لیول پر سوچے گا اور ایک سسٹم وضع کرے گا۔ اس سسٹم کے وضع کرنے سے اسکول آف تھاٹ آپ سے آپ وجود میں آ جاتا ہے۔ یہ انسانی فکر کا خاصہ ہے اور فکر کا ایک لازمی تقاضا ہے کہ ایسا لازماً ہوگا۔ اس کو مسلک کہتے ہیں۔

(محاضراتِ فقہ)

What are Nusoos?

جواب: نصوص سے مراد ہے قرآن پاک اور حدیث کا متن Text۔ قرآن کی آیت کو بھی نص کہتے ہیں اور حدیث کو بھی نص کہتے ہیں۔

(محاضراتِ فقہ)

If there are four Imams, how should we go about deriving modles of actions from them? should we just adopt one?

جواب: بہتر تو یہ ہے کہ آپ جو کچھ ابھی تک کرتی رہی تھیں وہی کرتی رہیں اور اس میں کوئی نئی چیز شروع نہ کریں۔ لیکن اگر آپ چاہیں کہ کسی ایک فقیہ کی پیروی کریں تو بہتر یہ ہے کہ پھر ایک ہی فقیہ کی پیروی کریں۔ اس کی میں نے مثال دی تھی کہ اگر کوئی آدمی اپنی پسند ناپسند سے pick and choose کا کام شروع کر دے تو اس سے شریعت کے مقاصد کو نقصان پہنچنے کا امکان رہے گا۔ اس لئے احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ کسی ایک ہی فقیہ کی رائے کی پیروی کریں۔ لیکن جو اہل علم ہیں انہوں نے نہ پہلے اس کو لازمی سمجھا نہ آج لازمی سمجھتے ہیں۔ جب فتویٰ دینا ہوتا ہے تو وہ دیکھ لیتے ہیں کہ اگر کسی خاص مسلک کا نقطہ نظر زیادہ قوی ہے تو اس کے مطابق وہ فتویٰ دے دیتے ہیں۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: اجتماعی سنتوں کو انفرادی سنتوں پر فوقیت حاصل ہے۔ پھر حقوق اللہ کو حقوق العباد پر فوقیت کیوں نہیں۔

جواب: حقوق اللہ کو یقیناً حقوق العباد پر فوقیت حاصل ہے۔ درجہ اللہ کا ہی بڑا ہے۔ لیکن چونکہ انسان کمزور ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے بعض حالات اور بعض صورتوں میں انسان کو اجازت دی ہے کہ وہ حقوق العباد کو ترجیح دے اور حقوق اللہ کو عارضی طور پر نظر انداز یا ملتوی کر دے۔ یہ بات صرف اجازت کی ہے افضلیت کی نہیں ہے۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: گزشتہ لیکچر میں آپ نے امام ابوحنیفہ کے طریقہ تدریس کا ذکر فرمایا جو بہت دلچسپ لگا۔ ان کے پڑھانے کا یہ طریقہ کسی کتاب میں درج ہے یا یہ آپ کا اپنا استنباط ہے۔

جواب: یہ ان کے تمام تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے۔ پرانے زمانے میں اکثر لوگوں کا طریقہ یہی ہوتا تھا۔ آپ امام محمد کی کتابیں دیکھیں، خاص طور پر ان کی دو کتابیں، یعنی کتاب الاصل، جو کتاب المبسوط بھی کہلاتی ہے اور دوسری کتاب پانچ چھ جلدوں میں ہے، کتاب الحجۃ علی اھل المدینہ۔ جس میں

انہوں نے امام مالک اور امام ابوحنیفہ کے درمیان اختلافی مسائل پر بحث کی ہے۔

ان سب بزرگوں کا طریقہ تدریس یہ ہوتا تھا کہ پہلے وہ کہتے تھے کہ قال ابوحنیفہ، یعنی ابوحنیفہ نے یہ کہا، قلنا، ہم نے یہ کہا، قال انہوں نے کہا، قلنا ہم نے کہا۔ بیس بیس صفحات تک یہی ہوتا ہے کہ قال، قلنا، انہوں نے یہ کہا اور ہم نے یہ کہا۔ اس پورے سلسلہ بیان میں سب کے بارے میں تفصیل موجود ہوتی ہے کہ کس نے کیا کہا۔ پھر آخر میں ایک بات پر اتفاق رائے ہوجاتا ہے۔ امام شافعی کی کتاب الام پڑھیں۔ اس میں آدھی سے زیادہ کتاب ان بحثوں پر مشتمل ہے کہ میں عراق گیا تو وہاں ایک فقیہ سے میری بحث ہوئی۔ انہوں نے یہ کہا میں نے یہ کہا، انہوں نے یہ کہا، اور میں نے یہ کہا۔ بالآخر وہ مان گئے کہ تم صحیح کہہ رہے ہو۔ یہ تو سب کتابوں میں لکھا ہے۔ اس میں استنباط کی ضرورت نہیں، آپ کوئی بھی پرانی کتاب اٹھا کر دیکھ لیں۔ المدونہ دیکھ لیں اس میں بھی ایسا ہی ہے۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: کل روزہ افطار کرنے کے حوالہ سے الی لیل کے بارے میں بات کرتے ہوئے سورج کی ٹکیا غروب ہونے یا اس کے اثرات ختم ہونے پر بات ہوئی۔ لیل کی وضاحت کے لئے کیا ان چیزوں کو دیکھا جائے گا یا نبی اکرم ﷺ کی سنت دیکھی جائے گی۔ اس معاملہ میں واضح روایات منقول ہیں جن میں آپ نے جلد افطار کرنے کا حکم دیا ہے۔ خود بھی جلدی فرمائی۔ ایسے میں کیا ایک گروہ کی رائے درست اور دوسرے گروہ کی رائے غلط قرار نہیں پائے گی۔

جواب: میرے نزدیک پہلے گروہ کی رائے درست ہے اور دوسرے گروہ کی رائے کمزور ہے۔ لیکن اس کے درست ہونے کا امکان موجود ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ یہ تو لیل کے لفظ کی ایک فہم ہے جس کو آپ غلط کہہ سکتے ہیں۔ میں خود بھی اس کو غلط سمجھتا ہوں لیکن اس کو گمراہی کہنا اور اس کو مسئلہ بنانا درست نہیں ہے۔ یہ نہ کہیں کہ یہ اسلام سے انحراف ہے۔ یہ تو فہم کا معاملہ ہے جس میں غلطی بھی ہوسکتی ہے۔ وہ احادیث درست ہیں جن میں روزہ جلدی افطار کرنے کا حکم ہے۔ وہ اس کی تعبیر یہ بیان کرتے ہیں کہ جیسے ہی رات شروع ہوجائے فوراً روزہ افطار کرو۔ جب رات شروع ہوجائے تو مزید دیر بالکل نہ کرو اور فوراً روزہ افطار کرلو۔ ان کی رائے میں جب تک شفق موجود ہے رات شروع نہیں ہوئی۔ لہٰذا جب رات ہی شروع نہیں ہوئی تو آپ نے افطار کیسے کرلیا۔

میں ایک اور مثال دیتا ہوں۔ امام احمد بن حنبلؒ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ جب سورج کی ٹکیا چھپ جائے، تو سمجھا جائے گا کہ رات شروع ہوگئی۔ بعض حنبلی فقہا کا کہنا ہے کہ اگر درمیان میں کوئی پہاڑ ہو، اور سورج کی ٹکیا اس پہاڑ کے پیچھے چھپ گئی۔ آپ کو اس کی شفق بھی نظر نہیں آرہی ہے تو کیا آپ کو پہاڑ پر چڑھ کر دیکھنا ہوگا کہ سورج واقعی ڈوب گیا ہے یا نہیں؟ پرانے زمانے میں گھڑیاں تو ہوتی نہیں تھیں۔ تو اگر پہاڑ پر چڑھ چڑھ کر دیکھنا پڑے تو افطار تو دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔ اس لئے امام احمد اور ان کے ہم مسلک فقہا نے کہا کہ نہیں جی اوپر جانے کی شرط ضروری نہیں ہے، اس کے بغیر بھی رات ہوجائے گی۔ یہ انہوں نے ایک رائے دے دی۔ اب ہوسکتا ہے کہ پہاڑ کے پیچھے سورج موجود ہو۔ جو لوگ حنبلی نہیں تھے انہوں نے اس کا مذاق اڑایا۔ اور طرح طرح کے لطیفے بنائے۔ ایک صاحب نے ایک حنبلی سے کہا کہ میں سفر پر جارہا تھا۔ روزہ افطار کرنے کے لئے اترا۔ سورج اونٹ کے پیچھے چھپ گیا تو میں سمجھا کہ سورج ڈوب گیا۔ آپ کے فقہ کے مطابق کھڑے ہوکر دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی، اس لئے میں نے روزہ افطار کرلیا۔ روزہ افطار کرنے کے بعد اونٹ چل پڑا، تو پتہ چلا کہ سورج تو موجود ہے۔ بتائیے میرا روزہ ہوا کہ نہیں۔ یہ ایک دوسری انتہا ہے۔ امام احمد کا مقصد یہ نہیں تھا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ شریعت نے غیر ضروری مشکل کا حکم نہیں دیا۔ حرج کا حکم نہیں دیا۔ اگر اس دور میں یا آج کے دور میں آپ کے پاس گھڑی نہیں، نہ جنتری ہے اور درمیان میں اتنا اونچا پہاڑ ہے جس پر چڑھنے کے لئے دو تین گھنٹے چاہئیں۔ تو کیا شریعت کہتی ہے کہ آپ پہاڑ پر چڑھ کر دیکھیں۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ لیکن اب اس کو انتہا پر لے جانا کہ اونٹ کے سائے میں بیٹھ کر آپ کہیں کہ سورج ڈوب گیا ہے، تو یہ ناانصافی ہے۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: اگر کسی کا حمل ساقط ہوجائے اور اس کو ماہواری کا زمانہ نہ ہو تو کیا روزے رکھ سکتی ہے؟

جواب: جی ہاں، اگر بعد از اسقاط اس کو ادرار خون نہ رہا ہو تو روزہ رکھ سکتی ہے۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: جیسا کہ آپ نے بتایا کہ سفر کے دوران نصف نماز ہوگی۔ لیکن میں نے پڑھا تھا کہ اگر آپ کسی جگہ انیس دن قیام کریں تو نصف نماز ہے۔اگر انیس دن سے زیادہ ہے تو پوری نماز ادا کرنی ہوگی۔

جواب: یہ درست ہے۔میں نے سفر کی مثال دی تھی۔سفر وہی ہے جو مقررہ مدت سے کم ہو۔مقررہ مدت انیس دن نہیں بلکہ پندرہ دن ہے۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: مزاج کے تنوع کے حوالہ سے آج کی گفتگو نے ذہن کو بہت واضح کیا ہے لیکن ایک سوال ابھرتا ہے کہ جب مزاج کا تنوع اتنا اثر انداز ہوتا ہے تو کیا اس سے اجتہادات کی حیثیت کم یا زیادہ نہ ہوگی؟

جواب: اجتہاد کی حیثیت صرف قرآن وسنت کی میزان کی وجہ سے کم یا زیادہ ہوگی۔اگر کسی کا ذاتی ذوق قرآن وسنت کی میزان میں قابل قبول ہے تو وہ اجتہاد قابل قبول ہے۔اگر اس میزان میں وہ ہلکا ہے تو نا قابل قبول ہے۔صرف کسی کے ذاتی ذوق کی وجہ سے اس کو قابل قبول یا نا قابل قبول نہیں سمجھا جائے گا۔

مثال کے طور پر قرآن مجید میں ایک جگہ آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سمندر سے 'لحماً طریاً' تمہارے لئے نکالا ہے۔اور ایک جگہ آیا ہے کہ 'احل لکم صید البحر وطعامه' کہ تمہارے لئے سمندر کا شکار اور اس کا کھانا جائز قرار دیا جاتا ہے۔'متاعاً لکم وللسیارة' تمہارے لئے بھی اور قافلوں کے لئے بھی۔یہ دو آیات ہیں جن میں ایک جگہ لحم طری یعنی تر وتازہ گوشت کا ذکر ہے اور دوسری جگہ شکار کا اور ایک جگہ کھانے کا حکم ہے۔اب آپ ذوق کو دیکھیں کہ امام ابوحنیفہ کوفہ میں بیٹھے ہیں جہاں ایک طرف دجلہ بہتا ہے اور دوسری طرف فرات بہتا ہے اور وہاں جو چیز سب سے ملتی ہوگی وہ شاید مچھلی ہو۔اتنی کثرت سے مچھلی ملتی ہوگی کہ جس کا کوئی شمار نہیں۔امام مالک مدینہ منورہ میں بیٹھے ہوتے تھے جہاں مچھلی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔قریب ترین جگہ جہاں سے مچھلی سکتی تھی وہ رابغ کی بندرگاہ ہے جہاں اس زمانہ میں آدمی کم از کم دس دن میں مدینہ پہنچتا ہوگا۔اب مچھلی دس دن تو کیا ایک دو دن میں خراب ہو جاتی ہے۔تو گویا مدینہ منورہ میں مچھلی بہت نا پید تھی۔اب امام مالک نے صید، طعام اور لحم طری تینوں کے الگ الگ مفہوم لئے۔امام مالک نے کہا کہ لحم طری سے مراد وہ گوشت ہے جو آدمی سمندر سے تازہ بہ تازہ لے لے۔لیکن صید اور طعام دو الگ الگ مفاہیم میں آیا ہے۔طعام سے مراد ہر وہ سمندری چیز ہے جو وہاں پیدا ہو رہی ہو تو اس کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔لہٰذا سمندر میں پیدا ہونے والے کیکڑا، کچھوا اور تمام سمندری جانور حلال ہیں۔ان سب کو لحم طریا کے عموم میں لیا جائے گا۔لغت کے اعتبار سے اس کی گنجائش موجود ہے۔صید کا لفظ بھی ہے اور طعام کا لفظ بھی ہے۔امام ابوحنیفہ کوفہ میں بیٹھے تھے جہاں مچھلی کثرت سے ملتی تھی۔انہوں نے فرمایا کہ عرف عام میں سمندر کی جو چیز کھائی جاتی ہے وہ مچھلی ہے۔قرآن پاک میں بہت سے احکام عرف کی بنیاد پر دیئے گئے ہیں لہٰذا جو چیز عرف میں شامل نہیں ہے وہ قرآن پاک کے مفہوم میں شامل نہیں ہے۔یہ ایک لمبی بحث ہے۔تو امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ صرف مچھلی جائز ہے اور اس کے علاوہ کوئی اور سمندری جانور جائز نہیں ہے۔امام مالک نے فرمایا کہ ہر سمندری جانور جائز ہے۔اب اس میں یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ امام مالک کا ذوق کیا تھا اور امام ابوحنیفہ کا ذوق کیا تھا۔آپ صرف یہ دیکھیں گے کہ قرآن وسنت کے الفاظ میں دونوں آراء کی گنجائش ہے کہ نہیں ہے۔اگر گنجائش ہے تو ٹھیک ہے اور اگر قرآن پاک کے الفاظ اور عربی زبان کے لحاظ سے یہ گنجائش نہیں ہے تو پھر یہ رائے قابل قبول نہیں ہے۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: اجتہادات کے سلسلہ میں آپ نے غسل کی صورت میں جس طرح تیمّم کر کے دکھایا تو ہم نے تو کسی حدیث میں ایسا نہیں دیکھا، ہم نے تو حدیث میں یہی پڑھا ہے کہ غسل کی صورت میں بھی نماز والا تیمّم ہی کیا جائے۔

جواب: آپ نے شاید میری پوری بات نہیں سنی۔آپ نے حدیث میں جو سنا ہے وہی صحیح ہے۔حدیث کے مطابق غسل کی ضرورت ہو اور پانی موجود نہ ہو نماز کے لئے وضو والا تیمّم ہی کرو۔یعنی مٹی یا پتھر پر ہاتھ مارو۔پہلے ہاتھوں پر پھیرو۔پھر دوسرا ہاتھ مار کر اس کو تھوڑا جھٹکو، اس کے بعد منہ پر پھیر لو۔حدیث میں تو یہی ہے اور ہوتا بھی یہی ہے۔لیکن جب تک یہ حکم واضح نہیں ہوا تھا اس وقت ایک صحابی کو اس کی ضرورت پیش آئی۔ان کو معلوم نہیں تھا کہ حضورؐ نے جو تیمّم کا حکم دیا ہے یہ صرف وضو کے لئے ہے یا غسل کے لئے بھی یہی حکم ہے۔انہوں نے اپنی فہم میں یہ سمجھا کہ شاید مٹی میں لوٹ پوٹ ہونا غسل کے لئے ضروری ہو۔انہوں نے ایسا ہی کیا۔آ کر حضورؐ

کو اطلاع دی۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ ضروری نہیں تھا۔ یہ سارا واقعہ بھی حدیث ہی کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے۔ میں نے بھی حدیث کی کتاب سے لیا ہے۔ مجھے عمار نے براہ راست نہیں بتایا تھا۔ حدیث کی کتاب ہی میں یہ لکھا ہوا ہے۔

(محاضراتِ فقہ)

The emergence of various school has been very nicely elaborated by you, Jazak Allah. However it is not yet clear as to how certain things which are Halal or permissible for us but ars Haram for Shiah groups, such as opening fast with the first Azan after Maghrib but Shiahs delayed it.

اس طرح کے جزوی اختلافات نص کی تعبیر میں فرق کی وجہ سے پیدا ہوجاتے ہیں۔ اسی روزے کی مثال لیجئے۔ قرآن پاک میں آیا ہے کہ 'اتمو الصیام الی اللیل' کہ روزے کو مکمل کرو رات تک۔ اب یہاں دو لفظ آئے ہیں اور الی۔ یعنی رات اور تک۔ اس پر بہت طویل اور مفصل بحث ہوئی ہے جس کے تذکرہ کے لئے وقت نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہ نے اس کا مفہوم سمجھا اور فقہا کی بڑی تعداد نے یہی مفہوم لیا کہ جب تک لیل داخل نہ ہوجائے اس وقت روزہ رکھا جائے۔ جب لیل کا دخول شروع ہوجائے، تو سمجھا جائے گا کہ نہار ختم ہوگیا۔ اس وقت روزہ کھول دیا جائے گا۔ لیکن لیل کیا ہوتی ہے اور کب شروع ہوتی ہے۔ فقہا کی غالب اکثریت کا یہ کہنا ہے کہ جب سورج کی ٹکیا نظروں سے اوجھل ہوجائے اور ڈوب جائے تو رات یعنی لیل شروع ہوجاتی ہے۔ سورج کے لئے ٹکیا کا لفظ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ اگر آپ ریگستان یا میدانی علاقے میں کھڑے ہوجائیں تو غروب ہوتا ہوا سورج ایک گیند کی طرح نظر آتا ہے۔ جیسے فٹ بال ہوتی ہے۔ اس گیند کو فقہا ٹکیہ کے لفظ سے یاد کرتے ہیں۔ تو فقہا کہتے ہیں کہ جب سورج کی ٹکیا ڈوبتے ڈوبتے اس کا آخری حصہ بھی ڈوب جائے تو اس وقت سمجھا جائے گا کہ دن ختم ہوگیا اور رات شروع ہوگئی۔ اس وقت روزہ کھول لیا جائے گا۔ بعض فقہا جن میں شیعہ فقہا بھی شامل ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ محض ٹکیہ کا ڈوبنا کافی نہیں ہے۔ اس لئے کہ ٹکیہ کی روشنی کا ڈوبنا بھی ضروری ہے۔ ایک پیلا پن جس کو شفق کہتے ہیں وہ سورج کی ٹکیا ڈوبنے کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔ جو خاصا سرخ ہوتا ہے اور پہلی نظر میں یہ تعین کرنا مشکل ہوتا ہے کہ ٹکیا ڈوبی کہ نہیں۔ تو جب تک اس کی سرخی غائب نہیں ہوتی، اس وقت گویا یہ سمجھا جائے کہ ٹکیا پوری طرح سے نہیں ڈوبی۔ وہ شفق ٹکیا کے تابع ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب ایک چیز کسی دوسری چیز کے تابع ہوتی ہے تو تابع کا بھی وہی حکم ہوتا ہے جو اصل کا ہوتا ہے۔ لہٰذا اصل اور تابع جب دونوں ڈوب جائیں، تب رات شروع ہوگی۔ اس عمل میں دس بارہ منٹ مزید وقت لگتا ہے۔ اس لئے وہ بارہ منٹ مزید انتظار کرتے ہیں۔ یہ محض لیل کی تعبیر میں اختلاف ہے۔ کوئی قرآن یا سنت میں اختلاف نہیں۔ صرف یہ اختلاف ہے کہ لیل کس کو کہتے ہیں۔ اکثریت کے خیال میں سورج کی ٹکیا کے غائب ہونے سے رات شروع ہوجاتی ہے۔ دوسرا فریق کہتا ہے کہ جب ٹکیا کے اثرات بھی ڈوب جائیں گے تو تب لیل شروع ہوگی۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ فقہا کی غالب اکثریت کا کہنا درست ہے۔ اس لئے کہ دن اس وقت شروع ہوتا ہے جب سورج نکلنے لگتا ہے۔ سورج کی ٹکیا کے ظہور سے قبل جب اس کی سرخی یا شفق ظاہر ہوتی ہے اس کو دن کا آغاز قرار نہیں دیا جاتا۔ اس سے پہلے کے وقت کو نہار کہتے ہیں اور اس وقت تک فجر کی نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ یہی اصول ٹکیا کے غائب ہونے کے وقت بھی پیش نظر رکھا چاہیئے۔ بہرحال یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس پر کسی لمبی گفتگو کی ضرورت ہو۔ یہ دو مختلف رائے ہیں۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: بہت سے لوگ اس بات پر اعتراض کرتے ہیں کہ نماز جیسا عمل جس کو نبی ﷺ نے دن میں پانچ بار کر کے دکھایا، اس میں یہ بات ہم تک کیوں نہ پہنچی کہ آپؐ کی نماز آپ زندگی کے آخر میں تمام تبدیلیوں کے بعد کس شکل میں تھی؟ اس بارے میں اختلاف کا پایا جانا تشویش ناک ہے۔

جواب: مجھے بنیادی اختلاف تو یہ ہے کہ اس بارے میں اختلاف کی موجودگی کوئی تشویش ناک بات نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے مختلف اوقات میں مختلف لوگوں کے مجمع کے سامنے نمازیں پڑھیں اور مختلف انداز میں پڑھیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز میں جس جس طرح سے کیا اور جو جو کیا وہ سب محفوظ رہے۔ کوئی ادا رسول اللہ ﷺ کی ایسی نہ ہو جو مسلمانوں میں محفوظ نہ رہے اور مسلمانوں کا کوئی ایک طبقہ اختیار نہ کرے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ بعض اوقات پوری پوری

رات نماز پڑھتے تھے۔ یہاں تک کہ پاؤں مبارک میں ورم آ جایا کرتا تھا۔ حضرت عائشہؓ صدیقہ نے ایک بار عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ قرآن پاک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے تمام اگلے پچھلے گناہ، اگر کوئی تھے بھی، تو معاف کر دیئے ہیں۔ آپؐ تو پیغمبر ہیں اور بخشے گئے ہیں۔ پھر آپؐ اتنی محنت کیوں کرتے ہیں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ 'افلا اکون عبداً شکوراً' کیا میں شکرگزار بندہ نہ بنوں۔ بعض اوقات آپ پوری پوری رات نوافل پڑھا کرتے تھے۔ بعض اوقات مسجد نبوی میں دن کے وقت اور خاص طور پر ظہر کے بعد طویل نوافل پڑھنے کا کبھی کبھی معمول ہوتا تھا۔ طویل نوافل میں جب آدمی ہاتھ باندھ کر نماز پڑھتا ہے، تو بعض اوقات ہاتھ تھک جاتا ہے، اور ہاتھ کھول کر نماز پڑھنے میں آرام ملتا تھا۔ آپ رمضان کے آخری تین دنوں میں کبھی فیصل مسجد میں آئیں۔ جہاں ان تین راتوں میں محفل شبینہ ہوتا ہے جس میں دس دس پارے پڑھے جاتے ہیں۔ آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ایک ہی پارہ پڑھنے میں ہاتھ دکھ جاتا ہے اور جب امام رکوع میں جاتا ہے اور سب ہاتھ کھولتے ہیں تو بڑا سکون ملتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ بھی طویل نمازوں میں کبھی کبھی ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھا کرتے تھے۔ اب کسی نے دیکھا کہ حضورؐ دست مبارک چھوڑ کر نماز پڑھتے ہیں تو انہوں نے بیان کیا کہ حضورؐ ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھا کرتے تھے۔ کبھی ہاتھ اوپر باندھا اور تھکنے کے بعد نیچے باندھ دیا۔ نیچے تھک گیا تو ذرا اوپر کر لیا، اس سے آرام مل جاتا ہے۔ اس لئے اس میں نہ تو کسی جائز یا ناجائز کا مسئلہ ہے، نہ اس میں کسی مکروہ اور مستحب کا مسئلہ ہے۔ ان میں سے ہر طرزِ عمل سنت ہے اور ان میں سے ہر طرزِ عمل اپنی جگہ جائز ہے۔ فقہاء نے صرف یہ سوال اٹھایا کہ ان میں افضل عمل کون سا ہے۔ اگر میں ان کاموں کو کروں تو کون سا پہلے کروں۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھنا افضل ہے۔ کچھ نے کہا ہاتھ باندھ کر پڑھنا افضل ہے۔ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ سب سنت کا حصہ ہے۔ اس لئے اس میں کسی تشویش کی کوئی بات نہیں ہے اور نہ ہی اس میں پریشانی کی کوئی بات ہے۔ مسلمان چودہ سو برس سے نماز اسی طرح پڑھ رہے ہیں، آئندہ بھی پڑھیں گے، آپ پریشان نہ ہوں۔

آپ کا جی چاہے تو سورۃ فاتحہ میں آمین اونچی آواز سے پڑھئے اور جی چاہے تو آہستہ پڑھئے۔ جی چاہے تو رفع یدین کریں اور جی نہ چاہے تو نہ کریں۔ سب صورتیں جائز ہیں۔ سب سنت ہیں اور سب کے سنت ثابتہ ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ نہ یہ چیزیں مسلمانوں میں افتراق کا موجب ہیں، نہ ان سے اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ حرم شریف میں جا کر دیکھیں۔ لاکھوں افراد کئی کئی طریقوں سے نماز پڑھتے نظر آتے ہیں۔ کوئی زور سے آمین کہتا ہے۔ کوئی آہستہ سے کہتا ہے۔ سب ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں اور کوئی لڑتا نہیں۔ یہ تو ہمارے ہاں ان امور کو اختلاف کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں لڑنے کے اسباب اور ہیں۔ ان کا آمین زور سے یا آہستہ کہنے سے کوئی تعلق نہیں ہے نہ ہی اس کا رفع یدین سے کوئی تعلق ہے۔ نماز کے اندر رفع یدین کرنے سے کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔ ہاں نماز سے باہر رفع یدین کرنے سے جھگڑا ہوتا ہے۔ جب جاہل اور متعصب لوگ ایک دوسرے پر رفع یدین کرتے ہیں اس سے ہر مسلمان کو بچنا چاہئے۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: شوہر کے گم ہونے پر آپ نے مسئلہ بیان کیا جو واضح نہ ہو سکا۔ دوسرا جو مسئلہ آسان ہے وہ بیان فرما دیں۔

جواب: فقہا نے مفقود الخبر کے مسئلہ میں مختلف جوابات دیئے ہیں۔ امام مالکؒ نے فرمایا کہ ایسی صورت میں جب یہ یقین ہو جائے کہ اب شوہر مر گیا ہو گا عورت عدت کی مدت گزار کر دوسرا نکاح کر سکتی ہے۔ یہ یقین چار سال میں ہو گا۔ چار سال میں جب یہ یقین ہو جائے تو یہ سمجھا جائے گا کہ وہ شوہر اب مر گیا اور عدالت فیصلہ کر کے نکاح فسخ کر دے گی۔ حتیٰ کہ وہ آ بھی جائے تو نکاح فسخ ہی سمجھا جائے۔ لیکن یہ امام مالک نے اس وقت فرمایا تھا جب ذرائع آمد و رفت اور رسل و رسائل بہت محدود تھے۔ اس کی دلیل امام مالک کی طرف سے مالکی فقہا نے یہ دی کہ اگر کوئی شخص اس گم شدہ آدمی کو تلاش کرنے جائے تو مثلاً مشرق میں چین کی طرف جائے گا تو چھ مہینے جانے کے لگیں گے اور چھ مہینے آنے کے لگیں گے۔ پھر مغرب میں جانے کے لئے چھ چھ مہینے اور آنے جانے میں لگا دے گا اور آ کر بتا دے گا کہ نہیں ملا۔ پھر شمال اور جنوب میں ایک ایک سال لگائے گا۔ اس طرح چار سال سے کم میں صحیح تلاش ہی نہیں ہو سکتی۔ آج کل کے زمانے میں تلاش نسبتاً آسان ہے۔ چار سال سے کم میں یہ بات معلوم ہو سکتی ہے۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: اگر کسی معاملہ میں علما کی آرا ایک سے زیادہ ہوں اور بظاہر وہ قرآن وسنت سے ٹکراتی بھی نہ ہوں، تو کیا ہمیں پوری آزادی ہے کہ ہم جس رائے کو مرضی ہو، لے لیں۔ لیکن ہم یہ کیسے کر سکتے ہیں کہ فلاں امام کا علم وتقویٰ زیادہ تھا۔ اگر سب کو مانیں اور سب کی رائے کا احترام کریں تو کیا یہ نفس کی خواہش نہ ہو گی کہ جس وقت

جس کا حکم آسان لگا وہ مان لیا۔

جواب: آپ کی بات بالکل درست ہے۔ اپنے نفس کی پیروی نہیں کرنی چاہئے اور اپنی ذاتی پسند ناپسند پر شرعی امور کا فیصلہ نہیں ہونا چاہئے۔ طرزِ عمل یہ ہونا چاہئے کہ اللہ اور اس کے رسول نے جو حکم دیا ہے ہمیں اس کے مطابق چلنا چاہئے۔ جہاں اللہ اور اس کے رسول کے احکام کو سمجھنے میں کسی غیر معمولی گہرائی اور فہم کی ضرورت ہے۔ تو اگر ہمیں کسی کے علم اور فہم پر اعتماد ہے تو اس کی فہم کے مطابق عمل کرنا چاہئے۔

اس معاملہ میں بہتر اور محتاط راستہ تو یہ ہے کہ آپ اپنی رائے پر عمل کرنے کی بجائے کسی ایسے صاحب علم کی رائے پر عمل کریں جس کے علم اور تقویٰ پر آپ کو اعتماد ہو۔ یہ بات کہ جہاں ضروری اور ناگزیر ہو کسی دوسرے امام کے فقہ پر عمل کیا جائے یہ شروع سے ہو رہی ہے اور اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ اس پر عمل درآمد پہلے بھی ہوتا تھا آج بھی ہو رہا ہے اور آئندہ بھی ہوگا۔ شریعت نے نہ امام ابوحنیفہ کی تقلید کا حکم دیا ہے نہ امام شافعی کی، نہ امام احمد کی۔ شریعت تو رسول اللہ ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد مکمل ہوگئی۔ الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی، نعمت تمام ہوگئی، دین مکمل ہوگیا، شریعت مکمل ہوگئی۔ اس لئے حضورؐ کے بعد آنے والے کسی بھی آدمی کا کوئی قول فی نفسہ واجب التعمیل نہیں ہے۔ حتیٰ کہ کسی صحابی کی رائے بھی as such واجب التعمیل نہیں ہے۔

لیکن شریعت کے ماہرین، علماء اور شریعت میں تخصص رکھنے والے اور شریعت کو سمجھنے والے حضورؐ کے زمانے میں بھی اس کا مفہوم بیان کیا کرتے تھے۔ صحابہ اکرام نے حضورؐ کے حکم سے لوگوں کے مسائل کے جوابات دیئے حضورؐ کے زمانے میں بھی صحابہ کا شمار اہل علم میں تھا۔ بعض کا شمار عام صحابہ میں تھا۔ عام اہل صحابہ سے پوچھا کرتے تھے۔ اس لئے جس کو قرآن وسنت کا حکم سمجھنے میں کوئی مشکل ہو وہ اہل علم سے پوچھے گا۔

پوچھنے کے اس حکم کی وجہ سے بہت ساری رولنگز جمع ہوگئیں۔ تو جن فقہا کی رولنگز زیادہ بہتر انداز میں مرتب ہوگئی ان ہی پیروی زیادہ لوگ کر رہے ہیں۔ جن کی رولنگز مرتب نہیں ہوئیں ان کی پیروی شروع نہیں ہوئی۔ اس لئے یہ محض ایک سہولت ہے اور پیچیدگی اور کنفیوزن سے بچنے کا ایک راستہ ہے۔ اگر کوئی شخص خود صاحب علم ہے اور اللہ نے اسے علم دیا ہے اور وہ دلائل سے یہ جان سکتا ہے کہ کسی امام کا قول قوی ہے یا زیادہ بہتر ہے تو اس کو اس رائے یا قول کو اختیار کرنے کی اجازت ہے۔ لیکن ایک ایسے آدمی کو، جس کے پاس شریعت کا علم نہ ہو، یہ راستہ اختیار کرنے کی اجازت دی جائے تو اس سے بعض ایسی قباحتیں پیدا ہوں گی جن سے بچنا بہت دشوار ہے۔ اس کی ایک مثال فقہ کی سب کتابوں میں ملتی ہے میں آپ کو دیتا ہوں۔ اکثر لوگوں نے یہ مثال بیان کی ہے۔

شریعت کا حکم یہ ہے کہ انسانی معاشرہ میں تعلقات حیا کی بنیاد پر استوار ہوں۔ خاص طور پر دو جنسوں کے درمیان میل جول شریعت کی حدود کے اندر ہو اور حیا کے احکام کے مطابق ہو۔ جب دو فرد رشتہ ازدواج میں منسلک ہوں تو یہ کام اللہ کے احکام اور شریعت کے مطابق ہو۔ یہ تعلق انسانوں کے علم میں ہو۔ تمام لوگوں میں اس کا اعلان کیا گیا ہو کہ فلاں دو افراد آج سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو رہے ہیں۔ یہ شریعت کے احکام ہیں۔

اب شریعت کے ان احکام کے ضمن میں قرآن پاک میں بعض نصوص آئی ہیں۔ احادیث میں کچھ نصوص آئی ہیں۔ ان کو سامنے رکھ کر اور ان کا مقصد سمجھ کر فقہائے اسلام نے کچھ تفصیلی ضوابط مرتب کئے ہیں۔ امام مالک نے اپنی فہم کے مطابق یہ ضابطہ مقرر فرمایا کہ جب نکاح ہو رہا ہو تو اس کے لئے کسی کو باقاعدہ گواہ بنانے کی تو ضرورت نہیں البتہ عام اعلان کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اگر نکاح اس طرح ہو کہ معاشرہ میں عام لوگوں کو معلوم ہو جائے۔ محلّہ میں سب کو پتہ چل جائے کہ فلاں اور فلاں کی شادی ہو رہی ہے تو یہ کافی ہے۔ چاہے دو آدمی بطور خاص گواہ بننے کے لئے وہاں موجود نہ ہوں۔ یہ امام مالک کا نقطہ نظر ہے۔ مثلاً محلّہ میں بڑی دعوت ہو رہی ہے۔ کسی نے پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے تو وہاں ہر کوئی بتا دیتا ہے کہ فلاں کی شادی ہو رہی ہے۔ لوگوں کو معلوم ہو جائے تو یہ کافی ہے۔ آپ نے پانچ سو آدمیوں کو کھانے پر بلایا ہے اور دعوت کردی کہ بیٹے کی یا بیٹی کی شادی ہے تو امام مالک اس کو کافی سمجھتے ہیں۔ دو متعین گواہ ضروری نہیں۔

امام ابوحنیفہ یہ فرماتے ہیں کہ کم از کم دو متعین گواہ ضروری ہیں جو عقد نکاح میں موجود ہوں۔ جو ایجاب اور قبول کو ہوتے دیکھ لیں۔ یہ کم سے کم تقاضا ہے اور اس سے کم پر نکاح نہیں ہوگا۔ یہ امام ابوحنیفہ کا نقطہ نظر ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ اصل عقد میں تو دو گواہوں کی موجودگی ضروری نہیں ہے لیکن جب یہ لڑکی رخصت ہو اور شوہر کے گھر جائے، اس وقت کم از کم دو گواہ ہونے چاہئیں اور یہ ضروری ہے۔

اب یہ تین مختلف نقطہ نظر ہیں، مقصد سب کا ایک ہی ہے۔ اب اگر کوئی شخص ایسا کرے کہ ایک لڑکا اور لڑکی آپس میں رہنے لگیں اور یہ کہیں کہ امام مالک کے نزدیک

دو گواہ ضروری نہیں تھے اور لوگوں کو بتانا بھی ضروری نہیں تھا اور صرف چراغاں اور دعوت کھلانا کافی ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک چراغاں اور دعوت بھی ضروری نہیں تھی۔ لہٰذا ہم نے چراغاں اور دعوت بھی نہیں کی۔ عقد نکاح کے وقت امام شافعی کے نزدیک دو گواہ ضروری تھے وہ بھی نہیں کیئے۔ رخصتی کے وقت امام ابوحنیفہ کے نزدیک ضروری نہیں تھے وہ بھی نہیں کیئے۔ یہ تو شریعت کے حکم کی صریح خلاف ورزی اور محض بدکاری ہے۔ یہ تو پرلے درجہ کی بداخلاقی اور بے حیائی ہے۔ یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ اگر کسی شخص کو اپنے خواہشات نفس کی پیروی کی اجازت دے دی جائے تو اس کے نتائج اس طرح کے نکل سکتے ہیں۔

اس لئے دو شرائط کا خیال رکھیں۔ آپ جس فقیہ کے نقطہ نظر سے دلائل کے ساتھ اتفاق کریں۔ ایک شرط یہ ہے کہ واقعی اللہ کے حضور جوابدہی کے احساس کے ساتھ یہ ارادہ ہو کہ اللہ کے حکم پر چلنا ہے اور اللہ کی شریعت کو سمجھنا ہے۔ یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ارادہ ہے کہ نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ اتنا علم ہو کہ یہ معلوم ہو سکے کہ شریعت کا اصل مقصد کیا ہے۔ شریعت کی تعلیمات اس بارے میں کیا ہیں اور ان کو کس انداز سے سمجھ کر اس فقیہ نے یہ رائے قائم کی ہے۔ اس رائے سے یہ فقیہ شریعت کے کس مقصد کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ چیز اگر حاصل ہے تو پھر دوسرے کسی فقیہ کی رائے اختیار کر لینے کا عمل قابل قبول ہے۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: حکم تکلیفی جب قرآن وسنت سے ثابت ہوسکتا ہے تو پھر اجماع کی پیروی کو کیوں فرض کے درجے میں لایا گیا۔

جواب: اجماع کو اس لئے فرض درجے میں لایا جاتا ہے کہ قرآن مجید میں آیا ہے کہ ومن یتبع غیر سبیل المومنین نولہ ما تولیٰ ونصلہ جھنم' جو مسلمانوں کے اجتماعی راستے سے ہٹ کر کسی راستے کی پیروی کرے گا ہم اس کو اسی راستے پر چلائیں گے اور جہنم میں جلائیں گے۔ قرآن مجید کا حکم ہے کہ اگر کوئی مسلمانوں کے متفقہ فیصلہ کے خلاف جائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو جہنم میں پھینکے گا۔ یعنی مسلمانوں کا وہ متفقہ فیصلہ جو شریعت کے مطابق ہو۔ وہ واجب التعمیل ہے۔ اس لئے اجماع کی پیروی لازمی ہے۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: کیا تمام فقہا نے جیسے کہ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی اور شیعہ امام نے اپنے اپنے اصول بنائے۔ پھر ان پر اجتہاد کیا۔ کیا آج کے دور میں بھی کسی معاملہ پر اجتہاد کیا جا سکتا ہے۔

جواب: جی ہاں! بالکل کیا جا سکتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ کیا جا رہا ہے بلکہ کیا جانا چاہئے۔ جو بھی نئے معاملات پیش آ رہے ہیں ان پر اجتہاد ہوتا آ رہا ہے۔ ہر دور کے اہل علم ان پر اجتہاد کرتے رہتے ہیں۔ آج اسلامی بنکنگ اور اسلامی انشورنس پر کام ہو رہا ہے۔ تکافل کا ادارہ بن رہا ہے۔ یہ تمام ادارے یعنی بنک اور تکافل کے ادارے پہلے تو موجود نہیں تھے۔ آج کے فقہا اس پر اجتہاد سے کام لے رہے ہیں اور اس سے متعلق احکام مرتب کر رہے ہیں۔ اس لئے اجتہاد پہلے بھی ہوتا تھا آج بھی ہو رہا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔ جب تک انسان اس دنیا میں موجود ہے اور شریعت پر عمل کرنا چاہتا ہے تو اس کو نت نئے مسائل پیش آتے رہیں گے اور ان کا حل شریعت کی روشنی میں تلاش کیا جاتا رہے گا۔

(محاضراتِ فقہ)

کل کے لیکچر میں نصوص کی بات کچھ اس طرح سمجھ میں آئی تھی کہ نصوص احادیث چار ہزار، نصوص قرآن چار سو، کل چار ہزار چار سو نصوص ہیں، تو کیا یہ اسی طرح ہیں؟
میں نے یہ کہا تھا کہ احادیث کی کل تعداد چالیس اور پچاس ہزار کے درمیان ہے۔ اور قرآن مجید کی کل آیات چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ کے قریب ہے۔ ان میں وہ احادیث اور آیات جن کا تعلق براہ راست فقہی احکام اور فقہی معاملات سے ہے۔ مثلاً نکاح، وضو، نماز اور خرید و فروخت وغیرہ کے معاملات ہیں۔ یہ جو اس انداز کی آیات ہیں ان کی تعداد تھوڑی ہے۔ قرآن پاک اٹھا کر دیکھ لیں۔ سورۃ فاتحہ میں کوئی عملی ہدایت نہیں ہے بس ایک دعا سکھائی گئی ہے۔ پھر سورۃ البقرۃ میں یقیمون الصلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا تعلق عمل سے ہے۔ اس کے بعد بنی اسرائیل کا تذکرہ ہے۔ اس میں ہمیں کوئی عملی ہدایت نہیں ہوگئی ہے۔ اگرچہ رہنمائی ملتی ہے۔ ہمارا ایک رویہ اور طرز عمل اس کے نتیجے میں بنتا ہے۔ لیکن براہ راست احکام اور فقہی نوعیت کی ہدایات کم ہیں۔ وہ آگے چل کر پہلے پارے کے وسط میں شروع ہو جاتی ہے جہاں

احکام ہیں جو ایک عملی چیز ہے۔ اس لئے براہ راست احکام کی تعداد قرآن وحدیث میں کم ہے اور یہ محض ایک اندازہ ہے۔ ان کی تعداد کے بارہ میں میرا ناچیز اندازہ چار ہزار چار سو کے لگ بھگ ہے۔

یہ چار ہزار چار سو آیات واحادیث جو عملی مسائل سے متعلق ہیں، یہ لامتناہی عملی معاملات پر منطبق ہوتی ہیں۔ مسائل تو لامتناہی ہیں۔ میری اور آپ کی زندگی میں لاکھوں معاملات پیش آتے ہیں تو باقی انسانوں کی زندگی میں ملا کر کتنے ہوں گے۔ ان لاکھوں کروڑوں مسائل پر شریعت کے چار ہزار چار سو یا اس کے لگ بھگ نصوص منطبق ہوتے ہیں۔ ان انطباق اور عمل درآمد کے لئے گہرے غور وخوض کی ضرورت ہے۔ جب تک انسان گہرائی کے ساتھ غور نہیں کرے گا ان نصوص کو منطبق نہیں کر سکے گا۔ اس لئے شریعت کے اس حصہ کو فقہ کہتے ہیں تا کہ غور وخوض کی یہ بات انسان کو یاد رہے۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: کیا فقہ گنجلک اور الجھی ہوئی چیز ہے؟

جواب: نہیں، فقہ گنجلک چیز نہیں، نہ ہی وہ الجھی ہوئی چیز ہے اور نہ وہ کوئی ناپسندیدہ چیز ہے۔ بلکہ وہ انسانوں کی ضروریات کو پورا کرنے والی ایک ناگزیر چیز ہے۔ شریعت پر جب بھی عملی زندگی میں عمل درآمد ہوگا اس کے تفصیلی احکام مرتب کرنے پڑیں گے۔ ان احکام کو مرتب کرنے کے لئے شریعت کی نصوص کو سمجھنا ہوگا، ان کی تعبیر وتشریح کرنی ہوگی۔ اسی کو فقہ کہتے ہیں۔ فقہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جائے گی، پھیلتی چلی جائے گی۔ آپ کو نئے نئے معاملات آئے روز پیش آتے رہیں گے، اور ان نت نئے معاملات میں رہنمائی کی ضرورت پڑے گی۔

اگر پہلے دن سے یہ ارادہ ہو کہ شریعت پر عمل کرنا ہے۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے منشا کو زندگی میں ڈھالنا ہے تو پھر انسان خود بخود اس کے مطابق زندگی کو ڈھالتا چلا جاتا ہے۔ لیکن اگر پہلے دن سے عزم یہ ہو کہ شریعت کی ہر چیز میں کیڑے نکالنے ہیں اور مشکلات کی نشاندہی کرنی ہے تو آسان سے آسان چیز میں بھی مشکلات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔

دنیا یہ نہیں دیکھتی کہ اس کے اپنے ہاں مشکلات کتنی ہیں۔ آج سے کئی سال پہلے میں نے آٹھ نو سو صفحات کی ایک ضخیم کتاب دیکھی۔ اس میں انگریزی پروٹوکول کے آداب لکھے ہوئے تھے۔ اس میں ایک پورا باب اس بارے میں تھا کہ جب کسی مہمان کو کھانے کی میز پر بٹھاؤ، تو اس کے آداب کیا ہیں، برتن کیسے رکھیں گے اور مہمان کو کیسے بٹھائیں گے۔ ہمارے ایک بزرگ دوست تھے۔ وہ مغرب کی ہر چیز کے بڑے قائل تھے اور مسلمانوں کی ہر چیز کے بڑے ناقد تھے۔ وہ یہ کہا کرتے تھے کہ مسلمانوں نے فقہ کے نام پر دین اور زندگی دونوں کو پیچیدہ کر دیا ہے۔ میں نے کہا کہ مسلمانوں نے زندگی کو پیچیدہ کر دیا ہے یا نہیں۔ لیکن انگریزوں نے تو ضرور زندگی کو از حد پیچیدہ کر لیا ہے۔ مسلمان زمین پر بیٹھ کر کھانا کھا سکتے ہیں۔ لیکن انگریزوں نے صرف کھانا کھانے پر سو صفحات لکھے ہیں کہ کھانہ کیسے کھایا جائے گا۔ چونکہ وہاں کی باتوں پر اعتراض نہیں ہوتا اس لئے وہاں کی چھوٹی سے چھوٹی چیز اچھی معلوم ہوتی ہے۔ شریعت کے معاملہ میں چونکہ تامل ہوتا ہے اس لئے یہاں کی ہلکی اور آسان چیز بھی پیچیدہ معلوم ہوتی ہے۔ فقہ کی کوئی چیز بھی پیچیدہ نہیں ہے۔ آپ کوئی بھی کتاب اٹھا کر دیکھ لیں۔ آپ کو لگے گا کہ بڑی عقلی، سائنٹفک اور سسٹمیٹک چیز ہے۔ آسان سے آسان چیز بھی ان لوگوں کے لئے مشکل ہو سکتی ہے جنہوں نے اس کو پڑھا نہ ہو۔ جب پڑھ لیا تو پھر بہت آسان معلوم ہوتا ہے۔ آپ دو چار سال فقہ کی کتابیں پڑھیں، آپ کو بہت آسان اور بہت لبرل اور سائنٹفک معلوم ہوں گی۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: کیا کچھ لوگ اسلامی فقہ کی تدوین نو کر رہے ہیں؟

جواب: اسلامی فقہ کی تدوین نو تو مستقلاً ہوتی رہتی ہے۔ کوئی دور ایسا نہیں آیا اور نہ آئے گا کہ فقہ میں تدوین نو، نظر ثانی، revision اور re-codification کا عمل نہ ہوتا ہو۔ اس لئے کہ انسانی حالات بدلتے رہتے ہیں۔ انسان کے مزاج اور مسائل اور بدلتے رہتے ہیں۔ جب مسائل اور حالات بدلتے ہیں تو ہر دور کے فقہا اپنے دور کے مطابق مسائل پر غور کرتے رہتے ہیں اور ہدایت ورہنمائی دیتے رہتے ہیں۔ اس لئے یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ آج اس کو کرنے کی ضرورت پیش آئے۔

یہ تو شروع سے ہو رہی ہے۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: کیا اتنے سال پرانے فقہاء کے اجتہادات کی پیروی ضروری ہے۔انہوں نے زمانے سے پہلے کی باتیں کیسے کیں جب کہ وہ عقل ہی سے کام لے رہے تھے؟ وحیٔ الٰہی تو نہیں آتی تھی۔

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ جب عقل وحیٔ الٰہی کی رہنمائی میں کام کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی مدد اس کو حاصل ہو جاتی ہے اور وہ ایسے ایسے کام کر سکتی ہے جو وہ عقل نہیں کر سکتی جو وحیٔ الٰہی کے خلاف یا وحیٔ الٰہی کی رہنمائی سے ہٹ کر کام کرتی ہے۔اس لئے جن فقہا نے زمانے سے آگے بڑھ کر عقل سے کام لیا۔وہ اس لئے یہ سب کچھ کرنے کے قابل ہوئے کہ وحیٔ کی رہنمائی میں اس کے حدود کے اندر کام کر رہے تھے۔جو لوگ وحی الٰہی سے آزاد رہنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ان کی عقل ایک بہت بڑی رہنمائی اور برکت سے محروم ہو جاتی ہے۔اس لئے وہ کام نہیں کر سکتی۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: آج فقہ کے بہت سے مسائل اختلافی نوعیت اختیار کر چکے ہیں۔ایسے میں ان کو چھوڑ کر کیا شریعت پر سیدھا سادا عمل کرنا بہتر نہ ہوگا؟

جواب: اسی سیدھا سادا شریعت پر عمل کرنے کو ہی فقہ کہتے ہیں۔فقہ شریعت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔فقہ شریعت ہی کے عملی احکام کی فہم کا نام ہے۔جب شریعت کے عملی احکام پر آپ یا کوئی اور عمل کرے گا تو اس عمل کرنے کے لئے شریعت کے احکام کو سمجھنا ضروری ہے۔اور سمجھنے کے اس عمل ہی کا نام فقہ ہے۔وہ ماضی کے کسی انسان کی فہم ہو یا آج کے کسی انسان کی فہم ہو۔جس کی فہم پر آپ کو اعتبار ہے، جس کے دین اور تقویٰ پر آپ کو اعتماد ہے آپ اس کی فہم پر بھروسہ کر کے عمل کریں۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: فقہ تقدیری کیا اختلاف کا باعث نہ بنی؟

جواب: فقہی معاملات میں اختلاف بری چیز نہیں ہے۔اختلاف اچھی چیز ہے اگر وہ شریعت کے حدود کے اندر ہو۔اور ہر شخص یہ سمجھتا ہو کہ یہ میری فہم ہے جس میں غلطی کا امکان ہو سکتا ہے۔اور یہ دوسرے فقیہ کی فہم ہے جس میں درستی کا امکان ہے۔جب تک یہ بات ہو تو اختلاف رائے میں کوئی قباحت نہیں۔آزادانہ اور مخلصانہ اختلاف رائے سے تفقہ بڑھتا ہے۔صحابہ کرام میں بھی بہت سے معاملات میں ایک سے زائد آرا موجود تھیں۔جس کی مثالیں آپ کے سامنے ہیں۔اگر ان اختلافی آرا کو دین بنا لیا جائے۔یا شریعت کا قائم مقام سمجھا جائے تو اس سے خرابی پیدا ہوتی ہے۔

ایک فقیہ کی فہم انتہائی قابل احترام ہے۔لیکن اس سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے۔اس لئے کہ اس میں غلطی کا امکان موجود ہو سکتا ہے۔جو چیز غلطی سے مبرا ہے۔جس میں سو فیصد صحت ہی صحت ہے وہ صرف اللہ کا کلام اور اس کے رسول کے ارشادات ہیں۔اس کے علاوہ ہر انسان کی فہم میں، ہر انسان کی بصیرت میں اور ہر انسان کے اجتہاد میں غلطی کا امکان موجود ہے۔یہی وجہ ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجتہد صحیح نتیجے پر پہنچتا ہے تو اس کو دو اجر ملیں گے۔اور اگر غلطی کرے گا تو اس کو ایک اجر ملے گا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ مخلصانہ غلطی بھی اللہ کی نظر میں پسندیدہ ہے۔مجتہد کی غلطی اللہ کی نظر میں ایسی ہے کہ جیسے آپ کا ایک چھوٹا عزیز بچہ ہو، جس نے ابھی چلنا سیکھا ہو۔جب وہ گرتا ہے تو آپ کو اس پر بہت پیار آتا ہے اور آپ ایک دم اس کو گود میں اٹھا لیتی ہیں۔تو گویا انسان ایک بچے کی طرح ہے۔وہ اپنی محدود علم اور عقل سے اللہ کا حکم معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔اور اخلاص سے غلطی کرتا ہے تو وہ غلطی بھی اللہ کو پسندیدہ ہے۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: آپ نے تذکرہ فرمایا ہے کہ کلام، فقہ اور تصوف میں ایسے موضوعات بنیادی اہمیت اختیار کرتے چلے گئے جو متعدد قباحتوں کا سبب نے۔کیا ایسا تو نہیں کہ ایک بڑی علمی تحریک جو عباسی دور میں برپا ہوئی، اسے درست رخ نہ دیا جا سکا اور یہ علم کچھ عرصہ بعد لایعنی کی شکل اختیار کر گیا؟ علمی مزاج اور ماحول کو مثبت انداز میں استعمال

نہ کرسکنا، سیاسی اور علمی قاعدین کی غلطی تھی براہ کرم رہنمائی فرمائیے۔

جواب: میرے خیال میں مسلمانوں کے عمومی فکری انحطاط کی وجہ سے ایسا ہوا، جب مسلمانوں میں ایک عقلی انحطاط دسویں صدی ہجری میں شروع ہوا تو اس عقلی انحطاط کے منفی اثرات تمام علوم پر پڑے۔ ان منفی اثرات سے علم کلام بھی متاثر ہوا۔ باہر کے لوگوں کی خرافات کو بلا چوں و چرا قبول کر کے اپنے نظام میں شامل کرنے کا یہ رجحان اس زمانے میں زیادہ ہوا۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: مسئلہ خلق قرآن کی طرف آپ نے اشارہ فرمایا ہے۔ براہ کرم آگاہ فرمائیں کہ مسئلہ اتنا اہم کیوں سمجھا گیا کہ مؤیدین اور مخالفین نے اس پر شدید موقف اپنایا؟ یہاں تک کہ وہ واقعات پیش آئے جو افسوس ناک بھی ہیں اور حیرت انگیز بھی؟

جواب: میرا خیال ہے کہ دونوں فریقوں نے یہ سمجھا کہ اگر دوسرے فریق کا موقف اختیار کیا گیا اور عامۃ الناس نے اس کو اپنایا تو اس سے اسلام کے مستقبل پر بہت منفی اثرات مرتب ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کچھ حضرات کا کہنا یہ تھا کہ بنیادی سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب سے ہے اسی وقت سے اس کی صفات بھی اس کے ساتھ ہیں۔ اس پر تو اتفاق رائے ہو گیا۔ صفات بھی ازلی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات بھی ازلی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ خالق ہے تو یقیناً وہ ہمیشہ سے خالق ہے۔ لہٰذا ہمیشہ سے خلق بھی ہے۔ اگر صفت خالقیت کا مظہر خارج میں ہونا بھی ضروری ہے تو کیا مخلوقات کا موجود ہونا بھی ازل سے ہی ضروری ہے؟ بعض لوگوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی صفت خالقیت کے ظہور کے لئے مخلوقات کا ہونا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ انہوں نے دنیا کو بھی ازلی کہا۔ دنیا کو بھی قدیم قرار دیا اور اللہ تعالیٰ کو بھی قدیم قرار دیا۔ یہ بات متکلمین اسلام نے غلط قرار دی۔ امام غزالیؒ نے جن بنیادوں پر ابن سینا کی تکفیر کی ہے ان میں عالم کے قدم کا مسئلہ بھی ہے۔ ابن سینا قدم عالم کا قائل تھا۔ وہ کہتا تا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات قدیم ہے۔ اس کے خالق ہونے کو بھی وہ قدیم مانتا ہے اور وہ اس بات کا بھی قائل تھا کہ جب اللہ تعالیٰ کی صفت کا مظہر قدیم ہے تو خلق بھی قدیم ہونی چاہئے۔ ابن سینا بظاہر ایک عقلی بات کہتا تھا، لیکن اس کے نتائج بڑے خطرناک تھے۔ اسی طرح سے مامون اور قاضی احمد ابن ابی داؤد یہ کہتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی صفات کو بھی قدیم مانا گیا اور صفات کے مظاہر کو بھی قدیم مانا گیا، اور قرآن مجید کو بھی صفات کے مظہر کے طور پر قدیم مانا گیا تو پھر بقیہ بہت سی چیزیں بھی قدیم ماننی پڑیں گی۔ اس کے نتیجے میں شرک کا بہت بڑا دروازہ کھل جائے گا اس لئے مامون اور اس کے رفقاء اس کو غلط عقیدہ سمجھتے تھے اور اس کو روکنا چاہتے تھے۔ اس کے مقابلے میں امام احمد اور دوسرے حضرات کا خیال یہ تھا کہ اگر قرآن مجید کو ایک حادث چیز سمجھا گیا اور یہ قرار دیا گیا کہ قرآن مجید ایک ایسی چیز ہے جو بعد میں اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے تو اس کو عام انسانوں کے کلام کی طرح ایک کلام سمجھا جائے گا۔ جیسے ہر کلام ایک زمانے میں پیدا ہوتا ہے وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ جو چیز بعد میں پیدا ہوئی وہ کچھ عرصہ بعد ختم بھی ہو جاتی اس لئے اس عقیدہ کی وجہ سے تو قرآن مجید پر کہیں ایمان کمزور نہ پڑ جائے اور شریعت کی جامعت اور ابدیت پر فرق نے پڑے۔ امام احمد اس خطرے کو بہت شدت سے محسوس فرما رہے تھے۔ اس لئے انھوں نے دوسرا موقف اختیار کیا۔ مامون اور قاضی احمد ابن ابی داؤد اس دوسرے خطرے کو محسوس کر رہے تھے اس لئے انھوں نے اپنا موقف سختی کے ساتھ نافذ کرنا چاہا۔ میرے خیال میں ممکن ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے کا موقف سمجھنے اور اس کے ممکنہ نتائج و تضمنات کا اندازہ کرنے میں مشکل پیش آئی ہو۔ شاید اس کا سبب Lack of communnication ہو۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: قرآن و حدیث میں مومن، مسلم، کافر، منافق، فاجر کی اصطلاحات استعمال کی گئیں ہیں۔ علماء نے اس میں زندیق کی اصطلاح کا اضافہ کیا۔ اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

جواب: زندیق کا لفظ دراصل قدیم ایران میں استعمال ہوتا تھا۔ زندیق کے معنی یہ ہیں کہ ایک شخص زبان سے تو اسلام کا اظہار کرے، زبان سے اسلامی اصطلاحات اور اسلامی تعلیمات سے وابستگی کا اقرار کرے، لیکن اسلامی اصطلاحات اور اسلامی تعلیم کو وہ معنی پہنائے جو اسلام میں نہیں ہیں۔ ایسا آدمی چونکہ حضور ﷺ کے زمانے میں نہیں پایا جاتا تھا، اس زمانہ میں لوگ یا مکمل طور پر مسلمان ہوتے تھے یا نہیں ہوتے تھے۔ یا منافق ہوتے تھے۔ اس کے برعکس ایسا آدمی جو زبان سے اظہار کرے کہ

میں مسلمان ہوں، زبان سے قرآن کو بھی مانتا ہو، یا نماز، روزے کو بھی مانتا ہو، لیکن ان سب اصطلاحات اور احکام کی تعبیر وہ کرے جو قرآن اور سنت کے خلاف ہو، ایسا آدمی بعد میں پیدا ہوا۔ بعد میں اس طرح کے بہت سے لوگ سامنے آئے اور یہ باطنیت کا ایک مظہر تھا۔ باطنیوں کی کوشش رہی ہے کہ اسلام کی وہ تعبیریں کی جائیں کہ جو مسلمان خالی الذہن ہیں یا اسلام کے بارے میں زیادہ علم نہیں رکھتے وہ گمراہی کا شکار ہو جائیں۔ ان کو اسلام سے براہ راست برگشتہ کرنے کی بجائے جو ذرا مشکل کام تھا، بالواسطہ طور پر اسلام سے برگشتہ کر دیا جائے اور اسلام کی تعلیم کو وہ معنی پہنا دیے جائیں جو اسلام میں نہیں ہیں۔ مثلاً نماز کے یہ معنی کہ اللہ کو یاد کرنا کافی ہے، پانچ وقت اٹھک بیٹھک کرنے کی ضرورت نہیں۔ روزے کے یہ معنی کہ آپ غیر ضروری خواہشات سے بچیں، پورا دن بھوکا رہنے کی ضرورت نہیں۔ اس طرح کی تعبیرات ان لوگوں کو بہت پسند آتی ہیں جن کے دل میں پہلے سے چور ہو یا جن کا ایمان پختہ نہ ہو۔ آزادی فکر کے نام پر اس طرح کی تعبیرات کی اگر اجازت دے دی جاتی تو آج اسلام کا نام ونشان تک نہ ہوتا۔ اس لئے یہ اصطلاح زندیق کی اختیار کی گئی۔ زندیق کی اصطلاح استعمال کرنے کا مقصد یہی تھا کہ ایسے لوگوں کی تشخیص کی جائے۔ ان کو identify کیا جائے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: تقدیر مبرم اور تقدیر معلق کے تصور کی وضاحت فرمائیں۔ بعض شیعہ علماء کے مطابق یہ تصوران کے عقیدہ بداء کے مماثل ہے۔

جواب: تقدیر مبرم اور تقدیر معلق تو بہت بعد کی اصطلاحات ہیں۔ یہ اصطلاحات قدیم متکلمین کی نہیں ہیں، نہ یہ اصطلاحات قدیم مفسرین کی ہیں۔ لیکن جو حضرات یہ اصطلاحات استعمال کرتے ہیں ان کی نظر میں اللہ تعالیٰ کی تقدیریں دو طرح کی ہیں، اللہ تعالیٰ کے اندازے دو طرح کے ہیں۔ ایک اندازہ تو وہ ہے جو خالص امور طبیعیۃ اور تکوینیہ سے تعلق رکھتا ہے، جس کے پابند اصلاً نباتات و جمادات ہیں۔ اقبال کہتے ہیں۔

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات

اس تقدیر میں کوئی تخلف نہیں ہو سکتا۔ لیکن نباتات و جمادات کو اور کائنات کی قوتوں کو قوت فیصلہ یا ارادہ حاصل نہیں ہے۔ ان کو اچھے برے کی تمیز کا اختیار حاصل نہیں ہے۔ جانوروں کو ایک خاص انداز سے چلنے کا حکم ہے۔ زمین و آسمان کو ایک خاص انداز کی حرکت کا حکم ہے۔ یہ تقدیر مبرم ہے جس میں کوئی تخلف نہیں ہوتا۔ کوئی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔

ایک تقدیر وہ ہے جو انسانوں کے لئے ہے۔ انسانوں کو اچھے برے کا فیصلہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ اچھے برے کے معاملہ میں اس کو اختیار دیا گیا ہے، choice دی گئی ہے، وہ غلط راستہ بھی اختیار کر سکتا ہے اور صحیح راستہ بھی اختیار کر سکتا ہے۔ یہ تقدیر معلق کی ایک قسم ہے یہاں سے تقدیر مبرم اور معلق کا فرق شروع ہوا۔ بعد کے متکلمین کی اصطلاح میں تقدیر مبرم سے مراد وہ چیزیں ہیں کہ جس میں انسان اپنے فیصلے سے کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ مثلاً انسان کی موت کا وقت مقرر ہے۔ انسان کی عمر مقرر ہے۔ کوئی انسان چاہے کہ اپنی عمر میں اضافہ کرلے یا کمی کرلے تو وہ ایسا نہیں کہتا۔ ہر انسان کا ایک گروپ مقرر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے میرے بارے میں فیصلہ کیا ہے کہ میں فلاں جگہ پیدا ہوں گا۔ فلاں ماں باپ کے ہاں پیدا ہوں گا۔ فلاں جگہ مروں گا۔ میں اپنے فیصلہ سے اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ اس طرح کے معاملات تقدیر مبرم کہلاتے ہیں۔

اس کے برعکس جن معاملات میں میرے فیصلے یا choice سے فرق پڑتا ہے وہ تقدیر معلق ہے۔ یہ محض اصطلاح کا فرق ہے۔ یہ اصطلاح نہ قرآن پاک میں آئی ہے نہ حدیث میں آئی ہے۔ نہ متقدمین کے ہاں ملتی ہے بلکہ بعد والوں کے ہاں ہے۔

تقدیر معلق کا بداء سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بداء کا تصور جو شیعہ کلام میں پایا جاتا ہے وہ مختلف ہے۔ بداء کا تصور یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو جزوی واقعات کا علم پہلے سے حاصل نہیں ہے۔ یہ علم ان کو ان جزوی واقعات کے وقوع پذیر ہو جانے کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔ ایک بنیادی سوال پہلے یہ پیدا ہوا تھا کہ کیا اللہ تعالیٰ کو کائنات کے ایک ایک ذرے کا علم ہے! جب یہ سوال پیدا ہوا تو بعض حضرات، خاص طور پر فلاسفہ میں سے کچھ لوگوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کو کلیات کا علم تو ہے، جزئیات کا علم نہیں۔ میری جیب میں اگر چار سکے ہیں تو چوتھا سکہ کون سا ہے؟ نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کو اس کا علم نہیں۔ اس کو صرف کلیات کا علم ہے کہ ایک محمود غازی ہے، اس کے پاس اتنے پیسے ہیں، فلاں جگہ کام کرتا ہے۔ یہ بات وہ جانتا ہے، لیکن یہ تفصیلات جو میرے بارے میں ہیں؟ یہ نعوذ باللہ اس کے علم میں نہیں ہیں۔ کچھ لوگ ایسا سمجھتے تھے اور اس

زمانے کی عقلیات کے لحاظ سے وہ اسی لغو نتیجے پر پہنچے۔ جب یہ تصور ایک بار ایک حلقہ میں عام ہوگیا تو پھر یہ سوال پیدا ہوا اللہ تعالیٰ جو بہت سے فیصلے کرتا ہے وہ نعوذ باللہ اس مفروضے پر کرتا ہے اور نقل کفر، کفر نہ باشد، کہ بہت سی جزئیات اس کے علم میں نہیں۔ بعد میں جب حکم دینے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ چونکہ جزئیات سامنے نہیں تھیں اس لئے نتیجہ غلط نکل آیا تو پھر اللہ تعالیٰ اس پر نظر ثانی کرتا ہے۔ اس نظر ثانی کے عمل کو بداء کہتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ ایک غلط بات ہے اور بالبداھت غلط ہے۔ لیکن چونکہ اس زمانے میں یہ لغو خیال ایک حلقہ میں پھیل گیا تھا، اس لئے کچھ لوگ اس سے متاثر ہوگئے۔ اس زمانے میں جو لوگ اس کے قائل ہوئے کہ خالق کائنات کو جزئیات اور انفرادی واقعات کا علم نہیں ہوتا، ان میں بعض بڑے بڑے فلاسفہ بھی شامل ہیں جنہوں نے عقلی دلائل کے ساتھ ثابت کیا کہ اللہ تعالیٰ کا علم صرف کلیات تک محدود ہے، جزئیات تک محیط نہیں ہے۔ انہوں نے جن عقلی دلائل سے یہ بات کہی تھی آج وہ عقلی دلائل مضحکہ خیز معلوم ہوتے ہیں لیکن اس زمانے میں یہ بہت state-of-the-art قسم کی چیزیں مانی گئیں۔ یہ بات ایک زمانے میں عام تھی اور جو دلائل دیے جاتے تھے وہ سب ایک ہی طرح کے تھے۔ مثلاً ایک ''دلیل'' یہ دی گئی کہ اگر ایک بادشاہ ہو اور اس کی سلطنت میں دس لاکھ آدمی ہوں تو بیک وقت وہ دس لاکھ آدمیوں سے کیسے مخاطب ہوسکتا ہے۔ وہ اپنے گورنروں سے مخاطب ہوگا، والی سے مخاطب ہوگا، گورنر نائب گورنر سے مخاطب ہوں گے، وہ فلاں سے ہوگا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی کرتا ہے کہ وہ کلیات سے رابطہ رکھتا ہے اور کلیات کے ذریعے جزئیات تک پہنچا جاسکتا ہے۔ یہ بات آج بالبداھت کمزور اور غلط معلوم ہوتی ہے۔

جزئیات سے رابطہ اور ایک ایک آدمی کی بابت ہر بات کی بیک وقت اطلاع ہونا، یہ بہت آسان بات ہے۔ کئی سال پہلے میں انگلستان گیا تو میں نے پہلی مرتبہ دیکھا کہ وہاں انفرادی طور پر ہزاروں لاکھوں آدمیوں سے بیک وقت رابطہ رکھنے کا ایک نظام ہے۔ اگر آپ انگلستان میں کہیں جانا چاہتے ہیں تو آپ کمپیوٹر سے اپنا ایڈریس وہاں نوٹ کروادیں، کمپیوٹر آپ کو گائیڈ کرتا رہے گا کہ آپ سڑک کے دائیں ہوجائیں، پھر آپ مین روڈ پر جائیں۔ پچاس میل کے بعد پھر دائیں مڑ جائیں۔ بائیں مڑ جائیں۔ پھر وہ آپ سے کہے گا آپ دو سو میل چلیں۔ دو سو میل کے بعد آپ فلاں بڑی سڑک ایم 1 یا ایم 2 پر ہوجائیں اور اس طرح آپ کے گھر تک آپ کو پہنچا دے گا۔ اس وقت میں نے اپنے دوست سے، جو مجھے لے کر جارہے تھے کہا کہ مجھے وہ جزئیات کے علم والا مسئلہ یاد آرہا ہے، کہ کس طرح یہ کمپیوٹر ایک ایک آدمی کو، انگلستان میں اس وقت کتنی گاڑیوں کو ایک ایک گھر تک پہنچا رہا ہے۔ جب انسانوں کی بنائی ہوئی مشین یہ کرسکتی ہے تو اللہ تعالیٰ کیوں نہیں کرسکتا؟

سوال: اللہ کے علم اور اللہ نے جو اختیار دیا ہے، ان دونوں باتوں میں مطابقت کیسے پیدا ہوگی؟ اللہ کو معلوم ہے کہ فلاں شخص کل ۱۰ بجے کوئی نیک کام کرے گا یا فلاں شخص کوئی برا کام کرے گا؟ کیا یہ دونوں حضرات اپنے اختیار سے اس علم کے خلاف جاسکتے ہیں؟ پھر سزا و جزا کا کیا ہوگا؟

جواب: یقیناً اللہ تعالیٰ کے اندازے اور علم میں ہے کہ کون کیا کرے گا۔ لیکن یہ بات کہ اللہ کے علم میں کیا ہے، یہ میرے اور آپ کے علم میں نہیں ہے، اور نہ ان لوگوں کے علم میں ہے جو اچھا یا برا کام کریں گے۔ اگر کوئی اچھا کام کرنے والا ہے اور وہ نہیں کرتا تو اللہ کے علم میں یہ بھی ہے کہ وہ نہیں کرے گا۔ اصل میں اللہ کے علم اور اندازے میں کوئی تعارض اور فرق نہیں ہے۔ ہمارے علم اور اندازے میں تعارض اور فرق ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ مستقبل میں کیا ہوگا؟ یہ اللہ کے علم میں ہے۔ بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ ''انا کل شیءٍ خلقناہ بقدر''۔ تقدیر اور قدر کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جس کا مفہوم assesment ہے۔ اندازے کا ہے۔

بطور ایک استاد کے میں ابھی ڈاکٹر ایوب صابر صاحب سے عرض کر رہا تھا کہ میرا اندازہ یہ ہوتا ہے کہ میں جس کلاس کو پڑھاتا ہوں اس میں کون پاس ہوگا اور کون فیل ہوگا؟ اور عموماً ۸۰ فیصد ایسا ہی ہوتا ہے۔ لیکن جو پاس ہوتا وہ اس لئے پاس نہیں ہوتا ہے کہ میرا اندازہ تھا کہ وہ پاس ہوگا۔ جو فیل ہوتا ہے وہ اس لئے فیل نہیں ہوتا کہ میرا اندازہ تھا کہ وہ فیل ہوگا۔ وہ اپنی کارکردگی کی وجہ سے فیل یا پاس ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ میں ان کو جانتا ہوں اس لئے میرا اندازہ ۸۰ فیصد درست نکلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علم اور اندازے میں کوئی تعارض یا فرق واقع نہیں ہوتا۔ جتنا اس کا علم ہے اتنا ہی اس کا اندازہ بھی ہے۔ اس لئے اس کا اندازہ سو فیصد درست ہوتا ہے۔ اس لیے اس نے تقدیر کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ جس کے معنی اندازہ کرنے کے ہیں، قدر کے ہیں۔ وہاں مجبوری کا مفہوم کہیں نہیں ہے۔ استاد لائق طالب علم کو فیل ہونے پر مجبور نہیں کرتا۔ ایک اچھا ڈاکٹر اندازہ کرلیتا ہے کہ مریض اگر اسی طرح سے بے احتیاطی کرتا رہا تو اس کو یہ اور یہ نقصانات ہوں گے۔ مریض کو جو نقصانات ہوتے ہیں وہ اس کی اپنی بے احتیاطیوں کی وجہ سے ہوتے ہیں، ڈاکٹر کے اندزے کی وجہ سے نہیں ہوتے۔ ایک انجینئر کو اندازہ ہوتا ہے کہ اتنی اونچی عمارت جس میں اس طرح کا مواد لگایا گیا ہے، اگر یہی مواد لگا کر یہ عمارت مقررہ حدود سے زیادہ اونچی کی جائے تو یہ گر جائے گی۔ اب یہ عمارت انجینئر کے اندازے کی وجہ سے نہیں

کرتی، وہ اس مواد کی کمزوری کی وجہ سے گرتی ہے۔ یہی بات اللہ تعالیٰ کے اندازے کے بارے میں کہی جاسکتی ہے جو سو فیصد درست ہوتا ہے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: What is the ralationship between Ijtehad and Ilme- Kalaam, What platform is there in the present world for the renaissance of the two and of Ibn Khaldun?

Second, Please comment on the works of those like Harun Yahya, as Quranic interpretation in the light of scientific development, in your opinion, is it a good source of learning about Islam or a more exaggeration to drag the meanings of ayas to fit in a certain framework?

جواب: ابن خلدون کا renaissance تو قیامت میں ہی ہوگا، اس سے پہلے نہیں ہوسکتا۔ اجتہاد کے renaissance کے لئے بہت سے ادارے کر رہے ہیں۔ ہمارا یہ موجودہ پروگرام بھی اجتہاد کی ایک مشق ہے جو یہ ادارہ کر رہا ہے، اسلامی نظریاتی کونسل کر رہی ہے، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کر رہی ہے۔ جو بھی کام اس وقت کیا جا رہا ہے وہ اجتہاد کی revival کے لئے استعمال ہوگا۔

دوم، میں جناب ہارون یحیٰ کو شخصی طور پر نہیں جانتا، لیکن میں نے ان کی جو کتابیں دیکھی ہیں وہ اچھی ہیں۔ جتنا ان کے بارے میں سنا ہے یہی سنا ہے وہ اچھے اور مخلص انسان ہیں، صاحب علم ہیں۔ ان کی کتابوں سے استفادہ کرنا چاہئے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: برصغیر میں عقل و نقل کے موضوع پر کس نے کتاب لکھی؟

جواب: عقل و نقل کے عنوان سے کوئی مستقل کتاب کسی نے لکھی ہو تو وہ میرے علم میں نہیں ہے۔ لیکن جن حضرات نے عقل و نقل کے تقابل پر کتابیں لکھی ہیں اس میں ایک نام مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ہے، جن کی تین کتابیں مفید ہیں۔ ایک ''المصالح العقلیہ'' ہے جو کسی عربی کتاب کا آزاد ترجمہ اور تلخیص ہے۔ انہی کی ایک کتاب اور ہے جس کا انگریزی ترجمہ Answer to Modernism کے نام سے ہوا ہے، جس میں انہوں نے آج کل کے معاملات کے بارے میں کچھ بنیادی باتیں بتائی ہیں کہ اسلامی نقطہ نظر کو formulate کرتے ہوئے کن اصولوں کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ ایک آدھ کتاب ان کی اور ہے۔ کوئی خاص کتاب آپ کے ذہن میں ہو تو میں نہیں جانتا۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: جدید علم پر منضبط انداز میں کونسی سہل کتاب ہے جسے درسیات میں شامل کیا جاسکے؟

جواب، جدید علم کوئی ایسا علم نہیں ہے کہ اس کو ایک کتاب میں لکھا جاسکے۔ جدید علم تو ایک سمندر ہے اور اس کے کسی ایک فن میں مہارت پیدا کرنے کے لئے بہت کچھ محنت درکار ہے۔ اس لئے میرے خیال میں کوئی ایسی کتاب نہیں ہوسکتی جو جدید علم پر مبنی ہو اور سارا جدید علم اس میں آجائے۔ جدید علم کلام پر بھی کوئی ایک کتاب نہیں ہے۔ مختلف کتابیں سامنے رکھنی پڑیں گی۔ لیکن میرے خیال میں ایک بہت اچھی کتاب ''کبری الیقینات الکونیہ'' ہے۔ یہ ڈاکٹر سعید رمضان البوطی کی تصنیف ہے، شام کے بہت بڑے عالم ہیں۔ میرے خال میں اسلام کے بنیادی عقائد کو جدید انداز میں ذاتی طور پر سمجھنے کے لئے یہ ایک اچھی کتاب ہے۔ اردو میں آسان کتاب میرے خیال میں علامہ شبلی کی ''الکلام اور علم الکلام'' ہے جو کہ اس موضوع پر بلاشبہ ایک اچھی کتاب ہے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: علم الکلام پر جو مولانا ادریس کاندھلوی کی کتاب ہے، اس کے بارے میں آپ کا تجزیہ وتبصرہ کیا ہے؟

جواب: مولانا محمد ادریس کاندھلوی بلاشبہ بہت بڑے عالم فاضل انسان تھے، ان کے کام پر میں کیا تبصرہ کرسکتا ہوں۔ البتہ میں ایک عمومی اور اصولی بات عرض کرسکتا ہوں۔ مولانا ادریس کاندھلوی صاحب یا مولانا شبلی نعمانی یا مولانا محمد قاسم نانوتوی یا اس طرح کے اور اکابر کی کتابیں بہت اچھی اور بڑی فاضلانہ کتابیں ہیں، لیکن وہ قدیم علم کلام کو قدیم اسلوب میں بیان کرتی ہیں۔ اس لئے وہ علم کلام کے مختصص طلبہ کے لئے تو بہت مفید ہیں، لیکن وہ جدید علم کلام کے تقاضوں کو شاید اس حد تک پورا نہ کرسکیں جس حد تک آج کے ذہن میں سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ مولانا ادریس کاندھلوی کی کتاب میں نے کئی بار پڑھی ہے۔ بہت عالمانہ کتاب ہے۔ مولانا قدیم علم کلام کے بڑے ماہر تھے۔ لیکن قدیم علم کلام کے جو اصول موضوعہ ہیں وہ آج کے اس نئے دور کے تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے قابل فہم نہیں ہیں، نہ آج کل کے انسان کے ذہن میں وہ سوال پیدا ہوتے ہیں اور نہ قدیم انداز کے جوابات سے وہ مطمئن ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آج کل قائداعظم یونیورسٹی کا کوئی طالب علم نہ جوہر کو جانتا ہے نہ عرض کو جانتا ہے، وہ نہ حادث کی اصطلاح سے واقف ہے نہ قدیم کے تصور سے آشنا ہے۔ یہ مسائل اس کے مسائل ہی نہیں ہیں۔ یہ کیٹگریز اب ختم ہوگئی ہیں۔ آج یہ مسائل زیر بحث نہیں ہیں۔ لہٰذا وہ علم کلام جو ان اساسات پر مبنی ہو وہ آج کے طالب علم کے لئے غیر مفید ہے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: آپ نے سید حسین نصر کے بارے میں اچھے الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ حالانکہ میری معلومات کے مطابق وہ شیعہ ہیں اور مغربی علم کلام سے بہت متأثر ہوئے ہیں اور انتہا پسندانہ عقلی مسلک کے حامی ہیں اور ان کے ہاں بہت سے فکری انحرافات بھی موجود ہیں۔ اس لئے آپ کا ان کی فکر کے بارے میں کیا تبصرہ ہے؟

جواب: میرا خیال ہے کہ کوئی بھی آدمی ایسا نہیں ہوتا کہ آپ سو فیصد اس کے خیالات سے اتفاق کرتے ہوں۔ سید حسین نصر بہت بڑے عالم فاضل انسان ہیں اور مسلکاً شیعہ ہیں، یہ میں بھی جانتا ہوں۔ لیکن ان کے خیالات میں کوئی ایسی serious اور قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ کہیں کہیں شیعہ نقطہ نظر کو بیان کرتے ہیں، جو فطری بات ہے کیونکہ وہ خود شیعہ ہیں۔ لیکن عمومی طور پر مغربی فکر پر ان کی تنقید اور اسلامی عقائد کے بارے میں ان کا بیان بہت متوازن اور قابل قبول ہوتا ہے۔ اس لئے میرے خیال میں ایک مغربی تعلیم یافتہ انسان کے سامنے اسلام کا موقف بیان کرنے میں جو کتابیں مفید ثابت ہوتی ہیں اس میں ان کی کتابیں بھی شامل ہیں۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: ظاہری شریعت اور باطنی شریعت کی حقیقت کیا ہے؟

جواب: ظاہری شریعت اور باطنی شریعت دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ وہ ایک ہی چیز کے دو پہلو ہیں۔ جو حقیقت میرے ظاہر و باطن کی ہے وہی شریعت کے ظاہر و باطن کی ہے۔ آپ میرے باطن کو میرے ظاہر سے الگ نہیں کرسکتے۔ اگر الگ کردیں گے تو میری شخصیت نامکمل رہ جائے گی۔ اسی طرح سے اگر شریعت کے ظاہر کو شریعت کے باطن سے الگ سمجھا جائے گا تو وہ نامکمل رہ جائے گی۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: مربی جائز امور سے تو منع کرسکتا ہے، اگر ناجائز حکم دے تو کیسا ہے؟

جواب: ''لاطاعة لمخلوق فی معصية الخالق'' (خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں)۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: معرفت تک پہنچنے کا ذریعہ ریاضت اور کوشش ہے جس کے بارے میں آپ نے ارشاد فرمایا۔ کیا والدین یا اعزاء کی ریاضت بھی وراثت میں جاری ہوتی ہے؟

جواب: نہیں، بالکل نہیں جاری ہوتی۔ ہر آدمی کی کوشش اس کے اپنے لئے ہی کارآمد اور مفید ہے۔ ''لاتزر وازرة وزر اخرىٰ'' (کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے

گا)۔''وان لیس للانسان الا ما سعی'' کوئی شخص کسی کے عمل سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔اپنا عمل ہی انسان کو فائدہ پہنچا سکتا ہے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: آپ اس عقیدے کی علمی تشریح کسی طرح کریں گے: ''**ان من ضروریات مذھبنا ان لکل من ائمتنا مقاماً لا یبلغه ملک مقرب و لا نبی مرسل**''؟ (یہ ہمارے مذہب کی ضرورت ہے کہ ہمارے آئمہ میں سے ہر ایک کا ایسا مقام ہے جس تک نہ کوئی مقرب فرشتہ پہنچ سکتا ہے اور نہ کوئی بھیجا ہوا نبی)۔

جواب: میرے خیال میں یہ اسلامی عقیدہ نہیں ہے۔اگر کسی نے کہا ہے تو اسلامی عقیدے سے انحراف کیا ہے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: علاقائی ثقافت، علاقائی رسوم و رواج اور اطوار و عادات کے حوالے سے شریعت اسلامی کا کیا نقطۂ نظر ہے۔یعنی شریعت اسلامی انہیں تحفظ فراہم کرتی ہے یا انہیں kill کرتی ہے؟

جواب: شریعت اسلامی مقامی عادات و اطوار، علاقائی ثقافتوں اور رسوم و رواج کو ہرگز ختم نہیں کرتی۔ وہ ان سب کو ایک شرط کے ساتھ اپنے نظام اجتماعی اور اپنے تہذیبی مثالیہ یا پیراڈائم میں سمو لیتی ہے، وہ شرط یہ ہے کہ ان میں سے کوئی چیز شریعت کے احکام سے متعارض نہ ہو۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: اتنے مذاہب اور اتنی کوششیں ہیں، آخر انسان نے individually کیا بننا ہے، کیا بننا چاہتا ہے؟ اور دین ہمیں کیا بنانا چاہتا ہے؟

جواب: میرے خیال میں دین ہمیں ایک اچھا، متوازن اور مکمل انسان بنانا چاہتا ہے۔ ایک ایسا انسان جو اخلاقی اقدار پر کاربند ہو، جو روحانی اصولوں کی بنیاد پر کام کرتا ہو، جو دوسروں سے محبت کرتا ہو اور جو اپنے اور دوسروں کے لیے کام کرتا ہو۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: سارے مذاہب یہی کہتے ہیں جو آپ نے کہا پھر آخر اسلام ہی کیوں؟

جواب: یہی تو اس ساری گفتگو کا خلاصہ ہے۔ اسلام کا جو طرۂ امتیاز ہے اسی کو بیان کرنے کے لیے گفتگو ہوئی ہے۔ دعویٰ تو سب ہی یہی کرتے ہیں۔ دنیا کا ہر قانون یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ عدل و انصاف قائم کرے گا، لیکن آپ کی اس بات کا جواب دینے کے لئے کئی انداز ہو سکتے ہیں۔ ایک تاریخ کا انداز ہو سکتا ہے کہ کیا تاریخ میں اسلام نے کوئی جدت فراہم کی؟ کیا عملاً اسلام کی تعلیم ایسی جامع تعلیم ہے جو ایک جامع انسان اور متکامل انسان پیدا کر سکے؟ میرے خیال میں اسلام کی تعلیم سب سے زیادہ جامع، متکامل اور متوازن ہے۔ بقیہ مذاہب میں یک رخا پن پایا جاتا ہے۔ کسی ایک پہلو پر زور ہے تو دوسرے کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ اس لئے اسلام ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: وحدت ادیان کا جو تصور مولانا آزاد نے پیش کیا ہے، اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ سورہ بقرہ کی ایک آیت ہے کہ ''**ان الذین اٰمنوا والذین ھادوا والنصاریٰ والصابئین من اٰمن باللہ والیوم الاٰخر**''.

جواب: میں مولانا ابوالکلام آزاد کے نظریات وحدت ادیان سے تو واقف نہیں ہوں۔لیکن وحدت ادیان کے جس تصور کی بہت سے لوگ دعوت دیتے ہیں میں اس سے اتفاق نہیں کرتا، بلکہ اس کو اسلام کے دین کامل ہونے اور رسول اللہ ﷺ کی ختم نبوت پر ایمان کے منافی سمجھتا ہوں۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: [تنزلات ستہ کے بارہ میں تھا]

جواب: تنزلات ستہ۔ ''عقل اول عقل دوم وغیرہ کے تصورات'' میرے خیال میں قرآن وسنت کے بالکل مطابق نہیں ہیں۔ان امور کا کوئی تعلق قرآن وسنت سے نہیں ہے۔اصل میں جب یونانی فلسفہ عربی میں ترجمہ ہوا تو یونانی فلسفہ کے بہت سے غلط عقائد اور خیالات بعض فلاسفہ نے قبول کر لیے۔بطور جوابی دلیل یا الزامی جواب کے قبول کئے یا کسی اور وجہ سے قبول کئے؟ یہ اللہ بہتر جانتا ہے۔لیکن ان خیالات کو قبول کرنے کے بعد انھوں نے ان خیالات کو اسلامی عقائد بیان کرنے کے لئے استعمال کیا۔

ان میں سے ایک خیال یہ بھی تھا۔یونانی اول تو اللہ کے وجود کے قائل نہیں تھے۔لیکن ان میں جو قائل تھے۔وہ یہ کہتے تھے (اگرچہ انتہائی فضول اور لغو بات ہے۔ لیکن بہت سے لوگوں نے اسے قبول کرلیا) کہ ایک خالق سے ایک ہی مخلوق کا ظہور ہوسکتا ہے۔یہاں جتنے لوگ بیٹھے ہیں ایک ایک کے کئی بچے ہیں۔یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک سے ایک کا ظہور ہوتا ہو۔اللہ تعالیٰ سے ایک ہی کا ظہور ہوتا ہے۔بعض احادیث میں آیا ہے کہ سب سے پہلے اللہ نے عقل کو پیدا کیا۔اس پر ان فلاسفہ کو گویا دلیل ہاتھ آگئی۔تو انھوں نے کہا: دیکھو حدیث میں بھی آیا ہے، گویا عقل اول اللہ نے پیدا کی۔عقل اول سے عقل دوم پیدا ہوئی اور اس سے نو عقلیں پیدا ہوئیں۔اور پھر نویں عقل سے یہ ساری کائنات چل پڑی۔اگر نویں عقل سے ہزاروں لاکھوں پیدا ہوگئے تو عقل اول سے کیوں نہیں ہوسکتے تھے۔اللہ کے حکم سے براہ راست کیوں نہیں ہوسکتے تھے؟ یہ سوال کسی نے ان سے پوچھا نہیں۔اگر پوچھا تو اس کا کیا جواب ملا، مجھے معلوم نہیں۔لیکن یہ خیالات تھے جو کچھ صوفیوں نے باطنی صوفیوں اور اخوان الصفاء جیسے لوگوں نے مسلمانوں میں پھیلائے۔ان معاملات کا نہ عقیدے سے تعلق ہے، نہ صوفیاء سے تعلق ہے۔یہ مباحث نہ ابو طالب مکی کے ہاں ہیں، نہ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے ہاں ہیں، نہ جنید بغدادی کے ہاں ملتے ہیں۔نہ اور بزرگوں کے ہاں ملتے ہیں۔یہ سوالات اور مباحث تو بہت بعد والوں کے ہاں ملتے ہیں۔اول ما خلق اللہ العقل اگر درست ہے اور واقعی حدیث میں آیا ہے تو اس کا مفہوم وہ نہیں ہے جو بعض فلاسفہ بیان کرتے ہیں۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: کیا علم لدنی علم الوحی کے متوازی ذریعہ علم ہے؟

جواب: علم لدنی، علم الوحی کے متوازی ذریعہ علم نہیں ہے۔علم لدنی سے مراد یہ ہے کہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کا خاص انعام کسی انسان کے اوپر ہوتا ہے اور اس کو خصوصی علم حاصل ہوجاتا ہے۔ہم خود دیکھتے ہیں، ایسے بڑے بڑے اکابر ہمارے زمانے میں بھی ہوئے ہیں کہ انہوں نے وہی تعلیم پائی جو ہم سب نے پائی، لیکن ان میں سے بعض کو اللہ نے بڑا علم دے دیا۔مولانا انور شاہ کشمیری اسی درس نظامی کے پڑھے ہوئے تھے، لیکن ان کو اللہ نے جو علم دیا وہ باقی درس نظامی کے فضلاء کو نہیں ملا۔اس طرح کا علم علم لدنی کہلاتا ہے، جو اللہ تعالیٰ اپنی خصوصی مہربانی سے کسی انسان کو سمجھ یا فہم کے ذریعہ دے دے۔اس کی حدیث سے بھی تائید ہوتی ہے۔حضرت علیؓ سے کسی نے پوچھا تھا کہ کیا رسول اللہ ﷺ نے آپؓ کو کوئی خاص تعلیم بھی دی ہے۔انھوں نے کہا نہیں کوئی خاص تعلیم نہیں دی ہے۔کتاب اللہ، سنت رسولؐ اور یہ دستاویز جو میری تلوار کی نیام میں رکھی ہے یا پھر وہ فہم جو اللہ تعالیٰ اپنے کسی خاص بندے کو دے دے لہٰذا اللہ تعالیٰ کسی خاص بندے کو اگر خاص فہم دے جو اکثر دے دیتا ہے تو اس فہم سے اس بندہ کو ایک خاص علم حاصل ہوجاتا ہے، اس کو علم لدنی کہہ دیتے ہیں۔یہ خاص فہم اگر شریعت کے مطابق ہے تو اللہ کی طرف سے ہے، ورنہ محض انسان کے نفسانی خیالات یا ذہنی ژولیدگی کا نتیجہ ہے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: کیا عبد، صدیق، قطب، وحدت، غوث، قطب الاقطاب وابدال قرآن وسنت سے ثابت ہیں؟ قضاء وقدر کے فیصلوں کی تنفیذ سے ان کا کوئی تعلق ہے؟

جواب: جی نہیں! یہ اصطلاحات قرآن وسنت سے ثابت نہیں ہیں۔قضا اور قدر کی تنفیذ کا میرے خیال میں ان مناصب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔لیکن بہت سے حضرات نے یہ چیزیں بیان کی ہیں، خاص طور پر ابن عربی نے اس پر بہت بحث کی ہے اور تفصیل سے۔اور بڑی دلچسپ باتیں لکھی ہیں۔ان مباحث سے پتا چلتا ہے کہ ابن عربی کی نظر میں ایک روحانی hierarchy بھی موجود ہے۔یہ روحانی hierarchy ہی اللہ تعالیٰ کے احکام تکوینی پر عمل درآمد کراتی ہے۔میں نہیں جانتا

انھوں نے یہ بات کس بنیاد پر لکھی ہے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: احسان عمل کا نام ہے یا کیفیت کا؟

جواب: احسان عمل کا نام ہے اور کیفیت کا بھی۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: کیا انسان کسی ایسی روحانی معراج تک پہنچ سکتا ہے کہ جب چاہے رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرامؓ، یا متقین سے براہ راست رہنمائی لے لے؟

جواب: میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد آپ (ﷺ) سے براہ راست رہنمائی لینے کا اگر کوئی اہل تھا تو وہ صحابہ کرامؓ تھے۔ صحابہ کرامؓ بعض اوقات کسی مسئلے کے جواب میں سرگرداں رہتے تھے۔ ایک ایک ماہ تک بحث رہتی تھی، اور اس کے بعد اتفاق رائے سے مسئلہ حل کرتے تھے۔ اگر وہ براہ راست حضور ﷺ سے پوچھ سکتے تو صحابہ کرامؓ جا کر پوچھ لیا کرتے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کو یہ فیصلہ کرنے میں بہت عرصہ لگا کہ مجھے جنگ جمل میں جانا چاہئے یا نہیں؟ اس کے بعد وہ جنگ جمل میں شرکت کے لئے تشریف لے گئیں۔ اس کے بعد ان کو احساس ہوا کہ انھوں نے غلط کیا اس پر وہ توبہ بھی کیا کرتی تھیں۔ صدقہ بھی کیا کرتی تھیں، اپنے بھائی اور دوسرے رشتے داروں کو ڈانٹا بھی کرتی تھیں کہ مجھے روکا کیوں نہیں۔ اگر حضور ﷺ سے وہ پوچھ سکتیں تو یقیناً پوچھتیں۔ اس سے پتہ چلا کہ کوئی ایسا طریقہ نہیں ہے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: کیا روحانیت میں پیدائشی ولی یا نسبی بنیادوں پر تقویٰ کا کوئی تصور ہے؟

جواب: محض نسبی بنیاد پر ولایت یا تقویٰ کا اسلام میں کوئی تصور نہیں ہے۔ قرآن پاک میں انبیاء علیہم السلام کے مختلف رشتہ داروں کا ذکر کر کے ان کی مثالیں دے کر یہ بتایا گیا ہے کہ اپنے عمل سے ہی انسان اچھا یا برا ہوسکتا ہے۔ کسی کا نسب اس کو اچھا یا برا نہیں بنا سکتا۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ کسی کا نسب بھی اونچا ہو اور عمل بھی اچھا ہو تو ہوسکتا ہے اس کو زیادہ بڑا درجہ مل جائے۔ لیکن عمل کے بغیر نسب ہی سب کچھ کر لے یہ نہیں ہوسکتا۔ روحانیت میں پیدائشی ولی ہونے کی جہاں تک بات ہے، تو واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو پیدائشی ولی بنانا چاہے تو جب چاہے اور جس کو چاہے بنا سکتا ہے، یہ تو اس کی رحمت، قدرت اور مشیئت کی بات ہے۔ اس میں کیا رکاوٹ ہے۔ ہر انسان میں اچھائی اور برائی کا داعیہ اللہ نے رکھا ہے۔ اگر وہ کسی میں پیدائشی طور پر برائی کا کوئی داعیہ نہ رکھے یا کم رکھے تو میرا خیال ہے کہ ایسا ہونا اس کی سنت سے متعارض نہیں۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: شاہ ولی اللہ کی کتاب انفاس العارفین میں ایسے واقعات ہیں کہ جو شریعت کے اعتبار سے درست نہیں؟

جواب: میں نے انفاس العارفین آج سے 30 سال پہلے پڑھی تھی اور بالاستیعاب پڑھی تھی، مجھے کوئی ایسا واقعہ اس میں نہیں ملا جو شریعت سے متعارض ہو۔ کوئی متعین واقعہ آپ کے سامنے ہو تو بتائیے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: ایک حدیث میں بغیر بیعت کی موت کو جاہلیت کی موت کہا گیا ہے؟

جواب: وہ حدیثیں دو طرح کی ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جن میں اس طرح کے مضمون کا ذکر ہے کہ من لم یعرف امام زمانه فهو جاهل (جو امام زمانہ کو نہیں پہنچانتا وہ جاہل ہے)۔ یہ حدیث تو موضوع ہے۔ ایسی کوئی حدیث ثابت نہیں ہے۔ ایک حدیث وہ ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس کی گردن میں بیعت

نہ ہو اور وہ مر جائے تو وہ صحیح اسلامی موت نہیں ہوگی۔اس مضمون کی احادیث ثابت نہیں۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب مسلمانوں میں الجماعت کا تصور موجود تھا۔صحابہ کرامؓ اور تابعین میں بیعت کا نظام قائم تھا۔لوگ حضور ﷺ سے یا آپ کے صحابہ کرامؓ سے بیعت کیا کرتے تھے۔تابعین اور تبع تابعین کے بعد کے زمانے تک یہ سلسلہ رائج رہا۔اس زمانے میں جس نے بیعت نہیں کی اس نے غلطی کی۔لیکن آج چونکہ یہ نظام موجود نہیں ہے۔الجماعت بھی موجود نہیں ہے،کوئی ایک ایسا الامام بھی موجود نہیں ہے،اس لئے آج بیعت کرنا آپ کے اختیار میں ہے،آپ کا جی چاہے تو بیعت کریں۔جس کے ایمان،علم،عقل،تقویٰ اور اخلاص پر آپ کو اعتماد ہو اس کے ہاتھ پر بیعت توبہ یا بیعت جہاد کی جاسکتی ہے۔جس پر اعتماد نہ ہو یا جس کے علم و تقویٰ کے بارہ میں تامل ہو اس کی بیعت نہ کریں۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: آج کے مادہ پرستی کے دور میں جب خواہشات نفس انسان کو بار بار شر پر ابھارتی ہیں،تزکیے کے لئے مربیین کی ضرورت محسوس ہوتی ہے لیکن صحیح مربیین آج کے دور میں کہاں ہیں؟

جواب: یقیناً آج کے دور میں جعلی مربیین کی کثرت ہے۔اصلی اور مخلص مربیین بہت کم ہیں۔لیکن مولانا رومی نے ایک بات بڑی اچھی لکھی ہے۔انھوں نے لکھا ہے کہ جعلی مربی کا وجود اس بات کی دلیل ہے کہ اصلی مربی بھی کہیں نہ کہیں موجود ہے۔اس لئے کہ جعلی سکہ اسی بازار میں چلتا ہے جہاں اصلی سکہ بھی موجود ہو۔جہاں اصلی سکہ موجود نہ ہو وہاں جعلی سکہ چل ہی نہیں سکتا۔اس لئے جعلی سکے کی موجودگی اس بات کی دلیل ہے کہ اصل سکہ بھی موجود ہے۔آپ کی تلاش کی بات ہے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: آج کے نوجوانوں کے لئے تزکیہ واحسان کے حصول کے لئے کیا راہ عمل تجویز کریں گے؟

جواب: میں نے،آپ کو یاد ہوگا،تین طریقے بتائے تھے:ان تینوں طریقوں میں سے میں تو یہی تجویز کروں گا کہ قرآن کی تلاوت،سیرت کا مطالعہ اور عبادات کی پابندی کے ساتھ کبائر سے اجتناب ہی سے آج کے دور میں روحانی پاکیزگی حاصل کی جاسکتی ہے۔

سوال: آج کل یہ صورت حال بہت کثرت سے موجود ہے کہ ایک نوجوان بے مقصد زندگی سے اسلام کی طرف آتا ہے عبادات میں کثرت ہوجاتی ہے۔ہر عمل میں شریعت کا حکم تلاش کرتا ہے۔ظاہر و باطن پر توجہ دیتا ہے۔لیکن پھر کسی انتشار کا شکار ہوکر الحاد کے راستے پر نکل جاتا ہے؟

جواب: ایسا نوجوان تو بہت غنیمت ہے۔اس کے دین وایمان کا تحفظ ہماری اور آپ سب کی ذمہ داری ہے۔اگر کسی کے دل میں الجھنیں ہیں یا پریشان کن حالات ہیں تو ہم سب کو اس کا ہاتھ پکڑنا چاہئے،رہنمائی کرنی چاہئے اور ہم میں سے جس کے رابطہ میں کوئی ایسا نوجوان آئے اسے اپنے سے بڑے اہل علم کے سامنے پیش کرنا چاہئے تاکہ اگر اس کی کوئی الجھن ہو یا کوئی مسئلہ ہو تو وہ دور کرسکیں۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: تصوف شرعی سے کیا مراد ہے؟

جواب: تصوف شرعی سے مراد وہ تصوف ہے جو شریعت کے مطابق ہو،قرآن وسنت کے مطابق ہو،قرآن وسنت کے مستند اور معتمد شارحین کی تصریحات کے مطابق ہو۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: کیا یہ ممکن ہے کہ بندہ متصوف بھی ہو اور شریعت کے احکامات کی پابندی بھی کرے؟

جواب: بالکل ممکن ہے،نہ صرف ممکن ہے بلکہ لازمی اور ضروری ہے۔ماضی قریب ہی میں ایسے لاکھوں ہزاروں لوگ رہے ہیں۔جنھوں نے شریعت کی پابندی بھی کی اور تصوف کے طریقے پر بھی کاربند رہے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: آج کل جو ذکر کا طریقہ مختلف جگہ رائج ہے کہ اندھیرا کر کے اللہ ہو کی ضربیں دل پر لگانا، کیا یہ بھی آج کل کی ضرورت کے تحت ہے؟

جواب: یہ تو وہی بتا سکیں گے جو یہ کرا رہے ہیں۔ لیکن مجرد ذکر اچھی چیز ہے۔ قرآن وسنت میں اس کا حکم ہے۔ اجتماعی طور پر کرنا چاہئے یا انفرادی طور پر، اس کا شریعت نے کوئی حکم نہیں دیا۔ آپ انفرادی طور پر کریں یا اجتماعی طور پر کریں، شریعت میں دونوں کی گنجائش ہے۔ ضرب لگائیں، نہ لگائیں۔ اس پر مجھے ذاتی طور پر کبھی شرح صدر نہیں ہوا۔ لیکن ذکر فی نفسہ شریعت کا حکم ہے جس پر ہم سب کو عمل کرنا چاہئے۔ ضرب لگانا اور اجتماعی طور پر ذکر بالجہر کرنا میرے خیال میں شریعت کے مزاج اور صحابہ کرامؓ کے طریقہ کے مطابق نہیں ہے۔ لیکن جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ اس کو ایک علاج سمجھ کر کرتے ہیں، ان پر نکیر ہرگز نہ کریں۔ کیوں کہ یہ ایک اجتہادی معاملہ ہے اور میں اس گفتگو میں ایک مرتبہ پہلے کہہ چکا ہوں کہ اجتہادی یا اختلافی معاملے پر نکیر نہیں کرنی چاہئے۔ علمی طور پر آپ ان سے اختلاف کرنا چاہیں تو ضرور کریں۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: بعض معاصر لوگ تصوف کو بدعت کہتے ہیں اور اس پر شدید تنقید کرتے ہیں؟

جواب: جو حضرات رائج الوقت تصوف کو بدعت کہتے ہیں اور اس کے مختلف پہلوؤں پر تنقید کرتے ہیں وہ درست کہتے ہیں، اس لئے کہ تصوف کے نام پر اتنی خرافات رائج ہوگئی ہیں اور تصوف کے نام پر کاروبار کے ایسے ایسے تجارتی اڈے لوگوں نے بنا لیے ہیں، ایسے ایسے لوگ تصوف کے علمبردار بن گئے ہیں جن کی زندگی ایک شریف انسان کی زندگی بھی نہیں، ایک اچھے مسلمان کی زندگی تو دور کی بات ہے۔ اس لئے جن لوگوں نے تنقید کی ہے۔ میرے خیال میں وہ بے بنیاد نہیں ہے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: کیا شیخ سعدی متصوف تھے؟ وہ شہاب الدین سہروردی کے خلیفہ تھے یا نہیں تھے؟

جواب: یہ میرے علم میں نہیں ہے کہ شیخ سعدی شہاب الدین سہروردی کے خلیفہ تھے کہ نہیں تھے۔ متصوف ہونا ان کی کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے تذکرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک مرضی السیرت انسان تھے۔ دینی رجحانات رکھتے تھے، باکردار انسان تھے۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن میں نے ان کی زندگی کے بارے میں زیادہ نہیں پڑھا، تاہم ایک تصوف کے عالم کے طور پر ان کی شہرت نہیں ہے۔ ان کی شہرت ایک معلم اخلاق اور ایک ادیب اور ایک اچھے شاعر کے طور پر ہے۔ لیکن ان کی شاعری میں اچھے خیالات کا اظہار ہے۔ ان کی کتاب گلستان اچھے اخلاق سکھاتی ہے۔ اس لئے میرے خیال میں ان کا احترام کرنا چاہئے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: آپ نے "داتا" کا لفظ استعمال کیا۔ کیا یہ لفظ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مناسب نہیں، غیر اللہ پر اس کا اطلاق کیا درست ہے؟

جواب: داتا ایک لقب ہے جو شیخ علی ہجویری کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یہ جو القاب ہوتے ہیں اس میں لغوی معنی پر توجہ نہیں دی جاتی۔ لقب کا استعمال ادنیٰ مناسبت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس طرح کے القاب کے بارے میں بہت سے لوگوں کو غلط فہمی ہو جاتی ہے۔ بعض لوگوں پر توحید کا شدت سے غلبہ ہوتا ہے اور اس غلبہ توحید میں وہ اس طرح کی عام سی چیزوں پر بھی اعتراض جڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ داتا کا لفظ گنج بخش فیض کے معنی میں ہے۔ انہوں نے لوگوں کو فیض پہنچایا۔ اسی لئے داتا ان کا لقب ہے یعنی دینے والا۔ آخر ہم معطی کہتے ہیں، دینے والے کا لفظ بھی ہم استعمال کرتے ہیں۔ داتا لغوی معنی میں حقیقت کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ ہی ہے، لیکن داتا گنج بخش کا لقب داتا گنج بخش اس معنی کے اعتبار سے نہیں ہے۔ ایک ادنیٰ مناسبت کی وجہ سے لقب رکھ دیا جاتا ہے۔ امام اعظم کا لقب امام اعظم تھا۔ اب اگر کوئی موحد کھڑا ہو جائے یا کوئی شان رسالت کا علم بردار یہ اعتراض کرنے لگے کہ مسلمانوں کا امام اعظم تو رسول اللہ ﷺ کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ امام اعظم کہنا شرک فی النبوت ہے۔ یہ صحیح نہیں ہوگا۔ امام اعظم کو ایک خاص وجہ سے امام اعظم کہا جاتا ہے۔ قائد اعظم کو قائد اعظم ایک خاص مناسبت کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ وہ یہ لقب دینے والوں کی رائے میں اپنے زمانے کے سیاسی قائدین میں سب سے بڑے قائد تھے۔ امام اعظم اپنے زمانے کے ائمہ فقہ میں سب سے بڑے امام مانے گئے۔ اس لئے

امام اعظم کا لقب ان کے لئے استعمال کیا گیا۔اس لئے کسی لقب پر لغوی معنی کے اعتبار سے جب تک صراحتاً کوئی قابل اعتراض بات نہ ہو اعتراض نہیں کرنا چاہئے۔
(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: اسباب کو اختیار کرنے کے تین درجات دوبارہ بیان فرمادیں؟

جواب: میں نے عرض کیا تھا کہ توکل کے بارے میں تین قسم کی غلط فہمیاں لوگوں میں عام طور پر پائی جاتی ہیں۔ بالفاظ دیگر توکل کے بارہ میں تین تصورات پائے جاتے ہیں۔ایک تصور تو وہ ہے جو شریعت کے مطابق ہے۔جس کی قرآن پاک اور سنت میں تعلیم دی گئی ہے۔''اجملوافی الطلب'' فرمایا گیا کہ اسباب کو اختیار تو ضرور کرو، لیکن اسباب کو اختیار کرنے میں حد سے آگے نہ بڑھو۔ جائز اسباب اختیار کرو، شریعت کی حدود کے اندر رہ کر ان کو استعمال کرو اور نتیجے کو اللہ پر چھوڑ دو۔ یہ توکل کا مفہوم ہے جو قرآن مجید اور احادیث مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے۔صحابہؓ اور تابعینؒ نے اسی توکل کو اختیار کیا۔انبیاء نے بھی یہی توکل اختیار کیا۔اسباب کے بارے میں دوسرا رویہ یہ ہے جو ایک انتہا پر ہے کہ اسباب ہی کو سب کچھ سمجھ لیا جائے۔اسباب ہی کی فراہمی میں زندگی کی ساری توانائیاں لگادی جائیں، شب و روز انسان اسباب ہی کی فکر میں گھلتا چلا جائے۔اور اسباب ہی کو نتیجے کا اصل سبب قرار دیا جائے۔ یہ رویہ بھی درست نہیں ہے۔ایک اور رویہ بالکل دوسری انتہا پر ہے: سرے سے اسباب کو نظر انداز کیا جائے اور اسباب کو بالکل چھوڑ کر براہ راست نتیجے کی اللہ تعالیٰ سے امید لگالی جائے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عمومی سنت اور مشیت کے خلاف ہے۔اسباب کے بارے میں جو تعلیم شریعت نے دی ہے یہ رویہ اس کے مطابق نہیں ہے۔اگر ایسا ہوا کرتا تو انبیاءؑ کو اور صحابہ کرامؓ کو میدان جنگ میں جانے کی اور بہت سی قربانیاں دینے کی اور بے شمار پریشانیاں اٹھانے کی ضرورت نہ ہوتی۔اللہ تعالیٰ براہ راست دین کو قائم کردیتا، براہ راست دشمنوں کی فوجوں کے چھکے چھوٹ جایا کرتے۔ براہ راست سب کچھ ہو جایا کرتا۔ یہ جو صحابہ کرامؓ شہید ہوئے، انبیاء کو آروں سے چیرا گیا، انبیاء کو قید کیا گیا۔ یہ سارے اسباب اختیار کرنے کے نتائج تھے۔
(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: میرا سوال تصوف کے بارے میں یہ تھا کہ آپ نے بھی جیسا کہ اپنی گفتگو میں فرمایا کہ تصوف اس وقت ایک ایسی "Complex Situation" میں چلا گیا ہے کہ اس کو بیان کرنے کے لئے بہت علمی اور بہت اونچے فکری معیار کی ضرورت ہے اور اس درجے کے ہمیں مربیین کی ضرورت ہے کہ جو یقیناً ناپید ہیں یا بہت کم ہیں۔اس صورت حال میں آپ ذاتی طور پر کیا سمجھتے ہیں کہ شاہ ولی اللہؒ نے حضرت مجدد الف ثانیؒ نے بھی اس سلسلے کو جاری رکھا۔اس پر مولانا مودودی نے ''تجدید و احیائے دین'' میں اپنی ذاتی رائے یہ دی ہے کہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر وہ ایسا نہ کرتے، اس سلسلے کو جاری وساری نہ رکھتے تو زیادہ اچھا ہوتا کہ ہم مزید برائیوں سے بچ جاتے۔اس وقت جو سب سے۔اگر محتاط الفاظ میں کہوں۔ظالم اور جابر ہمارے ملک میں ہوتا ہے وہ یا پیر ہوتا ہے مخدوم ہوتا ہے یا پھر اسی طرح کی کچھ اصطلاحات اس کے نام کے ساتھ لگی ہوتی ہیں۔ پہلے دور میں لوگوں کا بیعت کا معیار بہتر تھا وہ خود تجزیہ کر کے اچھے برے میں فرق کر سکتے تھے۔اب ہر شخص کو جب آپ تجزیہ کا اختیار دیں گے تو وہ اپنے لئے کیسے صحیح راستہ اختیار کر سکے گا؟

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ تصوف کے نام پر یقیناً انحرافات پیدا ہوئے اور ایسے خیالات اور خرافات لوگ تصوف کے نام پر بیان کرنے لگے ہیں جو دراصل تزکیہ و احسان کے لئے لازمی اور ضروری نہیں تھے۔جیسا کہ میں نے عرض کیا باطنیوں میں سے کچھ لوگ تصوف کے نام پر سامنے آئے۔جنھوں نے غلط عقائد صوفیاء سے منسوب کردیے۔ان کی کتابوں میں الحاقات ہوئے اور ایسی مثالیں درجنوں ہیں کہ بڑے بڑے صوفیاء کی کتابوں میں الحاقات کیے گئے ہیں اور ان کو باطنی نقطہ نظر کے قریب لانے کی کوشش کی گئی۔اس لئے جن حضرات نے تصوف پر تنقید کی ہے انھوں نے انہی اسباب کو سامنے رکھ کر تنقید کی ہے۔ان حضرات کی تنقید بڑی وزنی ہے اور اس کی مستحق ہے کہ اس پر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔اور یہ طے کیا جائے کہ تزکیہ و احسان کے مقاصد کو آج کے دور میں حاصل کرنے کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ایک زمانہ تھا۔جو صدر اسلام کا زمانہ نہیں تھا، لیکن بعد میں چوتھی یا پانچویں صدی ہجری میں یا چھٹی صدی ہجری میں۔ جب یہ صوفیانہ سلسلے وجود میں آئے۔ان صوفیانہ سلسلوں میں بعض نے بڑی بڑی مفید خدمات سرانجام دیں۔اپنے اپنے علاقوں میں ان کے اثرات بہت مفید اور گہرے ہوئے۔انھوں نے امت مسلمہ کو ایک مرکز پر جمع رکھا۔پھر وقت کے ساتھ ان کی گرفت کمزور ہوتی گئی اور ان کے جانشین عموماً محض ایک روایت کے ترجمان یا نمائندہ بن کر رہ گئے۔جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ جب کوئی

ادارہ بنتا ہے تو ادارے میں کچھ اسباب اور وسائل بھی اختیار کیے جاتے ہیں۔ بعد میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ وسائل مقاصد کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اور مقاصد نظر انداز ہو جاتے ہیں۔ یہ بات جہاں اور بہت سے میدانوں میں ہوئی تصوف کے میدان میں بھی ہوئی۔ تصوف میں ایسے طریقے یا اعمال جن کی حیثیت دراصل تدبیر یا وسیلے کی تھی وہ اصل مقاصد بن گئے اور جو اصل مقاصد تھے وہ نظر انداز ہو گئے۔ آج کے اہل علم وتقویٰ کے لئے یہ بات غور کرنے کی ہے کہ آج تزکیہ و احسان کے مقاصد کو کیسے حاصل کیا جائے۔ اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آپ براہ راست قرآن مجید اور سنت سے اپنے آپ کو وابستہ کر لیں۔ آپ قرآن پاک کی تلاوت کریں، مطالعہ کریں اور ایسے حضرات جن کے دین وتقویٰ اور علم وعقل پر آپ کو اعتماد ہو تو ان کی کتابیں، ان کا تذکرہ، ان کی سوانح عمری مطالعہ میں رکھیں تو اس سے خود بخود نیکی کا، تقویٰ اور صلاح کا ایک رجحان پیدا ہوتا ہے۔ اللہ کی کتاب خود رہنمائی فراہم کرتی ہے اور آپ خود بخود اس راستے پر چل پڑتے ہیں۔ اگر صاحب علم و تقویٰ لوگ موجود نہ ہوں تو براہ راست قرآن سے رجوع کریں اس لئے کہ جس قرآن نے پہلے اتنی بڑی تعداد میں اصحاب تقویٰ اور ارباب تزکیہ واحسان پیدا کیے ہیں وہ آج کیوں پیدا نہیں کر سکتا؟ یقیناً وہ آج بھی پیدا کر سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بغیر کسی صاحب احسان کی تربیت کے آپ براہ راست قرآن کی تربیت سے اس منزل تک پہنچ جائیں۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: آج کا آپ کا لیکچر بلاشبہ ایک مشکل موضوع پر تھا اور جس طرح گزشتہ لیکچرز میں آپ نے انصاف کیا ہے آج بھی آپ نے انصاف کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ صرف ایک مختصر سی بات کروں گا۔ اگر اس میں کوئی سوال پیدا ہوتا ہے یا تبصرے کی گنجائش پیدا ہوتی ہے تو مجھے خوشی ہوگی۔ آپ نے فرمایا تھا اور درست فرمایا تھا کہ یہودیوں نے ظاہریت پر بڑا زور دیا اور اس بارے میں وہ بڑا متشددانہ رویہ رکھتے تھے۔ عیسائیت نے اس ضمن میں آپ نے پال کا نام لیا، وہ بھی آپ نے درست نام لیا، لیکن میرے خیال میں بائبل "New Testament" میں میتھیو اور مارکس نے خود بخود جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے یہ قول منسوب کر رکھا ہے کہ جب حضرت یحییٰ علیہ السلام کے پیروکاران کے پاس آئے اور انھوں نے ان کے روبرو یہ سوال اٹھایا کہ آپ اور آپ کے جو ساتھی آئے ہیں وہ روزہ نہیں رکھتے۔ اس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ جواب دیا کہ جب تک آپ کے درمیان ایک دولہا ہے (انگریزی ترجمہ میں Bridegrooms) اس وقت تک خوشیاں ہیں، بے فکری ہے۔ جب دولہا چلا جائے گا اس کے بعد روزہ رکھنا شروع کر دیں گے۔ ظاہر ہے یہ بھی کوئی الحاق یا تحریف ہے۔ ایک پیغمبر کی زبان سے یہ بات نہیں آ سکتی۔ لیکن جہاں تک بائبل ہے اس میں خود اس قسم کے اشارے ملتے ہیں۔ آپ نے تزکیہ اور احسان کو بیان کرتے ہوئے بالخصوص حدیث جبریلؑ کے حوالے سے جو بات کہی ہے وہ بھی درست ہے، اور تصوف کے ساتھ اس کو ملا کر میرے خیال میں آپ نے اس کو ضرورت سے کچھ زیادہ وسعت دے دی ہے۔ اس میں جس احسان کا ذکر ہے وہ ترک دنیا نہیں ہے، بلکہ وہ دنیا کو قبول کر کے اس کی اصلاح کرنے کا نام ہے۔ تزکیہ یا احسان اتنی بھی صفائی کا تقاضا نہیں کرتا کہ آپ دنیا کے بارے میں جو رجحانات ہیں وہ نظر انداز کر دیں۔ اور تہذیبوں کی تعمیر کا کام بھی اس صفائی کے ساتھ نکل جائے۔ اس کی بھی ایک حد ہی ہے۔

آپ نے فرمایا کہ تصوف ایک ردعمل تھا، اور جو بھی ردعمل ہوگا اس میں افراط وتفریط تو ہوتی ہے خود آپ نے بھی اشارہ کیا ہے کہ وہ ''صوف'' پہنتے تھے اور ان کا کھانا پینا ان کے حلیے بالکل ظاہردار یا مادہ پرستوں سے جدا تھے۔ تو ان میں تو لازمی طور پر ایک رجحان ترک دنیا کا نظر آتا ہے۔ خود تصوف میں بھی جو دو مدارس فکر تھے، ایک خراسانی اور دوسرا بغدادی، ان دونوں میں زندگی سے فرار جیسی کیفیت تھی۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ شاید انسان کی نجات ترک دنیا میں زیادہ ہے۔ فنا کی جو آپ نے تعریف کی وہ اچھی تھی، لیکن فنا کو اگر بقاء کے ساتھ وابستہ کر کے آپ اس کی تعریف کا تعین کریں گے تو میرا خیال ہے کچھ تھوڑا سا وہی معنی نکلے گا جس کی آپ مزمت کر رہے تھے۔ اس طرح تصوف میں بہت سارے نظریات ہیں جو اہل تصوف کے بنیادی نظریات ہیں۔ یہاں تک کہ شاہ ولی اللہؒ نے بھی ان کا ذکر کیا ہے ان کی کتاب جو وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے درمیان فیصلہ کے بارہ میں ہے اس میں بھی انہوں نے ذکر کیا ہوا ہے۔ خود مجدد الف ثانی نے بھی ان سارے مراحل سے گزر کر تسلیم کیا کہ مقام عبدیت کو میں نے سب سے بہتر پایا۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ وحدت الوجود، وحدت الشہود، تصور شیخ، علم لدنی یہ سب کیا ہے؟ اس نے تو اتنا نقصان مسلمانوں کو میرے خیال میں پہنچانا ہے کہ اگر مسلمانوں کے زوال کے بارے میں کوئی تحقیق کرے تو ثابت ہوگا کہ غالباً تصوف کا اس زوال میں بڑا ہاتھ ہے۔ اس سے لازماً وہ منفی تصوف مراد ہے جس کا آپ نے ذکر ہے۔ لیکن یہ اس کا لازمی نتیجہ تھا جو ہونا تھا۔ مثلاً صوفی لٹریچر میں جگہ جگہ آپ کو یہ باتیں ملیں گی کہ ''علم درسی نہ بود علم

سینا بود'' خود مولانا رومؒ نے کہا ہے، جن کا ذکر آپ نے بھی کیا ہے کہ ''علم حق در علم صوفی گم شدہ'' کہ علم حق جو ہے وہ صوفی کے علم میں ختم ہو گیا۔ تو علم حق تو شریعت ہی ہے تو اس قسم کی باتیں ہیں اس نے مسلمانوں کو اپنے علوم سے علیحدہ کر دیا اور میرا خیال ہے کہ وہ جو ہمارے ہاں تہذیبی انحطاط آیا ہے اس میں تصوف کا بڑا ہاتھ تھا۔

جواب: جہاں تک اس بات کا تعلق ہے سینٹ پال سے پہلے بائیبل میں یہ چیز موجود ہے۔ اس سے میں تھوڑا اختلاف کروں گا۔ تاریخی طور پر سینٹ پال پہلے سامنے آئے اور موجودہ چار انجیلیں بعد میں سامنے آئیں۔ اس لئے درحقیقت جو بات سینٹ پال نے کہی تھی وہی بات بعد میں ان چار انجیلوں میں ظاہر ہوئی جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے 104 یا 105 سال بعد سامنے آئے۔ اس لئے قانون تورات کو منسوخ کرنے کی اصل ذمہ داری موجودہ چار انجیلوں پر نہیں، بلکہ اس سے پہلے سینٹ پال پر عائد ہوتی ہے۔ سینٹ پال ہی کے خیالات سے متاثر ہو کر جن حضرات نے انجیلیں لکھیں انھوں نے وہ خیالات بھی اس میں بیان کر دیے۔ لیکن سینٹ پال پہلے ہوں یا یہ چار انجیلیں پہلے ہوں، یہ تو محض ایک ضمنی چیز ہے۔ جو بات میں کہنا چاہتا تھا وہ یہ تھی کہ عیسائیت میں روز اول ہی سے قانون اور شریعت کے ظاہری پہلو کو بہت کم اہمیت دی گئی، بلکہ بڑی حد تک نظر انداز کر دیا گیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو توازن مطلوب تھا، جس کی قرآن مجید نے دعوت دی ہے، وہ نہ یہودیوں میں تھا اور نہ عیسائیوں میں۔ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ سینٹ پال پہلے تھے یا وہ انجیلیں پہلے تھیں۔

رہی آپ کی یہ بات کہ تصوف کی ایک غلط اور زوال پذیر دور کی تعبیر نے مسلمانوں کو نقصان پہنچایا۔ اس سے کوئی اختلاف نہیں کر سکتا۔ یقیناً تصوف میں زوال آیا۔ یہ زوال فقہ میں بھی آیا۔ اس نے بھی مسلمانوں کو نقصان پہنچایا۔ وہ زوال جو تقلید کے نام پر متاخرین میں آیا وہ بھی مسلمانوں کی پریشانیوں کا بہت بڑا سبب ہے۔ پچھلے دنوں مجھے ترکی کے بارے میں کچھ کتابیں پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ خاص طور پر دو تین کتابیں مشہور ہیں۔ ایک نیازی برکس کی ہے، ایک برنا ڈلیوس کی ہے۔ دونوں کتابیں بڑی کلاسک حیثیت رکھتی ہیں۔ ایک دو اور کتابیں میں نے دیکھیں۔ مجھے پہلے سے یہ خیال تھا اور اب ترکی کی تاریخ پر از سر نو نظر ڈالنے کے بعد بہت شدت سے احساس ہوا کہ ہمارے متاخر فقہائے اسلام کی ایک بڑی تعداد کی مقلدانہ ذہنیت نے اور تقلید پرستانہ انداز پر زور دینے کے رویہ نے ترکی میں سیکولرازم کا راستہ ہموار کیا۔ اور سلطنت عثمانیہ کے زوال میں اگر براہ راست نہیں تو بالواسطہ وہ ضرور ذریعہ بنے۔ اس لئے جہاں بھی فکری زوال اور عقلی انحطاط آئے گا وہاں انحطاط پذیر خیالات بھی آئیں گے۔ وہ تصوف میں آئے ہوں، فقہ میں آئے، ہوں، وہ تفسیر کے نام سے آئے ہوں نتیجہ سب جگہ ایک ہی نکلے گا۔ ایک زمانہ تھا کہ تفسیر قرآن پاک کو ایک زندہ اور حویت (Dymanism) سے بھرپور زندہ کتاب کے طور پر مسلمانوں کے دلوں میں اتارتی تھی، ان کے رگ و پے کا حصہ بناتی تھی۔ اس کے برعکس اگر آپ نویں، دسویں، گیارہویں، بارہویں صدی ہجری کی تفسیر دیکھیں تو ان میں سے متعدد تفسیروں میں اس طرح کے از کار رفتہ مسائل آپ کو کثرت سے ملیں گے جن کا کوئی تعلق عملی زندگی سے نہیں ہے۔ ایسے سوالات جو کبھی بھی مسلمانوں کے لئے عملی سوالات نہیں رہے، ان مسائل کا نام تفسیر رکھ دیا۔ ظاہر ہے کہ ان تفسیروں کو پڑھ کر نہ قرآن پر ایمان پختہ ہوتا ہے نہ قرآن کی گہرائیوں میں اترنا نصیب ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے بہت خوب کہا ہے کہ

علاج ضعفِ یقیں ان سے ہو نہیں سکتا
غریب اگرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق

دور متاخر کے مسلمان مفسرین میں اس طرح کے دقیق نکتے تو بہت پیدا ہوئے، لیکن اس سے ضعفِ یقیں کا علاج نہیں ہو سکا۔ اس لئے یہ بات میں محض تصوف تک محدود نہیں رکھتا، بلکہ مسلمانوں کی ساری علمی روایت کو دسویں صدی ہجری کے بعد سے ایک زوال و انحطاط سے واسطہ پڑا، اور بعد کے مزید تین سو سال میں وہ زوال اپنی انتہا تک پہنچ گیا۔ مزید برآں جلتی پر تیل ڈالنے کا کام مغرب کی اس ''ترقی'' نے انجام دے دیا۔ ایک طرف مغرب میں تیزی سے علم و فن کی ترقی ہو رہی تھی۔ دوسری طرف مسلمان زوال کا شکار ہو رہے تھے۔ اس کیفیت نے زمین آسمان کا فرق پیدا کر دیا اور مسلمانوں کا زوال کھل کر سامنے آ گیا۔ اس زوال و انحطاط کو صرف تصوف تک محدود کرنا میرے خیال میں درست نہیں ہے۔ یہ مسلمانوں کی پوری علمی تاریخ کی ناکامی ہے۔ یہ کسی ایک علم یا فن کی ناکامی نہیں، پوری روایت کی ناکامی ہے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: باطنیت کے حوالے سے جو بات آپ نے کہی تھی اس میں خود تصوف کے جو بڑے لوگ ہیں وہ بھی شامل ہیں۔ ان کی تحریروں میں اس کے کچھ جراثیم ملتے ہیں۔ مثلاً امام جعفرؒ کا یہ کہنا تھا کہ قرآن کے ہر لفظ یا سطر میں چار سطحیں ہیں۔ جن کے بارہ انھوں نے کہا تھا کہ عبارہ، اشارہ، لطیفہ اور حقیقت۔ اسی طرح مقاتل ابن

سلیمانؒ کا کہنا یہ تھا کہ قرآن میں ایک مفہوم تاریخی ہے، ایک مجازی ہے، ایک حقیقی ہے۔تو اس میں باطنیت پیدا ہوجاتی ہے۔یعنی الفاظ کے پیچھے ایک باطن ہے جس کا صرف ایک صاحب باطن کو ہی علم ہے، عام انسانوں کو نہیں ہے۔اسی طرح علم لدنی بھی خود باطنیت کی طرف جاتا ہے۔اگر میں یہ اصرار کروں کہ مجھے قرآن کی آیات کی ایک خاص مطلب معلوم ہے۔جو پچھلے پندرہ سو سال کسی کو پتا نہیں تھا تو میں باطنیت کی طرف جارہا ہوں۔

جواب: جہاں تک امام جعفر صادقؒ کا تعلق ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ جو چیزیں ان سے منسوب ہیں وہ سب سو فیصد درست ہیں۔امام جعفر صادقؒ نے خود کوئی کتاب تحریر نہیں فرمائی، انھوں نے کوئی چیز املاء نہیں کی، ان کے کسی براہ راست شاگرد نے کوئی کتاب نہیں لکھی، ان سے جو بھی اقوال منسوب ہیں وہ بہت بعد کے لوگوں نے ان سے منسوب کیے ہیں۔خاص طور پر جو اقوال باطنیت کے رجحانات رکھتے ہیں تو وہ بہت بعد میں باطنی اہل قلم نے خاص طور پر اسماعیلی اہل قلم نے ان سے منسوب کیے ہیں۔اس لئے ان بیانات کے امام جعفر صادقؒ کے اقوال ہونے میں مجھے شدید تأمل ہے۔میرے خیال میں یہ امام جعفر صادقؒ کے اقوال نہیں ہیں۔یہی بات مقاتل بن سلیمان کے بارہ میں کہی جاسکتی ہے۔یہاں یہ بھی ذہن میں رہنا چاہئے کہ مقاتل بن سلیمان کا شمار بہت سے جید اہل علم کے نزدیک مستند لوگوں میں نہیں تھا۔

لیکن جو دوسرے حضرات ہیں انھوں نے یقیناً بعض ایسے مسائل اٹھائے ہیں جن کا بعد کے لوگوں نے غلط استعمال کیا۔اور غلط استعمال ہر چیز کا ہوسکتا ہے۔اچھی چیز کا بھی غلط استعمال ہوسکتا ہے اور غلط چیز کا تو غلط استعمال ہوتا ہی ہے۔میرے خیال میں مقاتل ابن سلیمان کی تفسیر میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کا کوئی ایسا مفہوم لیا جاسکتا جو قرآن وسنت کے خلاف ہو۔

علم لدنی کا مفہوم جو اکابر صوفیاء کے ہاں مشہور ہے وہ یہی ہے کہ ایک فہم خاص جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہو، بشرطیکہ وہ قرآن وسنت کی حدود کے مطابق ہو۔کوئی ایسی فہم جو قرآن وسنت کی نفی کردے وہ زندقہ ہے اور قابل قبول نہیں ہے۔واقعہ یہ ہے کہ ایسے انسان ہر دور میں موجود ہوتے ہیں، آپ نے بھی دیکھے ہوں گے، میں نے بھی دیکھے ہیں، جو عام انسانوں سے بڑھ کر فہم وبصیرت رکھتے ہیں اور وہ فہم وبصیرت ظاہری اسباب کی محتاج یا مرہون منت نہیں ہوتی۔جو اسباب مجھے اور آپ کو حاصل ہیں وہی ان کو بھی حاصل ہوتے ہیں۔میں اور آپ ایک درس گاہ میں داخل ہوتے ہیں۔ہمارے ساتھ دس طلباء اور ہیں۔ہم سب وہی تعلیم پاتے ہیں۔وہی کتاب وہی استاد، سب کچھ وہی ہوتا۔ان سب طلبہ میں سے ایک بہت نمایاں ہوکہ صفِ اول کا مفکر بن جاتا ہے، وہ اکنامکس پڑھ کر ڈاکٹر محبوب الحق بن جاتا ہے۔باقی لوگ نہیں بن پاتے تو کیوں نہیں بن پاتے۔صرف اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کوئی خاص بصیرت دی تھی، کوئی خاص عقل دی تھی، کوئی خاص ذوق وشوق اور ملکہ دیا تھا۔اسی کو علم لدنی کہتے ہیں۔اگر یہ خصوصی فہم وبصیرت دینی معاملات میں ہو تو اس کی پرکھ کا واحد ذریعہ قرآن مجید اور سنت رسولؐ ہے۔اگر یہ بصیرت دنیاوی معاملات میں ہو تو انسانی عقل اور تجربہ اس کی پرکھ ہے۔اگر یہ بصیرت انسانی عقل اور تجربے کے خلاف ہے، یا قرآن وسنت کے خلاف ہے تو دونوں صورتوں میں استرداد کے قابل ہے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: تصوف تقرب الی اللہ کا نام ہے۔سوال یہ ہے کہ اس تقرب کی حدود کیا ہیں؟ کیا ”انا الحق“ اور ”ما فی جبتی سوی اللہ“ جیسے دعوے خلاف اسلام نہیں ہیں؟ آپ نے دیگر صوفیاء کا ذکر کیا، لیکن عوام میں مشہور دو نام حلاج اور منصور کا ذکر نہیں فرمایا۔اور تقرب اور وحدالوجود میں فرق واضح ہوجائے تو سامعین کے لئے مفید ہوگا۔

جواب: آپ کا یہ سوال تو ایک سلسلہ سوالات ہے۔ان کا جواب اختصار کے ساتھ یہ ہے کہ تقرب کی حدود وہی ہیں جو شریعت میں بیان ہوئی ہیں۔تقرب کی معراج یہ ہے کہ انسان کو درجہ احسان حاصل ہوجائے اور یہ یقین حاصل ہوجائے کہ وہ براہ راست اللہ تعالیٰ کی نظروں میں ہے۔اللہ تعالیٰ کے حضور اس حضوری کا جو احساس اور شعور ہے۔وہ یقین اور فطرت ثانیہ کے درجے تک پہنچ جائے یہی تقرب ہے۔

”انا الحق“ اور ”ما فی جبتی سوی اللہ“ جیسے دعوے بلاشک وشبہ شریعت سے متعارض ہیں۔ان کے شریعت سے متعارض ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔جن حضرات نے یہ دعوے کئے ہیں، یا جن سے منسوب ہیں، ان کے بارے میں مسلمانوں میں دو نقطہ نظر رہے ہیں۔ایک نقطہ نظر اس دعوے کی تاویل کا ہے کہ ان دعوؤں اور بیانات کی کچھ ایسی تاویل کی جائے کہ یہ شریعت سے متعارض نہ رہیں۔

دوسرا نقطہ نظر وہ ہے جو ان کے معاصر علماء کا تھا۔ آپ نے منصور اور حلاج دو نام لئے ہیں۔ یہ دو نام نہیں ہیں۔ یہ ایک ہی شخص کا نام ہے: حسین ابن منصور حلاج پورا نام یہ تھا۔ یہ بغداد میں ایک شخص تھا۔ میرے مطالعہ کی رو سے یہ ایک گمراہ، زندیق اور ملحد شخص تھا۔ اس دور کے علماء کرام نے اس کے بارے میں یہی فیصلہ کیا تھا۔ اپنے دور کے سب سے بڑے مفسر، سب سے بڑے محدث اور مستند ترین مؤرخ علامہ حافظ ابن کثیر نے البدایہ النہایہ میں حسین بن منصور کو بہت بڑا زندیق قرار دیا ہے اور اس کے قتل کیے جانے پر تشکر کے الفاظ انھوں نے اپنی تاریخ میں لکھے ہیں۔ میں تو منصور کے بارے میں حافظ ابن کثیر دمشقیؒ کی رائے کا قائل ہوں۔ اس زمانے کے جتنے معاصر تذکرے ہیں وہ سب اس شخص کو ملحد اور زندیق اور باطنی قرار دیتے ہیں۔ بعد میں باطنی شعراء کی وجہ سے اس کی شہرت نیک نامی کے انداز کی ہونے لگی۔ اور بہت سے حضرات نے اس کے اقوال کی تاویل کرنا چاہی۔ انا الحق کی تاویل اگر کر بھی لی جائے تو منصور کے بہت سے ایسے اقوال اور اعمال معاصر تاریخوں میں موجود ہیں جن کی کوئی مثبت تاویل نہیں کی جاسکتی۔ ان بیانات کو شریعت کے مطابق قرار دینا بڑی دشوار بات ہے۔

لیکن ایسے بزرگ خاص طور پر شیخ بایزید بسطامیؒ یا اور بہت سے دوسرے حضرات جو ہر اعتبار سے متبع سنت اور مرضی السیرت بزرگ تھے، جن کے معاصر تذکرہ نویس ان کے تقویٰ اور اخلاص کی گواہی دیتے ہیں، ان سے اگر اس طرح کے اقوال مروی ہوں تو ان کی بلاشبہ تاویل ہونی چاہیے اور درست تاویل کی جانی چاہیے۔ ان حضرات کے اقوال کی ایک تاویل یا توجیہ تو وہ ہے کہ جو حضرت مجدد الف ثانیؒ نے کی ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ بعض اوقات ان بزرگوں کے شدت احساس کی وجہ سے ان پر ایک عالم وارفتگی طاری ہو جاتا ہے۔ اس کیفیت میں ان کی زبان سے بے ساختہ الفاظ نکل جاتے ہیں جو بظاہر ان کے عام عقیدہ اور خیالات سے متعارض ہوتے ہیں۔ شیخ بایزید بسطامیؒ سے منصوب عبارتوں کی بھی انہوں نے یہی تاویل کی ہے۔ شدت احساس کی وجہ سے کبھی کبھی اللہ کے حضور حضوری کا احساس ان کے ہاں اتنا شدید ہو جاتا تھا کہ ان کو یہ محسوس ہونے لگتا تھا کہ کائنات میں کچھ نہیں ہے اور صرف اللہ ہی کا وجود ہے۔ اسی شدت احساس کی وجہ سے ان کی زبان سے اس طرح کے الفاظ نکل گئے۔ جو اپنے ظاہری مفہوم میں نہیں لئے جانے چاہیں۔

وحدت الوجود اور تقرب دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ وحدت الوجود کوئی عقیدے کا مسئلہ نہیں، نہ شریعت کا مسئلہ ہے۔ عقیدہ اور شریعت کا مسئلہ توحید کا مسئلہ ہے جس کی ضد شرک ہے۔ وحدت فلسفہ کا مسئلہ ہے جس کی ضد کثرت ہے۔ جب تصوف میں فلسفیانہ عناصر شامل ہونے لگے، اور یہ سلسلہ ساتویں آٹھویں صدی ہجری سے شروع ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے بھی کبھی کبھی ایسا ہو جاتا تھا، اس وقت سے بہت سے ایسے مباحث تصوف کی کتابوں میں آگئے جو نہ عقیدے کا مسئلہ تھے، نہ طریقت کا مسئلہ تھے، نہ تقرب الی اللہ سے ان کا کوئی تعلق تھا۔ وہ فلسفہ کے مسائل تھے۔ جو مثلاً وحدت الوجود اور اس طرح کے مباحث کی صورت میں سامنے آئے۔

یہ مباحث تصوف میں بیان کرنے میں سب سے نمایاں کردار شیخ محی الدین ابن عربی کا ہے۔ جو شیخ اکبر کے نام سے مشہور ہیں۔ شیخ اکبر کے بارے میں بھی دو نقطہ نظر امت میں پائے جاتے ہیں۔ ایک شدید نقطہ نظر علامہ ابن تیمیہؒ کا ہے جو ان کو دائرہ اسلام سے قریب قریب خارج ہی سمجھتے ہیں۔ دوسرا نقطہ نظر ان کے متبعین کا ہے جو ان کو شیخ اکبر اور خاتم الاولیاء اور سب سے بڑا ولی کہتے ہیں۔ ایک معتدل اور درمیانہ نقطہ نظر شیخ احمد سرہندیؒ کا ہے۔ جو کہتے ہیں کہ میں ان کا احترام کرتا ہوں، لیکن میں ان کی رائے سے اختلاف کرتا ہوں۔ ایک جگہ انھوں نے بہت زبردست بات کہی ہے جو ان کے مکتوبات میں بھی موجود ہے۔ کسی مرید نے ان کو خط لکھا اور شیخ محی الدین ابن عربی کے متبعین میں سے کسی بزرگ کا کوئی قول نقل کیا جو بظاہر شریعت سے متعارض معلوم ہوتا تھا۔ اس کے جواب میں حضرت مجدد نے فارسی میں لکھا کہ ''فقیر را اصلاً تاب استماع این سخناں نیست، بے اختیار رگِ فاروقیم بحرکت آمد''۔ فقیر کو اس طرح کی باتیں سننے کی تاب نہیں ہے۔ آپ کا خط پڑھتے ہی میری رگ فاروقیت بے اختیار حرکت میں آگئی۔ پھر آگے انھوں نے لکھا کہ مارا کلام محمدؐ عربی درکار است نہ کلام ابن عرب: (ترجمہ) ہمیں محمدؐ عربی کا کلام درکار ہے ابن عربی کا کلام درکار نہیں ہے۔ مارا بنص کار ست، نہ بفص، ہمیں نص قرآنی سے بحث ہے، فص یعنی فصوص الحکم (ان کی مشہور کتاب) سے بحث نہیں ہے۔ وفتوحات مدینہ مارا از فتوحات مکیہ مستغنی ساختہ۔ یعنی فتوحات مدینہ یعنی حضورﷺ کی فتوحات (احادیث اور شریعت) نے ہمیں فتوحات مکیہ سے (جو ابن عربی کی کتاب ہے) مستغنی کر دیا ہے۔

میرے خیال میں یہ نقطہ نظر سب سے معتدل ہے۔ شیخ محی الدین ابن عربی کے اصل خیالات کیا تھے؟ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ ان کی کتاب فتوحات مکیہ آج سے کافی عرصہ پہلے میں نے پڑھی تھی۔ میں اپنا ذاتی تجربہ بتا رہا ہوں۔ فتوحات مکیہ جب میں نے پہلی مرتبہ پڑھی۔ آج سے کوئی تیس سال پہلے، تو کچھ حصے اس کے سمجھ آئے اور کچھ حصے سمجھ میں نہیں آئے۔ لیکن میرا تاثر یہ تھا کہ یا تو یہ شخص بہت اونچے درجے کا عبقری اور جینیئس تھا۔ اتنا بڑا جینیئس کہ اس سے بڑا Genius انسانوں میں کوئی

پیدا نہیں ہوا۔ یا پھر بہت ژولیدہ فکر انسان تھا جس سے بڑا ژولیدہ فکر مسلمانوں میں پیدا نہیں ہوا۔

پھر اتفاق سے ۱۹۸۶ء میں آج سے ۲۱ سال پہلے مجھے شام جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں دمشق میں ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی جن کا نام محمد محمود غراب تھا۔ ان کے بارے میں بتایا گیا کہ اس وقت شیخ محی الدین ابن عربی کے علوم کے سب سے بڑے ماہر دنیا میں یہ ہیں۔ جب میں ان سے ملنے گیا تو ان سے گفتگو کے دوران پتا چلا کہ فتوحات مکیہ کے جو نسخے اس وقت مروج رہے ہیں اور فصوص الحکم کے جو نسخے مروج ہیں وہ اکثر جعلی ہیں اور ان سب میں باطنیوں نے الحاقات کئے ہوئے ہیں۔ انھوں نے مجھے ایک نسخہ دکھایا جو ان کے بیان کے مطابق شیخ محی الدین ابن عربی کے اپنے ہاتھوں کا لکھا ہوا تھا۔ اس نسخہ کے آخر میں اس میں ایک جگہ لکھا ہوا تھا جو ان کا گویا کولوفون تھا جس سے اندازہ ہوا یہ انہی کا لکھا ہوا ہے۔ ''وانا الفقیر الی اللہ محی الدین المودعو بابن عربی''۔ اس طرح کی کوئی چیز لکھی ہوئی تھی۔ شیخ محی الدین ابن عربی کے بارے میں کوئی بات کہنا بڑا دشوار ہے۔ نہیں کہہ سکتے کہ کون سی بات انھوں نے کہی اور کون سی نہیں کہی۔

یہ امر واقعہ ہے کہ جب پانچویں، چھٹی صدی ہجری میں باطنیوں کو دنیائے اسلام کے بعض علاقوں میں عروج اور اثر و رسوخ حاصل ہوا۔ مثلاً اسماعیلیوں کو مصر میں اور قرامطہ کو کئی دوسرے علاقوں میں اور متعدد مقامات پر ان کی حکومتیں قائم ہوئیں، مراکش میں، ہمارے ملتان اور سندھ میں، تو انھوں نے بڑے پیمانے پر بزرگان اسلام کا قتل کیا۔ اور سینکڑوں ایسے واقعات ہوئے کہ باطنیوں نے مختلف خانقاہوں میں جا کر وہاں کے مقامی بزرگ کو شہید کیا اور خود کو ان کا خلیفہ یا جانشین ظاہر کر کے وہاں قبضہ کر لیا۔ ملتان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں بھی ایسا ہوا۔ ملتان میں شمس الدین سبزواری کے نام سے جو بزرگ مدفون ہیں ان کے بارہ میں بھی بعض اہل تحقیق کی بیان ہے کہ ملتان میں بھی اسی نام سے ایک باطنی شخص آیا۔ اس کے بارے میں کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ شمس الدین تبریزی ہیں جو مولانا رومؒ کے شیخ تھے، لیکن یہ شمس الدین وہ شمس الدین نہیں تھے۔ شمس الدین سبزواری نام کا ایک باطنی تھا جو یہاں آیا اور یہاں کے چند مقامی بزرگوں کو شہید کر کے ان کی جگہ جانشین بن کر بیٹھ گیا تھا۔ یہ انھوں نے کئی جگہ کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے یہ بھی کیا کہ قلمی کتابیں لکھ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پھیلائیں۔ ہندوستان کے بزرگوں کے بارے میں کتابیں عرب دنیا میں، عرب دنیا کے بارے میں ماوراء النہر میں اور ماوراء النہر کے بزرگوں کی کتابوں کے بارے میں مراکش میں الحاقات کر کے ملحدانہ باطنی خیالات کو عام کیا خود شیخ عبدالوہاب شعرانی جیسے جید صاحب علم بزرگوں کو اپنی زندگی ہی میں اس کا تجربہ ہوا۔ اگر ایسا ہے تو پھر مزید احتیاط سے کام لینا چاہئے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: تصوف کے ذکر میں حافظ شیرازی اور غالب کا ذکر تو ہوا علامہ اقبال کا ذکر کیوں نہیں؟

جواب: حافظ اور غالب کا تذکرہ تو ضمناً آیا تھا۔ خدانخواستہ علامہ اقبال کے بارے میں میرے خیالات حافظ شیرازی اور غالب جیسے نہیں ہیں، ہرگز نہیں ہیں۔ علامہ اقبال کا ذکر تو میں مولانا جلال الدین رومی اور امام غزالی کے ساتھ کروں گا۔ حافظ اور غالب کے ساتھ نہیں کروں گا۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: توکل کے معنی کو آج کل کی تبلیغی جماعت صحیح طرح استعمال کر رہی ہے یا نہیں؟

جواب: یہ تبلیغی جماعت سے پوچھئے۔ میرا تبلیغی جماعت سے کوئی تعلق نہیں، میں ان کا ترجمان بھی نہیں ہوں۔ میں ان کا مداح ہوں، ان کا احترام کرتا ہوں، لیکن میں ان کا نمائندہ نہیں ہوں۔ لہٰذا میں نہیں کہہ سکتا ہوں کہ وہ توکل کی اسلامی اصطلاح کو کن معنوں میں استعمال کر رہے ہیں۔ توکل کے جو معنی شریعت کی رو سے میں نے سمجھے ہیں وہ میں نے عرض کر دیے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: کیا توحید وجودی پر ایمان اسلام کے عقیدۂ توحید کا حصہ ہے؟

جواب: جی نہیں! بالکل نہیں۔ عقیدۂ توحید کے فلسفیانہ تصور کا وحدت سے کوئی تعلق نہیں۔ توحید تو حید ہے، جو شرک کے مقابلہ میں ہے۔ وہ توحید وجودی نہیں کہلاتی۔ وجودیت کی اصطلاح وحدت وجود کہلاتی ہے۔ توحید کا لفظ یہاں بعض بزرگوں نے غلط استعمال کیا ہے۔ وحدت دراصل فلسفے کی اصطلاح ہے اور اس کا عقیدے سے

کوئی تعلق نہیں۔عقیدے کی اصطلاح توحید ہے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: آپ نے آیات کی منسوخی یا نکلانے کے حوالے سے جونام لیے ہیں کہ صدیق اکبرؓ تک کو بھی اس کا اختیار نہیں تھا۔کیا حضورﷺ کا نام آپ نے دانستہ نہیں لیا۔ کیا ان کو اختیار تھا یا نہیں تھا؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ اسلامی شریعت ضرورت کے تابع ہے یا ضرورت اسلامی شریعت کے تابع ہے؟ بظاہر اور اصولاً تو ضرورت ہی تابع ہونی چاہئے لیکن حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں قطع ید کی منسوخی جو ہے تو وہ شریعت کا ضرورت کے تابع ہونا ہے۔اگر ایسا صحیح تھا تو آج ایسا کیوں نہیں ہوسکتا؟

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ شریعت یا قرآن پاک کو کوئی بھی منسوخ نہیں کرسکتا۔پیغمبر بھی نہیں کرسکتا۔قل ما یکون لی ان ابدلہ من تلقاء نفسی قرآن کی آیت ہے کہ کہہ دیجئے کہ میں اپنی طرف سے اس میں آیک آیت بھی تبدیل نہیں کرسکتا۔لیکن اپنی گفتگو میں رسول اللہﷺ کا اسم گرامی میں نے دانستہ اس وجہ سے نہیں لیا تھا کہ میں نے قرآن پاک اور سنت دونوں کا ذکر کیا تھا۔سنت کے احکام ایک حکمت کی وجہ سے تدریج کے اصول کے اعتبار سے حضورﷺ نے بعض جگہ منسوخ بھی فرمائے ہیں۔بعض احکام شروع میں دیئے گئے۔بعد میں ان کو منسوخ کرکے دوسرا حکم دیا گیا۔تدریج قرآن کے احکام میں بھی ملحوظ رکھی گئی ہے اور سنت میں بھی رکھی گئی ہے۔اس وجہ سے میں نے حضورﷺ کا نام نہیں لیا تھا۔ورنہ جہاں تک قرآن پاک میں کسی تبدیلی کا حق ہے وہ تو خود قرآن میں رسول اللہﷺ کو یہ اعلان کردینے کا حکم دیا گیا ہے کہ مجھے اس کتاب کی ایک آیت میں بھی ذرہ برابر تبدیلی کرنے کا اختیار نہیں ہے۔لیکن سنت کے معاملے میں حضورﷺ نے تدریج سے کام لیتے ہوئے بعض احکام میں تقدیم وتاخیر کی ہے اور بعض احکام میں تخصیص وتقیید فرمائی ہے۔اس لئے میں نے حضورﷺ کا اسم گرامی نہیں لیا تھا۔

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ ضرورت شریعت کے تابع ہے یا شریعت ضرورت کے تابع ہے،تو میرے ایمان ویقین اور فہم دین کی رو سے ضرورت شریعت کی تابع ہے۔میں علامہ اقبال کے اس نقطہ نظر کا قائل ہوں۔

کہ حدیث بے خبراں ہے تو بہ زمانہ بساز
زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

اگر زمانہ تمہارے ساتھ بنا کر نہیں رکھتا تو تم زمانہ سے لڑو اور اس کو اپنے مطابق بناؤ۔یہ بات جو حضرت عمر فاروقؓ سے منسوب ہے یہ بہت misquote اور misuse ہوئی ہے۔اول تو میں نے بہت تحقیق کی کہ کسی مستند کتاب میں مجھے یہ بات مل جائے،لیکن کسی مستند کتاب میں یہ بات نہیں ملی۔حدیث کی کسی بھی مستند کتاب میں،یا اس زمانے کے مستند ترین مورخین یا سیرت نگاروں میں سے کسی نے یہ بات نہیں لکھی۔یہ بات بعد کے لوگوں نے لکھی ہے۔انہوں نے بھی جو لکھا ہے اس کا مفہوم صرف یہ ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے قحط سالی کے دنوں میں یہ حکم دیا تھا کہ چوروں کے ہاتھ کاٹنے میں جلدی نہ کرو اور یہ دیکھو کہ اس نے کسی غربت یا فقرو فاقہ کی بنیاد پر تو چوری نہیں کی۔یہ بات اس نتیجہ سے بالکل مختلف ہے جو متجددین اس واقعہ سے نکالنا چاہتے ہیں۔یہاں سیدنا عمر فاروقؓ کوئی نئی بات نہیں فرمارہے ہیں،بلکہ شریعت ہی کے حکم کی یاددہانی کرارہے ہیں۔

شربعت کا حکم یہی ہے،اور اس پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے،کہ محتاج اور فقیر شخص اگر اپنی فوری حاجت یا ضرورت کا خاطر چوری کررہا ہے تو وہ چوری نہیں سمجھی جائے گی،اور اس پر قطع ید نہیں ہوگا۔ایک بھوکا آدمی اپنی بھوک مٹانے کے لئے کسی کے گھر جاکر چوری کرلے اور وہاں سے کھانا چرا کر کھالے اس پر قطع ید کی سزا نہیں ہوگی۔یہ بات فقہاء کرام نے قرآن پاک کے ہی الفاظ سے اخذ کی ہے۔والسارق والسارق فاقطعوا ایدھما جزاء بما کسبا (اور چور،خواہ عورت ہو یا مرد،دونوں کے ہاتھ کاٹ دو،یہ ان کی کمائی کا بدل ہے)۔جنہوں نے چوری کے ذریعے کسب کیا ہو،یعنی اس میں کمانے کی یا کسب کی نیت شامل ہو،کسی فوری اور حقیقی ضرورت کی تکمیل کی نیت نہ ہو۔

ایک غریب شخص مر رہا ہے،علاج کے لئے اس کے پاس رقم نہیں ہے۔آج کل چھ چھ ہزار،آٹھ آٹھ ہزار کا ایک معمولی انجکشن آتا ہے،اگر وہ نہ لگائے تو فوری طور جان کا خطرہ ہے،یا جو دل کے مریض ہوتے ہیں وہ دورہ کے وقت فوراً زبان کے نیچے گولی رکھتے ہیں ورنہ گڑبڑ ہوجاتی ہے،اگر ایسی صورت میں وہ شخص کہیں سے قیمتی دوائیں چرالے اور گولی لے کر منہ میں رکھ لے تو یہ اس شدید ضرورت کے تحت آئے گا،اس پر قطع ید نہیں ہوگا۔حضرت عمرؓ فاروق نے (آج کل کی اصطلاح میں کہہ سکتے

ہیں)ایک Directive جاری کیا تھا جس میں شریعت کے اس حکم کی یاد دہانی کرائی گئی تھی اور اس پر سختی سے عمل کرنے کی ہدایت کی تھی۔
حضرت عمر فاروقؓ سے منسوب یہ واقعہ اگر درست ہے تو اس کا یہی مفہوم ہے۔اس کا کوئی تعلق قرآن پاک کے کسی حکم کو معطل کرنے سے نہیں ہے۔ جو حکم واضح طور پر قرآن پاک میں دیا گیا ہے اس کو حضرت عمر فاروقؓ تو کیا، سارے صحابہؓ مل کر بھی تبدیل کرنے کا حق نہیں ہے۔اس واقعہ کی یہ تعبیر جو آج کل بعض لوگ کرتے ہیں اور زور وشور سے دہراتے ہیں، یہ تعبیر لغو اور مہمل ہے۔اصل حوالہ کوئی نہیں دیتا، بس ایک مبہم بات کہہ دی جاتی ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے حدود معطل کر دی تھیں۔ دراصل بعض متجددین یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر حضرت عمرؓ کو حدود معطل کرنے کا اختیار تھا تو آخر ہم میں کیا کمی ہے، ہمیں یہ اختیار کیوں نہیں مل سکتا؟ یہ استدلال میرے خیال میں صحیح نہیں ہے۔اور نہ کسی فقیہ نے حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے سے لے کر آج تک یہ بات کہی ہے۔آج کے زمانے میں استاد عبدالقادر عودہ، جو اسلام کے فوجداری قانون پر سب سے بڑے آخری مصنف ہیں، وہ خود مصری عدلیہ کے اعلیٰ مناصب پر فائز رہے اور زمانہ کی ضرورت سے کم واقف نہیں تھے۔انہوں نے یہ بات نہیں لکھی۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: کیا مسلمانوں کی اجتماعیت کے لئے ضروری ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان متفقہ فیصلہ کر کے ایک دن عید الفطر اور عید الاضحیٰ منائیں؟

جواب: میرا خیال ہے کہ ایسا ہو جائے تو بہتر ہے۔ایسا ہونا چاہئے۔ میں ذاتی طور پر اس کا قائل ہوں اور میں نے اس کے لئے ایک زمانے میں کوشش بھی کی لیکن میں کامیاب نہیں ہوا۔امام ابوحنیفہ کا نقطہ نظر یہ ہے اور فقہ کی تمام کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ اگر اقصائے مشرق میں چاند نظر آ جائے اور اقصائے مغرب میں معتبر ذرائع سے اس کی اطلاع مل جائے یا انتہائے مغرب میں چاند نظر آ جائے اور انتہائے مشرق میں اس کی اطلاع مل جائے تو جن جن کو اطلاع مل جائے ان کے لئے اس پر عمل کرنا واجب ہے۔اس نقطہ نظر کی رو سے اگر ہم یہ معلوم کر لیں کہ کسی ایک علاقے میں چاند ہو گیا ہے تو پوری دنیا میں اس پر عمل درآمد فرض ہو جانا چاہئے۔اگر یہ ممکن نہ ہو تو مکہ مکرمہ کی رویت کو معیار مان لیں اور اس پر عمل درآمد شروع کر دیں۔اس پر بھی ہمارے علماء کرام تیار نہ ہوں تو ایک حساب مقرر کر لیں۔حساب قرآن مجید سے ثابت ہے کہ **لتعلموا عدد السنين و الحساب** حساب کا ذکر اور مشروعیت تو قرآن مجید سے ثابت ہے۔لیکن جس انداز میں ہمارے بعض حضرات بعض احادیث کی تعبیر کرتے ہیں مجھے ان سے اتفاق نہیں ہے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: روح کو اللہ نے امر کہا ہے، کیا یہ تکوینی امر ہے؟

جواب: جی ہاں! روح یقیناً تکوینی امر ہے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: میرا سوال یہ ہے کہ متکلمین نے اسمائے حسنیٰ کی تعبیر سے صفات کی طرف جو عدول کیا ہے اور جس سے کئی طرح کے ابہام وجود میں آئے، اس کے کیا اسباب تھے؟ اسمائے حسنیٰ کی تعبیر جو محفوظ ترین تھی اس سے انہوں نے عدول اور صرف نظر کیوں کیا؟

جواب: اس کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ جب انہوں نے اسمائے حسنیٰ کو علم کلام کے اسلوب استدلال اور یونانی عقلیات کی اصطلاحات میں بیان کرنا چاہا اور ذات باری کے حوالے سے ان کی حقیقت کو متعین یا محدود کرنے کی کوشش کی، یعنی define کرنے کی کوشش کی، تو اس کے لئے ان کو صفات کی اصطلاح زیادہ موزوں ومناسب معلوم ہوئی۔اس لئے کہ ذات اور صفات ان دونوں کے آپس میں تعلق کی جو نوعیت ہوتی ہے وہ اسم اور مسمّی کے تعلق کی نوعیت سے مختلف ہوتی ہے۔اس لئے شاید انہوں نے اسے استعمال کیا ہو۔لیکن کم از کم اس وقت تک میرا اندازہ یہ ہے کہ صفات کی اصطلاح محدثین یا مفسرین نے شروع میں استعمال نہیں کی۔جو مستند ترین شارحین اسلام ہیں، مثلاً محدثین کرام امام احمد، امام بخاری، امام ابوحنیفہ، ان حضرات کی تحریروں میں صفات کا لفظ نہیں ملتا، بلکہ اسماء ہی کا لفظ ملتا ہے۔لیکن جن حضرات نے بعد میں آگے چل کر یونانی فلسفے سے اعتناء کیا۔مثلاً فارابی یا ابن سینا یا جنہوں نے یونانی عقلیات سے متاثر ہو کر کلام پر لکھا (جیسا ابوالحسن اشعری وغیرہ)، تو ان کے

ہاں صفات کی اصطلاح ملتی ہے۔شروع میں انہوں نے اس اصطلاح کے استعمال میں کوئی قباحت نہیں سمجھی ہوگی، لیکن بعد میں صفات اور اسماء کے درمیان خود بخود ایک بُعد پیدا ہو گیا جس سے وہ مسائل پیدا ہوئے۔شاید یہی وجہ رہی ہے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: اصحاب ظواہر آیت مبارکہ ''لیس کمثلہ شیء'' کی تاویل کرتے ہیں۔نیز اس زمانے میں عقیدے میں بہت سی بدعات داخل ہو گئی ہیں۔ان کے سد باب کا طریقہ کیا ہوسکتا ہے؟

جواب: بدعت کا تعلق عقیدے سے نہیں ہوتا۔بدعت کا تعلق عمل سے ہوتا ہے۔عقیدہ اگر غیر اسلامی ہے اور اسلام کے عقائد سے متعارض ہے تو وہ تو پھر بدعت سے زیادہ نازک اور خطرناک چیز ہو جاتی ہے۔جس کو اصطلاح میں بدعت کہتے ہیں وہ ہر وہ مذہبی عمل ہے جس کا شریعت نے حکم نہ دیا ہو اور آپ اس کو شریعت کا حکم سمجھنے لگیں یا شریعت نے اس کو وہ مقام نہ دیا ہو اور آپ اسے وہ مقام دے دیں۔اس کو بدعت کہا جاتا ہے۔جہاں تک اصحاب ظواہر کا تعلق ہے وہ ''لیس کمثلہ شیء'' کو اس کے لغوی مفہوم میں لیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرح کی کوئی اور چیز دنیا میں موجود نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ان کے تصور کے مطابق (جس طرح کا بھی ہاتھ ہو اس طرح کا ہاتھ) دنیا میں کسی اور کا نہیں پایا جاتا۔اسی مفہوم میں درست سمجھتے ہیں۔

لیکن اصحاب ظواہر اب بہت کم تعداد میں ہیں۔ہمارے برادر ملک سعودی عرب کے بعض علماء میں جس شدت پسندی کے مظاہر دیکھنے میں آتے ہیں اس کی وجہ سے ان کو بعض لوگ اصحاب ظواہر سے تشبیہ دے دیتے ہیں۔اس لئے کہ یہ حضرات ظواہر پر بہت اصرار کرتے ہیں اور قرآن مجید کے الفاظ کے ظاہری اور لفظی مفہوم پر بڑا زور دیتے ہیں۔بعض اوقات اس سے خاصے پیچیدہ مسائل بھی پیدا ہو جاتے ہیں جن کو بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں۔

عام طور پر مسلمانوں کی غالب ترین اکثریت کا رجحان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں قرآن مجید اور احادیث مبارکہ میں جو اس طرح کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں یہ متشابہات کی قبیل سے ہیں۔ان کو ٹھیٹ لغوی یا خالص ظاہری مفہوم میں نہیں لینا چاہئے۔ان کا مفہوم اس طرح کا لینا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے شایان شان ہو۔اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہے جس کو انسان کسی چیز پر قیاس بھی نہیں کر سکتا اور اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتا۔''لا تدرکہ الابصار وھو یدرك الابصار'' (کوئی بصیرت اللہ تعالیٰ کی حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتی)۔اب جب انسان اس کا ادراک ہی نہیں کر سکتا تو اس کو سمجھانے کے لئے قابل فہم اسلوب ہی اختیار کرنا پڑے گا۔

انسان کی مجبوری یہ ہے کہ وہ اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر ہی معاملات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔چار چیزیں دیکھی ہیں تو پانچویں چیز کو ان پر قیاس کر لیتا ہے۔اب جو قیاس پانچویں چیز کو بغیر دیکھے کرتا ہے وہ چار دیکھی ہوئی چیزوں کو سامنے رکھ کر کرتا ہے۔یہ وجود ذہنی ہے جو انسان کے ذہن میں ہوتا ہے۔چار گلاس اگر انسان نے دیکھے ہوں تو ایک گلاس کا تصور اس کے ذہن میں آجاتا ہے جو ذہن میں موجود رہتا ہے۔اس گلاس کا خارج میں کوئی وجود نہیں ہے۔لیکن گلاس کا لفظ جب بھی بولا جائے تو اس کے ذہن میں گلاس کی تصویر آجائے گی۔یہ وجود ذہنی ہے۔اس طرح کا وجود ذہنی انسان ''ہاتھ'' کے بارے میں بھی رکھتا ہے۔جب بھی ہاتھ لفظ بولا جائے گا تو یہ وجود اس کے ذہن میں آجائے گا۔اس وجود ذہنی کا جتنا بھی abstract تصور ہو، جتنا بھی غیر مادی اور مجرد تصور ہو وہ انہی مادیات سے مستعار اور انہی مادیات سے ماخوذ ہے جن کا انسان نے اپنے ظاہری حواس سے ادراک کیا ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس طرح کے وجود کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔اس کے وجود کی نوعیت کیا ہے، وہ خود ہی جانتا ہے۔اس لئے ارباب بصیرت نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وراء الوراء ہے یعنی صرف وراء نہیں ہے، بلکہ وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے۔یہ حضرت مجدد صاحب کے الفاظ ہیں۔کسی انسان کے بس میں یہ نہیں ہے کہ اس کی حقیقت کا ادراک کر سکے۔انسان اس کی ذات کا ادراک روز قیامت بھی کر سکے گا کہ نہیں کر سکے گا، یہ روز قیامت ہی پتہ چلے گا۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: شروع سے لے کر اب تک ایسی متعدد مثالیں دی جا چکی ہیں کہ کوئی فرد جو اسلام کی حقانیت پر یقین تو رکھتا ہے، رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں بھی ایسی کئی مثالیں ہیں اور اس کے بعد اب تک ہیں، لیکن اس کا یہ عقیدہ نہیں بن پایا۔مطلب یہ ہے کہ وہ اسلام کے اوپر ایمان نہیں لاتا۔مجھے یہ پوچھنا ہے کہ یقین عقیدے میں کب تبدیل ہوتا ہے اور اس طرح کا یقین کہ جو محض ایک فرد کے ذہن میں ہو وہ عقیدہ کیوں نہیں بن پاتا؟

جواب: عقیدہ اور ایمان کی سطح کیا ہے اور اس سے کیا مراد ہے؟ قرآن مجید میں ایک جگہ کفار کی ایک خاص قسم کے بارے میں آتا ہے کہ ''وجحدوا بھا واستیقنتھا انفسھم'' (دل میں ان کو اندر سے یقین ہے کہ یہ بات ایسی ہے لیکن زبان سے اس کا انکار کرتے ہیں)۔ گویا اندر سے محض یہ خیال ہونا، ظن غالب ہونا کہ یہ بات درست ہے لیکن زبان سے اس کا اعتراف نہ کرنا اور انکار پر مصر رہنا، اسی کو کفر کہتے ہیں اور یہی اسلام سے بغاوت ہے۔ عقیدہ محض دل سے یقین رکھنے کا نام نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہاں تو یقین کے الفاظ آئے ہیں: ''واستیقنتھا انفسھم''۔ یقین ہی سے یہ لفظ نکلا ہے۔ لہٰذا محض دل کا یقین کافی نہیں ہے۔ بلکہ زبان سے اس کا اقرار بھی ضروری ہے ایمان یعنی اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب یہ دونوں ایک ساتھ ہوں گے تو اس کو عقیدہ کہا جائے گا۔ اور عقیدے سے مراد ایک ایسی پختہ چیز کہ جس سے آپ کا عمل اس طرح بندھ گیا ہو جیسے میں نے ابھی عرض کیا کہ پھر عمل اس کے نتیجے سے باہر نہ جائے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: تقدیر پر ایمان کے حوالے سے آج کل بہت الجھنیں موجود ہیں۔ خاص طور پر یہ کہ جب ایک انسان کی تقدیر میں جنت یا جہنم لکھ دی گئی ہے تو پھر عمل کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ تقدیر کے معاملے میں اگر ہم کمپیوٹر پروگرام کی مثال دے کر سمجھیں تو بہت مناسب ہوگا۔ جس طرح کمپیوٹر پروگرامنگ میں ہم پروگرام کو دیکھتے رہتے ہیں اور IF اور Else کی صورت میں دو تین آپشنز دے دیتے ہیں اور پروگرام کا رزلٹ آپشنز کے مطابق ہوتا ہے۔ اسی طرح کیا یہ سمجھا جائے کہ انسان کی زندگی کی پروگرامنگ کر دی گئی ہے اور آپشنز کے استعمال کے مطابق دونوں نتائج کا امکان رکھ دیا گیا ہے؟

جواب: میں کمپیوٹر بالکل نہیں جانتا، اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ سوال یا مثال درست ہے کہ نہیں۔ لیکن میں ایک معلم ہوں اور بطور معلم میرا ایک تجربہ ہے جو میں آپ کے سامنے بیان کر رہا ہوں۔ مجھے اس تجربے سے تقدیر کے مسئلے کو سمجھنے میں بہت مدد ملی ہے۔ ممکن ہے آپ کو بھی مدد ملے۔

تقدیر کے لفظی معنی ہیں اندازہ (assesment)۔ اللہ تعالیٰ خالق کائنات ہے، اس کا اندازہ بھی مکمل ہے۔ ہم مخلوق ہیں، ہمارا اندازہ بھی نامکمل ہوتا ہے۔ ایک بہت بڑا انجینئر جب اندازہ کرتا ہے کہ اس کی بلڈنگ کیسی ہوگی تو جتنا بڑا ماہر ہوتا ہے اتنی ہی وہ بلڈنگ اس کے اندازے کے مطابق ہوتی ہے۔ آپ اگر ایک اچھے معلم ہیں، تو آپ کو اپنے طلبہ کی کارکردگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ میرا اپنے بارے میں اگر یہ خیال ہو کہ میں اچھا معلم ہوں تو برا نہ مانئے گا۔ کیونکہ ہر شخص اپنے بارے میں اچھا ہی خیال رکھتا ہے۔ میں اپنے بارے میں تجربہ رکھتا ہوں کہ مجھے اکثر اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ طالب علم اگر A پوزیشن میں نہیں تو B میں ضرور آئے گا، اور وہ طالب علم کامیاب نہیں ہوگا، فلاں طالب علم درمیان میں رہے گا۔ یہ اندازہ مجھے تقریباً سال کے وسط میں ہو جاتا ہے اور پچھلے تیس پینتیس سال میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ یہ اندازہ بالکلیہ غلط ثابت ہوا ہو، جس کے بارے میں اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی پوزیشن آئے گی۔ عموماً کسی نہ کسی انداز میں اس کی پوزیشن آ ہی جاتی ہے۔ یہ پوزیشن اس لئے نہیں آتی کہ میں نے ایسا اندازہ کیا تھا، میرا اندازہ اس کی پوزیشن آنے کا سبب یا علت ہرگز نہیں ہوتا۔ بلکہ طالب علم کی پوزیشن اس لئے آتی ہے کہ اس طالب علم کی کارکردگی اچھی تھی۔

اللہ تعالیٰ کا اندازہ بالکل قطعی اور سو فیصد مکمل ہوتا ہے، کوئی چیز اس کے اندازے سے باہر نہیں جا سکتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے اندازے اور علم میں اور اللہ تعالیٰ کے حکم اور فیصلہ میں فرق ہے۔ بندہ اللہ کے حکم اور فیصلہ کا پابند ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ انسان کو مجبور نہیں کرتا کہ انسان اچھی یا بری پرفارمنس دے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بنایا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی کارکردگی کیسی ہوگی۔ ماں اپنے بچے کو جانتی ہے کہ چلنا سیکھا ہے، چل سکتا ہے کہ نہیں سکتا۔ جب ماں بچے کو بلاتی ہے کہ آؤ اور اس کو چلنے کی تربیت دے رہی ہوتی ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ کتنے قدم چل سکے گا، کتنے قدم نہیں چل سکے گا۔ جب وہ اتنے قدم چل لیتا ہے تو لپک کر آگے بڑھ کر اسے پکڑ لیتی ہے۔ تو یہ اندازہ ہمارے آئے دن کے مشاہدے میں ہیں جو عموماً صحیح ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کیا ہے۔ ''انا کل شیء خلقناہ بقدر'' (ہم نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر دیا ہے)۔ ''وما امرنا الا واحدة کلمح بالبصر'' (اور ہمارے حکم میں ایک لمحے کی تاخیر اور دیر نہیں ہوتی)۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ کا اندازہ مکمل ہے۔

اس لئے تقدیر کو سمجھنے کے لئے یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ تقدیر انسان کو مجبور نہیں کرتی، بلکہ تقدیر انسان کو محرک فراہم کرتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس اندازے کے مطابق ڈھالے۔ اگر اچھا استاد کلاس میں کھڑے ہو کر کہے کہ میں یہ توقع رکھتا ہوں کہ ہر طالب علم اپنی کارکردگی بہتر بنائے اور اس کی پوزیشن یہ اور یہ آنی چاہئے، استاد

کے اس اندازہ سے اچھے طلبہ میں ایک داعیہ پیدا ہوگا اور وہ اپنی کارکردگی بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔ تقدیر کا غالباً یہی منشا ہے۔ ورنہ یہ بات اللہ تعالیٰ کے عدل وانصاف سے بعید تر ہے کہ اس نے پہلے سے فیصلہ کرلیا ہو کہ میں جہنمی ہوں اور بعد میں اپنے اسی سابقہ فیصلہ کے مطابق مجھے جہنم میں بھیج دے۔ اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا ہے کہ میرے ہاں عدل وانصاف کے خلاف کوئی کام نہیں ہوگا: ''وما انا بظلام للعبيد'' ان الله لا يظلم مثقال ذرة (اللہ تعالیٰ ذرہ برابر ظلم اپنے بندوں پر نہیں کرتا)۔ یہ ظلم تو بنیادی انسانی اوصاف کا حامل انسان بھی نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات تو اس سے بہت بعید ہے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: آج کا موضوع تو ہر اعتبار سے بڑا نازک ہے، لیکن فاضل مقرر نے شرح وبسط کے ساتھ اسے نبھایا ہے۔ اس میں ایک پہلو ایسا ہے جس کے حوالے سے استفسار نہیں بلکہ تشنگی ہے، جسے میں عرض کرنا چاہ رہا ہوں۔ مسلمانوں کی ابتدائی صدیوں میں جو بیرونی نظریات کی یلغار ہوئی ہے، خواہ وہ یونانی فلسفہ ہو، یا ایرانی مابعد الطبیعات، یا ہندی ویدانت، اس کا دفاع تو کیا گیا لیکن اس کے اثرات ابھی تک ہمارے ہاں کس قدر موجود ہیں۔ اس کا جائزہ شاید آج کی گفتگو میں تحدید وقت کے اعتبار سے نہیں کیا گیا۔ ایک طالب علم کی حیثیت سے اس موضوع کے کن حدود کا کس طرح سے مطالعہ کیا جانا چاہئے؟

جواب: جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ یونانی منطق اور فلسفہ، ہندو ویدانت ازم اور ایرانی مابعد الطبیعات اور mysticism سے مسلمانوں نے استفادہ کیا اور اسلامی عقائد کو بیان کرنے میں ان کے اسلوب سے فائدہ اٹھایا، اس میں کوئی قباحت اور حرج معلوم نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ اگر اسلام ایک عالمگیر پیغام ہے اور دنیا کی ہر تہذیب کو متاثر کرنے کے لئے آیا ہے تو جس تہذیب میں اسلام کا پیغام جائے گا اس تہذیب کے اسلوب، طرز استدلال اور انداز بیان سے کام لینا تو عین تقاضائے حکمت ہے۔ لیکن دوسری تہذیبوں کے علوم وافکار سے استفادہ کا یہ عمل ایک دودھاری تلوار بھی ہے۔ اگر اس اسلوب سے استفادہ کرنے والے اور اس طرز استدلال پر معاملات کو پرکھنے والے اسلام پر گہری گرفت رکھتے ہوں اور اسلام کے عقائد میں گہری بصیرت رکھتے ہوں تو نئے اسلوب اور نئے استدلال کو محض ایک وسیلہ اور آلے کی حیثیت سے استعمال کریں گے اور اسلامی عقائد کی خدمت کے لئے ان کو استعمال کریں گے۔ جیسا کہ امام غزالی نے کیا۔ یونانی منطق میں مہارت ان کی کتابوں کے صفحے صفحے سے عیاں ہے۔ مغربی یعنی یونانی علوم وفنون سے امام غزالی کی واقفیت ان کی کتابوں سے نمایاں ہے۔ لیکن انہوں نے اسی طرز استدلال سے کام لے کر اسلام کے عقائد کی وضاحت کی اور اس زمانے کے ماحول میں یونانی علوم وفنون کے بڑے سے بڑے ماہرین سے منوالیا کہ اسلامی عقائد اور اسلامی تعلیم، یونانی طرز استدلال کے مطابق مکمل طور پر قابل دفاع ہے اور اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو نا قابل دفاع ہو۔ یہی حال کئی اور بزرگوں کی تحریروں کا بھی ہے۔

برصغیر کے نامور ترین بزرگ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ اس طرز استدلال پر مبنی ہے جس سے ہندوستان کے مسلمان فلاسفہ اور مفکرین مانوس تھے۔ انہوں نے بہت سی ایسی چیزیں استعمال کیں اور استدلال میں ایسے ایسے مسائل اٹھائے جو متقدمین نے اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ لیکن ہندوستان کے ماحول میں اس کی ضرورت تھی۔ اس لئے اس کو بطور ایک وسیلہ اور آلے کے استعمال کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔

علامہ اقبال نے تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں مغربی طرز استدلال کو استعمال کیا ہے۔ لیکن ایک بات ان تمام بزرگوں کے احترام کے باوجود عرض کیے بغیر چارہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ ان تمام بزرگوں کا جو احترام تمام مسلمانوں کے دل میں ہونا چاہئے اس میں کوئی دورائے نہیں ہوسکتیں۔ لیکن ان میں سے ہر بزرگ کی فارمولیشن میں بعض ایسے بیانات آگئے جن کے بارے میں محتاط اہل علم کا خیال تھا کہ یہ نہیں آنے چاہئیں۔ یہ وہ بیانات ہیں جو ان بزرگوں کے سلسلہ استدلال میں رائج الوقت اسلوب اور رائج الوقت خیالات وتصورات کی رعایت کی وجہ سے آگئے۔ یہ تقریباً ہر دور میں ہوتا رہا ہے۔

مثال کے طور پر عقائد کی تشریح میں ایک قدیم متکلم نے لکھا ہے کہ والارض مهادا کی تفسیر سے یہ ثابت ہوا کہ زمین حرکت نہیں کرتی، بلکہ زمین ٹھہری ہوئی ہے۔ اپنے زمانہ کی عقلیات اور طبیعات کے پیش نظر وہ زمین کو ساکن قرار دیتے تھے۔ وہ اسلامی عقائد کا اس پر دارومدار رکھتے ہیں کہ زمین کو غیر متحرک ثابت کریں اور ساکن قرار دیں اور یہ ثابت کریں کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے، یعنی مدار کائنات یا مدار کہکشاں سورج نہیں بلکہ زمین ہے۔ ان کا خیال درست نہیں تھا، اور بعد میں ثابت بھی ہوگیا کہ غلط تھا۔ لیکن یونانیوں کے استدلال سے جن حضرات نے استفادہ کرنا چاہا انہوں نے اس استفادے کے عمل میں یونانیوں کی بعض ایسی چیزیں بھی اصول موضوعہ کے طور پر قبول کرلیں جو بعد میں تحقیق سے ثابت ہوا کہ صحیح نہیں تھیں۔ اس طرح کی غلطی کا امکان ہر دور میں ہوسکتا ہے اور دوسرے معاصر اور متأخر اہل علم

ان غلطیوں کا سد باب بھی کرتے رہے ہیں۔ مجدد الف ثانیؒ نے جہاں اپنی تحریروں میں ہندو ویدانت ازم کا رد کیا ہے وہاں ان کے اسلوب اور استدلال کو استعمال بھی کیا ہے۔ ممکن ہے انہی کے درجے کا آئندہ آنے والا کوئی مفکر اس میں بعض ایسی چیزوں کی نشاندہی کرے جو نہیں ہونی چاہئیں تھیں۔ اس لئے یہ تو ہر دور میں ہوتا رہے گا۔ لوگ استفادہ بھی کرتے رہیں گے، استدلال کے نئے نئے اسالیب کو استعمال بھی کرتے رہیں گے، اس میں کبھی کبھی اور کہیں کہیں احتیاط کی خلاف ورزی بھی ہو جائے گی جس پر زیادہ چیں بہ جبیں ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ بعد میں آنے والے اس بے احتیاطی کی وضاحت اور نشاندہی بھی کرتے رہیں گے۔ اور جیسے میں نے عرض کیا کہ فکر کی کشتی نازک اسی طرح رواں دواں رہے گی۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: میرا نام مدثر ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا آپ یہ مانتے ہیں کہ انسانی عقل ارتقاء کے مراحل سے گزرتی رہی ہے اور اگر ایسا ہے تو آیا عقیدہ انسان بھی ارتقاء کے مراحل سے گزرا ہے یا نہیں؟ جیسا کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی ام الکتاب میں لکھا ہے کہ عقیدہ شریعت سے توحید یعنی Monotheism کی طرف آیا ہے؟

جواب: مجھے نہیں معلوم کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے کیا لکھا ہے۔ میں نے ان کی تحریروں سے زیادہ استفادہ نہیں کیا، اس لئے میں نہیں جانتا کہ مذکورہ کتاب میں کیا لکھا ہے۔ لیکن یہ بات کہ انسانی عقل میں ارتقاء ہوا ہے، درست ہے۔ انسانی عقل اور اس کے مزاج وطبیعت میں، انسانی تہذیب وتمدن نے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ارتقاء کیا ہے۔ اس نے طفولیت کے دور سے لڑکپن کے دور میں، لڑکپن کے دور سے جوانی اور پختگی کے دور میں قدم رکھا ہے اسی حساب سے اللہ تعالیٰ کے انبیاء عقیدے کو بیان کرتے رہے ہیں۔ عقیدے کی حقیقت تو ایک ہی رہی ہے لیکن اس کے بیان کا انداز مختلف انبیاء کے زمانے میں مختلف رہا ہے۔ جیسے ایک بچہ پرائمری سکول میں پڑھتا ہے تو اس کو اس سطح پر مضامین پڑھاتے ہیں کہ وہ سمجھ سکے۔ جب وہ پرائمری سے بڑھ کر مڈل میں داخل ہوتا ہے تو اسے آپ تاریخ، جغرافیہ پڑھاتے ہیں۔ تاریخ وجغرافیہ میں کوئی تعارض نہیں ہوتا۔ ایک ہی تاریخ اور جغرافیہ ہے جو پرائمری، مڈل اور آگے کے مراحل میں پڑھائی جاتی ہے، لیکن سطح میں فرق ہوتا ہے۔ یہی فرق انبیاء کی تعلیم میں رہا ہے۔ شروع میں جو انبیاء آئے انہوں نے عقیدے کو اس انداز سے اور اس سطح پر بیان کیا کہ اس زمانے کا ابتدائی انسان اس کو سمجھ سکے۔ جب انسانیت پختگی کے دور میں داخل ہوگئی اور بین الاقوامیت کا ایک دور آ گیا تو رسول اللہ ﷺ نے ان تمام سوالات کا جواب اپنی زبان مبارک سے یا قرآن پاک کی شکل میں انسانیت کو دے دیا جس کی بنیاد پر آئندہ آنے والے تمام ادوار میں انسان عقیدے کو بیان کر سکتے ہیں۔

یہ بات خود علم کلام کی تاریخ سے بھی نمایاں ہے۔ میں کئی بار عرض کر چکا ہوں کہ جو انداز عقیدے کو بیان کرنے کا فقہ اکبر میں ہے وہ انداز امام غزالی کی کتابوں میں نہیں ہے۔ یہ بات امام ابوحنیفہ یا ان کے معاصرین کی شان میں کوئی گستاخی نہیں ہوگی کہ جو گہرائی امام غزالی کے یا امام رازی کے انداز میں ہے وہ الفقہ الاکبر میں نہیں ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس انداز سے عقائد کو بیان کرنے کی امام ابوحنیفہؒ نے ضرورت نہیں سمجھی، اس لئے کہ ان کے دور کے وہ مسائل نہیں تھے۔ جس انداز سے مثال کے طور پر شاہ ولی اللہؒ نے اسلامی عقائد کو بیان کیا وہ انداز بہت سے متقدمین کے انداز سے مختلف ہے۔ مجدد الف ثانیؒ نے جو انداز اختیار کیا وہ امام رازیؒ وامام غزالیؒ کے انداز سے مختلف ہے۔ اسی طرح علامہ اقبالؒ نے جو انداز اختیار کیا وہ ان تمام سے مختلف ہے، اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ آئندہ آنے والے اس سے مختلف انداز اختیار کریں گے۔ اس لئے انداز بیان اور اسالیب استدلال میں تو ارتقاء ہوتا رہے گا، لیکن عقیدے کی core میں کسی ارتقاء کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ وہ core ان بنیادوں کو فراہم کرتی ہے یا ان بنیادوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ ان بنیادوں پر انداز بیان کی تبدیلی وقت کے ساتھ ساتھ ہوتی رہے گی۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ ارتقاء علم کلام اور فکر کا ہوتا رہے گا۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: آپ نے فرمایا کہ طیبات اور خبیثات کے مابین اشیاء سے متعلق حکم واضح نہیں ہے، وہ انسانی ذوق پر مبنی ہے؟ کیا انسان اس میں آزاد اور خود مختار ہے؟

جواب: آپ نے شاید میری پوری بات نہیں سنی۔ میں نے کہا تھا کہ طیبات کو حلال قرار دیا گیا ہے اور خبیثات کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ حلال کی حدود بتا دی گئیں ہیں جن کی روشنی میں کسی چیز کے طیب ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا۔ قواعد کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔ بعض طیبات کی مثال دے کر بیان کر دیا گیا کہ یہ اور اس طرح کی

چیزیں طیبات ہیں۔خبیثات کے ساتھ بھی اسی طرح ہوا۔ وہاں بھی ضروری قواعد کی نشان دہی کر دی گئی۔لیکن اس سب تفصیل کے باوجود بعض نئی صورتیں ایسی پیش آسکتی ہیں کہ وہ grey area ہو،طیبات اورخبیثات کے درمیان کا علاقہ ہوجس میں رائے کا اختلاف پیدا ہونے کا خاصا امکان ہے۔ایک شخص کا ذوق اور رائے اس کوطیبات کی ایک قسم قرار دے،اور دوسرے کا ذوق اور رائے اس کوخبیثات میں سے قرار دے۔اس طرح کے معاملات کو جو بہت مستثنیات میں سے اور بہت شاذ و نادر ہوں گے،سلیم الطبع لوگوں کے ذوق اور صوابدید پر چھوڑ دیا گیا۔مثال کے طور پر ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر ''ذی مخلب''،یعنی جو پنجے والا جانور ہے، جو شکار کر کے گوشت کھاتا ہے یا جانور کو پکڑ کر کھاتا ہے وہ حرام ہے۔اسی طرح سے چوپایوں میں ہر وہ جانور جو شکار کر کے گوشت کھاتا ہے وہ بھی حرام ہے۔ چنانچہ بھیڑیا،شیر، چیتا یہ سب حرام ہیں۔ وہ جانور جو پنجے والے نہیں ہیں یا وہ جاندار جو شکار کر کے نہیں کھاتے ،جن کی اصل غذا نباتاتی ہے اور انسانوں میں ان کا دودھ استعمال کرنے کا رواج شروع سے چلا آ رہا ہے وہ جائز ہیں۔اب کچھ جانور تو متعین ہیں یعنی بکری، بھیڑ، گائے ،بیل، بھینس وغیرہ یہ تو معلوم ہیں۔ان دونوں کے درمیان ہوسکتا ہے کہ ایسے کوئی جانور بعض علاقوں میں پائے جاتے ہوں جن کے بارے میں قطعیت کے ساتھ یہ تعین دشوار ہو کہ اس کا تعلق کون سی قسم سے ہے۔ایسے جانور بعض علاقوں میں پائے جاتے ہیں اور بعض علاقوں میں نہیں پائے جاتے۔مثال کے طور پر زیبرا،اب زیبرے کے بارے میں یہ اختلاف پیدا ہوا کہ زیبرے کا تعلق کس گروہ سے ہے۔ زیبرے کو خالص جنگلی جانور مانا جائے ،جیسا کہ مثلاً گدھا ہے یا اس کو اس طرح کا جانور مانا جائے جس طرح مثال کے طور بیل یا ہرن یا نیل گائے ہے۔اس کے بارے میں اختلاف ہوسکتا ہے۔اس طرح کا اختلاف شریعت نے ذوق پر چھوڑ دیا ہے کہ آپ کا ذوق اور شریعت کا فہم جو فیصلہ کرے اس کے مطابق آپ عمل کریں۔اسی طرح سے مثال کے طور پر قرآن مجید میں کہا گیا ہے کہ ''واحل لکم صید البحر وطعامه'' کہ سمندر کا شکار اور سمندر کا کھانا تمہارے لئے جائز قرار دیا گیا ہے۔تمہارے لئے حلال قرار دیا گیا ہے۔ اب سمندر کے کھانے اور سمندر کے شکار سے کیا مراد ہے؟ کچھ فقہاء کا مثلاً امام ابوحنیفہ کا خیال ہے کہ اس سے مراد صرف مچھلی ہے۔اس لئے کہ مچھلی ہی وہ غذا ہے جسے طبع سلیم ہر دور میں پسند کرتی چلی آ رہی ہے۔اور رسول اللہ کے زمانے میں،صحابہ کرامؓ کے زمانے میں اور تابعین کے زمانے میں مچھلی کھانے کا عام طور پر عربوں میں رواج تھا اور وہ مچھلی کھایا کرتے تھے۔ وہ جانور جن کو عرب کا سلیم الطبع انسان فطری طور پر ناپسند کرتا تھا، وہ اگر سمندر سے پکڑے جائیں تو کیا وہ جائز ہوں گے،مثلاً کیکڑا، یا اس طرح کے دوسرے جانور، ان کو امام ابوحنیفہ ناجائز کہتے ہیں۔ جب کہ بعض دوسرے فقہاء جائز قرار دیتے ہیں۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: اسلام کا مفہوم اور مطلب مکمل خود سپردگی (complete submission) ہے۔اس سلسلہ میں انسان اپنی انفرادی زندگی کے علاوہ اجتماعی زندگی میں بھی اسلام کی ہدایت پر عمل کا پابند ہے۔ یہاں تک کہ اجتماعی زندگی میں اسلام کی تنفیذ بالجبر بھی ہوگی۔ایسے میں حریت بھی اسلام کا ایک اہم اصول ہے، جیسے کہ پروفیسر خورشید احمد صاحب نے پرسوں فرمایا تھا۔اس حدیث اور اطاعت کی حدود اور اسکوپ کیا ہے، ذرا وضاحت فرمائیے؟

جواب: میں نے یہ بات پہلے دن کی گفتگو میں بہت تفصیل کے ساتھ عرض کی تھی کہ اسلام جہاں ایک دین اور دینی عقیدہ ہے، جہاں وہ روحانیت کے اصولوں کا ایک مجموعہ ہے، جہاں وہ تہذیب اور تمدن کا ایک paradigm ہے۔ وہاں وہ ایک نظام قانون اور ضابطہ حکومت بھی ہے۔اسلام کی تعلیم کے مختلف حصے ہیں۔ان میں سے تین کی نشاندہی پہلے دن کی گفتگو میں ہوچکی ہے۔ایک حصہ وہ ہے جس کا تعلق انسان کے عقائد سے ہے۔ دوسرا حصہ وہ ہے جس کا تعلق انسان کے جذبات و احساسات سے ہے۔تیسرا حصہ وہ ہے جس کا تعلق انسان کے ظاہری اعمال اور جوارح سے ہے۔ پہلے دو حصوں کا ریاست سے کوئی خاص تعلق نہیں۔اس میں فرد خود ہی بڑی حد تک شریعت پر عمل درآمد کا پابند ہے۔معاشرہ اپنے اثر رسوخ سے، خاندان اپنے دباؤ سے، نظام تعلیم اپنی تعلیم وتربیت سے ان دونوں چیزوں پر عمل درآمد کو یقینی بنائے گا۔

شریعت کا تیسرا حصہ جس کا تعلق انسان کے ظاہری اعمال سے ہے اس میں بھی کچھ احکام تو وہ ہیں جو فرد کی براہ راست ذمہ داری ہیں اور فرد ہی ان پر عمل درآمد کا مکلّف ہے۔عبادات کے معاملات ہوں، اسی طرح سے نکاح وطلاق، گھر کے اندر کے معاملات ہوں، ان میں بھی عمومی طور پر عام حالات میں ریاست کو مداخلت کرنے کا حق نہیں ہے۔اسی طرح شریعت کی تعلیم کے جس حصہ کے بارہ میں، میں نے کہا تھا کہ وہ اسلام کا سوشل کوڈ ہے، معاشرت کے آداب ہیں جن کے بارے

میں قرآن پاک اور سنت نے ہدایت دی ہیں۔ ان معاشرتی آداب پر عمل درآمد میں بھی چند مستثنیات کے علاوہ ریاست کا کوئی رول اور کوئی کردار نہیں ہے۔

البتہ جہاں تک تعلق ہے ان قوانین کا جن کے مخاطبین اصحاب حکومت ہیں، جن کے مخاطبین اولی الامر ہیں وہ براہ راست ریاست کی ذمہ داری ہیں، اور ریاست بہر حال ان کو نافذ کرے گی اور ان کو توڑنے والوں کو سزا بھی دے گی۔ اگر اسلام کوئی معاشرہ قائم کرتا ہے، کوئی تہذیب قائم کرتا ہے، تو اس تہذیب کے تحفظ کے لئے ریاست بھی قائم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور وہ ریاست اسلامی قوانین کے مطابق کام کرتی ہے، تو وہاں یہ کہنا انتہائی لغو اور مہمل بات ہے کہ ریاست قانون پر عمل درآمد کے معاملہ میں مداخلت نہ کرے۔ اس لغو اور مہمل بات کے معنی یہ ہیں کہ مثلاً چور کو کچھ نہ کہا جائے، اس لئے کہ شریعت نے انسانوں کو آزادی دی ہے، یہ بات دنیا کا کوئی بھی نظام یا نظریہ قبول نہیں کرتا نہ یہ کوئی معقول عذر ہوگا کہ چونکہ شریعت نے آزادی دی ہے لہٰذا چوری کی آزادی بھی ہونی چاہئے۔ بداخلاقی کی آزادی بھی ہونی چاہئے۔ مخدرّات کے استعمال کی آزادی بھی ہونی چاہئے، ان امور کا تعلق اسلام کے قوانین فوجداری سے ہے اور یہ وہ چیزیں ہیں جن پر عمل درآمد کرانا لازماً ریاست کے فرائض میں شامل ہے۔ دنیا کی ہر ریاست کی طرح اسلامی ریاست کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے فوجداری قوانین کو نافذ کرے۔ دنیا کی ہر ریاست اپنے قوانین کو نافذ کرتی ہے۔ اسی طرح اسلام کی ریاست بھی اپنے قوانین کو نافذ کرے گی۔ چونکہ اسلام کے قوانین کی اساس اخلاقی ضوابط اور روحانی اصولوں پر ہے اس لئے اسلام میں بعض اوقات قانون اور اخلاقیات کی حدود مل جاتی ہیں۔ کہیں کہیں ایک ہو جاتی ہیں اور وہاں یہ تعین دشوار ہوتا ہے کہ کس حد تک قانون کی ذمہ داری ہے، کہاں سے اور کس حد تک قانون کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ شریعت نے اس معاملہ میں واضح ہدایات دی ہیں۔ اس ضمن میں کہیں کہیں دور جدید کے قانونی تصورات سے اسلامی قانون کا اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ اسلامی قانون بنیادی طور پر ایک اخلاقی قانون ہے۔ اور وہ اسلام کی دینی تعلیم اور اخلاقی اصولوں سے ہی اپنی آخری سند جواز حاصل کرتا ہے۔ وہ اپنی قوت نافذہ قانونی اصول سے اخذ کرتا ہے۔ لہٰذا اسلام میں قانونی اصول کا اصل مقصد اخلاقی اصول پر عمل درآمد کو یقینی بنانا اور اخلاقی معاشرہ قائم کرنا ہے۔ لہٰذا یہاں قانون اور اخلاق میں اس نوعیت کی علیحدگی ممکن ہی نہیں جو اہل مغرب نے پیدا کر دی ہے۔ تاہم ریاست کی مداخلت کا دائرہ عام طور پر صرف قانونی معاملات ہیں، اخلاقی امور عام طور پر ریاست کی مداخلت کے بغیر ہی انجام پانے چاہئیں۔

اسلامی تاریخ میں ایسی ہزاروں مثالیں ہیں کہ حکومت وقت نے کوئی فیصلہ کرنا چاہا اور ریاست کے کسی شہری نے اس کو ذاتی آزادی کے خلاف سمجھا، سیدنا عمر فاروقؓ نے ایک مرتبہ یہ فیصلہ کیا کہ مہر کی رقم کو محدود کر دیا جائے۔ لوگوں میں مغالات شروع ہوگئی ہے، لوگ مقابلہ کرنے لگے ہیں کہ زیادہ مہر کون رکھتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے سوچ کر یہ طے کیا کہ اس کی ایک حد بندی ہونی چاہئے اور پابند کیا جائے کہ لوگ ایک خاص حد سے زیادہ مہر ادا نہ کریں۔ انہوں نے اس کا اعلان کیا۔ جب وہ خطبہ دے کر نماز کے بعد مسجد سے باہر نکل رہے تھے تو دیکھا کہ ایک خاتون کھڑی ہوگئیں۔ بوڑھی خاتون تھیں۔ انہوں نے خلیفہ راشد کو مخاطب کر کے کہا کہ تمہیں یہ حق کس نے دیا ہے۔ قرآن پاک تو کہتا ہے: ''واتیتم احدھن قنطاراً فلا تأخذوا منہ شیئاً '' (اگر تم نے اسے سونے کا ایک ڈھیر بھی دیا ہوا ہو تو واپس نہ لو)۔ لہٰذا جہاں سونے کا ڈھیر دیا جا سکتا ہو تو وہاں آپ کی حد بندی کیا معنی رکھتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ ''اصابت امرأۃ واخطأ عمر'' (عورت نے صحیح کہا اور عمر نے غلطی کی)۔

دوبارہ لوگوں کو جمع کرنے کا حکم دیا۔ لوگ دوبارہ جمع ہوئے تو فرمایا کہ مجھ سے غلطی ہوگئی تھی میں اس کو واپس لیتا ہوں۔ اس لئے کہ انہوں نے فوراً احساس کر لیا کہ یہ فرد کا معاملہ ہے اور خاندان کے افراد آپس کے مشورے سے جو طے کرنا چاہتے ہیں وہ کریں۔ اس طرح کے معاملات میں ریاست کو مداخلت نہیں کرنی چاہئے۔ لہٰذا اخلاقی ہدایات اور قانونی احکام کے درمیان میرا خیال ہے کہ جو حدود ہیں وہ بہت واضح ہیں۔ ان میں کوئی التباس اسلامی شریعت کے اعتبار سے نہیں ہے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: منکر کس درجہ پر ہو اور مسلمان کس حالت میں ہوں تو منکر کے خلاف قوت کا استعمال کیا جائے گا۔ کن صورتوں میں صرف زبانی تلقین کافی ہوگی اور کیسے حالات پیدا ہو جائیں تو محض دل میں بھی برا جاننا قابل گرفت نہیں ہوگا؟

جواب: یہ تعین ایک تو منکر کی نوعیت اور منکر کے حجم کو سامنے رکھ کر کیا جائے گا کہ منکر کی نوعیت کیا ہے؟ منکر کتنا بڑا ہے، کس پیمانے پر، کتنی وسعت کے ساتھ وہ کارفرما ہے۔ دوسری بات میں نے حدود کی وضاحت کے سیاق میں کی تھی کہ ایک تو فرد کی حدود ہیں۔ پھر سوسائٹی کی حدود ہیں۔ پھر ریاست اور امت کی حدود ہیں۔ ان حدود کو

پیش نظر رکھا جائے گا، فرد کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ خود معروفات پر کاربند رہے اور منکرات سے بچے، اور اپنے حلقہ اثر میں تعلیم و تلقین اور تواصی کے ذریعہ اس بات کو یقینی بنائے کہ لوگ معروفات پر کاربند رہیں اور منکر سے اجتناب کرتے رہیں۔ لیکن فرد کا کام تلقین کرنا، فرد کا کام لوگوں کو تعلیم دینا، لوگوں کی غلط فہمیاں دور کرنا، اور اپنے دائرہ میں اس کام کی اشاعت کرتے رہنا ہے۔ اس سے زیادہ کا فرد مکلّف نہیں ہے۔ کوئی فرد قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتا۔ فرض کیجئے کہ کسی کے حلقہ اثر میں کوئی شخص چوری کر رہا ہے تو اس کی شرعاً یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ قصائی کی دکان سے گنڈاسا لے کر آئے اور مجرم کا ہاتھ کاٹ دے۔ یہ اس کی ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ ذمہ داری ریاست کی ہی رہے گی۔ ریاست یہ نہیں کہہ سکتی یا صدر/ وزیراعظم یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں نے تو تلقین کر دی تھی۔ وعظ کر دیا تھا۔ لوگوں نے نہیں مانا۔ وعظ کرنا ریاست کی ذمہ داری نہیں ہے۔ ریاست کی ذمہ داری نافذ کرنا ہے۔

آج سے کوئی بیس پچیس سال پہلے مجھے ایک تعلیمی منصوبہ پر غور و خوض کے سلسلہ میں آزاد کشمیر جانا ہوا۔ ان دنوں وہاں جنرل حیات خان صاحب صدر تھے۔ انہوں نے ہم سے تجاویز مانگیں۔ میں نے بھی اپنی گفتگو کی اور اس میں تجاویز پیش کیں۔ جنرل حیات صاحب نے تجاویز کو پسند کیا اور اپنی تقریر کے بعد کہا 'وما علینا الا البلاغ'۔ میں نے ہاتھ کھڑا کیا کہ مجھے کچھ کہنے کا موقع دیں، میں نے کہا کہ جناب صدر بن کر کہیں کہ 'وما علینا الا النفاذ'۔ ہماری ذمہ داری نفاذ کی ہے۔ بلاغ ہماری ذمہ داری ہے۔ نفاذ ان کی ذمہ داری ہے۔ وہ نفاذ کریں۔ وہ بلاغ پر اکتفاء نہیں کریں گے، اور ہم نفاذ کی حد تک نہیں جائیں گے، یہی حدود ہیں۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: اگر منکر موجود ہو اور اس کے خلاف آواز بلند نہ کی جائے تو پھر انفرادی طور پر بھی گناہ ہوگا، عذاب و سزا کیا مقرر ہے؟

جواب: یہ تو بڑا داخلی سوال ہے۔ ایسی صورت میں تو ہر شخص کو اپنی صورتحال کے مطابق خود فیصلہ کرنا چاہئے۔ کہ منکر کی نوعیت کیا ہے اور وہ کس حد تک اس کو روک سکتا ہے۔ بعض منکرات معاشرے میں اتنے پھیل جاتے ہیں کہ اس کے خلاف کسی ایک فرد کے لئے آواز بلند کرنا مشکل ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کو صرف اپنے دائرہ کار کی حد تک محدود رہنا چاہئے۔ اس صورت حال میں سوسائٹی کو آواز اٹھانی چاہئے۔ امت مسلمہ میں بحیثیت مجموعی رائے عامہ کو تیار کرنا چاہئے۔ رائے عامہ کو تیار کرنے کے بعد پھر آواز اٹھانی چاہئے۔ بغیر حکمت اور دانائی کے محض حق گوئی کے شوق میں جو تھوڑی بہت آزادی ہے اس کو بھی آپ ضائع کر دیں۔ یہ غالباً حکمت کے خلاف ہے اور شریعت کا منشا نہیں ہے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: مرد کو عورت سے اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن اس میں وہ تاکید نظر نہیں آتی جو عورت کو کی گئی۔ مثلاً اگر اللہ کے علاوہ سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں عورت کو حکم دیتا، اور یہ کہ عبادت تک میں بیوی شوہر کی اجازت کی محتاج ہے۔ یہ فرق کیوں نظر آتا ہے؟

جواب: بظاہر تو کوئی ایسا فرق نہیں ہے۔ دونوں کو کچھ ہدایت دی گئی ہیں کچھ ہدایات مردوں کو دی گئی ہیں۔ کچھ ہدایات خواتین کو دی گئی ہیں۔ اگر آپ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ خواتین کو زیادہ تاکید کی گئی تو شاید اللہ کے رسول ﷺ کے علم میں ہوگا کہ یہ دور آنے والا ہے جس میں خواتین کے حقوق کے نام پر ایک بڑا فتنہ پیدا ہو جائے گا اور اس کے نتیجے میں اخلاق اور اقدار اور روحانیت اور خاندان ہر چیز کو تہہ و بالا کر دیا جائے گا۔ شاید اس دور کے لئے رسول اللہ ﷺ نے خواتین کو تیار کرنے کے لئے پہلے سے اس طرح کی تاکید فرمائی ہوں۔ یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن مجھے اس تاثر سے اتفاق نہیں ہے کہ شریعت میں خواتین کے حق کو مرجوح قرار دیا گیا ہے اور مردوں کا حق نسبتاً راجح ہے۔ میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: آپ نے امام غزالی کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ ان کے خیال میں ازلیت نہیں ہے۔ ابدیت ہے اور فرشتوں میں ازلیت بھی ہے اور ابدیت بھی ہے۔ غالباً یہ عقیدہ درست نہیں ہے، فرشتوں کی تخلیق پہلے ضرور ہوئی ہے لیکن ان میں ازلیت نہیں ہے؟

جواب: میرا خیال ہے کہ میں نے یہ بات نہیں کہی۔ میں نے کہا تھا کہ فرشتوں کی عمر بڑی طویل اور بہت پہلے ان کو پیدا کیا گیا تھا اور بہت بعد تک شاید وہ رہیں گے۔

اس لئے ایک اعتبار سے انسان میں ملکوتیت کا رنگ پایا جاتا ہے۔میں نے یہ نہیں کہا کہ فرشتے ازلی ہیں، ازلی اور ابدی تو صرف اللہ کی ذات ہے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: I am a child developers; it is said that what you are at 6, you will be at 60. Boys are very sensitive. Maddrassa give abused, taunts to boys families are introuble where boys at early ages see voilence. Why are the Maddrass not following the Shariah rules of human resource and human development?

جواب: " I think the question should be addressed to the Maddrassas"

میں تو کوئی مدرسہ نہیں چلاتا، مجھے نہیں معلوم کہ اہل مدارس آپ کے سوال کے جواب میں کیا ارشاد فرماتے ہیں؟ میں اہل مدارس سے گزارشیں کرتا رہتا ہوں۔پچھلے کم از کم دس سال میں سینکڑوں مدرسے میں نے دیکھے ہیں۔میں نے علماء کرام سے بات کی ہے۔بعض علماء کرام نے کچھ گزارشات قبول بھی کی ہیں، بعض جگہ اصلاح بھی ہوئی ہے۔مختلف اسباب کی بناء پر اب مدرسوں میں یہ شعور پیدا ہو رہا ہے کہ مدارس کے نظام میں، دینی تعلیم کے نظام میں بنیادی اصلاح کی ضرورت ہے اور بعض جگہ ایسی نئی اصلاحات بھی آئی ہیں جن کے نتیجے میں اچھے اثرات کی توقع ہے۔پھر پاکستان کے علاوہ بھی کئی مسلم ممالک میں تعلیم کے میدان میں نئے تجربے ہوئے ہیں۔مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ برادر ملک سعودی عرب کا تجربہ تعلیم کے بارے میں بہت کامیاب رہا ہے۔انہوں نے نظام تعلیم کو ابتداء سے لے کر اور اخیر تک اس طرح منظّم کیا ہے اور اس کی نئی تشکیل کی ہے، restructure کیا ہے، جس کے نتیجے میں دینی تعلیم اور جدید تعلیم کو انہوں نے بڑی حد تک ہم آہنگ کر دیا ہے۔اور اس ہم آہنگی کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج ایک عام سعودی تعلیم یافتہ نوجوان، خواہ وہ عورت ہو یا مرد، وہ جہاں اسلامی نقطہ نظر سے بہت پختگی محسوس کرتا ہے، وہاں وہ اپنے عقیدے پر قائم رہتے ہوئے دور جدید کے تقاضوں کو بھی اپنی حد تک کما حقہ نبھا رہا ہے۔ہمیں سعودی عرب کے تجربے سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔مصر میں تجربات ہوئے ہیں۔کئی اور ممالک میں ہوئے ہیں۔سوڈان میں بعض بڑے اچھے ادارے بنے ہیں۔وہاں ایک یونیورسٹی ہے ام درمان اسلامی یونیورسٹی۔اس میں بڑا اچھا کام ہوا ہے۔اس کے بعض نصابات میں نے دیکھے ہیں جو بہت مفید ہیں۔اس لئے یہ سمجھنا کہ دنیائے اسلام میں کہیں پیش رفت نہیں ہوئی ہے میرے خیال میں صحیح نہیں ہے۔پیش رفت تو ہر جگہ ہو رہی ہے، اگرچہ اس کی رفتار بہت سست ہے۔رفتار تیز ہونی چاہئے۔وہ اس وقت تیز ہوگی جب ارباب حل وعقد کو احساس ہوگا۔ہمارے ہاں ارباب حل وعقد کو تعلیم کی اسلامی تشکیل کی ضرورت واہمیت کا بالکل احساس نہیں ہے۔احساس بھی کیسے ہو! ان کے ہاں اذان بجتی ہے، وہ چالیس سپارے پڑھنا چاہتے ہیں۔اس سے آپ اندازہ کر لیجئے کہ معاملات تعلیم کن لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ان کے جانشین جو آئے ہیں وہ بھی آپ کے سامنے ہیں، وہ بھی دیکھ لیجئے۔آج سے کوئی ایک ہزار سال پہلے ان کے ایک بزرگ نے شریعت منسوخ کر دی تھی۔اور ان کا ایک شعر ہے فارسی کا

برداشت غل شرع بہ تائید ایزدی

مخدوم روزگار علی ذکرہ السلام

ان کے ایک امام تھے، انہوں نے کہا تھا کہ میں آج سے اپنے ماننے والوں کے لئے شریعت منسوخ کر دیتا ہوں۔چنانچہ جو بزرگ آج خیر سے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے وزیر تعلیم ہیں وہ اسی عقیدے کے پیرو ہیں کہ شریعت ان کے لئے منسوخ ہو چکی ہے۔نہ ان کو نماز کی ضرورت ہے نہ روزے کی، نہ حج کی۔وہ صرف ذکر کے مکلّف ہیں۔ذکر سے مراد یہ ہے کہ دن میں ایک مرتبہ امام کا نام جپ لیا جائے۔امام کی تصویر کے سامنے کھڑے ہو جائیں۔اس طرح کے تصورات وہ اسلام کے بارے میں رکھتے ہیں۔اللہ بہتر کرے اور پاکستان کا نظام تعلیم ان کے مزید اثرات بد سے محفوظ رہے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: ایک سوال یہ ہے کہ ہمارے ہاں جس انداز میں مشترک خاندانی نظام رائج ہے وہ متعدد مثبت اور منفی پہلو رکھتا ہے۔کیا یہ نظام اسلام کے مزاج اور تعلیمات سے مطابقت رکھتا ہے؟

جواب: ہمارے ہاں جس انداز کا مشترکہ خاندانی نظام رائج ہے اس میں کچھ پہلو یقیناً ایسے ہیں جو شریعت سے متعارض ہیں اور شریعت کے احکام سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔مثال کے طور پر اگر شریعت کے احکام و روایت پر عمل کیا جائے اور ہر شخص کا ترکہ اس کے وارثوں میں تقسیم کر دیا جائے اور کسی شخص کی جائیداد اور مملکات دوسرے کے تصرف میں نہ ہوں۔اور جو جو حقوق اور ذمہ داریاں شریعت نے مختلف افراد کے ذمے لگائی ہیں ان کی انجام دہی میں ان کو پوری آزادی ہو تو مشترکہ خاندانی نظام بہت اچھی چیز ہے۔بہت بڑی نعمت ہے۔اس کی وجہ سے معاشرے میں اخلاقی اقدار کا تحفظ ہوتا ہے۔خاندانی نظام کی روایات برقرار رہتی ہیں۔اور نئی نسل کو سابقہ نسل کی تربیت میں رہنے کا اور ان کی زیر نگرانی تعلیم پانے کا موقع ملتا ہے۔خاندانی روایات ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتی ہیں۔لیکن اگر یہ باتیں نہ ہوں اور خاندانی نظام مغربی انداز کا ہو جس میں primogeniture کا اصول کارفرما ہے کہ متوفی کے وارثوں میں ذکر اکبر ہی خاندان کی ساری جائیداد کا وارث ہوتا ہے۔ باقی محروم ہوتے ہیں۔یا کوئی ایک فرد جو خاندان میں بااثر ہو وہ سب کی جائیداد اور حقوق پر قابض ہو جائے۔ایک مستبدانہ انداز سے سب کو ایک رخ پر چلائے۔یہ چیز شریعت کے احکام کے خلاف ہے اس سے اعراض واجتناب کرنا چاہیے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: فیملی ماحول میں مرد کی قیومیت زن پر ثابت ہے، کیا یہ قیومیت اس نظریہ عدالت سے متصادم نہیں ہے جس کے بارے میں آپ نے گفتگو کی ہے؟

جواب: قیومیت کی اصطلاح تو قرآن میں نہیں آئی۔قوامیت کی اصطلاح آئی ہے۔''قوام'' کے معنی صرف ذمہ دار کے ہیں۔گویا خاندان کی سربراہی کے ہیں۔ شریعت نے کہا ہے کہ انسان کی زندگی منظم اور مربوط ہونی چاہیے۔غیر منظم نہیں ہونی چاہیے۔دو آدمی بھی اگر سفر پر جا رہے ہوں تو اپنے میں سے ایک کو امیر مقرر کر لیں۔اس لئے ہر یونٹ کا ایک سربراہ ہونا چاہیے، لہٰذا خاندان کا بھی سربراہ ہونا چاہیے۔

خاندان کا سربراہ یا بیوی ہوگی یا شوہر ہوگا۔شریعت نے مختلف اسباب اور اعتبارات کی وجہ سے مرد کو خاندان کی ذمہ داری دی ہے، لیکن یہ اسی انداز کی سربراہی ہے جس انداز سے برطانوی پارلیمنٹ میں وزیر اعظم کابینہ کا سربراہ ہوتا ہے۔وزیر اعظم کے بارے میں برطانوی کابینہ کے ماہرین کا کہنا ہے کہ He is the first among equals کہ سب ارکان برابر ہیں، لیکن ان برابروں میں سب سے پہلے اس کا نمبر ہے۔تو مرد، عورت دونوں برابر ہیں۔ایک دوسرے کے ولی ہیں ''والمؤمنين والمؤمنات بعضهم اولياء بعض'' مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے ولی ہیں، دوست ہیں، ولی ظاہر ہے کہ برابر ہی ہوں گے۔لیکن ان برابروں میں کسی ایک تو پہلے ہونا چاہیے۔جب آپ ترتیب شروع کریں گے تو کوئی نام تو پہلے لکھیں گے، تو جس کو پہلے لکھیں گے وہی خاندان کا سربراہ اور دوسرا اس کا وزیر اور معاون ہوگا۔شریعت کہتی ہے کہ مرد کا نام پہلے لکھیں۔یہ معنی ہیں قوامیت کے۔کچھ ذمہ داریاں مردوں کی اضافی ہیں جن سے خواتین کو بری الذمہ کر دیا گیا ہے۔ان اضافی ذمہ داریوں کی وجہ سے اس کا نام پہلے لکھا جاتا ہے۔اس لئے اس سربراہی کا عدالت یا مساوات کا جو اسلامی تصور ہے اس پر کوئی منفی اثر نہیں پڑتا۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: میرا سوال صرف اس قدر ہے کہ گفتگو میں ایک بہت بڑا تخلیقی مرحلہ وہ تھا جس سے شاید ذہنوں کے اندر کوئی بدگمانی پیدا ہو کہ شریعت اور قرآن بہیمیت کو بدرجہ قائم رکھنا چاہتے ہیں، تاکہ معاملات ہوں۔جب کہ تمام شریعت جو ہے اس کے سارے ضوابط اس بہیمیت کے خاتمے کے لئے ہیں۔یہ کوئی ہلکا سا شاید گفتگو میں ذہن میں تعارض پیدا ہو، اس کا ازالہ فرمایئے؟

جواب: بہیمیت کی اصطلاح شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، ابن مسکویہ، مولانا رومی اور دوسرے بہت سے مفکرین اسلام نے استعمال کی ہے۔اس سے مراد کوئی physical animal نہیں ہے یا کوئی physical beastly existence نہیں ہے۔بلکہ یہ محض ایک اصطلاح ہے، اس سے مراد انسان کے وہ رجحانات ہیں جو خالص جسمانی یا مادی رجحانات ہیں۔انسان کو بھوک بھی لگتی ہے۔انسان کو پیاس بھی لگتی ہے۔اور بہت سے دوسرے جسمانی تقاضے پیدا ہوتے ہیں۔ ان تقاضوں کی تکمیل میں وہ بعض اوقات حدود کا خیال نہیں رکھتا۔اخلاقی حدود کو نظر انداز کر دیتا ہے۔یہ جو اخلاقی حدود اور روحانی پابندیوں کو نظر انداز کرنے کا جذبہ یا

داعیہ ہے اسی داعیہ کو فقہاء اسلام اور متکلمین اسلام نے بہیمیت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔اس جذبے کو مکمل طور پر ختم کرنا شریعت کا منشاء نہیں ہے۔شریعت یہ نہیں چاہتی کہ انسان کو بھوک نہ لگے۔انسان کو پیاس نہ لگے۔انسان کے اندر کوئی جسمانی اور فطری داعیہ پیدا نہ ہو۔ یہ سب دواعی تو پیدا ہوں گے۔اگر اللہ نے ان دواعی کو پیدا کیا ہے۔اللہ نے بھوک اور پیاس رکھی ہے، اللہ نے جنسی داعیہ پیدا کیا ہے تو وہ لامحالہ موجود رہے گا اور اس کو باقی رہنا چاہیئے۔اس کو ختم کرنا مقصود نہیں ہے۔کل میں نے عرض کیا تھا کہ حضرت عثمان ابن مظعون ؓ نے یہ بیان کیا ہے کہ ایک موقعہ پر ہم یہ چاہتے تھے کہ اپنا پورا وقت اللہ کی عبادت میں صرف کریں اور اگر حضور ﷺ ہمیں اجازت دیتے تو ہم جسمانی طور پر اپنے آپ کو آپریشن کے ذریعہ بعض جسمانی تقاضوں کے لئے نااہل بنا دیتے تا کہ پوری یکسوئی کے ساتھ عبادت میں گزاریں۔لیکن حضور ﷺ نے سختی سے اس کو ناپسند فرمایا اور کہا کہ میں روزے بھی رکھتا ہوں اور جسمانی تقاضے بھی پورے کرتا ہوں۔ میں اللہ کی عبادت بھی کرتا ہوں اور متاہلانہ زندگی بھی گزارتا ہوں۔ میں سوتا بھی ہوں اور رات کو عبادت بھی کرتا ہوں۔اس لئے میرا طریقہ ان دونوں چیزوں کو جمع کرنے کا ہے۔کسی ایک پہلو کو نظر انداز کر کے کسی دوسرے پہلو پر زور دینے کا نہیں ہے اور جو میرے طریقے پر نہ چلے اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔

اس لئے میرا خیال ہے کہ بہیمیت کے لفظ سے خائف نہیں ہونا چاہیئے۔یہ محض ایک اصطلاحی لفظ ہے۔انسان کے اندر محض کوئی فرشتہ پنہاں نہیں ہے۔ہمارا وجود اسی گوشت پوست سے، خاک و آب سے بنا ہوا ہے جس سے حیوانات کا وجود بنا ہے۔ظاہر ہے فرشتوں کی طرح ہمارا وجود محض نورانی نہیں ہے۔ہمارے جسم کی تشکیل اصلاً مادیات سے ہوتی ہے۔انسان کو نہ صرف مٹی سے پیدا کیا گیا، بلکہ بار بار قرآن مجید میں جتایا بھی گیا کہ تم کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔دوسری طرف اس جذبے کو بیان کرنے کے لئے کہ اللہ کے حضور جواب دہی کا احساس پیدا ہوتا ہے، اللہ کی عبادت کرنے کا دل میں اشتیاق پیدا ہوتا ہے، اللہ کو یاد کرنے کی تڑپ بار بار پیدا ہوتی ہے، اس جذبے کو ملکوتیت کی اصطلاح سے یاد کیا گیا۔اس کے مقابلے میں مادیت کے جذبے کو بہیمیت کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ کوئی اور اصطلاح بھی استعمال کی جاسکتی ہے۔

جواب: [پروفیسر خورشید احمد: قبل اس کے کہ غازی صاحب دوسرے سوال کے جواب کی طرف آئیں یہ جو ایشو ایک صاحب نے اٹھایا ہے، اس کو سوچنے کا ایک ذرا سا مختلف انداز بھی ہے۔دراصل بہیمیت سے مراد یہ ہے کہ خالص جبلی جو natural instincts اور چونکہ بہائم یا جانور کو عقل اور ارادے کو regulate کرنے کے لئے کسی بالاتر قوت کی ضرورت نہیں بلکہ جبلت ہی ان کو کنٹرول کرتی ہے تو ان کے ہاں یعنی افراط و تفریط اس معنی میں رونما نہیں ہوتی بلکہ ایک natural mechanism ہوتا ہے۔مثلاً جو نسل کی افزائش کا معاملہ ہے۔تو اس میں ایک automatic regulatory system ہے جو انسان میں نہیں ہے۔یہاں پر جو بات کی جارہی ہے وہ یہ ہے کہ جہاں تک جبلت کا تعلق ہے وہ ایک عطیہ الٰہی ہے۔لیکن ساتھ ہی انسانی زندگی میں بہیمیت کے اسٹیج سے آگے بڑھ کر کے اسے ریگولیٹ کرنے کے نظام کی ضرورت ہے۔ فالھمھا فجورھا وتقواھا، قد افلح من زکھّا وقد خاب من دسّھا میں گویا یہی mechanism دیا گیا ہے۔یہ mechanism کے بغیر تو بہیمیت کی نفی نہیں ہو رہی ہے۔اس جذبے کی نفی نہیں ہو رہی ہے بلکہ اس جذبے کو ریگولیٹ کیا جارہا ہے تا کہ وہ اپنے اصل مقاصد کی طرف جاسکے۔یہ غالباً اس سے مراد ہے۔]

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: اسلام کا جو انحطاط ہوا ہے decline ہوئی ہے for so many centuries اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم میں اجتہاد In the true sense of the word ختم ہو گیا ہے۔اجتہاد کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہمیں شریعت کا بھی مکمل علم ہو اور موجودہ زمانے کے جو تقاضے ہیں مثلاً نئی قسم کی سٹاک مارکیٹ ہے اور جو کچھ بھی نئے دور میں سامنے آیا ہے تو اس کے لئے دونوں قسم کی مختلف مہارتوں کا متحد ہو کر ایک فیصلہ کرنا کہ آج دنیا میں شریعت کے حوالے سے یہ چیز ٹھیک ہے اور یہ ٹھیک نہیں ہے۔یہ نہیں ہو رہا ہے۔اس میں ہم کنفیوژن میں پڑے ہوئے ہیں اس پر آپ کی رائے کیا ہے؟

دوسرا یہ کہ جس طرح آپ نے شریعت کو define کیا ہے۔موجودہ زمانے میں ۵۶ سے زیادہ جو اسلامی ممالک ہیں کوئی ایسا ملک ہے جہاں مکمل طور پر شریعت کے مطابق عمل ہو رہا ہو؟

جواب: میں آپ کے سوال کے پہلے حصے سے متفق ہوں۔واقعی مسلمانوں کا زوال اس لئے ہوا کہ انہوں نے اجتہاد کے عمل کو چھوڑ دیا اور تقلید کو اختیار کیا۔تقلید اگر

صرف شریعت کے معاملات تک محدود رہتی اور صرف صحابہ یا ائمہ مجتہدین تک محدود رہتی تو شاید اس کے خراب اثرات نہ ہوتے۔لیکن تقلید ایک مرتبہ جب مسلمانوں کے مزاج کا حصہ بن گئی تو انہوں نے ہر میدان میں ہر کس وناکس کی تقلید شروع کردی۔ یونان کی تقلید، ایرانیوں کی اور فارسیوں کی اور حتیٰ کہ بت پرستوں تک کی تقلید شروع کردی۔ یہاں تک کہ بہت سے مسلمان ہر علم وفن کے اصل اور بنیادی سرچشمہ کو چھوڑ کر محض تقلید کو کافی سمجھنے لگے۔ بعد میں جب ارسطو کی اور افلاطون، جالینوس کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا تو کسی چیز کے حتمی ہونے کے لئے یہ بات کافی تھی کہ ارسطو نے لکھی ہے یا جالینوس نے لکھی ہے۔اگر ارسطو نے کوئی بات بے وقوفی کی لکھ دی یا غلط لکھی تو وہ بھی آج تک طب کی کتابوں میں اسی طرح لکھی چلی آ رہی ہے کہ ارسطو نے لکھی ہے یا جالینوس نے لکھی ہے۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی علمی ترقی رُک گئی۔مسلمانوں میں جو سوچ کے دھارے تھے وہ ختم ہو گئے اور اس کے نتیجے میں ایک علمی زوال مسلمانوں میں پیدا ہوا۔ میں آپ کی اس بات سے متفق ہوں کہ اجتہاد کا احیاء ہونا چاہئے اور نہ صرف دینی علوم میں بلکہ دنیاوی علوم میں بھی اجتہاد ہونا چاہئے۔ مجھے یہ بات بہت ناگوار معلوم ہوتی ہے کہ ہم دینی علوم میں تو اجتہاد کا نعرہ لگائیں اور جو جدید علوم ہیں جن میں ہم سو فیصد مقلد بنے ہوئے ہیں، اس میں ہم اجتہاد کی آواز بلند نہ کریں۔اگر تقلید ہی کرنی ہے تو اپنوں کی کرنی چاہئے۔تقلید اگر ابن عابدین اور بعد کے علماء کی بری ہے تو میکالے کی تقلید اور بھی بری ہے۔تقلیدیں دونوں بری ہیں۔ان دونوں تقلیدوں میں سے اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ کم بری کون سی ہے تو میں کہوں گا کہ مسلمان علماء کی تقلید کم بری ہے اور میکالے کی تقلید زیادہ بری ہے۔اس لئے اجتہاد کا احیاء تو دونوں میدانوں میں ہونا چاہئے۔جدید میدان میں بھی ہونا چاہئے، قدیم میدان میں بھی ہونا چاہئے۔ میں آپ کی اس بات سے بھی متفق ہوں کہ جو لوگ اجتہاد کا فریضہ سرانجام دیں انہیں دنیا کے رائج الوقت تصورات اور افکار سے واقفیت ہونی چاہئے۔ یہ بات فقہاء اسلام نے پہلے دن سے لکھی ہے۔امام ابو یوسفؒ نے لکھا ہے کہ ''من لم یعرف اھل زمانه فھو جاھل'' (جو اپنے زمانہ کو نہیں جانتا وہ جاہل ہے)۔اس کو علم کے معاملے میں رائے دینے کا اختیار نہیں۔

امام محمد بن حسن شیبانی جو فقہ حنفیہ کے سب سے بڑے مدوّن ہیں جس زمانے میں وہ اپنی کتابیں مرتب کر رہے تھے تو جس میدان کی کتابیں یا مسائل مرتب کرتے تھے اس میدان کے لوگوں سے جا کر تبادلہ خیال کرتے تھے۔عملی مسائل سے آگہی حاصل کرتے تھے۔ پھر فقہی اجتہادات کو مرتب کرتے تھے۔جس زمانے میں وہ خرید و فروخت کے احکامات مرتب کر رہے تھے۔اس زمانے میں روزانہ دو گھنٹے بازار میں جا کر بیٹھتے تھے۔اور دوکانداروں کو لین دین کرتے دیکھتے تھے۔ان سے سوالات کرتے تھے۔ گویا آج کل کے لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ بزنس ایڈمنسٹریشن کا علم حاصل کرنے جایا کرتے تھے۔ بزنس ایڈمنسٹریشن کا علم حاصل کرنے کے بعد ہی انہوں نے شریعت کے احکام مرتب کئے۔ یہ کام آج بھی ہونا چاہئے اور ایک ایسی مہارت کو ہمیں جنم دینا چاہئے جو دونوں میدانوں کی جامع ہو۔شریعت کے معاملات کو کماحقہ سمجھتی ہو، مجتہدانہ بصیرت رکھتی ہو اور دور جدید سے ناقدانہ واقف ہو۔ میں اپنی بات پھر دہراتا ہوں: آج ہمیں علماء کی ایک ایسی ٹیم درکار ہے جو شریعت کے بارے میں مجتہدانہ بصیرت رکھتی ہو اور دور جدید کے مسائل سے ناقدانہ واقف ہو۔

سوال: حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات جو حضرت خضر علیہ السلام سے ہوئی ہے۔اس میں ایک اہم dimension یہ ہے کہ شریعت قائم ہے اور اس کے مقابلے میں کچھ اعمال ہیں جو شریعت کے خلاف ہیں۔لیکن ان کو اللہ تعالیٰ کی تائید حاصل ہے۔تو اب ایسی چیز کو قرآن مجید میں عبث تو نہیں ڈالا گیا، اس میں ہمارے لئے ضرور کوئی نہ کوئی سبق ہوگا۔ وہ کیا ہے؟ اسی میں اس کو relate کرنا چاہ رہا ہوں کہ جس طرح شریعہ میں ہم پردے کی فرضیت پر بات کرتے ہیں تو حضورؐ کی ازواج مطہرات کو اگر چھوڑ کر بھی باقی خواتین کو لیا جائے تو اس کا جو تصور اس وقت تھا اور وہ جو تصور اب ہے اس میں تبدیلی یا فرق کیوں ہے؟ کیا شریعہ میں ایسی گنجائش ہے کہ اس طرح کی چیزوں میں تبدیلی کی جائے اور اس کا دائرہ کار بڑھایا جائے؟

جواب: آپ کے سوال کے پہلے حصے کے بارے میں، میں یہ عرض کروں گا کہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں:

(۱) حکم تکوینی اور

(۲) حکم شرعی

حکم تکوینی کی پابند تو کائنات کی ہر مخلوق اور دنیا کی ہر چیز ہے۔ جمادات ونباتات ہوں، یا انسان وفرشتے ہوں، ہر شخص، ہر چیز، اللہ کی ہر مخلوق حکم تکوینی کی پابند ہے۔ حکم تکوینی کے تحت ہی انسان کی پیدائش اور مرنے کا فیصلہ ہوتا ہے۔انسان کے جملہ تکوینی معاملات براہ راست اللہ تعالیٰ چلاتا ہے۔ جو انسان زہر کھائے گا وہ مر جائے گا۔ پیغمبر کو بھی زہر دیا جائے تو اس کے جسم مبارک پر اس کا اثر ظاہر ہوگا۔تلوار سے جس کی گردن ماری جائے گی اس کی گردن کٹ جائے گی۔صحابیؓ کی گردن بھی کٹ

جائے گی، اور ابولہب اور ابوجہل کی گردن بھی کٹ جائے گی۔ یہ سب تکوینی احکامات ہیں۔ حکم تکوینی کا گہرا تعلق سلسلۂ اسباب اور علت ومعلوم سے ہے، جو سب کے لئے مشترک ہیں۔اس میں مسلمان یا غیر مسلمان کی کوئی تفریق نہیں ہے۔

حکم تشریعی وہ ہے جو شریعت کا حصہ ہے اور جو پیغمبروں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔ جو لوگ اللہ کے پیغمبر کو تسلیم کر لیں اور ایمان لا کر اسلام میں داخل ہو جائیں وہ شریعت کے حکم کے پابند ہیں۔کوئی صاحب ایمان بحالت ہوش وحواس احکام شریعت سے مستثنیٰ نہیں ہوسکتا، نہ کوئی صحابی، نہ صدیق، نہ شہید۔خضر علیہ السلام کے بارے میں میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ وہ کوئی انسان نہیں تھے (ممکن ہے یہ رائے غلط ہو)، میری رائے میں وہ فرشتے تھے اور ان ملائکہ میں سے تھے جو حکم تکوینی پر عمل درآمد کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ رہی ہے کہ وہ اپنے جلیل القدر پیغمبروں کو اپنے تکوینی دنیا کے راز دکھاتا ہے۔ وکذلک نری ابراھیم ملکوت السمٰوت والارض۔(یوں ہم نے ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی ملکوت کے راز دکھائے)۔

حضورﷺ کے بارے میں ہے کہ ہم انہیں مسجد اقصیٰ تک لے گئے۔لنریہ من آیاتنا تاکہ ہم انہیں اپنی نشانیں دکھائیں۔اپنی اسی سنت کے تحت اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی دنیا کے حکم تکوینی کے راز اور تکوینی دنیا دکھانے کے لئے حضرت خضرؑ کے پاس بھیجا کہ جا کر دیکھو۔خضرؑ اللہ کے حکم تکوینی کے پابند تھے، وہ شریعت کے پابند نہیں تھے۔اگر حضرت خضرؑ انسان ہوتے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بطور صاحب شریعت رسول یہ فرض تھا کہ ان پر قصاص کا حکم جاری کرتے اور توریت کے احکام پر عمل درآمد کرتے۔توریت کے حکم میں لکھا ہوا ہے کہ کان کے بدلے کان، ناک کے بدلے ناک، اور گردن کے بدلے گردن اور انسان کے بدلے انسان۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ حکم نافذ نہ کرنا اور اس موقعہ پر اس حکم کا حوالہ نہ دینا بہت معنی خیز ہے۔ان کے سکوت کی وجہ بظاہر یہی نظر آتی ہے کہ ان کو معلوم تھا کہ یہ حکم تکوینی ہے اور یہ اللہ کا وہ فرشتہ ہے جو شریعت کا پابند نہیں ہے، بلکہ حکم تکوینی کا پابند ہے۔قرآن پاک میں یہ کہیں نہیں آیا کہ خضرؑ انسان تھے۔کوئی ایسا اشارہ بھی نہیں آیا جس سے پتا چلتا ہو کہ خضرؑ انسان تھے۔''عبداً من عبادنا'' کے الفاظ ہیں۔عبد فرشتوں کے لئے بھی آتا ہے، انسانوں کے لئے بھی آتا ہے۔جنات کے لئے بھی آتا ہے۔اس لئے میرا خیال یہ ہے کہ خضر ملائکہ میں سے تھے، اور حکم تکوینی کے ماتحت کام کرتے تھے، جس طرح اور فرشتے تکوینیات کے پابند ہیں خضرؑ بھی تکوینیات کے پابند تھے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس دنیا کی سیر کرانے کے لئے یہ چیز دکھائی گئی ہے۔

دوسری بات آپ نے پردے کے بارے میں فرمائی ہے۔ پردے کے بارے میں قرآن پاک میں دو طرح کے احکامات ہیں۔ایک احکام تو وہ ہیں جو ازواج مطہرات کو مخاطب کر کے براہ راست ارشاد فرمائے گئے۔دوسرے احکام وہ ہیں جن میں دوسری تمام خواتین کے لئے ہدایات دی گئی ہیں۔(یا ایھا النبی قل لازواجک و بنتک و نساء المئو منین......حضورؐ کے ازواج مطہرات، صاحبزادیاں اور تمام مسلمان خواتین اس میں شامل ہیں)۔

اب ان دونوں کے درمیان مفسرین میں اختلاف رہا ہے کہ ازواج مطہرات کے لئے متعین احکامات کون سے ہیں اور کون سے احکام عام خواتین کے لئے ہیں۔لیکن اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ خواتین اسلام کا لباس محتشم اور متجبانہ ہونا چاہئے۔ان کا پورا جسم ڈھکا ہونا چاہئے اور ان کے جسمانی اعضاء دیکھنے والے کے سامنے ظاہر نہیں ہونے چاہئیں۔اس کی عملی شکل کیا ہوسکتی ہے، وہ مختلف علاقوں میں مختلف رہی ہے۔ ہر علاقے میں مقامی کلچر بھی ہوتا ہے، ایک ہمارے ایران کے لوگوں کا کلچر ہے اور ایک افغانستان کے لوگوں کا کلچر ہے۔ان میں سے کسی خاص علاقہ میں رائج کسی خاص شکل کو شریعت کا دائمی حکم قرار دینا درست نہیں ہے۔ایک عرب دنیا کا کلچر ہے اور ایک مغربی دنیا میں جو نئی مسلمان بہنیں ہیں، ان کا رواج اور مزاج ہے۔میرے خیال میں یہ سب رواجات شریعت کے مطابق ہیں اور اس میں سے اگر کوئی بھی طریقہ کار اختیار کیا جائے تو شریعت کے احکام کی پابندی کے تقاضے پورے ہو جاتے ہیں اور قرآن پاک کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: تمدنی تغیرات کے نتیجے میں جو ناقابل تغیر شرعی نصوص ہیں ان کی تعبیر کا حق آج کی دنیا میں کسے حاصل ہے؟ (پروفیسر عبدالجبار شاکر)

جواب: شریعت کے نصوص دو طرح کے ہیں: کچھ نصوص تو وہ ہیں جن کو کسی تعبیر وتشریح کی ضرورت نہیں۔ جو ہر دور میں اسی تعبیر وتشریح کے پابند ہیں جو رسول اللہﷺ نے دی۔صحابہؓ کے دور میں جس پر عمل کیا گیا اور آج تک مسلمان اس پر عمل درآمد کرتے چلے آرہے ہیں۔توحید، شرک، عدل وانصاف، قرآن مجید کے بنیادی احکامات، نماز، روزہ، عبادات، محرمات، نواہی ان سب امور میں کسی نئی تعبیر کی ضرورت نہیں۔ یہ تعبیرات اسی طرح قائم رہیں گی جیسا کہ چلی آرہی ہیں۔

لیکن شریعت کے کچھ نصوص ایسے بھی ہیں جن کی تعبیر ہر زمانے کے لحاظ سے مختلف ہوسکتی ہے۔اور شریعت کے ماہرین اور شریعت کے جاننے والے اس زمانے کے حالات کو سامنے رکھ کر نئی تعبیر کر سکتے ہیں۔یہ بات کہ یہ اختیار کس کو حاصل ہونا چاہئے۔یہ پچھلے سو سال سے زیر بحث ہے۔لیکن اس سے کسی کو بھی اختلاف نہیں ہوسکتا کہ جو لوگ بھی شریعت کی تعبیر کا فریضہ سرانجام دیں وہ شریعت پر کاربند ہوں،شریعت کے معیار پر اخلاق کے کم سے کم تقاضوں کو پورا کرنے والے ہوں اور شریعت کا کما حقہ،علم رکھنے والے حضرات ہوں۔علامہ اقبال کے حوالے سے یہ بات تو بہت کثرت سے لوگ بیان کرتے ہیں کہ وہ اجتہاد کا حق یعنی تعبیر شریعت کا حق پارلیمنٹ کو دینا چاہتے تھے۔لیکن علامہ اقبال کس طرح اور کس معیار کی پارلیمنٹ کا تصور اپنے ذہن میں رکھتے تھے اس پر کوئی بات نہیں کرتا۔

علامہ اقبال نے اسی خطبے میں یہ بھی لکھا ہے کہ پارلیمنٹ کی تعبیر کا حق اسی وقت دیا جاسکتا ہے جب پارلیمنٹ میں علماء کی ایک موثر موجودگی کو یقینی بنایا جاسکے۔یہاں علماء سے مراد مذہبی سیاست دانوں کی سیاسی پارٹیاں نہیں ہیں،جن کے نام میں علماء یا اسلام کا نام تو آتا ہے،لیکن ان میں شریعت کا گہرا علم رکھنے والے اتنے ہی ناپید اور کمیاب ہیں جتنا دوسری سیاسی جماعتوں میں۔یہاں علماء سے مراد وہ لوگ ہیں جو واقعی شریعت اور دین کا علم رکھتے ہیں۔اگر ان کی موثر موجودگی اور مشاورت پارلیمنٹ کو حاصل ہے اور پارلیمنٹ میں ایسے اراکین موجود ہیں جو دیانت داری اور اخلاص سے شریعت کے احکامات پر عمل کرنا چاہتے ہیں تو پارلیمنٹ کو یہ اختیار دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔لیکن پارلیمنٹ میں اس طرح کے افراد ہوں،جس طرح کا تجربہ ہمیں ہو رہا ہے اور وہاں اس طرح کے ''علماء کرام'' ہوں جس طرح کے علماء کرام ہم نے پارلیمنٹوں کی ممبری کے لئے لڑتے بھڑتے دیکھے ہیں تو پھر پارلیمنٹ کو یہ اختیار دینا کہ وہ اللہ اور رسول ؐ کی منشا کی ترجمان بن کے بیٹھے میرے خیال میں بہت خطرناک قدم ہے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: جیسا کہ آپ نے ابھی فرمایا کہ شرع علیکم فی الدین ماوصی بہ کے اندر بھی اور ''ان الدین عنداللہ الاسلام'' میں بھی دین ان مشترکات اور محکمات کا نام ہے جو حضرت نوحؑ سے لے کر حضورؐ تک چلے آرہے ہیں اور وہ غیر مبدل بھی ہیں۔تو اس طریقے پر کیا ہم اسلام کی تعریف یہ نہیں کرسکتے کہ اسلام نام ہے صرف ان محکمات کا جو حضرت نوحؑ سے لے کر تا ایں دم چلے آرہے ہیں۔اور یہ سب مذاہب میں عام ہیں اور ان مشترکات کو تلاش کرنا اسلام کی خدمت ہوگی؟

جواب: جو اصطلاح اختیار کرنا چاہیں آپ کو اختیار ہے...... ''لا مشاحة فی الاصطلاح'' (ترجمہ: اصطلاح میں کوئی جھگڑا یا اختلاف نہیں ہونا چاہئے)۔لیکن اسلام کی اصطلاح کو جب قرآن پاک اور رسول پاک ﷺ کی سنت کے سیاق وسباق میں استعمال کیا جائے گا تو اسی مفہوم میں استعمال کیا جائے گا جس میں قرآن پاک نے اس اصطلاح کو استعمال کیا ہے۔قرآن پاک نے یہ لفظ اس مشترکہ اور متفقہ دین کے لئے بھی استعمال کیا ہے جس کا ابھی آپ نے ذکر کیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ قرآن پاک نے اس کو دوسرے مذاہب سے الگ ممیز دین کے طور پر بھی استعمال کیا ہے۔چونکہ وہ اسلام جس کی حضرت نوحؑ نے تعلیم دی،حضرت ابراہیمؑ نے تعلیم دی،آج اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں ہے۔اس لئے جب اسلام کا لفظ آج بولا جائے گا تو اس سے مراد دین کی وہی شکل ہوگی جو رسول اللہ ﷺ نے ہم تک پہنچائی۔قطع نظر اس کے کہ دوسرے انبیاءؑ کی تعلیم میں اس میں سے کون سے محکمات شامل تھے اور کون سے محکمات شامل نہیں تھے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: پیدائش کے وقت مسلم بچے کے کان میں اذان کی آواز دی جاتی ہے اس کے باوجود وہ صحیح مسلمان نہیں بنتا۔کمزوری یا نقص کہاں ہے؟

جواب: کمزوری یا نقص تعلیم وتربیت میں ہے۔اگر تعلیم وتربیت کا نظام درست ہوجائے تو اس سے بیش تر مسئلے حل ہوسکتے ہیں۔مسلمان جب اسلامی ماحول میں تربیت پاتا تھا،اس کی ابتدا پیدائش کے بعد شروع ہوجاتی تھی،پھر جس گھر میں وہ پیدا ہوتا تھا اس کا ماحول اس کی تربیت کرتا تھا۔پھر وہاں تعلیم کا ایک بہترین نظام تھا جس کی اہمیت کو سب سے زیادہ تسلیم کیا جاتا تھا۔مسلمانوں کے دور اقتدار میں تعلیم کا تناسب سو فیصد تھا۔۱۸۳۵ء میں ایک مغربی مفکر نے لکھا کہ پنجاب میں (جو مرکز سے خاصا دور تھا) مسلمانوں کا تعلیمی تناسب ۱۰۰ فیصد اور بحیثیت مجموعی ۸۴ فیصد ہے۔گویا جب پنجاب میں مسلمانوں کا اقتدار تھا تو خواندگی ان میں سو فیصد تھی اور جب انگریز یہاں سے رخصت ہوا تو پنجاب میں بحیثیت مجموعی تعلیمی تناسب چار فیصد تھا۔اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ جو تہذیب سکھانے آئے تھے وہ کیا کر کے گئے

ہیں۔ چونکہ مسلمانوں میں تعلیم کی شرح سو فیصد تھی اوران کے ہاں تعلیم اور تربیت ایک ہی چیز تھی اور آج کی طرح وہ دو علیحدہ علیحدہ چیزیں نہ تھیں، اس لئے چار پانچ سال کی عمر میں ایک بچہ ضروری تعلیم اور لازمی دینی تربیت مکمل کر چکتا تھا اوراس کے اسلامی مزاج کی تشکیل ہو جاتی تھی۔ پھر جب تعلیم کے میدان میں آگے آتا تو تعلیم مکمل طور پر مذہب اسلام کی روشنی میں ہوتی تھی اس وجہ سے اس کی شخصیت میں خود بخود نکھار آ جاتا تھا۔اس کی زندگی اوراس کے شعبہ حیات میں خواہ کسی بھی شعبے سے وابستہ ہوان دونوں میں کوئی دوئی نہیں تھی کہ کہیں وہ مشرق کی بات کر رہا ہواور کبھی وہ مغرب کی بات کرتا ہو۔ اسلامیات میں اس کے خیالات کچھ ہوں اور تاریخ میں کچھ ہوں، سیاسیات میں اس کی رائے کچھ ہواور دینیات میں کچھ ہو، بلکہ تمام علوم کا نتیجہ ایک ہی ہوتا تھا کہ ایک مکمل اور متوازن اسلامی شخصیت تشکیل پاتی تھی جس میں مکمل ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ پھر وہ جب تعلیم سے فارغ ہو کر معاشرے میں عملی زندگی کا آغاز کرتا تو وہ معاشرہ بھی چونکہ اسلامی ہوتا تھا اور کاروبار میں، تجارت میں، زراعت میں ہر جگہ اسلامی اصول کارفرما ہوتے تھے اس لئے باہر سے آنے والے کی عملی تربیت خود بخود ہو جاتی تھی۔ یہ سلسلہ ماضی قریب تک جاری رہا۔مثال کے طور پر دارالعلوم دیوبند کے قیام سے وہاں سے یہ اثرات پیدا ہوئے کہ دیوبند کی پوری بستی میں اسلامی مزاج اور اسلامی روح سرایت کر گئی تھی۔ ایک صاحب ان دنوں کسی کام سے آئے، پڑھے لکھے تھے، دور دراز سے کسی شادی میں شرکت کے لئے آئے تھے، وہ خریداری کے لئے دیوبند کے بازار گئے، اور ایک سنار کے پاس پہنچے اور کچھ زیور ادھار خریدنا چاہا اور کہا کہ میں فلاں مشہور آدمی (اس کا نام لیا) کا مہمان ہوں، کل آپ کو رقم بھیج دوں گا۔ سنار نے کہا آپ کو مسئلہ معلوم نہیں کہ سونے اور چاندی میں ادھار لین دین سود ہے اور یہ جائز نہیں ہے۔ اب ان کو احساس ہوا کہ سنار مسئلہ ٹھیک بتاتا ہے۔ گاہک نے کہا کہ اچھا ٹھیک ہے میں کل دوبارہ رقم کا بندوبست کر کے آؤں گا اور زیور خریدلوں گا۔ سنار نے کہا آپ یوں خالی ہاتھ واپس نہ جائیں آپ مجھ سے ہی ادھار رقم لے لیں اور جو زیور خریدنا چاہئیں خریدلیں۔ کل میرا ادھار واپس لوٹا دیں۔ تو اس طرح ان صاحب نے زیور خریدا۔ بڑے حیران تھے کہ ایک سنارا اپنے کاروبار کے سلسلے میں نہ صرف مکمل طور پر ضروری فقہی مسائل سے آگاہ ہے بلکہ پیش آمدہ مسئلے میں اجتہادی بصیرت کا بھی مالک ہے۔ یہ معاشرتی ماحول کی بات ہے، صرف اذان سننا کافی نہیں۔اذان تو جب آج کل کے مسلمان دیتے ہیں تو اس کو صرف کان ہی سنتے ہیں۔لیکن دل سے جو اذان دی جائے اس کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ قیامت ہا کہ در قد قامت اوست۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: اگر کسی شخص تک اس دور میں دعوت دین نہیں پہنچی اور وہ اسی حالت کفر میں مر گیا تو اسی کے بارے میں کیا حکم ہوگا۔ نیز یہ کہ اس بارے میں ہم کتنے مجرم ہوں گے؟

جواب: آخرت میں اس کا معاملہ کیا ہوگا؟ اس سلسلے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ اللہ اور بندے کا باہمی معاملہ ہے۔اس سلسلے میں حتمی طور پر ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔لیکن قرآن پاک کی بے شمار آیات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر امت محمدیہ کے لوگوں نے دین اسلام کی تبلیغ دوسروں تک پہنچانے میں حجت تمام کر دی ہو تو روز قیامت ان سے باز پرس ہوگی، ورنہ نہیں۔اس سلسلے میں متقدمین علما نے اس پر جو کچھ لکھا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ غالب اکثریت علما کی اس بات کی قائل ہے کہ توحید پر ایمان لانے کے لئے کسی خارجی دعوت کی ضرورت نہیں۔اس لئے کہ توحید انسان کے اندر ایک فطری جذبہ ہے۔ پھر اس کے شواہد کائنات میں اس قدر نمایاں ہیں کہ توحید پر ایمان کا جذبہ انسان کے اندر سے خود بخود پیدا ہونا چاہئے۔اس کے ضمیر کو خود اس کی گواہی دینا چاہئے۔اس سے آگے رسالت پر ایمان، رسول اللہؐ کی نبوت پر اور قرآن پاک پر ایمان، یہ اشیا ایسی ہیں جن پر ایمان کے لئے اتمام حجت ضروری ہے اور اتمام حجت کے لئے دعوت و تبلیغ ضروری ہے۔قرآن پاک کی آیات سے پتا چلتا ہے کہ قیامت کے روز جب سوال و جواب ہوں گے تو ہر نبی اپنی امت کے بارے میں کہے گا کہ اس نے دعوت دین دے دی تھی۔ان کی امت البتہ اس سلسلے میں انکاری ہوگی۔رسول اللہؐ نے بھی اپنی امت تک دین کی دعوت پہنچائی ہے۔ خطبہ حجۃ الوداع میں آپ نے اس بات کا امت سے تین بار اقرار کرایا کہ آپ نے دعوت پہنچا دی ہے، اور امت نے تین مرتبہ تسلیم کیا۔اس پر آپ نے تین مرتبہ اللہ تعالیٰ کو گواہ بنایا کہ اے اللہ! میں نے اپنا کام کر دیا ہے۔اس کے بعد آپ نے امت کو حکم فرمایا: **فلیبلغ الشاھد الغائب**، اب اس امت کے لوگوں پر درجہ بدرجہ یہ فرض ہو گیا۔اس لئے کہ امت کو حکم دے دیا گیا کہ جو موجود ہیں وہ غیر موجود لوگوں تک یہ دعوت پہنچا دیں۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: داڑھی کے بارے میں آج کل بحث کرنا بھی ایک فیشن بن گیا ہے کہ داڑھی اتنی ہونا چاہئے اور اتنی نہیں ہونا چاہئے۔اس بارے میں ارشاد فرمائیں۔

جواب: میری ناقص رائے میں داڑھی رکھنا سنت مؤکدہ ہے۔آپؐ نے خود بھی داڑھی رکھی،آپ کے صحابہؓ نے بھی رکھی اور آپؐ نے داڑھی رکھنے کا حکم بھی فرمایا۔ داڑھی کے سائز کے بارے میں کوئی واضح طور پر حکم نہیں ملتا،سوائے اس کے کہ آپ نے فرمایا:**قصوا الشوارب و اعفوا اللحی**، کہ مونچھیں کٹواؤ اور داڑھی بڑھاؤ۔لیکن اس کا کوئی متعین سائز آپ نے مقرر نہیں کیا۔تاہم صحیح روایات سے آنجنابؐ کی لحیہ مبارکہ کا جو سائز معلوم ہوتا ہے وہ ایک مشت یا اس سے کچھ زائد کا ہے، مثلاً ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ جب نماز کی امامت کراتے تو تلاوت فرماتے ہوئے داڑھی مبارک کندھوں کے اوپر سے ہلتی ہوئی نظر آتی تھی۔اس سے اس کے گھنے ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔رسول اللہؐ کی ہر چھوٹی سے چھوٹی بات میں پیروی،صحابہؓ کا طرہ امتیاز تھا۔صحابہؓ ہر معاملے میں سیرت رسول کی پابندی کا انتہائی خیال رکھتے تھے۔حضرت عبداللہ بن عمرؓ اس بارے میں سب صحابہ سے ممتاز تھے۔ان کی کوشش ہوتی تھی کہ ہر کام عین اسی طرح کریں جس طرح رسول اللہؐ نے کیا تھا۔ حتیٰ کہ سفر حج پر جاتے ہوئے بھی آپ اسی راستے سے جاتے تھے جس راستے سے رسولؐ اللہ تشریف لے گئے تھے،اور اسی راستے سے واپس آتے جس راستے سے رسول اللہؐ نے واپسی فرمائی تھی۔داڑھی کے معاملے میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا عمل یہ تھا کہ زائد از یک مشت وہ کٹوا دیا کرتے تھے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضورؐ کی عادت مبارکہ بھی یہی تھی۔اس لئے یہی سائز افضل اور پسندیدہ ہے،تاہم داڑھی اس سے کم وبیش بھی ہوسکتی ہے۔یہ کوئی اصول دین کا مسئلہ نہیں کہ اس پر کفر واسلام کا مدار ہو۔

(اسلام کا قانون بین الممالک،ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: حج کے سلسلے میں بعض لوگوں کا طریقہ یہ بن گیا ہے کہ وہ یہاں سے عمرے کے لئے چلے جاتے ہیں اور پھر وہاں چھپ کر رہتے ہیں اور مزدوری کر کے دولت کماتے ہیں اور پھر حج کر کے واپس آتے ہیں،کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب: دولت کمانا جائز ہے۔اس میں کوئی چیز حرام نہیں ہے۔لیکن عمرے کی نیت سے جانا اور وہاں غیر قانونی طور پر ٹھہرنا درست نہیں ہے،اس لئے کہ عمرے پر جاتے ہوئے اس سلسلے میں جن کاغذات پر دستخط کرائے جاتے ہیں ان میں جانے والے سے اس بات کا وعدہ بھی لیا جاتا ہے کہ وہ عمرے کے سلسلے میں تمام قوانین وقت کی پابندی کرے گا،لہٰذا ان قوانین کی پابندی ہم پر ضروری ہے۔اس بنا پر وہاں ٹھہرنا جائز نہیں ہے۔لیکن اس عرصے کی تمام عبادات،نماز،روزہ،نوافل،سب جائز ہوں گے اور اسی طرح وہاں رہ کر رزق حلال جو کمایا وہ بھی جائز ہوگا۔اس کی مثال یوں سمجھیے کہ ایک شخص نے کسی ناجائز غرض سے سفر کیا،مثلاً چوری کی نیت سے سفر کیا اور دوران سفر وہ نمازیں پڑھتا رہا تو اس سفر میں پڑھی جانے والی نمازیں یقیناً جائز ہوں گی۔اس دوران ہوٹل میں ٹھہرا اور وہاں کھانا کھایا اور اس کی ادائیگی کی،یہ بھی جائز ہوگا۔سفر کا ناجائز ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ اس سفر کے دوران کی گئی عبادات یا جائز معاملات بھی ناجائز ہوگئے ہیں۔

(اسلام کا قانون بین الممالک،ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: ڈاکٹر صاحب!ایک ہی ملک میں مساجد کے قبلے کے بارے میں اختلاف کو آج کے دور میں کیونکر حل کیا جاسکتا ہے؟

جواب: قبلے کا مسئلہ ایسا نہیں ہے جو کہ حل طلب نہ ہو۔اس کا حکم یہ ہے کہ قریب ترین رخ سے اس سمت کو اختیار کرلیا جائے جس پر کعبہ واقع ہے۔قرآن پاک میں اس سلسلے میں جو احکام آئے ہیں اور سنت رسول اللہؐ میں اس سلسلے میں جو وضاحتیں ملتی ہیں ان کو سامنے رکھ کر فقہا نے قبلے کے تعین میں تین اصول قائم کیے ہیں:ایک قبلہ اس شخص کا ہے جو مسجد حرام کے اندر موجود ہے۔ایک قبلہ اس شخص کا ہے جو مکہ مکرمہ کے قرب وجوار میں موجود ہے۔ایک قبلہ اس شخص کا ہے جو دنیا میں کسی بھی جگہ موجود ہے۔جو شخص مسجد حرام میں موجود ہے اس کا قبلہ یہ ہے کہ کعبۃ اللہ عین اس کے سامنے موجود ہو۔اگر اس کی ناک کی سیدھ کسی اور طرف ہے تو اس کا رخ قبلے سے ہٹا ہوا سمجھا جائے گا۔جو شخص مکہ مکرمہ میں ہے اس کے لئے مسجد حرام قبلہ ہے،اگر اس کی ناک کی سیدھ میں مسجد حرام آجاتی ہے تو اس کی نماز درست ہوجائے گی،اس کے لئے بالکل کعبے کی سیدھ ضروری نہیں۔جو شخص دنیا کے کسی بھی حصے میں رہتا ہے اس کے لئے فقہائے اسلام نے کہا ہے کہ جہاں وہ کھڑا ہے اگر وہاں سے اس کے سامنے سے دائیں بائیں ایک لائن کھینچ دی جائے اور اس کے درمیان میں کہیں مکہ آجائے تو یہ قبلہ کی تعیین کے لئے کافی ہوگا۔قرآن نے اس کے لئے ''**شطر**'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔''**فولوا وجوهكم شطره**'' (البقرۃ ۲:۱۴۴)''**نحوه**'' کا لفظ استعمال نہیں کیا اور نہ ہی ''**اليه**'' کا لفظ استعمال کیا۔شطر کے معنی ہیں ٹکڑا یا حصہ۔یعنی

عمومی رخ اس طرف ہونا چاہئے جس طرف قبلہ ہے۔ یہ تو قبلے کا عام حکم ہے۔ جو علاقے مکہ مکرمہ کے قریب آباد ہیں یا اس رخ پر قرب وجوار میں آباد ہیں ان کا قبلہ مسجد حرام کی سمت ہے۔ لیکن جو علاقے ایسے خطے پر واقع ہیں جیسے برازیل، جہاں بیت اللہ کی سمت دونوں طرف شمار ہوسکتی ہے تو بیت اللہ کے قریب ترین راستے سے قبلے کا تعین کیا جائے گا۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: کیا ہمارا پرائیویٹ انٹرنیشنل لا کسی اسلامی ملک میں مکمل یا جزوی طور پر پایا جاتا ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ دور قدیم میں لوگ دور دراز سے حج کرنے کے لئے آتے تھے اور اب کیا طریقہ ہونا ہو چاہئے؟

جواب: موجودہ دور میں جہاں تک مسلمانوں کے پرائیویٹ انٹرنیشنل لا پر عمل کرنے کا تعلق ہے تو بعض دفعات پر عمل ہو رہا ہے، بعض پر نہیں ہو رہا۔ جیسا کہ اسلامی قوانین کے دیگر شعبوں کے بارے میں ہے کہ بعض پر عمل ہو رہا ہے بعض پر نہیں ہو رہا۔ پرائیویٹ انٹرنیشنل لا کے بعض قوانین ایسے ہیں جن پر مسلمان اپنے طور پر عمل کر سکتے ہیں جس میں حکومتی مداخلت یا جبر قطعاً شامل نہیں ہوتا۔ جہاں تک پرائیویٹ انٹرنیشنل لا کے اس شعبے کا تعلق ہے جس میں حکومتی مداخلت ضروری ہے اس میں بھی یہی صورت ہے کہ بعض پر عمل ہو رہا ہے بعض پر نہیں ہو رہا۔ رہا حج کا سوال تو فتح مکہ سے لے کر ۱۹۲۵ء تک تمام مسلمان آزادانہ حج کیا کرتے تھے۔ کوئی ویزا یا پاسپورٹ کا تعلق یا مسئلہ نہ تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج جو بعض ناروا پابندیاں لگائی گئی ہیں انہیں ختم ہونا چاہئے۔ یہ پابندیاں ۱۹۰۲ء میں انگریزوں نے بھی یہاں لگائی تھیں۔ حج ایک صاحب استطاعت مسلمان پر فرض ہے۔ اس فرض کی ادائیگی میں حکومتوں کو کم سے کم رکاوٹیں تو نہیں پیدا کرنا چاہئے۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: آپ نے کہا کہ کوئی شخص پاکستان میں جرم کر کے ہندوستان چلا گیا، فرض کیجئے اس نے قتل کیا تھا۔ پھر بعد ازاں وہ واپس آ گیا اور اسلام قبول کر لیا۔ تو کیا اس سے قصاص لیا جائے گا۔ حالانکہ اسلام قبول کرنے سے سابقہ جرائم معاف ہو جاتے ہیں؟

جواب: آپ نے جس حدیث کے حوالے سے سوال پوچھا ہے اس کا تعلق صرف حقوق اللہ سے ہے۔ اسلام قبول کرنے سے شرک معاف ہو جاتا ہے، سابقہ غلطیاں اور متروکہ نمازیں معاف ہو جاتی ہیں۔ لیکن حقوق العباد معاف نہیں ہوتے ہیں۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: مرتد کو سزائے موت دی جاتی ہے۔ جب کہ قرآن میں ہے **لا اکراہ فی الدین.**

جواب: دو باتیں ذہن میں رکھئے۔ پہلے تو یہ کہ **لا اکراہ فی الدین** کے معنی یہ ہیں کسی کو اسلام قبول کرنے پر زبردستی مجبور نہیں کیا جائے گا۔ جب ایک فرد بخوشی اسلام قبول کر لے تو پھر کچھ احکام ایسے ہیں کہ ان کی پابندی کرائی جائے گی۔ آیت کریمہ اس پر منطبق نہ ہوگی۔ **لا اکراہ** کا یہ بیان کردہ مفہوم اگر مان لیا جائے تو کل کو کوئی فرد یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ یہ پانچ نمازیں پڑھانے کی زبردستی کیوں ہے؟ ایک بات۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ سوال اس لئے پیدا ہوا کہ ہم میں سے مذہب کے بارے میں اکثر لوگ وہ تصور رکھتے ہیں جو یورپ میں عیسائیت کے بارے میں پایا جاتا ہے۔ یورپ میں مذہب کے بارے میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ مذہب سچ اور جھوٹ دونوں کی آمیزش ہے۔ یا یہ کہہ لیجئے کہ ہمارے ہاں اجتہاد کا جو تصور ہے وہ اہل یورپ کا تصور مذہب ہے کہ جس میں غلطی کا امکان پایا جاتا ہے، جس طرح اجتہاد کے بارے میں غلطی کا امکان ہے۔ لیکن اسلام کے منصوص احکام کے بارے میں ایسا سوچنا بھی غلط ہے۔ اس لئے کہ اللہ کے بیان کردہ احکام میں غلطی کا امکان بالکل نہیں ہوسکتا۔ یا یہ دیکھیے کہ ہم اپنے فقہی مسالک میں دی گئی اجتہادی جزئیات میں سے کسی کے ماننے نہ ماننے سے کسی مسلمان کی تکفیر نہیں کر سکتے، بلکہ کوئی شخص مسلمان رہتے ہوئے بھی کسی اجتہادی رائے سے اختلاف کر سکتا ہے۔ یہی تصور وہاں مذہب کا ہے کہ جس حکم کو چاہیں مانیں جس کو چاہیں نہ مانیں۔ قرآن وسنت کے احکام کی یہ حیثیت نہیں ہے۔ وہ قطعی اور یقینی طور پر مبنی برحق ہیں۔ ان کا انکار اسلام کی بنیاد کو منہدم کرنے کے مترادف ہے۔ اس بنا پر اسلام میں مرتد کی سزا موت ہے کہ ایسا شخص اسلام کی بنیاد کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: فتح مکہ کے موقع پر حضرت عثمانؓ نے ایک عورت کو امان دی اور آپ نے قبول بھی کر لی۔ لیکن فرمایا کہ تم میں سے کوئی ایسا نہ تھا کہ اس کو قتل کر دیتا کر دیتا۔ کیا حضرت عثمانؓ کی امان کو امان نہیں سمجھا گیا تھا۔ یا کوئی اور وجہ تھی۔ نیز کیا اسلام قبول کرنے والے کی جائداد اسلام قبول کرنے سے پہلے ناجائز ذرائع سے کمائی ہوئی ہے تو کیا وہ جائداد اب اس کا حق ہے یا نہیں؟

جواب: حضرت عثمان غنیؓ سے منسوب جو سوال آپ نے پوچھا ہے شاید آپ سے اس میں بھول ہوئی ہے۔ امان عورت کو نہیں بلکہ حضرت عثمانؓ ہی کے ایک عزیز عبداللہ بن سعد ابی سرح کو دی گئی تھی۔ ان کا معاملہ یہ تھا کہ اس واقعے سے کئی سال قبل وہ اسلام قبول کر کے مدینہ آ گئے تھے۔ لیکن اسلام غالباً اس وقت تک ان کے دل میں راسخ نہ ہوا تھا۔ رسول اللہؐ نے انہیں کتابت وحی پر مامور کر دیا۔ حضرت عبداللہ بن سعد کسی وجہ سے مرتد ہو کر مکہ چلے گئے اور اسلام کے بارے میں منفی پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ جب مکہ فتح ہوا تو تقریباً آٹھ افراد کے بارے میں رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اگر وہ غلاف کعبہ سے بھی لپٹے ہوئے ملیں تو ان کو قتل کر دیا جائے۔ ان آٹھ میں سے ایک یہ عبداللہ بن سعد ابی سرح بھی تھے۔ ان میں کچھ کو (غالباً دو کو) قتل کر دیا گیا اور کچھ کو معاف کر دیا گیا۔ بقیہ لوگ بشمول عبداللہ بن سعد مکہ سے فرار ہو گئے۔ حضرت عثمانؓ نے سوچا کہ جس طرح حضورؐ نے ان میں سے بعض افراد کو معاف کر دیا ہے انہیں بھی معاف کر دیا ہوگا۔ لہٰذا ان کو اپنے ہمراہ لے کر حضرت عثمان غنیؓ حضورؐ کے پاس لے آئے۔ حضرت عثمانؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! عبداللہ بغرض توبہ آئے ہیں۔ آپ خاموش رہے۔ پھر عرض کیا: پھر حضور خاموش رہے۔ پھر عرض کیا: پھر خاموش رہے۔ پھر عرض کیا تو آپؐ نے ان کی توبہ قبول کر کے ان کو دوبارہ اسلام میں داخل کر لیا۔ اس طرح وہ تائب ہو کر چلے گئے، ان کے جانے کے بعد آپ نے حاضرین مجلس سے فرمایا: تم لوگوں میں سے کسی نے اسے قتل نہ کر دیا۔ ایک صحابی نے عرض کیا: حضور ہمیں اشارہ فرماتے تو ہم اسے نہ چھوڑتے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا: نبی کے لئے جائز نہیں کہ آنکھوں کے اشاروں سے معاملات نمٹائے۔ یہ ہے اصل واقعہ۔ واقعہ عام امان کا نہیں بلکہ یہ واقعہ ایک جنگی مجرم کا ہے۔ لیکن اللہ کے رسولؐ نے ایسے سنگین جرائم کے مرتکب کو بھی حضرت عثمانؓ کی درخواست پر امان دی۔ بعد میں انہوں نے اسلامی فتوحات میں بڑا حصہ لیا، مصر، سوڈان، نوبیا کو فتح کیا، مسلمانوں کے پہلے بحری بیڑے کے کمانڈر تھے۔ اور بحری معرکے کے ذریعے قبرص فتح کیا۔ جائداد کے سلسلے میں تفصیل سے عرض کر چکا ہوں۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: حضرت عمرؓ نے فرمان جاری کیا تھا کہ قریش کو غلام نہیں بنایا جائے گا۔ ایسا حکم غیر قریش کے بارے میں کیوں نہ دیا گیا؟

جواب: دیکھیے یہ اعلان حضرت عمرؓ فاروق نے نہیں کیا تھا بلکہ خود حضورؐ نے کیا تھا کہ عربوں کو غلام نہیں بنایا جائے گا۔ حضرت عمرؓ فاروق نے اسے مزید وضاحت کے ساتھ دوبارہ جاری فرمایا۔ یہ عربوں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں تھی بلکہ خود قرآن کے ایک حکم کی تعمیل تھی۔ قرآن نے عربوں میں کہا تھا: **تقاتلو نھم اویسلمون** (الفتح ۱۶:۴۸) کہ یا تو یہ اسلام قبول کر لیں، یا پھر ان سے جنگ کرو۔ نیز کہا گیا: **واقتلو ھم حیث ثقفتمو ھم** (البقرۃ ۲:۱۹۱) کہ انہیں جہاں پاؤ قتل کر دو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ رہی ہے کہ جس قوم کو براہ راست انبیائے کرام علیہم السلام کے ذریعے دین کی دعوت دی گئی ان کے لئے صرف دو صورتیں رکھی گئیں: یا تو وہ اس دعوت کو قبول کر لیں یا انکار کی صورت میں ان کو ختم کر دیا جائے۔ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام تک کی قوموں کا مطالعہ اس کی تائید کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ اصول عربوں کے بارے میں بھی قائم رکھا کہ اسلام قبول کرو، ورنہ ختم کر دیے جاؤ گے۔ تیسری صورت غلامی ان کے لئے جائز ہی نہیں رکھی گئی۔ عرب، اسلام قبول کریں یا جزیرۂ عرب چھوڑ جائیں یا تلوار کا سامنا کریں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ رسول کے براہ راست مخاطب تھے، ان کے لئے حکمرانی پسند کی گئی تھی، محکومی نہیں۔ غلامی محکومی کی ایک صورت ہے۔ ایک سبب تو یہ تھا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ عرب کو اسلام کے مرکز کے طور پر چن لیا گیا تھا۔ وہاں کسی دوسرے کو باقی رہنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ رسول اللہؐ نے بستر مرگ پر جو ہدایات جاری فرمائی تھیں ان میں یہ ہدایت بھی شامل تھی: **لا یجتمع دینان فی جزیرۃ العرب.** کہ عرب میں دو دین جمع نہیں ہو سکتے، اس لئے وہاں یہودیوں اور عیسائیوں کو رہنے کی اجازت نہیں دی گئی اور انہیں جلاوطن کر دیا گیا۔ اور جلاوطن بھی یوں کیا گیا کہ حضرت عمرؓ نے انہیں ایک سال کی مدت دی اور کہا گیا کہ تم اپنی تمام اشیاء فروخت کر دو اور ہم مارکیٹ سے دوگنا قیمت پر انہیں خرید لیں گے، ایک گائے کی قیمت دو

گائے کے برابر ہوگی۔اس پر ان کی اپنی پسند سے ان کو شام بھیجا گیا۔وہاں انہیں زمینیں اور جائدادیں دی گئیں اور وہاں آباد ہو گئے، لیکن مشرکین عرب کے ساتھ ایسی کوئی رعایت نہیں رکھی گئی۔اس لئے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے براہ راست حریف رہے اور آخر تک حریف رہے۔ان کے لئے صرف اسلام یا تلوار میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: آپ نے مسئلہ غلامی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ عیسائیوں کی طرف سے جو جواب دیا جاتا ہے وہی قرآن کی طرف سے مسلمان دے سکتے ہیں۔سوال یہ ہے کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلام، آخری سب سے بڑا، جامع اور عالم گیر مذہب ہے تو اسے اس عالم گیر مسئلے کو حل کرنا چاہئے تھا، آخر اس نے عیسائیت جیسا رویہ کیوں اپنایا؟

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن پاک میں جیسا کہ میں نے عرض کیا کہیں بھی غلامی کا حکم نہیں دیا گیا۔رسول اللہؐ نے جنگی قیدیوں کو صرف غلام بنانے کی اجازت ہی نہیں دی، بلکہ اس کے لئے مفصل قواعد و احکام پر مشتمل ضابطہ بھی عنایت فرمایا۔مزید برآں خود حضورؐ نے جتنی جنگیں لڑیں، جن کی تعداد درجنوں میں ہے اور آپ کے حکم سے جو دستے بھیجے گئے، جن کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔ان میں سے بہت کم، شاید ایک یا دو جنگیں، ایسی تھیں جن میں جنگی قیدی غلام بنائے گئے۔

پھر غلام بنانے کے ساتھ ساتھ انہیں جو حقوق دیے گئے ان کی پوری تفصیل کتب حدیث وفقہ میں موجود ہے۔اس کی بنیاد پر فقہا نے ایک مفصل قانون ترتیب دیا۔ اسلامی قانون کی کوئی کتاب ایسی نہیں جس میں غلاموں کی آزادی کی مختلف شکلیں اور اس کے مفصل احکام بیان نہ ہوئے ہوں اور غلاموں کی آزادی کے فضائل بیان نہ کیے گئے ہوں۔اس کے احکام کیا ہیں، یہ فقہ کی ہر کتاب میں موجود ہے۔پھر ان غلاموں کو معاشرے میں باعزت طریقے سے کیسے رکھا جائے اور انہیں آہستہ آہستہ معاشرے کا معزز شہری کیسے بنایا جائے؟ اس کے لئے ہدایات دی گئی ہیں، پھر یہ کہ مسلم معاشرے میں جو ایک معزز شہری کو دینی، اخلاقی، سیاسی حقوق حاصل ہیں وہ غلاموں کو بھی حاصل ہیں۔غلاموں کے بارے میں یہ طرز عمل انہی احکام پر مبنی ہے جو رسول اللہؐ نے بیان کیا ہے۔لیکن آپ نے غلامی کو بالکل ختم نہیں کیا۔قرآن پاک میں بھی کوئی ایسا حکم نہیں ہے جس میں غلامی کو مکمل طور پر ناجائز قرار دیا گیا ہو۔میں سمجھتا ہوں کہ غلامی اگرچہ بری چیز ہے اور ایک ناپسندیدہ امر ہے اور اسلام کا مزاج یہ ہے کہ جتنا جلد ہو سکے اس کو ختم کیا جائے۔لیکن بعض اوقات ایسے حالات پیش آ سکتے ہیں کہ اس ناگزیر برائی کو اختیار کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔جیسے طلاق، کہ رسول اللہؐ نے اس کے بارے میں فرمایا: أبغض الحلال عندالله الطلاق. دیکھیے طلاق کو ناپسندیدہ کہا گیا، لیکن حرام نہیں قرار دیا گیا۔اس قسم کی اور مثالیں بھی ہیں کہ شریعت نے ایک چیز کو ناپسندیدہ کہا لیکن حرام قرار نہیں دیا۔اسی طرح غلامی حرام اس لئے نہیں کی گئی کہ بعض اوقات جنگی قیدیوں کا مسئلہ حل کرنے کی اس کے علاوہ کوئی اور صورت اسلامی نقطہ نظر سے قابل عمل نظر نہیں آتی۔آپ غور کیجئے کہ جہاں بڑی تعداد میں جنگی قیدی ہوں۔خاص طور پر بڑی جنگوں میں بڑی تعداد میں آئیں گے۔ان کا ڈسپوزل کیسے کیا جائے گا؟ غور کریں تو اس کی کئی صورتیں ممکن ہو سکتی ہیں، مثلاً میں جاپان و جرمنی کی مثال دیتا ہوں۔دوسری جنگ عظیم میں صرف روس اور جرمنی کے تقریباً دو کروڑ افراد مارے گئے، اسی طرح سے اتنی ہی تعداد میں جاپانیوں اور دوسری اقوام کا نقصان ہوا۔فرض کیجئے کہ اس جنگ میں مسلمان فاتح ہوتے اور اتنی تعداد میں دشمن مارے گئے ہوتے تو ایسی صورت میں ان کروڑوں عورتوں کا جو جنگی قیدی ہوتیں، کیا حل ہو سکتا تھا؟ ایک طریقہ یہ تھا کہ آپ ان جنگی قیدیوں کو بڑے بڑے باڑے اور قید خانے بنا کر ان میں بند کر دیں، جس طرح کہ ہٹلر نے یہودیوں کے ساتھ کیا۔اور آج تک دنیا اس کو برے نام سے یاد کرتی ہے۔دوسری بہتر صورت یہ ہے کہ ان کروڑوں عورتوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ایک حل اس کا یہ تھا کہ ان سے جبری مشقت لی جاتی اور جبری مشقت کے لئے ان کو زبردستی کھیتوں اور کارخانوں میں کام پر لگا دیا جاتا لیکن اس جبری مشقت کے لئے بھی ان کو گھروں کی، کپڑے کی اور دو وقت کھانے کی ضرورت پڑتی۔ان سب چیزوں کا بندوبست ریاست کہاں سے کرتی۔پھر ان کروڑوں جوان عورتوں کو یونہی بے شوہر رکھنے سے دوسری اخلاقی اور نفسیاتی خرابیاں پیدا ہوتیں۔ایک حل یہ تھا کہ ان قیدی خواتین کو ویسے ہی مسلم معاشرے میں چھوڑ دیں کہ یہ کروڑوں بے سہارا، بے شوہر اور بے گھر عورتیں جو چاہیں کریں۔اگر یہ قیدی جنگی صلاحیت رکھنے والے مرد ہوں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے اتنی بڑی تعداد میں جن مفتوحین کو دشمن سے توڑا ہے اسے واپس دشمن کو لوٹا دیا جائے اور وہ دوبارہ آپ کے مقابلے میں اسی طرح کھڑے ہو جائیں جیسے جرمنی پہلی جنگ عظیم کے بعد دوبارہ ایک خطرہ بن گیا، ایک آخری حل یہ ہے کہ ان جنگی قیدیوں کے بارے میں کوئی ایسا طرز عمل اختیار کریں کہ وہ بالآخر مسلم معاشرے کا ایک حصہ بن جائیں اور کچھ عرصہ مسلم معاشرے میں رہ کر وہ اسلامی تہذیب کو اپنا لیں اور یوں آخر کار معاشرے کے باعزت شہری بن جائیں۔اسلام

نے ان کے بارے میں یہ آخری طرزِعمل اختیار کیا جو ماضی کے رائج شدہ سارے طریقوں سے مختلف تھا۔اس طرزِعمل سے اس نے لاکھوں افراد کو جینے کا حق دے کر معاشرے کا باعزت شہری بنا دیا،اور یہ طرزِعمل ماضی کے تمام مروجہ طریقوں سے زیادہ کامیاب رہا۔رہا سوال کہ واضح طور پر اس کو ختم نہیں کیا۔آپ فرض کریں کہ پچاس لاکھ جنگی قیدیوں کی تعداد آ جائے جیسا کہ جرمنی میں ہوا۔اب ایک صورت یہ ہے کہ انہیں ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے، یہ ظالمانہ اقدام ہے جس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ایک یہ ہے کہ آپ ان کو معاشرے میں ویسے ہی کھلا رہنے دیں۔اس سے وہ بداخلاقی پیدا ہوگی جس کا سامنا جاپان اور جرمنی کو کرنا پڑا۔اور مسلم معاشرہ اس انارکی کی اجازت نہیں دے سکتا۔ایک یہ کہ آپ ان کو خاندانوں کا حصہ بنا کر انہیں بکھیر دیں کہ وہ بداخلاقی کے مرتکب بھی نہ ہوں اور ان کی ضروریات کی تکمیل بھی ہو اور کچھ عرصے کے بعد یہ کیفیت ہو کہ پتا نہ چلے کہ آزاد کون ہے اور غلام کون۔آزاد غلام یوں ملیں جلیں کہ باہم رشتہ داریاں تک قائم ہو جائیں۔میرے خیال میں یہ معقول ترین طریقہ تھا جو اسلام نے اختیار کیا۔آپ اس کو عارضی قید بامشقت کہہ سکتے ہیں جس کے لئے قید خانوں اور جیلوں کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں کے بجائے کھلے ماحول اور آزاد معاشرے کا انتخاب کیا گیا اور قیدی اس مقصد کے لئے گھروں میں بانٹ دیے گئے۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: اہل کتاب اور مشرکین کی وضاحت فرما دیں۔اور یہ فرما دیں کہ ان کی عورتوں سے نکاح جائز ہے یا نہیں۔اور کیا ایک غیر مسلم کو سلام کیا جا سکتا ہے؟

جواب: قرآن پاک کی نظر میں اہل کتاب اور مشرک ایک نہیں ہیں، اس لئے کہ قرآن نے مشرکوں اور اہل کتاب کو علیحدہ علیحدہ بیان کیا ہے، لیکن اہل کتاب کے عقائد خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بیان فرمائے ہیں۔اس حقیقت کے باوجود کہ ان کے عقائد میں مشرکانہ باتیں شامل ہیں ان کو مشرکوں سے الگ ایک مستقل زمرے میں رکھا گیا اور ان کو اہل کتاب کہا گیا، مثلاً یہودیوں کے بارے میں کہا گیا کہ یہودی کہتے ہیں: عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائی کہتے ہیں: مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔یہ یقیناً ایک مشرکانہ عقیدہ ہے۔لیکن ان مشرکانہ عقائد کے باوجود، اور تحریف کتب سماوی کے باوجود قرآن نے ان کی خواتین سے نکاح کا اجازت دی ہے اور کہا ہے کہ ان میں سے پاکیزہ اور باکردار عورتوں سے نکاح کر سکتے ہو، اس کے برعکس قرآن نے مسلم عورتوں کو اہل کتاب کے مردوں سے نکاح کی اجازت نہیں دی، لہٰذا ایک مسلمان عورت کسی عیسائی یا یہودی مرد سے شادی نہیں کر سکتی۔قرآن کے حکم کے بعد اس میں بحث کی گنجائش نہیں رہتی۔لیکن اگر اس حکم کی مصلحت یا حکمت پر غور کریں تو پتا چلتا ہے کہ اگر مسلمان عورت کا نکاح غیر مسلم مرد یعنی اہل کتاب سے کر دیا جائے تو اس کے عیسائی یا یہودی ہونے کے قوی امکانات رہتے ہیں۔اس کے برعکس ایک عیسائی یا یہودی عورت اگر کسی مسلمان سے شادی کر لے تو اس کے مسلمان ہونے کے مواقع پیدا ہو جائیں گے اس لئے کہ اسلام اس بات کے لئے سازگار حالات پیدا کرتا ہے کہ کوئی انسان دین دار اور مسلمان ہو کر مرے، اس کے برعکس ایک دین دار اگر بے دین ہو کر مرے تو اسلام اس کو پسند نہیں کرتا۔

رہا غیر مسلم کو سلام کرنا تو میری ذاتی رائے یہ ہے کہ غیر مسلم کو سلام کرنے میں کوئی حرج نہیں اس لئے کہ مسلمان اخلاق کا پیامبر ہے۔سلام کا جواب نہ دینا بداخلاقی ہے جو مسلمان کی شان سے بعید ہے۔قرآن میں سلام کے بارے میں کوئی تخصیص نہیں کی گئی۔قرآن میں ہے: واذا حییتم بتحیة فحیوا باحسن منهآ او ردها (النساء۴:۸۶) کہ جب تمہیں سلام کیا جائے تو بہتر جواب دو یا کم از کم ایسا جواب دے دو۔اس میں یہ تخصیص نہیں ہے کہ مسلمان سلام کرے تو جواب دو اور غیر مسلم سلام کرے تو جواب نہ دو۔

دراصل غیر مسلموں کو سلام کرنے کے بارے میں جو الجھن پیدا ہوتی ہے وہ مدینے کے گستاخ اور بداخلاق یہودیوں کے طرزِعمل کے بارے میں رسول اللہؐ کی ہدایت کا صحیح محمول نہ سمجھنے سے پیدا ہوتی ہے۔مدینے کے یہودی جو بڑے بدتمیز اور بدمزاج تھے جب کبھی رسول اللہؐ کی خدمت میں آتے تو حضورؐ کو ''السلام علیکم'' کے بجائے ''السام علیکم'' کہتے۔سام کے معنی عبرانی زبان میں موت اور تباہی کے ہیں۔صحابہ کرامؓ کو یہ بات ناگوار گزرتی تھی۔اس پر رسول اللہؐ نے ہدایت فرمائی کہ تم جواب میں صرف ''وعلیکم'' کہہ دیا کرو، یعنی تم پر بھی، ایک بار ام المومنین حضرت عائشہؓ نے اس پر شدت سے خفگی کا اظہار کیا تو حضورؐ نے منع فرمایا۔حضرت عائشہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! آپ نے نہیں سنا وہ کیا کہتے ہیں؟ حضورؐ نے فرمایا: تم نے نہیں سنا میں نے کیا کہا ہے۔اس واقعے سے صاف پتا چلتا ہے کہ رسول اللہؐ نے ان کی بدتمیزی کی وجہ سے ان کو ایسا جواب دیا تھا۔لیکن ان کے علاوہ دیگر لوگوں مثلاً مشرکین مکہ وغیرہ کے بارے میں ایسی کوئی روایت نہیں ملتی کہ ان کے سلام کا جواب بھی اسی طرح دیا گیا ہو۔مسلمان جب ان سے ملتے تو سلام کے جواب کا یہ انداز نہیں ہوتا تھا۔یہودیوں کے اس واقع سے بعض علما کو خیال ہوا کہ سب غیر مسلموں کو ایسا

ہی جواب دینا چاہئے۔ یا سرے سے غیر مسلموں کو سلام ہی نہ کرنا چاہئے۔ لیکن ذرا غور کیجئے کہ اسلامی سٹیٹ میں آپ انہیں شرک کی، شراب کی، خنزیر کی اجازت دیتے ہیں سلام کی نہیں دیتے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر کوئی غیر مسلم خوش اخلاقی سے آپ کو سلام کرلے تو آخر اس کا جواب کیوں نہ دیا جائے۔ ایک مرتبہ ایک یہودی کا جنازہ جا رہا تھا، اس کو دیکھ کر آپ کھڑے ہوگئے، کسی نے کہا کہ یہ تو یہودی کا جنازہ ہے آپؐ نے فرمایا: أليست نفسا. یعنی کیا یہ انسانی جان نہیں ہے۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: ایک طرف تو ہم کہتے ہیں کہ ہم دنیا میں توحید و مساوات کے علم بردار ہیں۔ دوسری طرف ریاست میں ہم غیر مسلموں کو شرک، شراب وغیرہ کے استعمال و اختیار کی کھلی چھٹی دیتے ہیں، نیز ہم اپنے ملک میں غیر مسلموں کو تبلیغ کی اجازت دے رہے ہیں۔ اس کی وضاحت فرمادیں۔

جواب: جہاں تک اس رائے کا تعلق ہے کہ اگر غیر مسلم کو اسلامی معاشرے میں اس قسم کی اجازت دے دی جائے تو اس سے مسلمانوں کے کردار بگڑنے کا خطرہ ہے تو ایسا امت کی پوری تاریخ میں کبھی نہیں ہوا۔ اس کے برعکس یہ تو ہوا ہے کہ غیر مسلموں کو جب بھی ایسی آزادی دی گئی اور وہ مسلمانوں کے قریب ہوئے، تو وہ مسلمانوں کے کلچر سے ایسے متاثر ہوئے کہ پھر انہیں وہ سب کچھ بھول گیا جو انہیں ان کا مذہب سکھاتا تھا۔ اس کی تفصیلات اوپر بیان کر چکا ہوں۔ دراصل اس آزادی کا مقصد یہ ہے کہ غیر مسلم باشندہ مسلم معاشرے میں اپنے اوپر کوئی جبر محسوس نہ کرے۔ یہ جبر ہی غلط عقیدے پر قائم رہنے کا درس دیتا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ اسلام کا دوستانہ ماحول میں مطالعہ کرے گا تو اسلام اور مسلمانوں کے وہ قریب آئے گا اور ایک نہ ایک دن مسلمان ہو جائے گا۔ آج کے سوا ارب مسلمان خود اس کی دلیل ہیں۔ جہاں تک کافروں یا غیر مسلموں کی تبلیغ کا تعلق ہے اس کی انہیں اجازت ہے۔ آپ کے ملک میں قانون قادیانیوں کو بھی تبلیغ سے نہیں روکتا۔ بلکہ اس بات سے روکتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی اصطلاحات استعمال کریں، مثلاً نبی رسول کی اصطلاح مسلمانوں کی ہے، وہ ایک ایسے شخص کو نبی اور رسول کہتے ہیں جو مسلمانوں کے ہاں مرتد سمجھا جاتا ہے، وہ ایسی عورتوں کو ام المومنین کہتے ہیں جن کا مسلمانوں کے ہاں نہ صرف یہ کہ کوئی احترام نہیں ہے، بلکہ جن کو مسلمان بدترین قسم کا کافر سمجھتے ہیں۔ یہ اصطلاح یعنی ازواج مطہرات، صرف اور صرف آنحضورﷺ کی ازواج مطہرات کے لئے استعمال ہوئی ہے۔ حتیٰ کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ازواج کو بھی امہات المومنین نہیں کہا گیا۔ دوسری مثال لیجئے۔ وائس چانسلر ایک اصطلاح ہے۔ اس کے کچھ فرائض منصبی ہیں۔ اب اگر کوئی دوسرا فرد اپنے آپ کو وائس چانسلر کہنے لگے تو اس کی اجازت نہ ہوگی۔ جہاں ریاست کا پورا نظام اصطلاحات پر مبنی ہو وہاں اصطلاحات کا استعمال بھی سوچ سمجھ کر کیا جاتا ہے۔ اور ہر کس و ناکس کو جا و بے جا ان اصطلاحات کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی، ورنہ سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔ عیسائیوں میں بشپ اور پوپ کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ یہ مخصوص ذمہ داریوں کے حامل مخصوص افراد کے ساتھ خاص ہے۔ یہ اصطلاح وہاں کسی بڑے سے بڑے شخص کے لئے بھی استعمال نہیں ہوسکتی، تو گویا ان القاب و اصطلاحات کے استعمال کی کچھ حدود و قیود ہیں جن سے باہر نہیں جایا جاسکتا۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: آپ نے فرمایا ہے کہ اسلام بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کا داعی ہے۔ لیکن اسلام نے ''ستی'' کی رسم کو ختم نہیں کیا جو کہ قتل انسانی ہے اور انسانی قتل بہت بڑا جرم ہے۔ جب کہ سود سے منع کیا گیا۔ آخر یہ فرق کیوں؟

جواب: بنیادی اصول یہ ہے کہ جب آپ کسی غیر مسلم گروہ کو اس کے اپنے مذہبی، شخصی اور اجتماعی قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے کی اجازت دیتے ہیں تو ان سارے معاملات کو برداشت کرنا پڑے گا۔ چاہے وہ ہمارے لئے کتنے ہی تکلیف دہ اور ناپسندیدہ کیوں نہ ہوں۔ ہمارے مذہب اور اخلاقی اقدار و احکام کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں، ان کی عبادات کے نظام کو بھی آپ قبول کرلیں گے اور ان کے اس نظام میں آپ کا نقطہ نظر نہیں بلکہ ان کا ہی نقطہ نظر تسلیم کیا جائے گا۔ اگر ان کے مذہبی اور معاشرتی نظام میں ردوبدل کرنے کا اختیار ہمیں ہو تو پھر ان کو آزادی تو نہ ہوئی، آزادی تو ہمیں ہوئی، قرآن پاک کہتا ہے: ان الشرک لظلم عظیم (لقمان ۳۱:۱۳) کہ شرک سب سے بڑا ظلم ہے۔ جب آپ شرک جیسے ظلم عظیم کی اپنی سرزمین پر اجازت دیتے ہیں جو اللہ سے بغاوت پر مبنی ہے تو پھر بقیہ جرائم اور شراب نوشی وغیرہ تو اس سے کم تر ہیں۔ قرآن پاک کہتا ہے کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ اللہ کا کوئی بیٹا ہے۔ یہ ایسی خوفناک بات ہے کہ بعید نہیں اس پر آسمان ٹوٹ کر گر پڑے، زمین

پھٹ جائے اور پہاڑ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوجائیں۔ جب آپ اس کی اجازت دے رہے ہیں تو پھر دوسری رسموں کی۔ جو آپ کو چاہے ظالمانہ معلوم ہوں۔ اجازت بدرجہ اولیٰ دینا ہوگی۔ جس کے پس منظر میں ان کی دانست میں محبت اور غیرت وحمیت کے جذبات ہیں۔ اس لئے مسلمانوں نے ان رسموں کو بزور نہیں روکا۔ اگر چہ بعض اہل علم اس رسم کے خلاف تھے۔ اور کوشاں رہے کہ اسے ختم ہونا چاہئے، لیکن محض تعلیم وتلقین سے ایسا نہیں ہوسکتا تھا اس لئے نہ ہوا۔ البتہ مسلمانوں کے میل جول کی وجہ سے یہ رسم بہت بڑی حد تک کم ہوگئی اور اسلامی دور کے آخر میں تو بہت ہی کم رہ گئی تھی۔ جہاں تک شراب نوشی کی اجازت کا تعلق ہے تو اس کی اجازت غیر مسلموں کو ہر دور میں دی گئی خود خلافت راشدہ میں بھی دی گئی۔ غیر مسلم اس کا کاروبار کرتے رہے اور اس پر فقہائے کرام میں بھی کبھی کوئی اختلاف نہیں رہا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم کی شراب ضائع کردے تو اس شراب کی قیمت بطور تاوان مسلمان ادا کرے گا۔ اگر کوئی غیر مسلم سور کا گوشت لے جارہا ہو اور مسلمان اپنی دینی حمیت کے تحت اسے چھین کر ضائع کردے تو مسلمان اس کی قیمت دینے کا پابند ہوگا۔ اس میں فقہا کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ غرض یہ کہ غیر مسلموں کے شخصی اور مذہبی امور کے معاملے میں ہم اپنی مرضی نہیں چلائیں گے۔ ان کو اپنی روایات واقدار کے مطابق زندگی گزارنے کا حق حاصل رہے گا۔ لیکن سود کا معاملہ ان امور سے مختلف ہے۔ سودی کاروبار کے منفی اثرات پورے اقتصادی نظام پر پڑتے ہیں۔ سود کا ایک کاروبار سارے نظام معیشت کو ڈائنامائیٹ لگا دینے کے مترادف ہے۔ اس لئے اس کی اجازت نہیں دی گئی۔ ماہرین نے لکھا ہے کہ سود کے نتیجے میں کم از کم چھبیس اخلاقی، اقتصادی اور معاشرتی قباحتیں پیدا ہوتی ہیں۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: آپ نے فرمایا کہ غیر مسلموں کو روک دیا گیا تھا کہ وہ مسلمانوں کا لباس نہ پہنیں۔ اس کی قانونی یا شرعی حیثیت بیان فرمادیں۔

جواب: مسلمانوں کو روکا گیا تھا کہ وہ غیر مسلموں کا لباس نہ پہنیں اور غیر مسلموں کو روکا جاتا رہا کہ وہ مسلمانوں کا لباس نہ پہنیں۔ مسلمانوں کے لے یہ شرط دائمی ہے۔ غیر مسلموں کے لئے یہ شرط دائمی نہیں۔ اب اگر کوئی لباس ایسا ہے جو خاص مسلمانوں کا شعار ہو تو ایسے لباس سے غیر مسلموں کو روکا جاسکتا ہے اور اس کے استعمال پر غیر مسلموں کے لئے پابندی لگائی جاسکتی ہے، مثال کے طور پر ابھی میں نے عرض کیا کہ پاکستان میں قادیانیوں پر بعض پابندیاں اس قسم کی لگائی گئیں۔ مثلاً کلمہ طیبہ کا بیج عام حالات میں کوئی بھی لگا سکتا ہے، مسلمان ہو یا غیر مسلم۔ لیکن قادیانیوں کو اس سے روک دیا گیا اس لئے کہ جب ایک غیر مسلم اپنے کفر کو چھپانے اور خود کو دھوکے سے مسلمان ظاہر کرنے کی خاطر شعائر اسلام کا استعمال کرے گا تو اس کو اس سے منع کر دیا جائے گا۔ اسی طرح کی پابندیاں حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کے دور میں لگائی گئی تھی، اس لئے کہ لوگ تیزی سے مسلمان ہورہے تھے، اور اس قبول اسلام کی وجہ سے ان کا معاشرتی رتبہ بھی ذرا بڑھ جاتا تھا۔ اس سے ناجائز طور پر فائدہ اٹھانے کی خاطر بعض غیر مسلموں نے ظاہری طور پر مسلمانوں کی سی وضع قطع اپنانا شروع کر دی جس سے بعض انتظامی اور سیاسی مشکلات پیدا ہوئیں اور ظاہری التباس کی وجہ سے مسلم اور غیر مسلم کا فرق ختم ہونے لگا، اسی التباس سے بچنے کی خاطر ایسی پابندی لگائی گئی تھی۔ اس قسم کی پابندی اب بھی لگائی جاسکتی ہے جس کی میں نے اوپر مثال دی ہے، البتہ یہ پابندی غیر مسلموں پر عارضی ہے۔ جب تک وہ حالات رہیں گے پابندی رہے گی۔ اس کے برعکس مسلمانوں پر اس قسم کی پابندی دائمی ہے مثلاً مسلمان کوئی ایسا لباس کبھی نہیں پہنیں گے جو لباس کسی غیر مسلم قوم کا مذہبی شعار ہو، مثال کے طور پر عیسائی پادریوں کا خاص مذہبی لباس ہے۔ ایک لمبا جبہ اور سر پر خاص ٹوپی، گلے میں صلیب۔ کسی مسلمان کو یہ لباس نہیں پہننے دیا جائے گا۔ اسی طرح ہندو پروہتوں کا لباس پہننا بھی مسلمانوں کے لئے جائز نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ عام لباس میں کوئی قباحت نہیں، ہر شخص جو لباس چاہے پہن سکتا ہے۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: آپ نے فلسفہ ہجرت پر تفصیل سے روشنی ڈالی، آپ نے فرمایا کہ ہجرت تزکیہ نفس کا بھی ذریعہ تھا، یہ بات غالباً تقوے کے معاملے میں تو درست ہوسکتی ہے، لیکن ہجرت کرنے والے سب کے سب یقیناً ایسے نہ تھے کہ ان کا صرف ہجرت کے ذریعے تزکیہ ہوسکتا ہو۔ دوسری بات یہ کہ ہجرت کے نتیجے میں معاہدات ہوئے جیسے صلح حدیبیہ، تو ایسے معاہدات کا تزکیے سے کیا تعلق ہے؟

جواب: جہاں تک ہجرت کے داخلی اور روحانی پہلو کا تعلق ہے تو جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ وہ کسی خاص وقت کے ساتھ تو مخصوص نہیں ہے کہ یہ مقاصد فلاں وقت

تک ہجرت سے وابستہ ہوں گے اور فلاں وقت نہیں۔ بلکہ ایسا بار بار ہوسکتا ہے کہ روحانی پاکیزگی، باطنی صفائی، تزکیہ وتعلیم یا تعلیمات اسلام پر عمل پیرا ہونے کے لئے ترک وطن کرنا پڑے۔ یہ ہجرت کا باطنی یا روحانی پہلو کہلاتا ہے۔لیکن ظاہر ہے کہ ہر ترک وطن میں یہ داخلی روح موجود ہونا ضروری نہیں۔ یہ روح جبھی موجود ہوگی جب ہجرت، صحیح معنی میں ہجرت ہوگی۔بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان اپنے ذہن کے مطابق بہتر سے بہتر اور بہتر سے بہترین کی تلاش میں سفر جاری رکھتا ہے،اس لئے تزکیہ وتربیت کے لئے ہجرت ہوسکتی ہے،اور ظاہر ہے کہ یہ ہجرت کا بلندترین درجہ ہوگا،اس کے برعکس جس کو جسمانی ہجرت کہا گیا ہے وہ ایسی چیز ہے جیسے ایک شخص ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف یا ایک سیاسی نظام سے دوسرے سیاسی نظام کی طرف یا ایک برادری کو چھوڑ کر دوسری برادری کی طرف چلا جاتا ہے،اس کا تزکیہ و تربیت سے کوئی تعلق نہیں۔ رہا ہجرت کے نتیجے میں معاہدات کا مسئلہ،تو رسول اللہؐ نے معاہدات فرمائے اور ہر معاہدے کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ دعوت اسلامی کے کام میں پیش رفت ہو،اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کو آگے بڑھایا جائے اور کفر وشرک کی طاقتوں کو جس قدر غیر موثر کیا جاسکتا ہے کیا جائے۔ان میں سے ہر معاہدہ اپنی جگہ بڑا اہم ہے۔ یقیناً حدیبیہ کا معاہدہ تاریخ ساز معاہدہ ہے۔قرآن پاک میں اسے فتح مبین کہا گیا ہے۔ یہ معاہدہ رسول اللہؐ کی سیرت اور پیغمبرانہ کمال کا شاہکار ہے۔اب تک صورت حال یہ تھی کہ مدینہ منورہ جغرافیائی طور پر دو بڑے دشمنوں کے درمیان تھا۔ایک طرف کفار مکہ تھے جن کے قرب وجوار کے لوگوں سے تعلقات بھی تھے اور وہ کعبہ کے متولی بھی تھے جس کی وجہ سے ان کو غیر معمولی سیاسی اور مذہبی اثر رسوخ حاصل تھا۔اور دوسری طرف یہودی تھے۔ دونوں بیک وقت مسلمانوں کے دشمن تھے۔ دونوں سے بیک وقت نمٹنا ممکن نہ تھا۔اگر یہودیوں سے نمٹتے ہیں تو مکے کی طرف سے کفار کے حملے کا خطرہ ہے،اور اگر کفار کے مقابلے کے لئے نکلتے ہیں تو بھی مدینہ خطرے میں پڑتا ہے اور یہویوں کی طرف سے حملے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ان حالات میں یہ ناگزیر تھا کہ کسی نہ کسی طرح دونوں میں سے ایک دشمن کو غیر جانب دار کردیا جائے۔ رسول اللہؐ نے اس غرض کے لئے یہودیوں کی شاطرانہ حرکتوں کی وجہ سے انہی کو اپنا ہدف قرار دیا اور کفار مکہ سے معاہدہ کرنے کو ترجیح دی۔اس معاہدے کی رو سے کفار مکہ کی طرف سے اطمینان ہوگیا اور خیبر کے یہودیوں کے خلاف کاروائی بہت آسان ہوگئی۔اسی بنا پر معاہدے کے وقت حضورﷺ نے فرمایا تھا کہ قریشی جو چاہتے ہیں دے دو اور ان کی ہر شرط قبول کرلو۔اس لئے کہ وہ ایسا موقع تھا کہ قریش کی کمزوری کا حضورؐ نے اندازہ کرلیا تھا۔ان کی ہوا پورے علاقے میں اکھڑ گئی تھی کہ نہتے مسلمان اتنے قریب پہنچ گئے ہیں اور اس پر بھی معاہدہ ہو رہا ہے۔ بالآخر یہ معاہدہ طے ہوا اور دس سال کے لئے اس پر عمل درآمد طے پایا۔اس عرصے میں یہودیوں سے نمٹ لیا گیا اور وہ خطرہ جو رنگ لانے کے قریب تھا اس کا خاتمہ ہوگیا۔اس کے بعد جب مدینہ مامون ومحفوظ ہوگیا اور اندرونی دشمن کو نکال باہر کیا گیا تو پھر کوئی بڑی خون ریزی بھی نہیں ہوئی اور نہ کوئی بڑا معرکہ پیش آیا، بلکہ سارا عرب آپ سے آپ اسلام کے زیرنگیں آگیا۔اس کے بعد جب کفار مکہ کی باری آئی تو بغیر تلوار چلائے مکہ فتح ہوگیا۔اس سے ثابت ہوگیا کہ صلح حدیبیہ فی الواقع فتح مبین تھی۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: آپ نے فرمایا ہے کہ اگر کسی غیر اسلامی ملک میں مسلمانوں کو اپنی شناخت کے خاتمے کا خطرہ ہو تو انہیں وہاں سے ہجرت کر کے کسی مسلم ملک میں چلے جانا چاہئے۔سوال یہ ہے کہ اگر کسی غیر مسلم کو اسلامی سٹیٹ میں اس قسم کا خطرہ لاحق ہو تو وہ کیا کرے؟

جواب: بات یہ ہے کہ اسلامی حکومت میں غیر مسلم کو اس قسم کا خطرہ لاحق ہی نہیں ہونا چاہئے۔اس لئے کہ اسلامی ملک میں بسنے والے غیر مسلم کو اس بات کی ضمانت دی جاتی ہے کہ اس کے تمام حقوق محفوظ ہوں گے، بشرطیکہ وہ مملکت کا وفادار رہے۔ یہ ذمہ داری اللہ اور اس کے رسولؐ نے لی ہے۔اور حقوق کی حفاظت کی یہ ضمانت اللہ اور اس کے رسولؐ نے دی ہے، آپ نے فرمایا کہ اگر کسی غیر مسلم کے حقوق تلف یا ضائع کیے گئے تو ایسا کرنے والے کے خلاف میں خود قیامت کے دن مدعی ہوں گا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے تو اپنے دور میں غیر مسلموں کے گرجے میں نماز تک پڑھنے سے اس لئے انکار کردیا تھا کہ کہیں آئندہ آنے والے مسلمان ان کی پیروی کرتے ہوئے گرجوں کو باقاعدہ مسجد ہی نہ بنا ڈالیں، حالانکہ گرجے والوں نے خود اس کی درخواست کی تھی۔ حضرت عمرؓ نے صرف اس بنا پر ایسا کرنے سے انکار کیا کہ کل کو مسلمان نماز گرجوں میں پڑھنے لگے تو پھر کوئی گرجا باقی نہیں رہے گا، تمام گرجوں کو مساجد بنا دیا جائے گا، جس سے غیر مسلموں کے مذہبی حقوق مجروح ہوں گے۔اس لئے اسلامی سٹیٹ میں غیر مسلموں کے حقوق کے تلف ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، تاہم اگر کوئی اپنی خوشی سے یہاں سے ترک وطن کر کے جانا چاہتا ہے تو اسے کون روک سکتا ہے۔قیام پاکستان کے موقع پر لاکھوں ہندو یہاں سے ترک وطن کر کے چلے گئے، حالانکہ قائداعظم نے بار بار ان کو یقین دلایا تھا کہ ان کے حقوق برابری کی سطح

پر محفوظ رہیں گے۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: ہجرت مسلمانوں کے لئے ایک مذہبی حیثیت بھی رکھتی ہے۔اس دور میں دارالحرب سے دارالاسلام کی طرف ہجرت کی شرعی حیثیت کیا ہوگی؟

جواب: میں نے ابھی تفصیل سے عرض کیا ہے کہ ہجرت، دعوت اور جہاد، ان تینوں میں باہم گہرا ربط ہے، ان تینوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کوئی مسلم کمیونٹی اس تعداد میں ہے کہ وہ اپنے تشخص کا تحفظ کر سکے اور غیر مسلم ماحول میں اپنی اور اپنی اولاد کی دینی تعلیم کا اہتمام کر سکے اس کو وہاں بحیثیت مسلمان کے شریعت نے رہنے کی اجازت دی ہے۔ چونکہ اس کو وہاں مکمل آزادی حاصل ہے اس لئے ایسی صورت حال میں مسلمانوں کے لئے وہاں سے ہجرت کرنا لازمی نہیں ہے۔ جیسا کہ رسول اللہؐ نے بعض علاقوں کے مسلمانوں کو ہجرت کا حکم نہیں دیا۔ اسی طرح وہ صحابہ کرام جو حبشہ ہجرت کر گئے تھے وہ وہاں بڑا عرصہ رہ کر واپس ہوئے اور مدینہ آنے کے سات سال بعد بھی ان کی بڑی تعداد وہاں رہی اور واپس نہیں آئی اور نہ ہی رسول اللہؐ نے کبھی ان سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ وہاں سے مدینہ واپس آجائیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جہاں مسلمانوں کو آزادی حاصل ہو وہاں وہ جا سکتے ہیں، بشرطیکہ یہ ہجرت دعوت کے لئے ہو اور ہجرت کے مقاصد مدنظر ہوں۔ رہا صرف مادی منفعت کے لئے ایک مسلمان کا کسی غیر مسلم ملک میں جا کر اس طرح رہائش اختیار کرنا کہ جس سے اس کے مذہب و نسل دونوں کے تحفظ اور بقا کو خطرہ لاحق ہو جائے، یہ جائز نہیں ہے، بلکہ اگر دارالحرب میں مستقل طور پر بسنے والے اور وہیں کے رہنے والے کسی مسلمان کو ایسی صورت درپیش ہو تو اگر ممکن ہو تو اسے وہاں سے دارالاسلام ہجرت کر جانا چاہئے۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: کیا معلمین کو اجرت دینا جائز ہے؟ یہ حضرت عثمانؓ کے دور میں ہوا تھا، لیکن آنحضورؐ کے دور میں معلم قرآن مرد وزن کو اجرت نہ دی جاتی تھی۔ کیا حضورؐ ہر تعلیم کو مفت کرنا چاہتے تھے یا تعلیم اسلام کو۔ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ نے اس اجرت کو جائز کہا ہے، دیگر ائمہ بھی یہی نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ریاست کی کیا ذمہ داری ہے؟

جواب: احادیث نبوی اور اقوال ائمہ یا تعامل صحابہؓ میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ جہاں تک یہ مسئلہ ہے کہ تعلیم عام کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے اس میں بھی دو رائے نہیں ہیں، امت مسلمہ رسول اللہ کی جانشین ہے، اس کو وہ تمام فرائض سپرد کیے گئے ہیں جو رسول اللہؐ نے انجام دیے۔ حضورؐ کے اولین فرائض میں **یعلمهم الکتب والحکمة ویزکیهم** (البقرۃ ۲:۱۲۹) شامل ہے، یعنی تعلیم، کتاب وحکمت اور تزکیہ، کردار وعمل۔ ریاست، جانشین رسول ہونے کے ناتے ان فرائض کو انجام دینے کی پابند ہے۔ ریاست یہ کام بالمعاوضہ، بلا استثنا اور بلا روک ٹوک کرے گی۔ ریاست کے وسائل اگر ناکافی ہوں تو ریاست اس کے لئے اضافی ٹیکس لگا سکتی ہے۔ لیکن رسول اللہؐ نے جن احادیث میں تعلیم قرآن کی اجرت لینے سے منع فرمایا، وہ اس صورت میں ہے جہاں کوئی شخص ان فرائض کی ادائیگی کے لئے یعنی تعلیم قرآن بلکہ اسی طرح اذان، امامت وغیرہ کے لئے کل وقتی طور پر فارغ نہ ہو۔ اگر وہ جز وقتی طور پر تعلیم قرآن کا کام کرتا ہو اور ان کاموں کے لئے اس نے اپنے آپ کو فارغ نہ کیا ہو تو اس کے لئے معاوضہ لینا نہ آج جائز ہے نہ کل جائز تھا۔ اس صورت حال میں تمام فقہا کی یہی رائے ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص کل وقتی طور پر تعلیم قرآن اور ایسے دیگر فرائض کی ان ذمہ داریوں کو ادا کرے اور اس کام کے لئے خود کو دوسرے مشاغل سے فارغ کرلے اور اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے روزی کمانے کا وقت بھی اس کے پاس نہ بچے، تو اس کو سرکاری خزانے سے یا مسلمانوں کے چندے سے تنخواہ دینا جائز ہے۔ رسول اللہؐ نے جب صحابہ کرامؓ کو کسی دینی یا دنیوی ذمہ داری پر بھیجا یا کوئی کل وقتی کام سونپا تو اس کے لئے آپؐ نے اجرت دی۔ آپؐ نے حضرت عمرؓ کو کسی کام کے لئے بھیجا تو واپسی پر آپؐ نے اس کام کی تنخواہ ان کو ادا کی، جسے قبول کرنے میں حضرت عمرؓ کو تامل ہوا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ اس کا معاوضہ لے لو۔ اسی طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ کو تمام صحابہؓ نے خلافت سنبھالنے پر معاوضہ ادا کرنا منظور فرمایا۔ اس لئے کہ یہ کل وقتی ذمہ داری تھی اور آپ نے خود بھی یہ معاوضہ لینا قبول فرمایا۔ اسی طرح تمام خلفائے راشدین نے بھی سرکاری خزانے سے کل وقتی ذمہ داریوں کی بنا پر معاوضہ لیا۔ اس لئے جو افراد کل وقتی ذمہ داریاں سنبھالیں گے ان کو ادائیگی کی جائے گی۔ حدیث کا اطلاق جز وقتی اور عارضی کام پر ہوتا ہے اور صحابہ وفقہا

کی راء کا اطلاق کل وقتی کام پر۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: کیا غلام اور آزاد کے درمیان سزاؤں میں تفاوت موجود ہے۔ اگر ایسا ہے تو کیوں؟

جواب: تفاوت موجود ہے۔ غلام کی سزا آدھی ہے، آزاد کی مکمل۔ قرآن میں ہے: **فعلیھن نصف ما علی المحصنت من العذاب** (النساء ۴:۲۵)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو غلام ہے وہ بذات خود ایک سزا میں گرفتار ہے کہ غلامی خود ایک سزا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس کے معاشرتی معیار کے مطابق تالیف قلب بھی مطلوب ہے۔ سزاؤں کا مقصد اسلام میں اصلاح ہے۔ سزاؤں میں حتی المقدور اس بات سے بچا گیا ہے کہ سزا پانے والا اسلام سے دور ہو جائے یا اس سے بدظن ہو جائے۔ سزا کا اصل مقصد اصلاح ہے۔ ایک شخص جو غلام ہے اس کو غلام ہونے کی سزا اس لئے بھی دی گئی ہے کہ اس نے مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو توڑنے کی عملی کوشش کی تھی۔ ایک شخص جو غلام ہو، اسے کسی کے چارج میں دے دیا جاتا ہے۔ اسے آپ قید بامشقت یا جبری مشقت کی ایک شکل کہہ سکتے ہیں۔ یہ قید بامشقت کی وہ قسم ہے جس میں قیدی کو چند پابندیوں کے ساتھ مسلم ملک یا معاشرے میں رہنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ مدت غلامی پوری کرنے کے بعد (دس سال ہو یا بیس یا کم و بیش) یہ کوشش کی گئی ہے اور کی جاتی ہے کہ وہ مسلم معاشرے میں رچ بس کر مسلم معاشرے کا ایک معزز اور آزاد شہری بن جائے۔ جیسا کہ ابتدائی دور میں اس بات کی ہزاروں بلکہ شاید لاکھوں مثالیں ملتی ہیں کہ جنگی قیدی غلام بنائے گئے اور یہ غلام اسلام کے قوانین جنگ اور احکام قید کی بدولت علم و حکمت کی بلندیوں اور حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر پہنچ کر معاشرے کے ایک باعزت شہری بن گئے۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: آپ نے اسلام کے دوسرے شعبے یعنی نماز کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ انسان کا ذاتی معاملہ ہے، جبکہ امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ نے تارک نماز کے لئے قید اور کوڑوں کی سزا تجویز کی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ معاملہ اجتماعی ہوسکتا ہے نہ کہ ذاتی۔ اس سلسلے میں آپ کیا فرمائیں گے؟

جواب: دیکھئے، میں نے وہ بات نہیں کہی جو آپ نے سمجھی ہے۔ میں نے کہا ہے کہ جو شخص نماز نہیں پڑھتا اور نہ پڑھنے کی مجاہرت بھی نہیں کرتا، اس کا نماز نہ پڑھنا معاشرے میں کسی گمراہی یا برائی کا سبب نہیں بنتا، تو حکومت کو اس میں مداخلت کرنے کا حق نہیں۔ امام ابوحنیفہؒ یا امام شافعیؒ نے جس ترک نماز پر سزا تجویز کی ہے وہ مجاہرت بالترک ہے جو معاشرے میں گمراہی، نماز کے استہزا اور توہین کا ذریعہ بنے۔ ایسی صورت میں فقہائے اسلام نے قریب قریب بالاتفاق ایسے شخص کو مستوجب سزا قرار دیا ہے۔ بعض نے قید کی سزا تجویز کی، بعض نے سزائے تازیانہ اور بعض نے سزائے موت تک تجویز کی ہے۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے اور کوئی شخص خاموشی سے ترک نماز کرتا رہتا تو اس کے معاملے میں حکومت کو مداخلت کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح مثلاً ایک شخص زندگی بھر بغیر وضو نماز پڑھتا رہتا ہے اور عام طور پر کسی کو پتا نہیں چلتا کہ یہ شخص بغیر وضو نماز پڑھتا ہے تو اگرچہ یہ ایک بہت بڑے جرم کا ارتکاب ہے لیکن کوئی عدالت یا سرکار اس میں مداخلت نہیں کرے گی۔ ایک شخص روزہ نہیں رکھتا (لیکن علی الاعلان کھاتا پیتا بھی نہیں پھرتا) اور خاموشی سے اپنے گھر میں کھاتا پیتا ہے تو یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے، اللہ تعالیٰ روز قیامت اس سے نمٹ لے گا، حکومت کو اس میں مداخلت کا حق حاصل نہیں۔ یہ سب وہ احکام ہیں جن کو آپ شریعت کا داخلی پہلو کہہ سکتے ہیں۔ اس سے بعض حضرات کو یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ اسلام ایک سیکولر دین ہے اور اسلام پر عمل کرنے میں بندہ صرف اللہ کو جواب دہ ہے اور یہ کہ کسی ریاستی ادارے کو اس معاملے میں مداخلت کا حق نہیں ہے۔ لیکن یہ ان احکام کا صرف ایک پہلو ہے۔ دوسرے پہلوؤں سے انہی احکام کو دیکھیں تو ریاست کو مداخلت کا پورا حق حاصل ہے۔ پھر عبادات کے علاوہ بقیہ ابواب فقہ تو ہیں ہی ریاست کے ذریعے عمل درآمد کیے جانے والے۔ ان میں آخری چار پانچ ابواب پر تو خالصتاً ریاست اور ریاستی اداروں کے ذریعے ہی عمل درآمد ہوتا ہے۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: کیا اسلام کا کوئی اپنا لباس ہے؟ اگر ہے تو وضاحت کیجئے۔

جواب: اسلام میں لباس کے احکام بڑے صاف اور سادہ ہیں جن سے ہر مسلمان واقف ہے، مثلاً مردوں کے لئے ریشم اور سونا پہننا حرام ہے۔ مردوں کو سونے کے زیورات یا سونے کی دیگر اشیا استعمال کرنا حرام ہے۔ مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے ضروری ہے کہ حیا اور حجاب کے اسلامی آداب و احکام کے مطابق لباس استعمال کریں۔ لباس ایسا ہو جو کسی غیر قوم کا مذہبی شعار نہ ہو۔ مزید برآں مردوں کے لئے عورتوں کی مشابہت اختیار کرنا اور وضع قطع اور تراش خراش اور لباس میں زنانہ پن اپنانا حرام ہے۔ اسی طرح عورتوں کے لئے مردوں کی مشابہت اختیار کرنا اور مردانہ وضع قطع، لباس اور تراش خراش اپنانا حرام ہے۔ ہر وہ شریفانہ لباس جو ان احکام پر پورا اترتا ہو، وہ اسلامی لباس ہے۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: آپ نے حقوق اللہ و حقوق العباد میں تعارض کی صورت میں حقوق العباد کو ترجیح دی ہے۔ قرآن پاک میں صوم وصلاۃ کا جس تکرار اور تاکید سے ذکر آیا ہے وہ حقوق اللہ کی ترجیح ثابت کرتا ہے، نیز اگر آپ کا کلیہ مان لیا جائے تو موجودہ دور کی مغربی اصطلاح ہیومین ازم (Humanism) کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

جواب: پہلی بات تو یہ ہے یہ موقف میرا نہیں قرآن مجید کا ہے، قرآن خود کہتا ہے......''**الا من اکرہ وقلبہ مطمئن م بالایمان ولکن من شرح بالکفر صدرا**'' (النحل ١٦:١٠٦) اگر کسی شخص کو مجبور کر دیا جائے اور اس کی جان کو خطرہ لاحق کر دیا جائے اور جان بچانے کی صورت ایک ہی ہو کہ کلمہ کفر کہہ کر جان بچالی جائے تو اس موقع پر کلمہ کفر زبان سے کہہ کر (نہ کہ تصدیق قلبی سے) جان بچائی جاسکتی ہے، دو شرطوں پر، ایک یہ کہ جان بچانے کا کوئی اور راستہ نہ ہو اور جان پر بن آئی ہو۔ دوسرا یہ کہ الفاظ محض زبان سے ادا ہوں دل سے نہ ہوں۔ اس باب میں فقہائے کرام نے اصول بیان کیا ہے: **حق العبد مقدم علی حق الشرع بامرہ.** ایک دوسرا کلیہ ہے جو فقہ حنفی کے مشہور امام ابن نجیمؒ نے بیان کیا ہے: **اذا اجتمع الحقان قدم حق العبد.** کہ دونوں حق اگر ایک جگہ اکٹھے ہو جائیں اور ان کے تعارض کو دور نہ کیا جاسکے تو حق العبد کو ترجیح حاصل ہوگی۔ رہا اس کا ہیومین ازم (Humanism) سے تعلق تو اس کا ہیومین ازم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یا تو آپ نے ہیومین ازم کو پڑھا نہیں یا آپ ہیومین ازم کے بارے میں اپنا کوئی الگ تصور رکھتے ہیں جو اہل مغرب کے تصور سے مختلف ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں مطلقاً نہ کوئی اقدار ہیں، نہ اخلاقی ضابطہ اور نہ کوئی حق و باطل کا مستقل معیار ہے، بلکہ ہر وہ چیز جس کو انسان پسند کر لے وہ اچھی ہے اور جس کو انسان ناپسند کرے وہ بری ہے، ظاہر ہے کہ یہ تصور بذات خود مضحکہ خیز ہے۔ لیکن مسلمانوں کے ہاں تو قرآن وسنت کی صورت میں دائمی معیار موجود ہے۔ پھر خود عیسائی بھی اس کے قائل نہیں۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ حقوق العباد کے سلسلے میں ان پانچ میں سے کسی ایک کا اتلاف ہوتا ہو اور اس کو نظر انداز کر کے حق اللہ ادا کرنا لازمی ہو تو اس کا کوئی بھی قائل نہیں، مثلاً ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے اور ایک نابینا جا رہا ہے اور آگے کنواں ہے جس میں اس نابینے کے گرنے کا خدشہ ہے تو بالاتفاق فقہا کی رائے ہے کہ نماز توڑ کر اس نابینے کو بچایا جائے گا، اگر ایسا نہ کیا تو نماز پڑھنے والا مجرم ہوگا اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک تو اس پر دیت بھی واجب ہوگی۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

(سیاسیات)

سوال: غزوہ بدر، احد اور حنین سے لے کر آج تک کبھی مسلمان اللہ کی معیت کے بغیر کامیاب نہیں ہوا۔ خداوند قدوس کی نصرت کبھی نافرمانوں کے ساتھ نہیں رہتی۔ قول و فعل کے تضاد کو کم کرنے کے لئے آج کے دور میں عملی صورت کیا اختیار کی جائے؟

جواب: لوگوں کو دعوت دی جائے۔ تبلیغ کی جائے۔ دین کی تعلیم دی جائے۔ بس یہی ہے، اس کے علاوہ تو کوئی چارہ نہیں۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: نورالدین زنگی کا جو واقعہ سیرت کی کتابوں میں نقل ہے اس کی تفصیلات بیان کریں۔ نورالدین زنگی کا واقعہ یہ ہے کہ شام کے حکمران تھے۔ یہ اس عظیم بادشاہ کے پیش رو ہیں جنھوں نے بیت المقدس کو عیسائیوں کے قبضہ سے آزاد کرا لیا تھا۔ جس کی نظیر اور مثیل کے مسلمان طویل عرصہ سے منتظر ہیں اور ان شاء اللہ نیا صلاح الدین ایوبی بھی آئے گا اور نیا نورالدین زنگی بھی آئے گا۔

جواب: نورالدین زنگی نے خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی۔ حضور ﷺ نے دو آدمیوں کی طرف خواب میں اشارہ کر کے نورالدین سے کہا کہ ان سے میری حفاظت کرو۔ نورالدین زنگی پریشان ہوئے، بہت سوچا، لیکن اس کی تعبیر سمجھ میں نہیں آئی۔ دوبارہ یہ خواب دیکھا۔ غالبًا تین چار مرتبہ یہ خواب دیکھا تو پھر لوگوں سے مشورہ کیا۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ آپ فوراً مدینہ منورہ چلیں۔ وہاں دیکھیں گے کہ اس خواب کی کوئی تعبیر ہو سکتی ہے کہ نہیں ہے۔ مدینہ منورہ چلے گئے۔ ظاہر ہے ان کا مدینہ منورہ چلے جانا ایک اہم واقعہ تھا۔ بہت بڑے حکمرانوں میں سے تھے۔ وہاں انہوں نے یہ چاہا کہ ان دو آدمیوں کی نشاندہی کریں جن کی طرف حضور ﷺ نے اشارہ کیا تھا۔ نورالدین نے کہا کہ مدینہ کے رہنے والے تمام لوگوں کے اعزاز میں میری طرف سے دعوت ہے اور میں ہر ایک کو اپنے ہاتھ سے انعام دوں گا۔

انہوں نے پورے اہل مدینہ کی دعوت کی۔ ایک ایک آدمی کو چلتے ہوئے انعام دیا لیکن وہ دو آدمی نظر نہیں آئے۔ اگلے دن انہوں نے پھر دعوت کی اور کہا کہ مدینہ کا رہنے والا کوئی بھی باشندہ غیر حاضر نہ رہے۔ اس بار بھی وہ دو آدمی نظر نہ آئے۔ تیسرے دن انہوں نے اصرار سے پوچھا تو لوگوں نے کہا کہ سب آ گئے ہیں صرف دو بزرگ ہیں جو باہر کہیں سے آئے ہیں اور وہ تمام دن رات عبادت میں گزارتے ہیں اور کہیں آتے جاتے نہیں۔ نورالدین زنگی نے کہا کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ لوگوں نے کہا کہ وہ کہیں آتے جاتے نہیں۔ نورالدین نے کہا کہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہوں۔ وہ ان کے مکان پر پہنچے تو دیکھا کہ وہی دو لوگ ہیں جن کی طرف حضور ﷺ نے خواب میں اشارہ کیا تھا۔ نورالدین زنگی نے تھوڑی سی سختی کی تو اہل مدینہ ناراض ہونے لگے کہ یہ تو بہت بڑے بزرگ ہیں۔ نورالدین نے کہا کہ آپ حضرات تشریف رکھئے۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں مجھے وہ کرنے دیجئے۔

'بزرگوں' سے جب باز پرس کی تو انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔ نورالدین زنگی نے حکم دیا کہ ان کے گھر کی تلاشی لی جائے۔ گھر کی تلاشی لی گئی تو جہاں ان کا مصلیٰ بچھایا گیا تھا وہاں سے پتھر کی ایک سل نکلی۔ پتھر کی سل کے نیچے ایک سرنگ روضہ اطہر تک نکالی ہوئی تھی۔ انہوں نے مکان روضہ اطہر کے قریب لیا ہوا تھا۔ نورالدین نے مزید سختی کی تو انہوں نے بتایا کہ ہم آرمینیا کے یہودی ہیں اور ہمیں فلاں حکمران نے بھیجا ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے جسم مبارم کو چرا کر لے جائیں۔ اس غرض کے لئے ہم نے یہ سرنگ بنانی شروع کی ہے۔ تمام دن کھدائی کرتے ہیں اور رات کو بقیع کے قبرستان میں یہ مٹی پھینک آتے ہیں۔ نورالدین نے ان کو سزائے موت دی۔ دو رکعات نماز شکرانہ ادا کیا۔ کہ اللہ کی ذات کی مہربانی سے ان کو یہ توفیق ہوئی۔ پھر نورالدین زنگی نے روضہ اطہر کے چاروں طرف خندق کھدوائی جو گہرے پانی تک چلی گئی۔ اس خندق میں سیسہ پگھلا کر بھروا دیا۔ اور اس کو اس طرح محفوظ کر دیا کہ آئندہ کوئی اس طرح کی جرات نہ کر سکے۔ وفاء الوفا جس کا میں کئی بار حوالہ دے چکا ہوں، اس میں یہ واقعہ تفصیل سے بیان ہوا ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: توہین رسالت کا قانون موجودہ صورت حال میں کس حد تک موثر ہو سکتا ہے جب کہ علما حضرات توہین کی تعریف پر ہی متفق نہیں۔ بریلوی حضرات دیوبندیوں

کےاور دیوبندی بریلویوں کے بارے میں توہین رسالت اور گستاخی کا فتویٰ دیتے ہیں۔کیااس طرح امت کا بڑا حصہ توہین رسالت قانون کی زد میں نہیں آئے گا؟

جواب: نہیں، میرے خیال میں نہیں آئے گا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ دیوبندی اور بریلوی حضرات توہین کی تعریف پر مختلف الرائے نہیں ہیں۔توہین کی تعریف تو پاکستان پینل کوڈ میں پہلے سے ہوگئی ہے۔ یہ کام نہ تو کوئی دیوبندی کرے گا نہ کوئی بریلوی کرے گا۔توہین کی قانونی تعریف کے بارے میں یہ لفظ پہلے ہی قانون میں موجود ہے اور یہ دفعہ 1926 سے موجود ہے۔1926 سے پہلے یہ دفعہ 298 میں موجود تھی۔1926 میں 298 اے کا اضافہ ہوا۔ پھر بعد میں 1940 وغیرہ میں 298 بی کا اضافہ ہوا اور پاکستان بننے کے بعد 1984 میں 298 سی کا اضافہ ہوا۔لیکن جو اصل الفاظ ہیں insult, put into disrepute وغیرہ، یہ سارے پہلے سے قانون میں موجود ہیں اور ان کی تعریف ہو چکی ہے۔ جو کوئی ان الفاظ کے مطابق توہین کا مرتکب ہوگا وہ قانون کی زد میں آئے گا۔کسی دیوبندی یا بریلوی عالم کی رائے یا ذاتی خیال کوئی معنی نہیں رکھتا۔

پھر اگر کوئی اختلاف ہے بھی تو وہ اس معاملہ میں ہے کہ کیا کوئی خاص بات جو کسی دیوبند عالم نے کہی ہے وہ اس نے کہی ہے؟ یا اس سے غلط منسوب ہے۔تحقیق سے ثابت ہوا کہ اس سے غلط منسوب ہے۔اگر کوئی ایسا مسئلہ آئے گا بھی تو حقائق اور واقعات کی بنیاد پر اس پر غور ہو جائے گا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: حضرت عمر فاروقؓ نے نہر سویز کو بنانے سے منع کیا۔اس کی وجوہات کو تھوڑا سا واضح کر دیں۔

جواب: آپؓ نے غالباً اس لئے منع فرمایا تھا کہ جو اسلام کا دل ہے، یعنی حجاز کعبۃ اللہ اور مدینہ منورہ، یہ براہ راست ان کی زد اور ان کے اثر میں آجائے گا۔اس لئے حضرت عمر فاروقؓ نے اس تجویز کو پسند نہیں فرمایا۔تجربہ نے ثابت کیا کہ جب سے نہر سویز بنی ہے یہ علاقہ براہ راست ان کی بحری طاقت کی زد میں آ گیا۔وہ جس آسانی سے مشرقی ممالک پر قبضہ کر سکے اس میں نہر سویز کی بڑی اہمیت ہے۔نہر سویز سے پہلے ان کو بہت دور سے آنا پڑتا تھا۔اس کے لئے وسائل اتنی آسانی سے دستیاب نہ ہوتے تھے۔بظاہر یہی چیزیں حضرت عمرؓ کے پیش نظر ہوں گی۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: آپ نے انتہائی اہم پہلو کی نشاندہی کی کہ اجتماعی طور پر مغربی پروپیگنڈے کے خلاف تنظیمی کام کی ضرورت ہے۔اس سلسلہ میں مختلف اخبارات وجرائد میں عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے کام کا تذکرہ ہوتا ہے۔یہ کس حد تک مثبت کام ہے؟

جواب: عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کو جہاں تک میں جانتا ہوں یہ ختم نبوت کے میدان میں کام کرتی ہے اور جہاں جہاں دنیا میں قادیانی اپنے غلط خیالات اور عقائد کو پھیلاتے ہیں یہ ان کو جواب دینے کے لئے وہاں کام کرتی ہے۔اچھا کام ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: اسلامیات کے نصاب میں مسلکی اختلافات کو ختم کرکے کے سلسلہ میں کوئی لائحہ عمل تجویز فرمائیں۔

جواب: مسلکی اختلاف کی دو قسمیں ہیں۔ایک تو وہ حقیقی علمی اختلاف ہے جس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔اگر آپ تحقیق کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچے ہیں۔تو آپ کو اختیار ہے کہ اس نتیجہ پر قائم رہیں۔لیکن دوسروں کی تحقیق میں بھی صحیح اور غلط ہونے کے امکان کو تسلیم کریں۔اس میں تو کوئی قباحت نہیں ہے۔لیکن اگر مسلکی اختلاف کی بنیاد پر مسلمانوں میں اختلاف اور تشتت اور تحزب پیدا ہوا اور ایک دوسرے کی تغلیط ہو تو یہ درست نہیں ہے۔امت کی وحدت تو قرآن پاک کی نص قطعی سے ثابت ہے۔ ان ھذہ امتکم امۃ واحدۃ۔امت کی وحدت کی تاکید قرآن پاک اور حدیث پاک میں ہوئی ہے۔لہٰذا کسی کی ذاتی رائے، ذاتی ذوق یا ذاتی اجتہاد امت کی وحدت پر اثر انداز نہیں ہونا چاہئے۔جب تک مسلمان قرآن پاک اور حدیث کے قطعی علم سے وابستہ رہیں گے، مسلکی اختلاف اپنی حدود میں رہے گا۔جب اس کو نظر انداز کر کے مسلکی کتابوں اور اختلافات کو بنیاد بنائیں گے تو اختلافات مزید شدید ہوں گے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: سرسید احمد خان کی شخصیت کے کئی پہلو تھے۔ جہاں وہ مغرب نواز تھے وہاں انہوں نے مسلمانوں کی رہنمائی بھی کی۔لیکن کیا یہ مدرسہ اور سکول کا الگ الگ تصور پیش کر کے انہوں نے مسلمانوں کو تقسیم نہیں کیا؟

جواب: جہاں تک علی گڑھ کا تعلق ہے اس نے تو مسلمانوں کو تقسیم نہیں کیا۔انگریزی تعلیم کا چرچا تو علی گڑھ سے بہت پہلے تقریباً پچاس سال پہلے سے شروع ہو گیا تھا۔ مسلمانوں نے انگریزی تعلیم سے کام لے کر مغربی پادریوں کی شرانگیزیوں کا جواب دینے کا کام بھی شروع کر دیا تھا۔آپ نے مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا نام سنا ہوگا۔ جنہوں نے پادری سی پی فنڈر کی تردید میں بڑا کام کیا۔ یہ کہنا میں بھول گیا کہ فنڈر ہی کے کہنے پر ولیم میور نے یہ کتاب لکھی تھی۔ پادری فنڈر ایک بہت بڑا پادری تھا جو مسلمان علما سے مناظرہ کے لئے آیا تھا۔مسلمان علماء سے مناظرہ کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ علمائے اسلام کو شکست دے کر عیسائیت کی تبلیغ کے لئے راہ ہموار کر دے گا۔مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ ہندوستان کے مشہور عالم،مناظر اور بزرگ تھے۔انہوں نے مغربی مذاہب یعنی عیسائیت اور یہودی مذہب کا بہت گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ان کے ساتھ فنڈر کا مناظرہ ہوا۔مناظرہ میں پادری فنڈر کو شکست ہوئی اور وہ یہاں سے فرار ہو گیا۔اس کے فرار کے بعد مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے کئی کتابیں لکھیں۔ایک کتاب عربی میں لکھی۔عربی کتاب کا نام اظہار الحق ہے اور مسیحیت کی تنقید پر مسلمانوں کی طرف سے لکھی جانے والی چند بہترین کتابوں میں سے ایک ہے۔

بعد میں مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے 1857 کے جہاد میں حصہ لیا۔ جہاد کی ناکامی کے بعد وہ ہجرت کر کے مکہ مکرمہ چلے گئے۔ وہاں جب لوگوں کو پتہ چلا کہ انہوں نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے تو ان کی شہرت ہوئی اور دنیائے اسلام کے مختلف علاقوں میں ان کا نام معروف ہو گیا۔ترکی کے عثمانی خلیفہ نے انہیں استنبول آنے کی دعوت دی۔اتفاق سے انہی دنوں پادری فنڈر بھی استنبول میں تھا اور وہاں وہ یہ کہتا پھر رہا تھا کہ میں نے ہندوستان کے علما کو شکست دے دی ہے۔ جب اس کو پتہ چلا کہ مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ بھی آرہے ہیں تو وہ راتوں رات وہاں سے فرار ہو گیا اور پھر استنبول واپس نہیں آیا۔عثمانی خلیفہ نے مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی یہ کتاب اپنے خرچ پر شائع کرائی۔عرب دنیا میں اور عرب دنیا سے باہر درجنوں مرتبہ چھپ چکی ہے۔مشہور معروف کتاب ہے۔

مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کا یہ تذکرہ اس لئے بھی آیا کہ ان کے معاونین میں ایک صاحب علم اور انگریزی داں شخص ڈاکٹر وزیر خان تھے جو سرسید کی پیدائش سے بھی شاید پہلے انگلستان گئے تھے۔ وہاں سے انگریزی پڑھ کر آئے تھے۔سرسید کا لڑکپن تھا جب سے ڈاکٹر وزیر خان نے انگریزی زبان،مغربی علوم اور بائبل کا مطالعہ شروع کر رکھا تھا اور مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کو انگریزی زبان میں مسیحیت کا لٹریچر اور حوالے دینا ان کا کام تھا۔اس لئے یہ کہنا کہ سرسید نے پہلی بار انگریزی تعلیم کو فروغ دیا، یہ صحیح نہیں ہے۔نہ انہوں نے مدرسہ اور جدید تعلیم کو الگ الگ کرنے کی کوئی بات کی۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: سرسید کا تعلیمی پس منظر مذہبی تھا یا نہیں؟

جواب: اس زمانے میں ہر شخص کا تعلیمی پس منظر مذہبی ہوا کرتا تھا۔سرسید نے وہی روایتی تعلیم حاصل کی تھی جو بقیہ لوگ حاصل کرتے تھے۔سرسید عربی فارسی جانتے تھے۔فارسی میں ان کی غزلیں اور نعتیں مشہور ہیں۔فارسی بہت اچھی طرح جانتے تھے۔سرسید اور بانی دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی ایک ہی استاذ کے شاگرد اور ایک ہی درسگار کے پڑھے ہوئے تھے۔

ہمارے ہاں روایت یہ بن گئی ہے کہ یا تو ہر چیز کو آپ بالکل منفی انداز میں دیکھیں گے یا بالکل عقیدت مندانہ انداز میں دیکھیں گے۔ضروری نہیں کہ کسی شخص کی ایک بات سے اگر آپ متفق ہوں تو اس کی بقیہ تمام باتوں سے بھی آپ اتفاق کریں۔ یا اگر آپ کو ایک بات سے اختلاف ہے تو اس کی باقی تمام باتوں سے بھی اختلاف کریں۔ سرسید کی بہت سی باتوں سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔لیکن ان کی جو باتیں قابل تعریف ہیں ان کی تعریف کرنی چاہئے۔ یہ رویہ مسلمان کے شایان شان نہیں ہے کہ اگر آپ کسی کی ایک بات سے اختلاف کرتے ہوں تو آپ اس کی ہر بات کا انکار کر دیں۔اور اگر کسی کے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں تو اس کی ہر بات سے اتفاق کر لیں اور اس کے ہر رطب و یابس کو درست مان لیں۔اسلامی رویہ یہ ہے کہ 'خذ ما صفا دع ما کدر'، جو اچھا ہے وہ لے لو اور جو برا ہے اس کو رد کر دو۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: آپ نے مقاصد شریعت کی طرف اشارہ کیا اور کچھ کو بیان کیا۔ کیا کسی ایک مقصد کی تکمیل کے لئے دوسرے مقصد کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟

جواب: جی بالکل کیا جا سکتا ہے۔ ان مقاصد میں ایک ترتیب ہے جو کو لازماً ملحوظ رکھنا ہوگا۔ آپ پہلے مقصد کی خاطر دوسرے مقصد کو قربان کر سکتے ہیں۔ ایک فرق کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کی کمزوریوں سے واقف ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ انسان جان قربان کرنے کے لئے مشکل سے آمادہ ہوتا ہے۔ اس لئے اگر جان بچانے کے لئے صرف زبان سے کلمہ کفر کہہ دیا جائے، بشرطیکہ دل و جان ایمان پر مطمئن ہوں، تو قرآن نے اس کی اجازت دی ہے۔ اس ایک اجازت کے علاوہ بقیہ تمام مقاصد میں اسی ترتیب کو پیش نظر رکھا جائے گا۔ اس میں تحفظ جان سب سے پہلے اور تحفظ مال سب سے آخر میں ہے۔ اس لئے اگر مال قربان کر کے جان بچائی جا سکتی ہے تو بچانی چاہئے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: آپ نے فرمایا کہ آپ ﷺ کا بہترین معجزہ خود آپ کی سیرت مطہرہ اور آپ کی لائی ہوئی شریعت ہے جس کا مثالی نمونہ آپ کی شخصیت تھی۔ اگر وقت ہو تو اس ام المعجزات پر مزید روشنی ڈالیں کیونکہ شریعت آپ کی خاص دلچسپی کا مضمون ہے اور شریعت کے بارے میں بڑے فتنے پھیلائے جا رہے ہیں۔

جواب: شریعت پر مفصل گفتگو کی جائے یہ بات تو بہت لمبی ہو جائے گی۔ شریعت کے بارے میں اختصار کے ساتھ یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہے اور اتنے مضبوط عقلی دلائل پر استوار ہے کہ چودہ سو سال سے اس پر لوگ غور کر رہے ہیں اور اس کے عقل پر مبنی ہونے کے نئے نئے دلائل سامنے آ رہے ہیں۔ اس کے متکامل ہونے کے بارے میں نئے نئے پہلو سامنے آ رہے ہیں۔ شریعت میں جن موضوعات پر احکام دیئے گئے ہیں ان میں خالص اخلاقی احکام بھی شامل ہیں۔ روحانیت کے اصول بھی ہیں اور خالص قانونی مسائل اور تصورات بھی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اس میں عملیت یعنی اس کا practical ہونا بھی ہے۔ شریعت بیک وقت عملی چیز بھی ہے اور مثالی بھی ہے۔ اس میں قانون اور اخلاق کا انسانی تاریخ میں پہلی بار کامیاب اجتماع بھی ہے۔ شریعت کا ہر حکم اخلاقی اصولوں پر مدار رکھتا ہے اور تمام اخلاقی اصول قانون کی شکل میں concretize ہوتے ہیں۔ نہ یہاں اخلاق و قانون محض نظریہ ہے جس کی عملی تشکیل کا سامان نہ ہو، جس طرح کہ دوسرے بہت سے نظاموں میں بعض نظریات ہوتے ہیں کہ نظریاتی حد تک تک وہ بہت خوشنما اور اچھے اخلاقی اصول ہوتے ہیں لیکن عمل کی میزان میں بہت ہلکے پھلکے ثابت ہوتے ہیں۔ یہ بات کہ کوئی تمہارے ایک گال پر چانٹا مار دے تو تم دوسرا گال بھی اس کے سامنے کر دو، تقریر کرنے میں تو اچھی لگتی ہے، لیکن کیا آج تک کوئی ایسا آدمی آیا ہے جس نے ایک گال پر چانٹا کھا کر دوسرا گال بھی واقعتاً دشمن کے سامنے پیش کر دیا ہو۔ کسی دشمن نے ایک شہر فتح کر لیا ہو تو مفتوح ملک کے حکمران نے دوسرا شہر بھی رضا کارانہ خالی کر دیا گیا ہو کہ یہ بھی لے لو۔ ایک کمرے میں ڈاکہ پڑا ہو تو دوسرے کمرے کا دروازہ بھی کھول دیا ہو کہ میاں چور یہاں کا مال بھی لے جاؤ۔ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ نظری حد تک، تقریر کرنے اور شعر و شاعری کے لئے یہ بڑا اچھا نعرہ ہے، لیکن جب تک کسی نعرہ کو قانون کی شکل دے کر عملاً یہ نہ بتایا جائے کہ اس پر عمل کیسے ہوگا وہ محض ایک نظریہ اور ایک نعرہ ہے۔

اسلامی شریعت نے جہاں اخلاقی اصول بتائے ہیں وہاں ان کو قانون سے relate کیا ہے۔ جو قانونی احکام دیئے ہیں ان میں سے ہر ایک کی اساس اخلاقی ہدایات اور اصولوں پر ہے۔ اسلام میں اخلاق اور قانون دونوں یکجا ہوتے ہیں۔ اسلام میں جو آدمی جتنا مذہبی ہے وہ اتنا ہی قانون کا پابند ہے۔ اسی طرح جو شخص اسلامی قانون پر جتنا کاربند ہے اتنا ہی وہ فکری اور اخلاقی اعتبار سے اونچے مقام پر ہے۔ یہاں روحانیت، spirituality, legality, religiosity اور قانون کی پابندی سب ایک جگہ جمع ہیں جو پہلے کبھی بھی اس طرح توازن سے جمع نہیں تھیں۔ دوسری روایات میں مذہبی لوگ دنیا کے عملی مسائل سے دور ہیں۔ جو عملی مسائل سے قریب ہیں وہ مذہبیات سے دور ہیں۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: ایک ایسے معاشرہ میں جہاں لوگ غربت کی چکی میں پس رہے ہوں۔ خودسوزی پر آمادہ ہوں اور فحاشی کا پرچار ایک بڑے پیمانے پر ہو۔ آپ کے خیال میں

ایک ایسے معاشرہ میں بڑے پیمانے پر حدوداللہ کو نافذ کرنا اسلامی قانون کی روح سے متصادم نہیں ہے؟

جواب: میرے خیال میں ایسے ہی معاشرہ میں حدوداللہ کو نافذ ہونا چاہئے۔ یہ تو ایک عجیب سا سوال ہے کہ پہلے معاشرہ اسلامی ہو پھر حدود نافذ ہوں۔ یہ تو ایسی بات ہے جیسے انڈہ پہلے یا مرغی پہلے۔

آپ دونوں کام ایک ساتھ شروع کریں۔ معاشرہ کی اصلاح بھی کریں اور قوانین بھی نافذ کریں۔ اسلامی قوانین معاشرہ کو بہتر بنانے میں مدد دیں گے۔ اچھا معاشرہ اسلامی قوانین کو موثر ہونے میں مدد فراہم کرے گا۔ دونوں ایک دوسرے کو سہارا دیں گے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: تعسس سے کیا مراد ہے؟ دوبارہ وضاحت فرمائیے۔

جواب: تعسس کسی ایسی سراغ رسانی کو کہتے ہیں جس کا مقصد معاشرہ میں امن وامان قائم کرنا ہو۔ معاشرے میں مجرموں کا پتہ چلانا ہو۔ عسس پولیس اور مجسٹریسی کو بھی کہتے ہیں۔ عسس وہ ادارہ تھا جو مجرموں پر قابو پانے کا فریضہ انجام دیتا تھا۔

تعسس اگر ح سے ہو یعنی تحسس تو اس کا مطلب ہے کسی اچھی چیز کی تلاش اور اچھی چیز کے بارے میں معلومات جمع کرنا۔ اس میں مثبت جاسوسی شامل ہے یعنی اپنے اپنے دفاع کے لئے معلومات تلاش کرنا بھی اس میں شامل ہے۔

تحسس کا مطلب ہے کسی منفی مقصد کی خاطر لوگوں کی برائیوں کی تلاش کرنا۔ جیسا کہ بعض حکومتوں میں مخالفین کی فائلیں بنا کر رکھتے ہیں۔ مخالفین کے اخلاقی جرائم کا ریکارڈ رکھتے ہیں۔ تصویریں بنا کر پھر ان کو بلیک میل کرتے ہیں، یہ تجسس میں آتا ہے جس کی ممانعت ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اچھے حاکم کو اچھے وزیر فراہم کرتا ہے اور برے حاکم کو برا وزیر فراہم کرتا ہے۔ آپ خود بھی وزیر رہ چکے ہیں۔ اس تجربہ کی روشنی میں آپ حاکم وقت کو کیسا سمجھتے ہیں؟

جواب: میں جب یہ بات کہہ رہا تھا تو میرے ذہن میں وسوسہ آیا تھا کہ یہ سوال کیا جائے گا۔ میرے خیال میں اس کا اصل جواب تو خود اس حدیث کے الفاظ میں پنہاں ہے۔ الفاظ یہ ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کسی حاکم کے ساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے تو اس کو اچھا وزیر فراہم کر دیتا ہے۔ اور جب کسی حاکم کو سزا دینا چاہتا ہے تو اس کو برے وزیر عطا کر دیتا ہے۔ اس حدیث کی روشنی میں اپنے سوال کا جواب آپ خود ہی دیجئے۔ میں تو نیک نیت اور نیک عزائم سے گیا تھا اور نیک کام ہی کرنا چاہتا تھا۔ جب تک میں محسوس کرتا رہا کہ میں کچھ اچھے کام کر سکتا ہوں تو میں وابستہ رہا۔ جب میں نے محسوس کیا کہ ایسا کرنا مشکل ہے تو میں الگ ہو گیا۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: جس ریاست مدینہ کا آپ نے ذکر کیا وہ جمہوری تھی، پارلیمانی، صدارتی یا کوئی اور طرح کی؟

جواب: میرے خیال میں حضور ﷺ کے زمانے کی حد تک تو وہ ریاست نبویؐ تھا۔ اس کو صرف نبوی اور پیغمبرانہ ریاست کہنا چاہئے۔ جب حضور ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے اور صحابہ کرام نے ذمہ داریوں کو سنبھالا تو اس وقت سے وہ جمہوری اور شورائی ریاست تھی۔ حضرت صدیقؓ اکبر نے صحابہ کرام کے مشورہ اور رضامندی سے خلافت کی ذمہ داری سنبھالی تھی۔ اس کو آج کل کی اصطلاح میں کیا کہنا چاہئے، اس بارے میں مختلف لوگوں کی مختلف آراء ہیں۔ میرے خیال میں اس کو صدارتی نظام کے قریب کہنا چاہئے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: سوشل کنٹریکٹ یا عقد اجتماعی کی روشنی میں جو معاشرہ بنتا ہے اس کی خصوصیات اور امتیازات پر روشنی ڈالیں۔

جواب: یہ تو بہت لمبی بات ہو جائے گی۔سوشل کنٹریکٹ پر تو بڑی بڑی کتابیں موجود ہیں۔ میں نے صرف یہ حوالہ دیا تھا کہ مغرب میں سوشل کنٹریکٹ کی بات تو بہت ہوتی ہے۔لیکن ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ واقعی سوشل کنٹریکٹ ہوا ہو۔ یہ واحد مثال ریاست مدینہ کی ہے جہاں قبائل کے نمائندوں نے ایک معاہدہ کیا اور اس کے نتیجے میں ایک معاشرہ قائم ہوا اور ایک ریاست بنی۔لہٰذا اگر سوشل کنٹریکٹ کی کوئی حقیقت ہے تو اس کا اطلاق مدینہ کی ریاست پر ہی ہوسکتا ہے۔کسی اور ریاست پر اس کا اطلاق مشکل ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: ریاست مدینہ میں کھیل اور اس طرح کی دوسری ثقافتی اور تفریحی سرگرمیوں کا کوئی انتظام تھا یا نہیں؟

جواب: ریاست مدینہ میں تفریح اور کھیلوں کا بھی انتظام تھا۔صحابہ کرام کھیلوں میں حصہ لیا کرتے تھے۔کھیلوں کے مقابلے ہوتے تھے۔گھڑ دوڑ، اونٹ دوڑ، تلوار بازی اور تیراندازی کے مقابلے ہوتے تھے۔ یہ مقابلے بچوں کے درمیان بھی ہوتے تھے اور جوانوں کے درمیان بھی۔ یہ چیزیں حضورﷺ کے زمانے میں رائج تھیں۔ آج بھی ہونی چاہئیں۔اس کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: ریاست مدینہ میں ابلاغ یا اخبار کے ادارے تھے؟

جواب: اخبار تو اس زمانے میں نہیں ہوتا تھا۔لیکن جو کام اس زمانے میں اخبار نویس کیا کرتے ہیں وہ اس زمانے میں شاعر کیا کرتے تھے۔حضورﷺ نے شعرو شاعری کے ادارے سے کام لیا ہے۔ دربار رسالت میں شعرا موجود ہوتے تھے۔اسلام کے نقطہ نظر کو عرب میں عام کرنے کے لئے صحابہ کرام نے اس ذریعے سے کام لیا۔اس لئے ہم ابلاغ اور تشہیر کے ہر جائز ذریعے سے جائز کام لے سکتے ہیں۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: اگر ریاست میں مکمل اسلام نافذ کرنے کا موقع میسر آجائے تو نافذ کرنے کے لئے کیا اسلامی شریعت codified حالت میں موجود ہے؟

جواب: اس وقت تو موجود نہیں ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر ملک کے حالات مختلف ہیں۔شریعت کے احکام ہر ملک کے حالات کے لحاظ سے الگ الگ کوڈیفائی ہوں گے۔ بیشتر حصہ کوڈیفائی شکل میں موجود ہے۔ بہت سے احکام تحریری اور کوڈیفائیڈ شکل میں موجود ہیں۔ جو کوڈیفائیڈ موجود ہیں ان کو پہلے نافذ کرلیں بعد میں بقیہ احکام کوڈیفائی بھی ہو جائیں گے اور نافذ بھی۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ریاست میں نفاذ شریعت کا کام تدریجی انداز میں کرنا چاہئے۔آپ کی رائے اس بارہ میں کیا ہے؟

جواب: میں تدریجی انداز کا ہی قائل ہوں۔ دور نبویؐ میں بھی اسلامی شریعت کا نفاذ تدریجی انداز میں ہوا تھا۔شراب ایک دن میں حرام نہیں ہوئی تھی۔سود کی حرمت ایک دن میں نافذ نہیں ہوئی تھی۔ یہ جو بہت سارے احکام ہیں یہ تقریباً سب ہی ایک ایک کرکے تدریجاً ہی نافذ ہوئے تھے۔قرآن پاک کا نزول تیئس سال میں ہونا خود اس بات کی دلیل ہے۔اگر ساری شریعت کو یکدم سے نافذ ہونا ہوتا تو یہ سارے احکام ایک ہی دن میں نازل ہو جاتے۔ جب آخری دن تک قرآن پاک نازل ہوتا رہا تو یہ اس کی دلیل ہے کہ یہ کام تدریج کے ساتھ ہونا چاہئے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: اسلامی جمہوریت اور مغربی جمہوریت میں کیا فرق ہے؟

جواب: اسلامی جمہوریت اور مغربی جمہوریت میں تین بڑے فرق ہیں۔ اسلامی جمہوریت شریعت کی بالا دستی کی پابند ہے۔ شریعت کے احکام کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کرسکتی۔ جب کہ مغربی جمہوریت کوئی بھی فیصلہ کرسکتی ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ اسلامی معاشرے کے بہترین لوگ مسلمانوں کے قائد ہونے چاہئیں۔ مغربی جمہوریت میں یہ شرط نہیں ہے۔ تیسری چیز یہ ہے کہ عامۃ الناس جب اعتماد کا اظہار کریں تو اس میں اخلاقی اور روحانی considerations کو پیش نظر رکھا جائے۔ مغربی جمہوریت میں اس کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: کیا سفیروں کو تحائف سرکاری خزانے سے دیئے جاتے تھے؟

جواب: جی ہاں! سفیروں کو تحائف سرکاری خزانے سے دیئے جاتے تھے۔ سفیر حکومت کے مہمان ہوتے ہیں فرد کے نہیں۔ اس لئے سفیروں کو سرکاری خزانے سے تحائف دیئے جانا شریعت کے مطابق ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: جو لوگ رسول اللہ کے طریقہ کار کے مطابق اپنی زندگیوں کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں حکومت وقت کی اسلام مخالف پالیسیوں کے بارے میں ان کا رویہ کیا ہونا چاہئے؟

جواب: مسلمان کا رویہ یہ ہونا چاہئے کہ اچھی چیز میں تعاون کرے اور بری چیز میں تعاون نہ کرے۔ **وتعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان** ۔ نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کرو اور برائی اور سرکشی کے کام میں تعاون نہ کرو۔ یہ رویہ ہر شخص کے ساتھ ہونا چاہئے۔ حکمرانوں کو اخلاص اور درد مندی سے نصیحت کرنی چاہئے۔ اگر درد مندانہ نصیحت جو شرعی آداب و احکام کے مطابق کی جائے تو وہ بے نتیجہ نہیں رہتی۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: جب ریاست خود مقصود نہیں تو آیت کریمہ میں جو ذکر ہوا ہے کہ 'و**اجعل لی من لدنک سلطانا نصیراً**۔

جواب: سلطان کے معنی حکومت نہیں ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی اختیار یا اقتدار کو میرا مددگار بنا دے۔ وہ خواہ براہ راست حکومت کی شکل میں ہو یا کسی حکومت سے مدد کی شکل میں ہو۔ دونوں چیزوں کی اجازت ہے۔ اس آیت کے الفاظ سے بھی ریاست کا ذریعہ اور وسیلہ ہونا اور خود مقصود نہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: حکومت ضرورت ہے مقصد نہیں۔ یہ بات ذرا وضاحت کے ساتھ بیان کردیں۔

جواب: حکومت مسلمانوں کا مقصود اصلی نہیں ہے۔ قرآن مجید میں کہیں بھی مسلمانوں سے یہ نہیں کیا گیا کہ اے مسلمانوں تم حکومت قائم کرو۔ یہ کہا گیا ہے کہ تم امت قائم کرو۔ تم میں سے ایک امت ہونی چاہئے جو اچھائی کی طرف بلائے اور برائی سے روکے۔ تم لوگوں کو اخلاق سکھاؤ۔

اس کام کو کرنے میں اگر حکومت رکاوٹ بنتی ہے تو اس کی اصلاح کرو۔ اور اگر تم میں سے کسی کو اللہ تعالیٰ حکومت دے دے تو وہ اس کو اسلام کے مطابق چلائے۔ اس لئے اصل اور بنیادی ذمہ داری معاشرہ کی اصلاح اور دین داری کا قیام ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں ایک ہوتا ہے 'مطلوب لعینہٖ'، اور ایک ہوتا ہے 'مطلوب لغیرہٖ یعنی مقصود لعینہ اور مقصود لغیرہ'، یعنی وہ چیز جو per se مقصود ہے۔ some thing to be required or to be done per se. ایک وہ چیز ہے جو کسی اور مقصد کی خاطر ایک ذریعہ کے طور پر ضرورت کی وجہ سے اختیار کی جائے۔ تو حکومت کی ضرورت بطور وسیلہ اور ذریعہ کے ہے بطور خود مقصود نہیں ہے۔ بالفاظ دیگر حکومت مقصود لعینہ نہیں، مقصود لغیرہ ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: موجودہ دور کی سب سے بڑی اسلامی مملکت سعودی عرب کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب: آپ ہی بتائیے کہ وہ سب سے بڑی اسلامی مملکت کس اعتبار سے ہے۔ اگر اس اعتبار سے ہے کہ وہاں مسلمان رہتے ہیں تو پھر تو انڈونیشیا اور پاکستان زیادہ بڑی مملکتیں ہیں۔ اگر اس اعتبار سے کہ وہاں حرمین واقع ہے تو بلاشبہ وہ سرزمین مقدس اور یقیناً قابل احترام ہے۔ مکمل اسلامی احکام کے مطابق افسوس ہے کہ آج کی کوئی مملکت اسلامی مملکت نہیں ہے۔ مکمل اسلامی احکام کے مطابق ایک اسلامی معاشرہ اور ریاست کا قیام ہم سب کی آرزو ہے۔ وہ جب قائم ہوگی کہ معاشرہ اسلامی ہوگا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ جب معاشرہ کے افراد کی اکثریت اسلام سے بے بہرہ ہو۔ عبادات کی پابند نہ ہو۔ چوری، بدکاری، جھوٹ اور اس طرح کے جرائم میں مبتلا ہو اور حکومت حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ جیسی قائم ہو جائے۔ یہ نہیں ہوسکتا۔

کسی نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں بہت امن تھا۔ آپ کے زمانے میں بدامنی کیوں ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ وہ میرے جیسے لوگوں پر حاکم تھے میں تم جیسے لوگوں پر حاکم ہوں۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: آپ نے فرمایا تھا کہ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں عریف اور نقیب کا ادارہ موجود تھا۔ کیا اس کو آج کے دور میں لوکل گورنمنٹ سسٹم کہا جاسکتا ہے؟

جواب: جی ہاں، کہا جاسکتا ہے۔

ایک مرتبہ جنرل ضیاء الحق نے 82-1981 میں ایک کمیٹی بنائی تھی۔ اس کو یہ کام کرنے کے لئے بھی کہا گیا تھا۔ اس کمیٹی میں میں نے عریف اور نقیب کی بنیاد پر لوکل گورنمنٹ کا ایک اسٹرکچر بنایا تھا۔ اب بھی اس کی کاپی میرے پاس پڑی ہوئی ہے۔ وہ خاکہ جنرل ضیاء الحق صاحب کو بھیجا بھی تھا، لیکن شاید انہوں نے یا ان کے رفقاء نے اس کو پاکستان کے لئے قابل عمل نہیں سمجھا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: ہمارے دین نے ہمیں سکھایا کہ غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دیں۔ اگر ایمان لائے تو ٹھیک ورنہ ذمی بن کر رہے یا پھر اس کے ساتھ جنگ ہے۔ امریکہ بھی آج کل یہی کر رہا ہے۔ کہتا ہے کہ اپنا سب کچھ میرے حوالہ کر کے ذمی بن کر رہو اور اگر نہیں مانتے تو جنگ کر دیتا ہے۔ اگر ہمارا دین یہ کہے تو ٹھیک ہے اور اگر امریکہ کہے تو غلط ہے؟

جواب: اسلام نے کبھی وہ کام نہیں کیا جو امریکہ کر رہا ہے۔ اسلام نے کبھی یہ نہیں کہا کہ آپ ہمارے دوست ہیں یا دشمن۔ دوست ہیں تو بلا تامل ہر اچھی بری بات میں ہمارا ساتھ دیں اور دوست نہیں ہیں تو دشمن ہیں اور ہم آپ کو تہس نہس کر دیں گے۔ اسلام یہ کہتا ہے کہ جو غیر مسلم آپ کے ملک میں رہتے ہوں تو یا تو وہ کسی مصالحت کے نتیجے میں آپ کے شہری بنے ہوں جس طرح کہ پاکستان کے غیر مسلم ہیں۔ یا کسی جنگ کے نتیجے میں بنے ہوں جیسا کہ کئی علاقوں میں غیر مسلم تھے۔ ان کے حقوق متعین اور محفوظ ہیں۔ جو معاہدہ کیا جائے اس پر عمل کیا جائے۔ شرائط اور حقوق وہ ہیں جو متعین ہیں ان میں کمی بیشی نہیں کی جاسکتی۔ وہ مفتوحہ علاقہ کے غیر مسلم شہری ہوں یا صلح کے علاقہ کے غیر مسلم ہوں۔ لیکن مصالحت یا معاہدہ کے نتیجے میں اگر غیر مسلموں کو مزید حقوق دیئے گئے ہوں تو ان کی پابندی بھی کرنی ہوگی۔ یہ اسلام کا حکم ہے۔ میرے خیال میں دوسرے عقائد کے ماننے والوں کو یا اقلیتوں کو اتنے حقوق آج تک کسی اور مذہب نے نہیں دیئے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: کیا موجودہ صدارتی یا پارلیمانی نظام اسلام سے مطابقت رکھتا ہے؟

جواب: میری ذاتی رائے میں صدارتی نظام اسلام سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔ لیکن آج کل کے ماحول میں پاکستان کے بہت سے سیاسی لوگ اس کو قبول نہیں

کرتے۔ شاید اس لئے کہ یہاں صدارتی نظام کا تجربہ خوش آئندہ نہیں رہا۔ یہاں صدارتی نظام کے نام پر فردِ واحد کی آمریت مسلط کی گئی جس نے ملک کو دو ٹکڑے کر کے چھوڑا۔

اسلامی نظام میں اصل چیز حکمرانوں پر عامۃ الناس کا اعتماد ہے۔ قرآن وسنت سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ اسلام کے مستند شارحین نے بھی یہی لکھا ہے۔ برصغیر کے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے لکھا ہے 'المھم فی الخلافۃ رضا الناس بہ' ۔ خلافت کے بارے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ لوگ اس پر راضی ہوں۔ امام غزالی نے اپنی کتاب 'فضائح باطنیۃ' میں لکھا ہے کہ 'فالشخص المتبوع المطاع اذا بایع کفا' کہ اگر کسی شخص سے جو یہ حیثیت رکھتا ہو وہ لوگ اس کی تابعداری کریں، جب عامۃ الناس اس سے بیعت کرلیں تو یہ کافی ہے۔ اس طرح کے درجنوں حوالے دیئے جاسکتے ہیں جس میں عامۃ الناس کے اظہارِ اعتماد کو ریاست کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: آپ نے فرمایا کہ اسلام کا اصل مقصد دعوت وتربیت اور حکومت ایک ضرورت ہے۔ اس دور میں مختلف جماعتیں جو اسلامی حکومت کے لئے کام کررہی ہیں وہ کہتی ہیں کہ ہم اجتماعی طور پر کافر ہیں کیونکہ اجتماعی معاملات اللہ کی کتاب کے مطابق نہیں ہورہے ہیں۔ وضاحت فرمائیں۔

جواب: یہ وضاحت تو آپ ان جماعتوں سے طلب کریں جو یہ کام کررہی ہیں اور پوری قوم کو آپ کے بقول اجتماعی طور پر کافر قرار دے رہی ہیں۔ ان کی طرف سے میں کیسے وضاحت کرسکتا ہوں۔ لیکن میں نے جو کچھ ان کے بارے میں تھوڑا بہت پڑھا ہے، اس کی روشنی میں وہ بات درست نہیں ہے جو آپ فرمارہے ہیں۔ جمعیت علمائے اسلام، جماعت اسلامی، جمعیت علمائے پاکستان کا لٹریچر دیکھیں تو ان کا کہنا یہی ہے کہ ہم دراصل دعوت وتبلیغ کے لئے کھڑے ہوئے ہیں اور دعوت وتبلیغ کے کام میں ایک غلط حکومت رکاوٹ بن سکتی ہے اس لئے حکومت کو بدلنے کا مقصد بھی ہمارا ایک ثانوی یا جزوی مقصد ہے۔ اس لئے نظری اعتبار سے وہ بھی وہی بات کہہ رہے ہیں جو میں نے عرض کی۔

مولانا مودودی نے ماچھی گوٹھ میں غالباً 1956 میں ایک تقریر کی تھی۔ اس میں انہوں نے اپنے پروگرام کے چار مدارج بیان کئے تھے۔ ایک تطہیر عقائد، دوسرا تعمیر عقائد، تیسرا اصلاح معاشرہ اور چوتھا اصلاح حکومت۔ انہوں نے یہ کہا تھا کہ ہم ان چاروں پر کام کریں گے۔ یہ وہی بات ہے جو میں نے کہی ہے اس لئے ان دونوں باتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

اگر کوئی کہتا ہے کہ ہم اجتماعی طور پر کافر ہیں تو مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ ہم الحمدللہ اجتماعی طور پر کافر نہیں ہیں۔ ہم اجتماعی طور پر بھی مسلمان ہیں اور انفرادی طور پر بھی مسلمان ہیں۔ پاکستان ایک مسلم اور اسلامی ریاست ہے۔ جیسے مسلمان انفرادی طور پر خطا کار ہوسکتے ہیں، اور گنہگار ہوتے ہیں، اسی طرح اجتماعی طور پر بھی مسلمانوں سے بھی غلطیاں سرزد ہوسکتی ہیں اور ہوتی ہیں۔ اس طرح ہماری ریاست مسلمان ہے لیکن اس سے بھی غلطیاں سرزد ہوسکتی ہیں۔ غلطیاں نہیں ہونی چاہئیں۔ ریاستی غلطیوں کے ہم سب ذمہ دار ہیں۔ پاکستانی ریاست یا پاکستانی معاشرہ کو کافر ریاست یا کافر معاشرہ کہنا میرے خیال میں غلط ہے۔ مسلمانوں کی یوں اجتماعی تکفیر کرنے والوں کو اللہ سے توبہ کرنی چاہئے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: رسول اللہ ﷺ کی سیرت کی روشنی میں پاکستان کے لوگوں کو سیاست پر زور دینا چاہئے یا دعوت وتبلیغ کے ذریعے اسلامی اقدار پھیلانے پر زور دینا چاہئے۔

جواب: میرے خیال میں تو سیاست پر زور دینے اور تعلیم وتربیت کو نظرانداز کرنے سے ہی سارے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ یہ بات میں کئی بار عرض کرچکا ہوں کہ سیرت مبارکہ کی روشنی میں کام کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے اسلامی اقدار، اخلاق اور تمدن کو دعوت وتبلیغ کے ذریعے قائم کیا جائے۔ اس کے بعد جب اسلامی تہذیب اور اسلامی اخلاق وجود میں آجائیں تو پھر ان کے تحفظ کے لئے ریاست کی ضرورت پڑتی ہے۔ ریاست مقصد نہیں بلکہ ضرورت ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: اتباع سنت میں پرانی دشمنی نظرانداز کرنا ثابت ہے۔کیاانگریزوں کی پرانی دشمنی کے بارے میں کوئی ہدایت ملتی ہے۔

جواب: حضورﷺ نے جن کی دشمنی کو بھلانے کے لئے کہا تھا وہ صحابی تھے اور اسلام لے آئے تھے۔انگریز اگر دشمنی چھوڑ کر اسلام قبول کر لیں تو ہم ان کو سر آنکھوں پر بٹھانے کے لئے تیار ہیں۔مشکل یہ ہے کہ انہوں نے یہ دشمنی پانچ سو سال سے نہیں چھوڑی اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں شدت آرہی ہے۔وہ جو قرآن پاک میں آیا ہے کہ 'وما تخفی صدورھم اکبر' تو یہ بات درست ثابت ہو رہی ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: جب بھی علمی اور تحقیقی کاوشوں کے نتیجے میں دنیاوی ترقی کی بات ہوتی ہے،فخر کے لئے ہمارے پاس ماضی کے سوا شاید کچھ نہیں بچتا۔مسلمانوں کی مادی اور ذہنی مغلوبیت کو دور کرنے کے لئے موجودہ دنیائے علوم وفنون کو قرآن وسنت کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے کیا حال ہی میں کوئی اجتماعی یا انفرادی اور منظم اور جامع کوشش کی جارہی ہے؟ مزید یہ کہ ایک فرد کے لئے یہ بات کس طرح ممکن ہے کہ وہ اسلامی قوانین کی جامعیت اور ابدیت کو جدید دور کے تقاضوں کے مطابق ثابت کرے؟

جواب: میرے خیال میں یہ کام ایک ملی اور اجتماعی فریضہ ہے۔اس لئے یہ اہم کام اداروں کو بھی کرنا چاہیئے اور افراد کو بھی کرنا چاہئے۔علامہ اقبال نے آج سے ستر اسی سال پہلے اس ضرورت کی طرف اشارہ کیا تھا۔انہوں نے 1925 میں صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے نام خط میں لکھا تھا کہ اس وقت مذہب اسلام گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جارہا ہے۔جو شخص زمانہ حال کے jurisprudence پر تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا وہ بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم اور شاید اسلام کا مجدد ہوگا۔اس لئے خواہ ایک فرد یہ کام کرے، یا بہت سے افراد مل کر یہ کام کریں،کام یہ بہت اہم ہے اور اس کی بہت ضرورت ہے۔اس میں پیش رفت بھی ہوئی ہے۔اب دنیا کے بہت سے دوسرے ممالک میں بھی یہ کام ہو رہا ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: سیاسی اور عسکری اعتبار سے جب مشکل وقت ہوتا ہے تو اسلام زیادہ تیزی سے پھیلتا ہے۔اس کی محرکات اور وجوہات کیا ہیں؟

جواب: اس کے محرکات اور وجوہات بظاہر یہ معلوم ہوتے ہیں کہ جب ملت مسلمہ کو سیاسی طور پر مشکل پیش آتی ہے اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو مسلمان خود بخود اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔مسلمانوں میں مصیبت کے وقت اللہ کی طرف رجوع کرنے کا ایک مزاج ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔اس لئے وہ سیرت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

غیر مسلموں کو جب کامیابی کے بعد مسلمانوں کے ساتھ براہ راست واسطہ پڑتا ہے تو ان کی زندگی کے ایسے پہلو سامنے آتے ہیں جو پہلے ان کے علم میں نہیں ہوتے۔دور سے جب آدمی معاملہ کرتا ہے تو اور بات ہوتی ہے اور جب قریب آتا ہے تو بہت سے دوسرے پہلو سامنے آتے ہیں۔جب اسلام کے نئے اور مثبت پہلو سامنے آتے ہیں تو مخالفین بھی مطالعہ کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور جب مطالعہ کرتے ہیں تو اسلام کے حقائق سامنے آجاتے ہیں۔اسلامی کی عظمت کا احساس ہوتا ہے اور یوں بہت سے لوگ اسلام قبول کر لیتے ہیں۔

رسول اللہﷺ کے بارے میں ایک مرتبہ ایک صحابی نے یہ بیان کیا تھا (اور یہ بیان حضورﷺ کے پیغام پر بھی صادق آتا ہے)۔کہ جب کوئی شخص رسول اللہﷺ کو پہلی مرتبہ دیکھتا تھا یا دور سے دیکھتا تھا تو اس پر ایک رعب اور خوف کی کیفیت طاری ہوتی تھی۔جب کسی کو حضورﷺ کے ساتھ قریب رہنے اور مل بیٹھنے کا موقع ملتا تھا تو پھر حضورﷺ کی محبت میں اضافہ ہوتا تھا۔جو جتنا قریب ہوتا تھا اتنا ہی حضورﷺ کی محبت میں غرق ہوتا تھا۔یہی حال حضورﷺ کے پیغام کا ہے کہ جو لوگ دور سے دیکھتے ہیں اور سنی سنائی باتوں پر بھروسہ کرتے ہیں وہ کسی پرانی عصبیت کی وجہ سے قریب نہیں آتے۔لیکن جب قریب آتے ہیں اور براہ راست واسطہ پڑتا ہے تو بہت سے ایسے پہلو سامنے آجاتے ہیں جن سے وہ پہلے واقف نہیں ہوتے۔اس لئے وہ اسلام قبول کر لیتے ہیں۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: آپ نے بہترین اسلامی معاشرہ کے قیام کے لئے جو اصول بیان کئے، یعنی پہلے تعلیم، پھر تربیت، پھر تہذیب۔ ہم اتنے لیٹ ہوگئے ہیں کہ اب کیا بہترین راستہ ہوسکتا ہے؟

جواب: ہم بالکل لیٹ نہیں ہوئے۔ آپ اسلامی تعلیم سے شروع کریں، تہذیب اور معاشرت خود بخود آجائے گی۔ مسلمانوں میں کوئی بھی چیز مکمل طور پر غائب نہیں ہوئی ہے۔ اسلامی تہذیب بھی مکمل طور پر غائب نہیں ہوئی ہے، نہ ہی اسلامی تعلیم مکمل طور پر معدوم ہے اور نہ ہی اسلامی ثقافت سرے سے ناپید ہے۔ یہ ساری چیزیں موجود ہیں لیکن کہیں دھندلا گئی ہیں، کہیں کمزور پڑ گئی ہیں۔ جب آپ تربیت اور تعلیم کا کام شروع کریں گے تو جو چیزیں دھندلا گئی ہیں ان پر پڑا ہوا غبار اتر جائے گا اور وہ صاف ہوکر سامنے آجائیں گی۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: امت کے لئے کچھ انتہائی متنازعہ امور پر رائے قائم کرنے کے لئے کیا کیا جائے؟

جواب: دیکھئے اللہ تعالیٰ کی منشا یہ نہیں تھی کہ تمام علما اور فقہا اور محدثین ایک جگہ جمع ہوکر ایک ہی رائے بنا دیتے اور ساری امت اس کی پیروی کرتی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا منشا نہیں تھا۔ یہ رسول اللہ ﷺ کا منشا بھی نہیں تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو خود تربیت دی کہ ایک سے زائد نکتہ نظر کو اپنائیں اور اختیار کریں۔ دو مثالیں میں نے آپ کو دی تھی۔ ایک مثال تھی بنی قریظہ کے محلّہ میں نماز عصر پڑھنے کی۔ جس میں کچھ صحابہ نے نماز راستہ میں پڑھ لی کچھ نے وہاں پہنچ کر پڑھ لی تو مغرب کا وقت ہوگیا اور نماز قضا ہوگئی۔ حضورؐ نے دونوں کو پسند فرمایا کہ لقد اصبتم لقد اصبتم دونوں سے کہا کہ تم نے ٹھیک کیا۔
ایک اور موقعہ پر دو صحابیؓ تھے۔ ان کو ایک سفر میں غسل کی ضرورت پیش آئی۔ پانی نہیں تھا انہوں نے تیمّم کر کے نماز پڑھ لی اور تیمّم اور نماز کے بعد ایک صاحب کو پانی مل گیا تو انہوں نے غسل دہرایا اور نماز بھی دہرائی جب کہ دوسرے صاحب نے کہا کہ دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تو دونوں نے اپنی بات حضورؐ کی خدمت میں عرض کی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ان صاحب سے جنہوں نے دوبارہ غسل کیا تھا کہ لک الاجر مرتین کہ تمہیں دہرا اجر ملے گا۔ جن صاحب نے غسل نہیں کی اور نماز نہیں دہرائی۔ آپؐ نے ان سے فرمایا لقد اصبت السنۃ، تمہیں سنت کے مطابق کام کرنے کی توفیق ہوئی۔ گویا دونوں کو حضورؐ نے بہت پسند فرمایا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ گویا بعض احکام کی ایک سے زائد تعبیریں ممکن ہیں۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: شیعہ حضرات کے بارے میں بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ کافر اور منافقین ہیں۔ شیعہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کو نہیں مانتے اور اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ نبی کریمؐ خلافت کی جو صفات دے گئے ہیں وہ ان حضرات میں موجود نہیں تھیں، کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ آئین میں ان کو کافر لکھوانا ہے۔

جواب: دیکھئے یہ بڑی غیر ذمہ داری کی باتیں ہیں۔ جو لوگ یہ باتیں کہتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت دے۔ ان کو یہ باتیں نہیں کہنی چاہئے۔ یہ دنیائے اسلام میں ایک ٹائم بم رکھنے کے مترادف ہیں۔ شیعہ حضرات آج سے نہیں ہیں۔ کم سے کم تیرہ سو برس سے چلے آرہے ہیں۔ کبھی بھی مسلمانوں نے ان کو کافر نہیں کہا۔ بڑے بڑے اہل علم نے شیعہ عقائد کا مطالعہ کیا تو انہیں غلط تو کہا، ان پر تنقید بھی کی اور ان کی کمزوریاں بھی واضح کیں لیکن کسی نے یہ نہیں کہا کہ شیعہ دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ لہٰذا یہ بات جو پچھلے پندرہ بیس سالوں سے پیدا ہوئی ہے۔ اس نے دنیائے اسلام میں بڑا افساد پیدا کیا ہے۔ میرے نزدیک شیعوں کے عقائد غلط ہیں۔ اسلام کے مطابق نہیں ہیں۔ بس بات ختم ہوگئی۔ میں ان کے عقائد کو صحیح نہیں سمجھتا۔ لیکن غلط عقائد کے علمبردار ماضی میں بہت سے لوگ رہے ہیں۔ خوارج کے بہت سے عقائد غلط تھے۔ لیکن ان کے بارے میں کسی نے نہیں کہا کہ وہ دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ شیعہ اس وقت بھی موجود تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کا انکار کرنے والے، اور حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کا انکار کرنے والے پہلے صدی میں بھی بہت تھے۔ لیکن کسی نے ان کو کافر نہیں کہا۔ کسی کی خلافت کے انکار سے کوئی کافر نہیں ہوتا۔ جس چیز کے انکار سے آدمی کافر ہوتا ہے وہ قرآن وسنت ہیں۔ قرآن مجید میں کہیں بھی نہیں آیا کہ اے مسلمانو ابوبکر اور عمر کو خلیفہ مانو۔ جو شخص ان جلیل القدر صحابہ کرام کی خلافت کا انکار کرتا ہے وہ امر واقعہ کا انکار کرتا ہے۔ اگر کوئی انکار کرے کہ سورج نہیں نکلا تو وہ ایک امر واقعہ کا منکر ہوگا۔ امر واقعہ کے انکار سے کوئی شخص کافر

نہیں ہو جائے گا۔اس کی بے وقوفی اپنی جگہ۔ بے وقوف ہونا الگ بات ہے اور کافر ہونا الگ بات ہے۔ اس طرح جاہل ہونا الگ بات ہے اور کافر ہونا الگ بات۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: خلیفہ کی اطاعت تو ہر حال میں سوائے اللہ کی نافرمانی کے فرض ہے، تو پھر جمہوریت میں حکومت یا صدر کے احکامات مسترد کیسے کریں؟ چونکہ اس سلسلہ میں کوئی باقاعدہ اصول یا قانون نہیں۔ اگر باقاعدہ اصول ہوگا تو اس کا طریقہ کار کیا ہوگا؟

جواب: جمہوریت یا غیر جمہوریت، بادشاہت یا غیر بادشاہت، ان سب نظاموں میں شریعت کے نقطہ نظر سے بنیادی چیز یہ ہے کہ جو فیصلہ ہوا ہے اگر وہ شریعت کے مطابق ہے اور عامۃ الناس کے مفاد پر مبنی ہے تو آپ اس کی تائید کریں۔ اور اگر کوئی فیصلہ، اقدام یا قانون شریعت کے خلاف ہے اور عامۃ الناس کے مفاد سے متعارض ہے تو آپ اس کی مخالفت کریں۔ اسلام میں پارٹی کی بنیاد پر مخالفت یا حمایت کا کوئی تصور نہیں۔ اسلام میں اس طرز عمل کی کوئی گنجائش نہیں کہ کوئی چیز شریعت سے متعارض ہو رہی ہے، شریعت کے خلاف کوئی فیصلہ کیا جا رہا ہو، کوئی قانون قرآن وسنت سے متعارض بنایا جا رہا ہو، لیکن آپ صرف اس لئے تائید کر رہے ہیں کہ آپ کی پارٹی یہ کام کر رہی ہے۔ یہ شریعت میں جائز نہیں۔ اسی طرح سے اگر کوئی کام شریعت کے مطابق ہو رہا ہے کوئی فیصلہ ایسا کیا جا رہا ہے جو شریعت کے مطابق ہے، کوئی قانون سازی ایسی ہو رہی ہے جس سے شریعت کے مقاصد کو آگے بڑھانے میں مدد ملتی ہے۔ لیکن آپ محض اس لئے اس کی مخالفت کر رہے ہیں کہ آپ کی مخالف پارٹی وہ کام کر رہی ہے۔ ایسی صورت میں نہ آپ کے لئے مخالفت کرنا جائز ہے، نہ ہی آپ کی پارٹی کے لئے جائز ہے۔ یہ وہ بنیادی چیز ہے جو اسلام کو مغربی جمہوریت سے ممتاز کرتی ہے۔ مغربی جمہوریت میں کسی چیز کی اچھائی یا برائی کا فیصلہ اکثر و بیشتر پارٹی کی پالیسی کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر پارٹی کی پالیسی ایک چیز کے حق میں ہے تو پارٹی اس کی تائید کرتی ہے ورنہ مخالفت کرتی ہے۔

میں نے ایسے مناظر دیکھے ہیں کہ اسمبلی میں رائے دینے والوں کو یہ بھی نہیں پتہ ہوتا کہ انہوں نے رائے کس چیز کے بارے میں دی ہے۔ پارٹی کی ہدایت آتی ہے کہ فلاں موقع پر ہاتھ اٹھا دو تو لوگ ہاتھ اٹھا دیتے ہیں۔ پارٹی کی طرف سے ہدایت آتی ہے کہ واک آؤٹ تو لوگ واک آوئٹ کر دیتے ہیں۔ بیشتر حالات میں واک آوئٹ کرنے والوں کو یہ پتا ہی نہیں ہوتا کہ ہم نے کیوں واک آؤٹ کیا ہے۔ یہ طرز عمل میرے خیال میں شریعت کے مطابق نہیں ہے۔ مسلمان کو ہر اس چیز کی تائید کرنی چاہیے جو شریعت اور عامتہ الناس کے مفادات کے مطابق ہو۔ اور ہر اس چیز کی مخالفت کرنی چاہئے جس میں شریعت کی نافرمانی ہو رہی ہو اور عامتہ الناس کے مفاد کی نافرمانی ہو رہی ہو۔ چاہے اس کا تعلق کسی بھی پارٹی سے ہو۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: What is the difference between Secularism & Enlightement of Islam or Moderate Islam?

جواب: علامہ اقبال نے سیکولرازم کی وضاحت کرتے ہوئے ایک جگہ اس کے لئے ''لادینیت'' کی اصطلاح استعمال کی ہے اور نیچے حاشیے میں لکھا ہے: ''یعنی امور مملکت سے مذہب کا لاتعلق ہو جانا''۔ یہی سیکولرازم ہے۔ جب دینی معاملات کو ملکی، اجتماعی، ملی، سیاسی معاملات سے بے دخل کر دیا جائے اور یہ طے کیا جائے کہ ملکی و ملی معاملات دین کی راہنمائی سے آزاد ہوں گے تو یہ سیکولرازم کہلائے گا۔ جہاں تک Enlightement Islam یا Moderate Islam کا تعلق ہے، تو ایک تصور تو Moderate Islam کا خود اسلام میں موجود ہے جہاں غلو سے منع کیا گیا اور اعتدال کی دعوت دی گئی ہے دوسرا Enlightement وہ ہے جس کی آج کل زور وشور سے دعوت دی جا رہی ہے۔ اس کی وضاحت تو وہی حضرات کر سکتے ہیں جو یہ دعوت دے رہے ہیں، میں اس کی وضاحت نہیں کر سکتا۔ میں تو اس moderation کی وضاحت کر سکتا ہوں جو قرآن مجید میں ہے۔ وہ غلو سے اعراض واجتناب ہے کہ غلو نہ کیا جائے، دین میں تشدد نہ کیا جائے۔ حدیث میں آیا ہے: ''ان ھذا الدین رفق فأو غلوا فیه برفق'' (یہ دین نرمی اور آسانی کی دعوت دیتا ہے لہٰذا دین پر نرمی اور آسانی کے ساتھ عمل کرو)۔ ''ولن یشاد الدین احد الا غلبه'' (دین کے معاملے میں جو شخص بھی سختی کرے گا تو وہ سختی اس پر غالب آجائے گی)۔ یہ دین میں اعتدال کا مفہوم

ہے۔آج کل جس اعتدال کی دعوت دی جارہی ہے وہ دعوت دینے والوں سے پوچھیں کہ اس سے کیا مراد ہے؟ میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: قرآن مجید کی آیت "یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمة سواء بیننا و بینکم" میں اہل کتاب سے تہذیبی مکالمے کی اجازت دی گئی ہے۔کیا آج کی مغربی تہذیب جو لادینیت کی علمبردار ہے، ان سے تہذیبی مکالمہ ممکن ہے؟ اگر ممکن ہے تو کن اساسات پر؟

جواب: آج کی مغربی تہذیب کے ساتھ بھی مکالمہ ممکن ہے۔ یقیناً یہ تہذیب ایک لادینی تہذیب ہے، لیکن اس کے بیشتر عناصر کا دارومدار اور بنیاد مسیحی عقائد اور تصورات پر ہے۔ بالفرض اگر یہ تہذیب لادینی نہ بھی ہو تو بھی مکالمہ ان لوگوں سے کیا جانا چاہئے جو آج کی غالب اور بالادست قوتوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے سامنے تین options ہیں۔تین کے علاوہ کوئی چوتھا option نہیں ہے۔"ھی ثلاثه لا رابعة لها"۔

ایک آپشن یہ ہے کہ آپ ان کے ساتھ تصادم کی پالیسی جاری رکھیں، یا آپ انہیں تباہ کردیں یا وہ آپ کو تباہ کردیں۔امکان یہی ہے کہ وہی ہمیں تباہ کردیں گے، ہم انہیں تباہ نہیں کرسکتے۔لیکن ایسا کرنا نہ ان کے مفاد میں ہے نہ ہمارے مفاد میں ہے۔دوسرا آپشن یہ ہے کہ کشمکش کی جو موجودہ صورتحال ہے وہ جاری رہے۔ یہ ایک غیر فطری اور غیر طبعی صورتحال ہے۔انسانی معاشروں میں جب غیر ضروری کشاکش ہوتی ہے تو معاشرہ توتر (Tension) کا شکار ہوتا ہے اور یہ توتر لامتناہی یا غیر معینہ عرصے تک جاری نہیں رہ سکتا۔اس لئے صورت بھی قابل قبول اور زیادہ قابل عمل نہیں ہے۔تیسری صورت یہ ہے کہ پر امن بقائے باہمی کا طریقہ طے کرنے کے لئے مکالمہ ناگزیر ہے۔اس لئے مکالمے کے علاوہ تو کوئی اور ممکنہ حل اس وقت موجود نہیں ہے۔مکالمے کے لئے ضروری ہے کہ جو لوگ اس میں حصہ لیں وہ مسلمانوں کے مستقبل پر اعتماد رکھتے ہوں۔

جو لوگ مسلمانوں کے ماضی سے بے خبر، حال سے برگشتہ اور مستقبل سے مایوس ہوں وہ کیا مکالمہ کریں گے۔وہ تو پہلے ہی غلامانہ ذہن رکھتے ہیں، ایسے غلام تو پہلے ہی ہتھیار ڈال چکے ہیں۔لہٰذا ہتھیار ڈال دینے والے، غلامانہ ذہن والے قائدین مکالمہ نہیں کرسکتے۔مکالمہ تو وہ آزاد فکر، باوقار اور ذمہ دار قائدین کرسکتے ہیں کہ جو اسلام پر اعتماد رکھنے والے، مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں پر امید اور مغرب سے برابری و مساوات کی سطح پر مکالمہ کرنے کا عزم اور صلاحیت رکھتے ہوں۔غلام اور آقا کے درمیان مکالمہ نہیں ہوتا۔ بھکاری اور بھیک دینے والے کے درمیان مکالمہ نہیں ہوتا۔ظالم اور مظلوم کے درمیان مکالمہ نہیں ہوتا۔جب تک تعلق کی نوعیت ظالم اور مظلوم کی رہے گی، وہ ہمیں ظالم قرار دیں یا ہم انہیں ظالم قرار دیں، جب تک ظالم اور مظلوم کی نوعیت رہے گی، جب تک مستعمِر اور مستعمَر کی نوعیت رہے گی، غالب اور مغلوب کی نوعیت رہے گی، مکالمہ بے معنی ہے۔اس لئے مکالمے کے لئے ضروری ہے کہ ایسے حالات پیدا کیے جائیں کہ مکالمہ بامعنی، مفید اور نتیجہ خیز ہو۔اس کے بغیر انسانیت کو کسی تباہی سے بچانا ممکن نہیں ہے۔نہ صرف تعداد بلکہ اثر و رسوخ اور جغرافیائی محل وقوع کے اعتبار سے اسلام اور مسیحیت مل کر پوری انسانیت کی تقریباً دو تہائی سے زائد کی نمائندگی کرتے ہیں۔اگر وسائل کو دیکھا جائے تو ماسوائے 15،14 فیصد وسائل کے، جس کا کچھ حصہ مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے، بقیہ تقریباً پچاسی فیصد وسائل بھی مغرب کے ہاتھ میں ہیں۔اس لئے انسانیت کا مفاد اس میں ہے کہ جلد از جلد اسلام اور مغرب کے درمیان آزادانہ، بامعنی اور نتیجہ خیز مکالمہ ہو۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: آپ کہہ رہے ہیں کہ مغرب سے ایک بامقصد مکالمہ ہونا چاہئے۔ جب مغرب مسلمانوں پر جنگوں پر جنگیں مسلط کررہا ہے تو ایسے میں مسلمانوں کے پاس کیا حل بچ جاتا ہے؟ یا مکالمہ کی صورت کیا ہوسکتی ہے؟ مسلمانوں کے پاس تو صرف دفاعی جہاد کا راستہ ہی بچ جاتا ہے۔اس لئے میرے خیال میں تیاری کرنی چاہئے؟

جواب: جہاں تک دفاع کا تعلق ہے، اس سے کبھی بھی غافل نہیں ہونا چاہئے۔اگر جارحیت ہو تو اس کا دفاع یقیناً اور بلاتأمل کرنا چاہئے، لیکن دفاع کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ مغرب کے جو ذمہ دار حضرات ہیں، جو وہاں نسبتاً معقول لوگ ہیں، ان کو مکالمے کی دعوت دی جائے اور مکالمے کی فضاء پیدا کی جائے۔لیکن مکالمے کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ دنیائے اسلام میں ایک متفقہ آواز ہو، ایک متفقہ مؤقف ہو اور دنیائے اسلام میں مستقبل کے بارے میں پر امیدی ہو۔

دنیائے اسلام کی قیادتیں اسلام اور اپنے وسائل کے بارے میں اعتماد رکھتی ہوں۔ علامہ اقبالؒ نے ایک جگہ کہا ہے کہ ’’مومن خود کا فرافرنگ شو‘‘ (سب سے پہلے اپنے آپ پر ایمان لاؤ اور فرنگی کے ساتھ کفر کرو)۔ جب تک وہ مومن خود کا فرافرنگ نہیں ہوں گے اس وقت تک مکالمہ نہیں ہوسکتا۔ اس کے لئے پہلے ہمیں ہوم ورک کرنا ہوگا، تیاری کرنی پڑے گی۔ ابھی مسلمانوں نے مکالمے کے لئے سرے سے کوئی ہوم ورک نہیں کیا۔ ہوم ورک کے لئے پہلے اپنے گھر کو in order کرنے کے بعد اس کے لئے فضاء پیدا کرنی ہوگی، مسلمانوں میں ایک متفقہ موقف کو جنم دینا ہوگا۔ متفقہ موقف اتنا موثر ہو، رائے عامہ اس کے بارے میں اتنی با اثر ہو کہ حکمران اور با اثر لوگ اس موقف کو اپنانے پر مجبور ہو جائیں۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: کیا مغربی سیکولر تہذیب اور اسلام میں مشترکات تلاش کیے جاسکتے ہیں؟

قرآن تو اہل کتاب کے ساتھ تعاون اور ہم کاری کی بات کرتا ہے۔ آج کل کی مغربی دنیا، کم از کم سیکولر مغرب، تو دین سے ہی برگشتہ ہے۔ کیا مادی وسائل کے محض استعمال پر ہی اکتفاء کرنا چاہئے؟ کہ باقی کی درآمد میں تو نظریات وافکار بھی آجاتے ہیں، ٹیکنالوجی کے انتقال میں بھی؟

جواب: اسلام اور مغربی تہذیب میں بہت سے مشترکات موجود ہیں اور ان مشترکات کو تلاش کیا جانا چاہئے۔ اس کے باوجود کہ وہ لا مذہب ہو گئے ہیں لیکن ان کی بڑی تعداد ابھی تک مسیحیت کے کسی نہ کسی تصور پر ایمان رکھتی ہے۔ وہ خالق کائنات پر ایمان رکھنے کے دعویدار ہیں، وہ انبیاء میں سے بہت سوں پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں، وہ آخرت کی زندگی کے قائل ہیں، اخلاقیات کی روحانی اساس کا تصور کسی نہ کسی انداز میں ان کے اندر موجود ہے اور انسانوں کی فلاح و بہبود کا کم از کم زبانی نعرہ اور دعویٰ ان کی زبانوں پر موجود ہے۔ یہ وہ مشترکات ہوسکتے ہیں جن کی بنیاد پر آگے بات کی جاسکے۔ پھر اسلام نے محض صرف مذہبی لوگوں کے ساتھ ہی تعاون کی بات نہیں کی، بلکہ رسول اللہ ﷺ نے تو بت پرستوں اور مشرکین کے ساتھ بھی تعاون کیا۔ جب رسول اللہ ﷺ کی عمر مبارک ۲۰ سال کے قریب تھی تو آپ ؐ اپنے چچاؤں کی معیت میں ایک اجتماع میں شریک ہوئے جس کا مقصد یہ تھا کہ عرب میں آنے والے ناداروں، بے کسوں اور مظلوموں کی مدد کی جائے اور با اثر قبائل کے مقابلے میں کمزور لوگوں کو مدد فراہم کی جائے۔ اس معاہدے کو عرب کی تاریخ میں ’’حلف الفضول‘‘ کے نام سے یاد کیا گیا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اعلان اسلام کے بعد دعوت کا آغاز فرمایا اور اسی طرح کی چیزیں اس دعوت کا حصہ بنیں تو بعض صحابہؓ کو حلف الفضول کی دفعات یاد آئیں۔ انہوں نے پوچھا کہ ’’حلف الفضول‘‘ کے بارے میں آپؐ کا کیا خیال ہے؟ جواب میں آپؐ نے فرمایا کہ میرے لئے ایسے کسی معاہدے میں شامل ہونا بہترین نعمتوں سے بھی زیادہ افضل ہے۔ ’’ولو دعیت الیه فی الاسلام لأجبت‘‘ (اور مجھے جب بھی اسلام میں کسی ایسے معاہدے کی دعوت دی جائے گی تو میںؐ لبیک کہوں گا، قبول کروں گا)۔ اس لئے معاہدہ، ہم کاری اور تعاون انسانی اقدار ہیں۔ مشترکہ اقدار، اخلاقی مقاصد اور انسانی مصالح کی بنیاد پر تو بت پرستوں سے اور مشرکین سے بھی معاہدہ ہوسکتا ہے۔ اس لئے موجودہ مغرب سے بھی ہونا چاہئے۔ جہاں تک مادی وسائل کا تعلق ہے تو مغرب سے سیکھنے کے لئے ہمیں بہت کچھ کرنا ہے۔ مادی وسائل تو بہر حال حاصل کرنا ہیں اور بھی بہت سے علوم وفنون ہیں جن میں مہارتوں کا حصول دنیائے اسلام کی آزادی اور تہذیبی مستقبل کے لئے ضروری ہے۔ لیکن جو بھی سیکھائے، خواہ وہ علوم وفنون کے میدان میں ہو، صنعتوں کے میدان میں ہو، ٹیکنالوجی کے میدان میں ہو یا خالص علوم کے میدان میں، وہ اسلام اور اسلامی تہذیب کی شرائط پر ہونا چاہئے، غیر مشروط نہیں ہونا چاہئے۔ یہی آج کی گفتگو میں بنیادی بات تھی جو میں آپ کے سامنے رکھنا چاہتا تھا۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: مغربی اور اسلامی تہذیب کا روز اول سے تصادم تو اہل علم کے علم میں ہے۔ کیا ہمارے حکمران، یعنی مسلم حکمران، حکمرانی کی خواہش رکھنے والے سیاسی اور عسکری قائدین بھی اس تصادم سے واقف ہیں؟ اگر واقف ہیں تو ان کی قیادت کیا عزائم رکھتی ہے؟ اگر واقف نہیں ہیں تو انہیں کون بتائے گا؟

جواب: میرے خیال میں دنیائے اسلام کے بیشتر قائدین اس تصادم اور اس کے ممکنہ نتائج سے پوری طرح واقف ہیں۔ مجھے بہت سے قائدین اور حکمرانوں سے بات کرنے اور ان کے خیالات سننے کا موقع ملتا رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ واقف سب ہیں۔ لیکن ان میں تین طرح کے لوگ ہیں۔ کچھ تو وہ ہیں جو واقفیت کے باوجود یہ

چاہتے ہیں کہ ہمارا اپنا وقت اور ہمارا دورِ حکمرانی اچھا گزر جائے اور ہم اپنا عرصہ اقتدار آرام سے گزار لیں۔ اس کے بعد مستقبل کی خدا جانے۔ مسلمان اور آنے والی نسلیں بھگتیں۔ ہم اپنا وقت ٹھیک ٹھاک انداز میں گزار کر چلے جائیں۔ کچھ لوگ تو خود غرضی کے اس درجے پر فائز ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو مسلمانوں کی موجودہ حالت پر اندر ہی اندر کڑھتے رہتے ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان بہت کمزور ہیں۔ مسلمانوں کے پاس وسائل نہیں ہیں، اس لئے مغربی طاقتوں کی محض خوشامد اور منتیں کر کے ان کے ماتحت رہ کر گزارا کرنا چاہئے اور اچھے وقت کا انتظار کرنا چاہئے۔ دنیائے اسلام میں سیاسی اور حکومتی قائدین میں بڑی تعداد کا تعلق انہی دو گروہوں سے ہے۔ اکا دکا حضرات ایسے بھی مل جاتے ہیں جن کا خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کو مغرب کے مقابلے کے لئے تیار کرنا چاہئے اور اس تیاری کے لئے جو بھی چیزیں ان کے پروگرام میں ہیں وہ ان کو کرتے رہتے ہیں۔ لیکن احساس سب کو ہے۔ ایسا نابینا کوئی بھی نہیں ہے جس کو یہ نظر نہ آ رہا ہو کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ لیکن اگر پھر بھی کسی حکمران یا سیاسی قائد کو نظر نہیں آ رہا تو ایسے حکمرانوں اور ایسے قائدین سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہئے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: صدر محترم! آپ کا بہت بہت شکریہ کہ اس سیریز میں متعدد دنیاوی، شرعی اور دیگر مسائل کو آپ نے discuss کیا ہے۔ دنیا آج اکیسویں صدی سے گزر رہی ہے۔ It's called knoweledge based & knoweledge-driven century. اس میں اب اگر دیکھا جائے تو Gap of knowledge between the West & Muslims is increasing and incearsing experimentlly, particularlly in science & technologies اس کی implications ہمارے لئے کیا ہیں؟ particularly on the defense side دوسرے ہم امہ کا نام لیتے ہیں۔ دس سال پہلے جب میں اسلامی بنک میں لیکچر پر گیا تو میں نے ایک calculation کی تھی کہ one percent of the income of the Ummah OICs countries amounts to 11 billion dollar. اگر وہ ایک percent ہم ہر سال خرچ کرتے رہیں تو ہم اپنے سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کے اداروں سمیت دیگر اداروں کو بھی چلا سکتے ہیں۔ وہ کیوں نہیں ہو رہا؟

جواب: میرے خیال میں اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ دنیائے اسلام کے بہت سے قائدین اور خاص طور پر باوسیلہ قائدین مغرب کے براہ راست اثر میں ہیں اور مغرب کے اثرات اور اشارہ ابرو کے منتظر رہتے ہیں اور اس اشارہ ابرو کے بغیر وہ کوئی کام کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ میں خود ایک یونیورسٹی سے وابستہ ہوں اور طویل عرصہ اس کی انتظامی ذمہ داریوں سے بھی میرا تعلق رہا ہے۔ ہماری یونیورسٹی نے کوشش کی کہ دنیائے عرب سے کچھ وسائل ہمیں حاصل ہو جائیں۔ ہم نے پاکستان کے تین سربراہوں سے مختلف عرب سربراہوں کو خطوط لکھوائے۔ اس کے جواب میں جو امداد ہمیں وصول ہوئی وہ ایک ملین ڈالر تو ایک فرمان روا کی تھی اور پچاس پچاس ہزار ڈالر تین یا چار مرتبہ ایک دوسرے فرمان روا کی تھی۔ اس کے علاوہ پچھلے 25 سالوں میں ایک پیسہ بھی کسی باوسیلہ مسلم حکمراں سے بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کو نہیں ملا۔ اس کے برعکس شاید ہی کوئی مہینہ ایسا گزرتا ہو کہ کوئی بااثر عرب فرمارو اکسی مغربی تعلیمی ادارے کو کروڑوں ڈالر نہ دیتا ہو۔ چند سال پہلے ایک عرب ملک کے شہزادے نے ایک مغربی ملک کا دورہ کیا اور وہاں اتنی بڑی رقم بطور عطیہ دی کہ مجھے یہ محسوس ہوا کہ شاید یہ طباعت کی غلطی ہے۔ میں نے اس کی تحقیق کی اور پتا چلا کہ وہ طباعت کی غلطی نہیں تھی بلکہ وہ غیر معمولی رقم اس شہزادے نے واقعی وہاں دی تھی۔ ایک اور عرب بااثر شہزادے نے ایک مغربی ملک میں ایک ادارے کو رقم دی اور اس ادارے نے وہ رقم یہ کہہ کر واپس کر دی کہ ہم تم جیسے دہشتگرد ملک کے وسائل سے کوئی استفادہ نہیں کرنا چاہتے۔ ان توہین آمیز رویوں کے باوجود وسائل کا رجحان یا وسائل کا بہاؤ مغربی ممالک ہی کی طرف ہے۔

آج سے کوئی بیس سال پہلے مجھے برطانیہ جانے کا اتفاق ہوا۔ برطانیہ میں ایک ادارہ ہے جس کا مقصد خلیج فارس یا خلیج عرب کے امور کا مطالعہ ہے۔ اس مرکز مطالعہ خلیج میں عرب دنیا نے اتنے وسائل دیئے ہیں اور وہاں گلف کے بارے میں اتنا لٹریچر موجود ہے کہ دنیا میں شاید ہی کہیں اتنا لٹریچر موجود ہو۔ میں وہاں دس بارہ دن مقیم رہا۔ ان دس بارہ دنوں میں استفادہ کرنے والے سو فیصد افراد یا تو اسرائیل کے تھے یا ہندوستان کے تھے۔ اسرائیلی اور انڈین ہی وہاں آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے اور عرب ممالک کی اہم ترین دستاویزات تک ان کی رسائی تھی جو عربوں کے عطیہ سے اور عربوں کے وسائل سے وہاں رکھی گئی تھیں۔

آپ اعلیٰ سائنسی تحقیق اور ٹیکنالوجی کا کوئی ادارہ قائم کر کے دیکھیے، پھر دیکھیں باوسیلہ مسلم حکمرانوں کے خزانوں سے کتنا پیسہ آتا ہے۔ آج سے آٹھ دس سال قبل

ہمارے محترم ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے ایک عالمی اسلامی سائنسی یونیورسٹی کا عالی شان منصوبہ تیار کیا تھا جس کا مقصد پوری دنیائے اسلام میں سائنسی تعلیم کو فروغ دینا تھا۔ ڈاکٹر صاحب یہ منصوبہ لے کر بہت سے عرب ممالک کے ذمہ داروں سے ملے۔ کسی نے بھی زبانی جمع خرچ کے علاوہ۔ وہ بھی بہت اترے جی سے۔ کچھ نہ کیا۔ اس صورتحال میں وہ وسائل دنیائے اسلام کے لئے نہ ہونے ہی کے برابر ہیں۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: کسی جگہ اسلامی شریعت کو apply نافذ کرنے کے لئے پہلے اسلامی اخلاق کی تربیت کرنا ضروری ہے یا ڈائریکٹ ہی اسلامی شریعت نافذ کی جائے گی؟

جواب: یہ دونوں کام ایک ساتھ ہونے چاہئیں۔ یہ کہنا کہ پہلے اخلاق درست ہوں اور پھر شریعت نافذ ہو۔ یہ عذر عذر لنگ معلوم ہوتا ہے اور شریعت کو ملتوی کرنے کے مترادف ہے۔ اس کی اجازت شریعت میں نہیں ہے۔ میں اور آپ یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ جب تک لوگوں کے اخلاق ٹھیک نہیں ہوتے اس وقت تک ہم شریعت کو نافذ نہیں کر سکتے۔ کس نے ہمیں شریعت کو ملتوی کرنے کا یہ اختیار دیا ہے۔ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اخلاق کی تربیت نہ کریں۔ اخلاق کی تربیت اور شریعت پر عمل درآمد دونوں ایک ساتھ ہونے چاہئیں۔ دونوں کو ایک دوسرے سے مدد ملے گی۔ دونوں ایک دوسرے کو complement کریں گے۔

(محاضراتِ فقہ)

Is democracy different from the concept of Hurriat in Islam?

جواب: ڈیموکریسی اور حریت اسلامی میں ایک بنیادی فرق ہے۔ وہ یہ ہے کہ ڈیموکریسی جس طرح کہ امریکہ اور برطانیہ میں ہے، اگر ڈیموکریسی سے مراد وہ ہے جو مغرب کے سیکولر نظاموں میں سمجھی جاتی ہے تو اس میں حق و باطل کا معیار اکثریت اور اقلیت ہے۔ اگر اکثریت کہہ رہی ہے کہ 'اے' حق ہے اور 'بی' غلط ہے۔ اس کا کوئی تعلق وحی الٰہی کی رہنمائی سے نہیں ہے۔ جب کہ شریعت یہ کہتی ہے کہ حق و باطل کا آخری، حتمی اور قطعی معیار اللہ کی شریعت اور رسول اللہ ﷺ پر آنے والی وحی ہے۔ اگر وہ کسی چیز کو حق کہتی ہے تو وہ حق ہے، چاہے ملک کے تمام چودہ کروڑ مسلمان خدانخواستہ یہ فیصلہ کر دیں کہ انہیں یہ یا وہ بات منظور نہیں، تو اس سے حق نہیں بدلے گا بلکہ حق حق ہی رہے گا۔ چودہ کروڑ انسان مل کر طے کر لیں کہ فلاں معاملہ جائز ہے اور وہ شریعت میں ناجائز ہو تو وہ ناجائز مسئلہ جائز نہیں ہو جائے گا۔ اسلام اور ڈیموکریسی میں یہ بنیادی فرق ہے۔

اگر ڈیموکریسی شریعت کے حدود کی تابع ہو۔ آپ یہ طے کر لیں کہ شریعت کی حدود بالا دست ہیں۔ شریعت ریاست کا بالا دست اور سپریم قانون ہے اور پارلیمنٹ کوئی قانون ایسا نہیں بنائے گی جو شریعت کے احکام کے خلاف ہو اور اس کو چیک کرنے کا کوئی موثر میکنزم ہو جو یہ چیک کرے کہ کوئی قانون شریعت سے متعارض نہیں ہے تو پھر ڈیموکریسی کی اسلام میں پوری پوری گنجائش ہے۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: کیا اسلامی ریاست میں چیف جسٹس کی برطرفی کی صورتیں جائز ہیں؟

جواب: سوال چیف جسٹس کی برطرفی کے جائز ہونے یا ناجائز ہونے کا نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس وقت ہم ایک قانون، ایک آئین اور ایک معاہدے کی روشنی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہمارے اور حکمرانوں کے درمیان ایک معاہدہ ہے جو دستور پاکستان کہلاتا ہے۔ امت اصل صاحب اختیار ہے جیسا کہ ابھی میں نے عرض کیا، اور حکمران اس کے نمائندے ہیں۔ ان نمائندوں کا عزل ونصب چند شرائط کی بنیاد پر ہوا ہے۔ وہ شرائط قانون اور دستور کی متعلقہ دفعات میں طے ہوئی ہیں۔ **المسلمون عند شروطھم:** یہ شریعت کا حکم ہے کہ مسلمان ان شرائط کے پابند ہیں جو وہ طے کریں۔ ان دستوری شرائط میں یہ طے کیا گیا تھا کہ چیف جسٹس کو نکالنے کا یہ طریقہ کار ہوگا۔ اب اس طریقہ کار کی خلاف ورزی سے شریعت کے احکام کی بھی خلاف ورزی ہوئی ہے۔ فرض کیجئے میں اور آپ یہ طے کریں کہ آپ مجھے اپنی گاڑی فروخت کریں گے اور میں آپ کو قسطوں میں قیمت ادا کروں گا۔ بعد میں آپ سے گاڑی کا قبضہ لے کر میں ڈنڈے کے زور پر آپ سے یہ کہوں کہ اس دستاویز پر دستخط کرو ورنہ میں تمہیں قتل کر ڈالوں گا اور آپ مجبوراً دستخط کر دیں کہ میں نے گاڑی مفت دے دی۔ اب میں یہ کہتا پھروں کہ فلاں صاحب نے مجھے گاڑی

ہدیہ کردی ہے۔اسٹامپ پیپر پر یہ لکھا ہوا ہے۔ایسا جبری اور یک طرفہ اسٹامپ پیپر valid نہیں ہے۔ اکـــراہ کی روشنی میں کیا جانے والا کوئی بھی فیصلہ شریعت میں قابل قبول نہیں۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: حکمران کے انتخاب کا اسلامی طریقہ کار کیا ہے؟

جواب: ابھی میں نے عرض کیا کہ عامۃ الناس کی رضامندی سے انتخاب ہونا چاہئے۔ عامۃ الناس اپنے فیصلے خود براہ راست بھی کر سکتے ہیں، اور اپنی طرف سے وکالتاً فیصلے کرنے کے لئے اپنے نمائندے بھی مقرر کر سکتے ہیں۔ایک زمانہ تھا کہ جو اصحاب بدر تھے وہ عامۃ الناس کی نمائندگی کیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت ہوئی تو لوگ حضرت علیؓ کے پاس گئے اور ان سے عرض کیا کہ اب آپ ہی سب سے بہتر ہیں۔ظاہر ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا تھا کہ اس وقت ان سے بہتر کوئی شخص روئے زمین پر موجود نہیں تھا۔لیکن انہوں نے فرمایا کہ **لیس ذالک الیکم** اس کا فیصلہ کرنے کا تمہیں اختیار نہیں ہے۔ **انما ذالک الی اھل بدر** یہ فیصلہ کرنے کا اختیار اہل بدر کو حاصل ہے۔**فمن رضی به اھل بدر فھو خلیفة** جس کو اہل بدر خلیفہ بنائیں گے وہی خلیفہ بنے گا۔ چنانچہ اس پورے عمل کی تکمیل میں تین دن لگے۔ جب اہل بدر کی بڑی تعداد نے اور ان کی غالب اکثریت نے سیدنا علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی اس دن سے انہوں نے خلافت کی ذمہ داریاں انجام دیں۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: جہاد فی سبیل اللہ کی وضاحت کرتے ہوئے آپ نے فرمایا تھا کہ جہاد اللہ کا کلمہ اونچا کرنے کے لئے ہوتا ہے تو پھر ہم کشمیر اور فلسطین میں جہاد فی سبیل اللہ کے دعویدار کیوں ہیں؟

جواب: کشمیر اور فلسطین میں کسی دوسرے کی زمین پر قبضہ کرنے کے لئے جہاد نہیں ہو رہا ہے۔وہاں کا جہاد اعلائے کلمۃ اللہ ہی کے لئے ہو رہا ہے۔اعلاء کلمۃ اللہ کے مفہوم میں یہ بات بھی شامل ہے کہ جب کوئی غیر مسلم قوت مسلمانوں کے علاقوں پر قبضہ کر لے یا مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکال دے یا مسلمانوں کو قتل کرے یا مسلمانوں کی تبلیغ اور دینی زندگی کی راہ میں کاوٹ ڈالے اس کے خلاف تلوار لے کر کھڑا ہونا بھی جہاد ہے۔ یہ خود قرآن مجید سے ثابت ہے۔**اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا و ان الله علی نصرھم لقدیر** (اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے، کیونکہ وہ مظلوم ہیں، اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے)۔ لہٰذا قرآن مجید کی رو سے مظلوم کو تلوار اٹھانے کا حق ہے۔فلسطینیوں سے زیادہ مظلوم قوم اس وقت روئے زمین پر نہیں پائی جاتی۔ کشمیریوں سے زیادہ مظلوم قوم ہمارے برصغیر کے علاقے میں نہیں پائی جاتی۔اس لئے ان کی جدوجہد بالکل جہاد ہے۔ وہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے ہے۔مسلمانوں کی آزادی کا تحفظ بھی اعلاء کلمۃ اللہ کا ایک ذریعہ ہے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: اس وقت جو پاکستان میں ریاست ہے وہ کس زمرے میں آتی ہے؟

جواب: پاکستان کی ریاست الحمد اللہ اسلامی ریاست ہے۔ پاکستان ایک اسلامک ری پبلک ہے۔ جیسے ہم گنہگار ہیں، جیسا میں ایک گنہگار مسلمان ہوں، ریاست پاکستان بھی ایک گنہگار مسلمان ریاست ہے، البتہ آج کل کچھ زیادہ ہی گنہگار ہو رہی ہے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: یہ چار پانچ دن سے مذاکرہ جاری ہے۔لیکن میں نہیں آسکا۔آج بین الاقوامی امور کے حوالے سے آیا ہوں۔ مجھ ناچیز کا ایک سبجیکٹ ہے۔ Islam's Encounter with the West اس پر میں نے کتابیں اور مقالے لکھے ہیں۔میں کچھ روشنی کی تلاش میں آ گیا کہ شاید مجھے کچھ روشنی ملے۔ میں صرف یہ

پوچھنا چاہتا ہوں کہ جیسا کہ آپ نے کہا کہ شریعت کی بالادستی ہونی چاہئے۔ اور اسلامی ریاست کا مقصد یہی ہے کہ اقامت الدین کے دین کا قیام ہو جائے۔ میں آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ بش نے ایک بیان میں کہا ہے، اس نے ملائیشیا کے ایک ٹی وی کو بیان دیتے ہوئے کہا ہے کہ میں نے طے کر لیا ہے کہ میں خلافت اس زمین میں نہیں نافذ ہونے دوں گا اور شریعت کو میں اس زمین میں نافذ نہیں ہونے دوں گا۔ یہ اس نے صاف صاف کہا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایک مغربی مصنف ڈینیل پائپس نے ایک کتاب لکھی ہے کہ Militant Islam Reaches America۔ اس میں اس نے لکھا ہے کہ میرا اور مغرب کا سب سے بڑا دشمن شریعہ ہے۔ اور اس نے ایک ادارہ قائم کیا ہے جو Institute of progressive Islam کے نام سے ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ برطانیہ کے وزیر خارجہ نے بہت پہلے یہ کہا تھا کہ میں شریعت کو نہیں قائم ہونے دوں گا۔ مجھے شریعت پسند نہیں ہے۔ رینڈ ایک بہت بڑا امریکن کارپوریشن ہے، اس کا کہنا ہے کہ ہر وہ شخص ہر وہ مسلمان جو میرے ویلیو سسٹم کے مطابق کام نہیں کرتا ہے وہ میرا دشمن ہے۔ مثلاً ان کے ہاں تو کھلی جنسی اباحیت ہے۔ مذہب ذاتی معاملہ ہے، جس کا جی چاہے عمل کرے، جس کا جی چاہے نہ کرے، جبکہ مسجد میں جانا اور نماز ادا کرنا میرے یہاں فرض ہے۔ تو اسلام کے بنیادی افکار اور بنیادی اصولوں سے اس طرح کی مخالفت امریکہ کر رہا ہے اور کرتا چلا آ رہا ہے، اور کہتا ہے کہ نہیں کرنے دیں گے۔ قرآن مجید کی آیت ہے کہ ''تم لڑو اپنے دشمن سے اور جو خدا کا دشمن ہے جسے تم نہیں دیکھ سکتے ہو''۔ کیا یہ لوگ خدا کے دشمن نہیں ہیں جس کو ہم نہیں دیکھ سکتے ہیں۔ ان کے خلاف میرا جہاد جائز نہیں ہے؟

میرے پاس توپ اور بندوق تو ہے نہیں کہ ہم اس سے لڑ سکیں، میرے ساتھ ان کے مقابلے میں نشر و اشاعت کی مشین نہیں ہے کہ پروپیگنڈے میں ان کا مقابلہ کر سکوں۔ ایک لے دے کے، میرے پاس تو میری جان ہے، ہم اپنی جان دے سکتے ہیں ان کے مقابلے میں، اس سے زیادہ تو ہمارے قبضہ میں کچھ نہیں ہے۔ آپ نے ابھی فرمایا کہ لڑنے والے دشمن کے خلاف خودکش حملہ کرنا تو ٹھیک ہے لیکن وہ جو لڑ نہیں رہا ہے اس کے خلاف ایسا کرنا درست نہیں ہے۔ اور یہاں تو جو آپ نے مثالیں دیکھیں کہ جو دین کی جڑوں کو اکھاڑ رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ ہم نہیں ہونے دیں گے کیا وہ دشمن نہیں ہیں؟ اس کے خلاف ہم نہیں لڑ سکتے؟ اس کے خلاف خودکش حملہ جائز نہیں ہے؟

جواب: میرا خیال ہے کہ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ ہم شریعت کو نافذ نہیں ہونے دیں گے، اس کے خلاف فی الحال ہمیں قلم سے جہاد کرنا چاہئے۔ فکر سے جہاد کرنا چاہئے۔ دعوت سے کام لینا چاہئے۔ لیکن اگر کوئی ہم پر باقاعدہ فوجی حملہ کر رہا ہے اس کا جواب ظاہر ہے کہ ہتھیار ہی سے دیا جائے گا۔ میں اس حملے کا بھی دفاع کروں گا اور قلم سے جواب بھی دوں گا۔ لیکن جس نے ابھی تک مجھ پر براہ راست حملہ نہیں کیا اور وہ اپنی زبان اور قلم سے میرے دین کے خلاف کام کر رہا ہے، اس کے جواب میں مجھے بھی اپنی زبان اور قلم سے اپنے دین کا دفاع کرنا چاہئے۔ وہ بھی جہاد القرآن ہوگا۔ جہاد بالقلم ہوگا۔ قرآن مجید میں جہاد القرآن کی اصطلاح بھی استعمال ہوئی ہے۔ مکی سورتوں میں ایک جگہ آیا ہے وجاھدھم بہ جھاد کبیراً (اس قرآن سے کام لے کر ان کے خلاف زبردست جہاد کرو)۔ لہٰذا ہمیں ان لوگوں کے خلاف جہاد بالقرآن کرنا چاہئے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: ایران کی موجودہ حکومت اور طالبان کی اسلامی حکومت میں کیا ہمارے لئے کوئی مثال بن سکتی ہے؟

جواب: میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس وقت مختلف مسلم ممالک کے حالات مختلف ہو سکتے ہیں اور جزوی فرق اور تنوعات کے ساتھ اسلامی ریاست یا اسلامی حکومت کے مختلف ماڈل ہو سکتے ہیں۔ اور ان متعدد ماڈلوں کی موجودگی کے یہ معنی نہیں ہوں گے کہ شریعت اسلامی کی اساس میں اختلاف ہے۔ یہ محض تعبیر وتفسیر اور اجتہاد کا اختلاف ہوگا۔

ایران میں شیعہ مسلمانوں کی اکثریت ہے، شیعوں کا ایک خاص نظام ہے۔ ان کے ہاں تقریباً منظّم چرچ کی طرح ہی کا ایک نظام روحانیان موجود ہے۔ مثلاً پہلے مجتہد ہوتا ہے، پھر حجۃ الاسلام ہوتا ہے، پھر آیت اللہ ہوتا ہے، پھر آیت اللہ کے اوپر آیت اللہ العظمیٰ ہوتا ہے، پھر ایک مرجع یا اعلم ہوتا ہے۔ مرجع کے فتوے کی لوگ پیروی کرتے ہیں۔ اس طرح کا نظام سنی دنیا میں نہیں ہے۔ اس لئے اگر شیعہ حضرات اپنا ایسا سیاسی نظام بناتے ہیں جس میں وہاں کے علماء کا کردار بنیادی اور اہم ہو تو وہ آسانی سے ایسا کر سکتے ہیں۔ لیکن اس طرح کا کوئی نظام سنی دنیا میں نہیں ہے۔ اس لئے یہاں ایسا کرنا موجودہ حالات میں ممکن نہ ہوگا۔

اسی طرح سے مثلاً سعودی عرب کا نظام ہے۔ سعودی عرب کے بارے میں بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ وہاں بڑی سخت قسم کی بادشاہت قائم ہے۔ شاہی خاندان ہی سب کچھ کرتا ہے اور عامۃ الناس کا وہاں کے معاملات میں کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ تاثر درست نہیں ہے۔ وہاں ایسا نہیں ہے۔ میں سعودی عرب بار ہا گیا ہوں، وہاں کے بے شمار ذمہ دار لوگوں سے میری گفتگوئیں رہی ہیں۔ ان کے قواعد بھی میں نے پڑھے ہیں۔ ان کے ہاں تین ادارے کام کرتے ہیں۔ یہ ادارے آج سے نہیں بلکہ پچھلے ستر، اسی سال سے کام کر رہے ہیں۔ ایک تو وہاں ھیئۃ کبار العلماء کا ادارہ ہے جس کی تاحیات رکنیت ہوتی ہے۔ میں ان سب سے تو نہیں ملا، لیکن ان میں سے بعض حضرات سے میری ملاقاتیں رہی ہیں۔ جن سے میں ملا ہوں، ان میں سے کچھ کے تقویٰ وتدین کی قسم کھا سکتا ہوں۔ میں ان کی رائے یا فہم سے تو اختلاف کر سکتا ہوں، یعنی میں یہ تو کہہ سکتا ہوں کہ میں آپ کی رائے کو غلط سمجھتا ہوں، ان کی فہم سے مجھے اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن ان کے اخلاص اور تقویٰ سے اختلاف نہیں ہو سکتا۔ اس طرح کے لوگ اس کے لائف ممبر رہے ہیں، وہاں بنیادی معاملات یہ طے کرتے ہیں۔ ان سے فیصلہ کرنے میں غلطیاں ہوئی ہوں گی۔ مجھے بھی ان کے بعض فیصلے کمزور معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اجتہادی فیصلے سے اختلاف تو ہر جگہ ہو سکتا ہے۔ یہاں حنفی حضرات بیٹھے ہیں ان کو امام شافعی کی رائے سے اختلاف ہے۔ جو مصری بھائی شافعی ہیں ان کو امام ابوحنیفہ کی رائے سے اختلاف ہے۔ لہٰذا رائے کے اختلاف سے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ان کے ہاں ایک نظام تو یہ ہے، لائف ممبر شپ ہونے کی وجہ سے بادشاہ یا پوری حکمران فیملی مل کر اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد اس ادارہ کے ارکان میں سے کسی ایک کا انتقال ہو جاتا ہے تو ادارہ کے لوگ چار پانچ نئے اہل علم کے نام لکھ کر بھیج دیتے ہیں۔ بادشاہ ان میں سے ایک کو مقرر کر دیتا ہے۔ وہ بھی لائف ممبر ہو جاتا ہے۔ اس طرح ایک سلسلہ تقریباً تسلسل کے ساتھ چلا آ رہا ہے۔ پاکستان میں ایسا نظام قائم کرنا اور کامیابی سے چلانا آسان نہیں ہے، شاید بہت مشکل ہو۔ پاکستان میں اس طرح کا نظام نہیں چل سکے گا۔

اس کے بعد ان کے ہاں جو بااثر لوگ ہیں، جن میں بعض قبائل کے سردار ہیں، جن کی بڑی بااثر حیثیت ہے، بعض بڑے بڑے قبائل اب بھی بااثر ہیں۔ آپ نے سدیری فیملی کا نام سنا ہوگا۔ سدیری برادران بادشاہت میں شامل ہیں۔ اسی طرح سے اور بڑی بڑی فیملیاں اور برادریاں ہیں، جن میں حجاز کے لوگ بھی شامل ہیں۔ قصیم کے لوگ بھی شامل ہیں۔ ان برادریوں کے ارکان متعین اور طے شدہ لوگ ہیں۔ اور جیسا کہ ماضی میں ہوتا تھا کہ اہم معاملات میں فیصلے کے لئے ان لوگوں کو بلایا جاتا تھا اور ان کے مشورے سے فیصلے ہوا کرتے تھے۔ ماضی قریب میں کم از کم تین چار مثالیں میرے علم یا مطالعہ میں آئی ہیں جس میں اہم معاملات کا فیصلہ ان لوگوں کی رائے کی بنیاد پر ہوا۔ چنانچہ شاہ سعود کو جب نکالنے کا فیصلہ ہوا تو سب سے پہلے فیصلہ انہی حضرات نے کیا تھا، اس کے بعد علماء کرام کے ہاں یہ بات گئی۔ کئی دن اس پر مباحثہ ہوتا رہا۔ ان کے فیصلے کے بعد شاہ سعود کو معزول کیا گیا اور شاہ فیصل ان کی جگہ تخت نشین ہوئے۔ اسی طرح سے ایک اسٹیج پر یہ طے ہوا کہ شاہ فہد مرحوم اپنا اختیار چھوڑ دیں اور ولی عہد شہزادہ عبداللہ کو یہ اختیار منتقل کر دیں۔ خاندان میں کچھ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ ایسا ہو، کچھ کا خیال تھا کہ ایسا نہ ہو۔ یہ ادارہ جو قبائلی سرداروں وغیرہ پر مشتمل ہے اس کی تعداد کیا ہے؟ مجھے یہ معلوم نہیں، لیکن وہ کئی سو حضرات ہیں۔ وہ جمع ہو کر اس پر غور کرتے رہے، کئی دن غور ہوتا رہا۔ دونوں طرف کے دباؤ بھی ان پر آتے رہے ہوں گے۔ دونوں طرف کے تاثرات اور آراء وہ سنتے رہے، بآلاخر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ایسا نہیں کرنا چاہئے اور میں نے یہ بھی سنا ہے۔ ممکن ہے صحیح ہو، ممکن ہے غلط ہو۔ کہ شاہ فہد اس کی anticipation میں روانگی کا سارا بندوبست کر چکے تھے اور کسی بیرون ملک میں علاج کے لئے جانا چاہتے تھے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کا جہاز تیار تھا۔ فیملی جہاز میں سوار ہو چکی تھی، وہ گھر سے نکل چکے تھے۔ فیصلے کی اطلاع اس وقت ملی جب وہ ایئرپورٹ پہنچ گئے تھے۔ جس کے نتیجے میں دوبارہ واپس آ گئے۔

میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس طرح کے معاملات اور ادارے ہمارے سعودی بھائیوں کے خیال میں شریعت کے شورائی تقاضوں کو پورا کر رہے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ اس سے شوریٰ کے اسلامی تقاضے پورے ہو جاتے ہیں۔ ہمیں باہر سے دیکھ کر اور کچھ مغربی صحافیوں کے پروپیگنڈے سے لگتا ہے کہ یہ شوریٰ نہیں ہے۔

ہمارے ہاں برطانوی نظام کے بارے میں ایک آئیڈیل نظام کا تصور پایا جاتا ہے۔ ملکہ برطانیہ جس کو بڑے اختیارات حاصل ہیں۔ کم از کم قواعد کی رو سے، قانون کی حد تک theoretically وہ بے پناہ اختیار کی مالک ہے، ہمیں جمہوریت کا مکمل نمونہ معلوم ہوتا ہے، ہمیں امریکہ جمہوریت کا مکمل نمونہ معلوم ہوتا ہے جہاں ایک آدمی تن تنہا پوری دنیا میں جو کچھ کر رہا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ لیکن ہمیں اپنا کوئی ادارہ جمہوری معلوم نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ اہل مغرب ہمارے اداروں کو جمہوری نہیں مانتے۔ ایران میں جہاں باقاعدہ الیکشن ہو رہے ہیں اور بالغ رائے دہی کی بنیاد پر آزادانہ طور پر حکومتوں کی hiring & firing ہو رہی ہے بڑے بڑے بااثر

حکمران جو نظام میں اثر رکھتے ہیں وہ الیکشن ہار گئے۔ ہاشمی رفسنجانی بڑے بااثر آدمی تھے الیکشن ہار گئے، خاتمی بہت بااثر آدمی تھے وہ بھی الیکشن ہار گئے۔ اس کو کوئی مغربی آدمی تسلیم نہیں کرتا کہ یہ جمہوریت ہے۔ دراصل اہل مغرب مسلمانوں کی کسی خوبی کو تسلیم نہیں کرنا چاہتے۔ اس لئے مسلمانوں میں بھی یہ خیال پھیل گیا ہے کہ ہم بڑے غیر جمہوری ہیں۔ حالانکہ جتنا مسلمان کے مزاج میں جمہوریت ہے اتنی شاید کسی اور کے مزاج میں نہ ہو۔ قائداعظم نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ''ہم تو نمازوں اور عبادت کے معاملہ میں بھی بڑے جمہوری ہیں، نماز میں بھی سب سے اچھے آدمی کو چنتے ہیں اور منتخب کر کے پھر آگے بڑھاتے ہیں کہ وہ نماز پڑھائے''۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: کیا پاکستان کی موجودہ گروہ بندیوں، فرقہ بندیوں پر مبنی ایک مثالی ریاست بن سکتی ہے؟۔

جواب: فرقہ بندی اگر اس انداز کی ہو کہ مذہبی فرقے اور فقہی گروہ آپس میں متحارب گروہ ہوں تو یہ صورتحال بلاشبہ بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہوگی۔ لیکن اگر اختلاف فقہی معاملات کی حد تک رہے اور دلیل کی بنیاد پر ہی ہو، اور کم از کم پاکستان کے آئین اور دستور کی حدود کے اندر رہے تو اس اختلاف کی موجودگی سے اسلامی شریعت کے نفاذ میں کوئی رکاوٹ نہیں پیدا ہوگی۔ پاکستان کا آئین اس اعتبار سے بہت آئیڈیل ہے اور مثالی ہے کہ اس میں جدید جمہوری تقاضوں اور اسلامی احکام کو بڑی خوبصورتی سے سمولیا گیا ہے اور دونوں کے تقاضے اس میں کماحقہ پورے ہوسکتے ہیں۔ بشرطیکہ آئین پر نیک نیتی سے عمل کیا جائے۔ ہمارے ہاں تو جو آئین کے تحفظ اور پاسداری کا حلف اٹھاتا ہے وہی سب سے زیادہ خلاف ورزی کرتا ہے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: آپ کے ارشادات سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ شریعت کا نفاذ ایک اہم اسلامی فریضہ ہے۔ جب کہ شریعت کی طرف دوبارہ لوٹ آنا کس طرح ممکن ہے؟

جواب: شریعت کی طرف لوٹ آنا بالکل ممکن ہے۔ آخر شریعت پر کسی نہ کسی حد تک تو عمل ہم کر رہی رہے ہیں۔ ابھی ہم نے مغرب کی نماز پڑھی، یہ بھی شریعت کا حکم ہے جس پر ہم سب نے عمل کیا ہے۔ اس کے علاوہ ہم اور بھی بہت سے احکام پر عمل کر رہے ہیں۔ جن احکام پر ہم عمل نہیں کر پا رہے یا اپنی کوتاہی اور غفلت سے نہیں کر رہے، اگر ہم ان پر بھی عمل کا ارادہ کرلیں گے تو شریعت آجائے گی۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: فقہی طور پر امام کے نصب وعزل کا اختیار عامۃ المسلمین کے پاس ہے۔ کیا اسلامی تاریخ میں یہ اختیار پرامن طور پر استعمال ہوا؟ کیا ولی عہد کا ادارہ اس اختیار کے منافی نہیں؟

جواب: یہ بات تو درست ہے کہ ولی عہد کے نظام کی جو صورت بعد میں بن گئی وہ کوئی آئیڈیل طریق کار نہیں تھا۔ لیکن مسلمان علماء کی بڑی تعداد نے ولی عہد کے ادارے کو اس اختیار کے یا اس طریق کار کے منافی نہیں قرار دیا جو خلفائے راشدین کے دور میں رائج ہوا تھا۔ خلفاء راشدین کے زمانہ میں خلیفہ کے بعد جانشین کا تقرر اور تعین ہوا، اس وجہ سے ولی عہدی کی روایت اسلامی تاریخ میں موجود رہی ہے۔ لیکن اس کی قانونی پوزیشن یعنی فقہی تکییف کے لئے فقہ اسلام میں یہ لکھا ہے کہ محض ولی عہد نامزد ہوجانے سے کوئی شخص خلیفہ یا جانشین نہیں بنتا، ولی عہدی تو دراصل اس غرض کے لئے ہوتی تھی کہ فوری طور پر ایک عبوری حکومت کے قیام میں مدد ملے۔ اگر عامۃ الناس بعد میں ولی عہد سے بیعت کرلیں، تو وہ مستقل خلیفہ ہوجائے گا، ورنہ نہیں۔ یہ بات علامہ ابن تیمیہ نے بھی لکھی، امام غزالی نے بھی لکھی ہے۔ امام غزالی نے واضح طور پر لکھا ہے کہ اگر سیدنا عمر فاروقؓ سے عامۃ الناس صحابہ کرامؓ بیعت نہ کرتے تو محض حضرت ابوبکر صدیقؓ کی نامزدگی کی بنیاد پر وہ خلیفہ نہیں بن سکتے تھے۔ یہ بات امام غزالی اور علامہ ابن تیمیہ دونوں نے لکھی ہے۔ کئی اور حضرات نے بھی اس کی طرف اشارے کیے ہیں اس لئے اس حد تک تو ولی عہدی کا جواز موجود ہے کہ فوری طور پر انتظام کو چلانے کے لئے ایک آدمی کو نامزد کردیا جائے کہ یہ مرنے والے حکمران کے بعد معاملات کو سنبھال لے گا، تاوقتیکہ ارباب حل وعقد کسی دوسرے آدمی کا انتخاب کرلیں۔ لیکن یہ بات کہ کیا عملاً اسلامی تاریخ میں ایسا ہوا ہے کہ ارباب حل وعقد نے کسی ولی عہد کی بیعت کرنے سے انکار کیا ہو اور وہ خلیفہ نہ بن سکا ہو؟ میری ناچیز رائے میں اسلامی تاریخ میں ایسا ہوا ہے، اور ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ تاریخ ابن کثیر میں ایسی متعدد مثالیں ذکر کی گئی ہیں کہ جہاں ارباب حل وعقد کے فیصلے

کے نتیجے میں ایک حاکم وقت کو برطرف کیا گیا، معزول کیا گیا اور اس کی جگہ دوسرے حکمران کو منتخب کیا گیا۔لیکن اس معاملے میں جہاں اچھی روایتیں ہیں وہاں غلط روایتیں بھی بہت ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح سے افراد میں اچھے برے دونوں قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: کیا ایک مرکزی امام نہ ہونے کی وجہ سے پوری امت ایک واجب کو ترک کرنے کا گناہ نہیں کر رہی؟

جواب: پوری امت کا ایک امام ہونا ضروری نہیں ہے۔اس لئے کسی واجب کا ترک لازم نہیں آ رہا۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: واجب کے لئے اگر کوئی ذریعہ ناگزیر ہو جائے تو وہ بھی واجب ہوگا، اور مثال میں یہ بات آئی ہے کہ جیسے جہاد کے لئے ریاست کا قیام ناگزیر ہے۔اگر فی الواقع اسلامی ریاست موجود نہ ہو تو جہاد کی کیا صورت ہوگی؟ اور کیا ریاست کے قیام تک کے لئے جہاد مؤخر رہے گا؟

جواب: اس سوال کا جواب سیدھے اور صاف انداز میں یہ ہے کہ اگر کہیں اسلامی ریاست موجود نہیں ہے اور وہاں مسلمان اقلیت میں ہیں تو ان پر جہاد سرے سے فرض ہی نہیں ہے۔لیکن اگر کسی مسلم علاقہ پر غیر مسلموں نے ناجائز قبضہ کر لیا ہے (جیسے کشمیر میں) اور وہاں کے مسلمان مل کر اپنی ایک قیادت کا انتخاب کر کے جہاد کا اعلان کر دیتے ہیں۔تو وہ قیادت ہی ریاست کے قائم مقام ہوگی۔اور اس کی سربراہی میں جہاد کیا جا سکے گا۔ وہ جائز اسلامی جہاد ہوگا۔جیسا کہ کشمیر اور فلسطین کا جہاد جائز اسلامی جہاد ہے۔اس پر جہاد ہی کے تمام احکام منطبق ہوں گے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: خودکش حملہ اور استشہادی حملہ میں کیا فرق ہے؟ کن صورتوں میں حملہ استشہادی کہلائے گا اور کن صورتوں میں خودکش؟

جواب: خودکش حملہ تو ایک مغربی اصطلاح ہے، جو اخباروں میں چل پڑی ہے اور مغرب کے ذمہ دار حضرات اس کی مذمت کر رہے ہیں۔ان کی دیکھا دیکھی ہمارے ہاں بھی بہت سے حضرات کہنے لگے ہیں کہ اسلام میں خودکش حملہ ناجائز ہے۔خودکش حملہ یا غیر خودکش حملہ کے جائز یا ناجائز ہونے کا دارومدار اس پر نہیں ہے کہ وہ خودکش ہے یا نہیں ہے، بلکہ اس کا دارومدار اس پر ہے کہ وہ شریعت کے احکام کے مطابق ہے کہ نہیں ہے۔ جہاد کا بنیادی حکم یہ ہے کہ وہ صرف محارب دشمن کے خلاف ہوگا، یعنی Belligerent دشمن پر حملہ کیا جائے گا۔non-Belligerent دشمن پر حملہ نہیں کیا جائے گا۔اسلام نے اپنے بین الاقوامی قانون کے ذریعے پہلی مرتبہ دنیا کو ایک مرتب و منظّم قانون جنگ عطا فرمایا۔اس قانون جنگ کی مسلمانوں نے بارہ سو سال تک پیروی کی۔مسلمان حکمرانوں کی طرف سے اس قانون جنگ کی خلاف ورزیاں اگر ہوئی بھی ہوں گی تو بہت تھوڑی اور نا قابل ذکر ہیں۔اس قانون جنگ کا ایک بڑا بنیادی اصول یہ ہے کہ تلوار یا ہتھیار کا استعمال صرف محارب کے خلاف کیا جائے گا، غیر محارب کے خلاف نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ اگر محارب فوج کے ساتھ کوئی ایسے غیر محارب دستے بھی ہیں، مثلاً میڈیکل کور یا ان کے خادمین ہیں، یا ان کے ساتھ کام کرنے والی خواتین ہیں، یا سپلائرز ہیں۔تو ان پر ہتھیار اٹھانا جائز نہیں ہے یہ بات احادیث میں بہت تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔اس مضمون کی واضح روایات موطا امام مالک، صحیح بخاری اور صحیح مسلم سے لے کر حدیث و سیرت کی ہر کتاب میں موجود ہیں۔ دوسرا بڑا بنیادی اصول یہ ہے کہ جہاد کا مقصد دشمن کو جسمانی طور پر بالکل ختم کرنا نہیں ہے۔دشمن کا وجود ختم کر دیا جائے، اس کو صفحہ ہستی سے سرے سے مٹا دیا جائے یہ جہاد کا مقصد نہیں۔ جہاد کا مقصد یہ ہے کہ اس کی اس قوت کو توڑ دیا جائے جو مسلمانوں کے خلاف استعمال ہو رہی ہو۔اور دعوت و تبلیغ اسلام یا مسلمانوں کی آزادی کے راستے میں جو رکاوٹیں ہیں ان کو ختم کر دیا جائے۔ جب کہ دہشتگردی میں جو بنیادی حملے کئے جاتے ہیں۔ وہ شہریوں اور غیر محاربین کے خلاف کیے جاتے ہیں، ان کو جسمانی طور پر مٹا دینا اور ختم کر دینا مقصد ہوتا ہے جو جہاد کا مقصد نہیں ہے۔لہٰذا جہاد کے بارے میں جتنے احکام قرآن پاک اور حدیث میں آئے ہیں۔ وہ اگر پیش نظر رکھے جائیں اور اس میں اگر کوئی شخص اپنی جان قربان کر کے محارب دشمن پر حملہ کرتا ہے۔تو بالکل جائز ہے اور بہت بڑی فضیلت کی بات ہے۔ محض اس لئے کہ حملہ کرنے والے کی جان بھی ضائع ہوگئی اس سے کوئی حملہ ناجائز نہیں ہو جاتا۔اگر میدان بدر میں کوئی صحابی ایسے ہوتے جو دشمن کی فوجوں میں جا کر کود پڑتے اور اس کے نتیجے میں ان کو یقین ہوتا کہ وہ شہید ہو جائیں گے تو ان کا

یہ فعل ہرگز ہرگز ناجائز نہ ہوتا۔ایسے واقعات بارہا ہوئے ہیں کہ مجاہدین اسلام شہادت کا یقین لے کر دشمن کی فوجوں میں جا گھسے۔اور شہید ہو گئے۔اس کو خودکش حملہ نہیں کہا جائے گا۔اس لئے کہ یہ جہاد ہے اور جہاد میں دشمن کو نقصان پہنچانا اور دشمن کے فوجیوں کو قتل کرنا جہاں دنیا کے ہر قانون کے لحاظ سے جائز ہے، وہاں اسلامی قانون کے لحاظ سے بھی جائز ہے۔

اس کے برعکس معاہدے کو توڑتے ہوئے یا دشمن کو دھوکا دے کر اس کو نقصان پہنچانا جسے قرآن پاک میں ''غدر'' کہا گیا ہے یا خیانت کرنا یہ جائز نہیں ہے۔دشمن سے ظاہری طور پر آپ معاہدے کر لیں اور باطنی طور پر معاہدے کی خلاف ورزی کر کے اس کے خلاف کاروائیاں کریں یہ شرعاً جائز نہیں ہے۔قرآن پاک میں اس کی ممانعت آئی ہے۔اسی طرح سے اگر کوئی دشمن میدان جنگ سے ہٹنے کے لئے تیار ہو اور جنگ کو ختم کرنا چاہے، تو مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ بھی جنگ کو ختم کر دیں۔یہ بات بھی قرآن پاک میں آئی ہے۔اسی طرح جب تک دشمن معاہدے پر کاربند رہیں مسلمانوں کو بھی معاہدہ پر کاربند رہنا چاہئے۔یہ سارے احکام اور قانون جنگ کی مختلف دفعات قرآن اور حدیث میں آئی ہیں۔اگر استشہادی حملہ ان احکام کے مطابق ہے تو وہ جہاد ہے اور اگر ان احکام کے خلاف ہے تو پھر وہ دہشت گردی ہے جس کا جہاد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: جب امت واحد ہے تو پھر ریاست بھی واحد ہونی چاہئے؟

جواب: یہ ضروری نہیں ہے۔یہ غلط فہمی بہت سے لوگوں میں پائی جاتی ہے کہ پوری امت مسلمہ کی ایک سیاسی وحدت بھی ہونی چاہئے، ایسا نہ قرآن مجید کی رو سے ضروری ہے نہ ایسا قابل عمل ہے۔اور نہ ماضی میں ایک طویل عرصے تک ایسا رہا ہے۔مدینہ منورہ میں مسلمانوں کی ریاست پہلی بار قائم ہوئی۔مدینہ منورہ کی ریاست کی جب رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ سربراہی فرما رہے تھے، اس وقت بھی مسلمان آبادیاں مدینہ منورہ سے باہر موجود تھیں جو مدینہ کی اسلامی ریاست کا حصہ نہیں تھیں اور وہاں کے مسلمان مدینہ کی ریاست کے شہری نہیں تھے۔ہمارے برصغیر میں بمبئی کے قریب تھانہ میں مسلمانوں کی بستی حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں موجود تھی۔حضرت عثمان غنیؓ کے زمانے میں اسپین میں اور مکران (پاکستان) میں مسلمان آبادیاں موجود تھیں۔یہ مسلمان اسلامی ریاست کے شہری نہیں تھے۔اس لئے یہ کہنا کہ سارے مسلمان ایک ہی ریاست کے شہری ہوں یہ کبھی بھی لازمی نہیں رہا، نہ قرآن پاک نے لازمی قرار دیا ہے، نہ کسی فقیہ نے لازمی قرار دیا ہے۔خود صحابہؓ کے دور کے فوراً بعد جب تابعین کی خاصی تعداد ابھی حیات تھی اور تمام ائمہ مجتہدین جو فقہ اسلامی کو مرتب کر رہے تھے، جن کی فقہوں کی آج تک ہم پیروی کر رہے ہیں حیات تھے۔ان کے زمانے میں مسلمانوں میں دو ریاستیں وجود میں آئیں۔اسپین کی اسلامی ریاست بنوامیہ کی سربراہی میں الگ ہو گئی اور بقیہ دنیائے اسلام میں بنی عباس کی سربراہی میں الگ ریاست قائم ہو گئی۔یہ سب امام ابوحنیفہ کے زمانے میں ہوا۔امام ابوحنیفہ اس وقت حیات تھے، امام مالک بھی حیات تھے۔ان میں سے کسی نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔ان میں سے کسی نے یہ فتویٰ نہیں دیا کہ اندلس کی اموی خلافت ناجائز ہے۔وہاں کے تمام فقہاء اور محدثین نے اموی خلفاء کی بیعت کی اور ان کی سربراہی میں جو دینی معاملات تھے ان کی پابندی کی، لیکن جب بھی ان حکمرانوں میں سے کسی سے دین کے احکام کی خلاف ورزی ہوئی، علمائے کرام نے فوراً اس کی نشاندہی کی۔اس لئے یہ سمجھنا کہ تمام مسلمانوں کی انتظامی طور پر ایک ہی ریاست ہونی چاہئے، یہ نہ تو شریعت کا تقاضا ہے اور نہ ماضی میں کبھی ایسا ہوا ہے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: کیا ادارہ خلافت کی عدم موجودگی میں OIC اپنی اصل روح کے ساتھ فعال بنائی جا سکتی ہے؟ اس کی صورت کیا ہو سکتی ہے؟

جواب: یہ سوال واقعی اہم ہے۔خاص طور پر اس لئے کہ مسلمانوں میں اس کے باوجود کہ ایک سے زائد ریاستیں تھیں خلافت کا مرکز ہمیشہ ایک ہی رہا۔مدینہ منورہ، کوفہ، دمشق، بغداد، قاہرہ، استنبول اور 1924 تک جب ترکی میں خلافت ختم ہو گئی، اس وقت تک مسلمانوں کا ایک روحانی، اخلاقی، سیاسی مرکز موجود تھا۔افسوس کہ آج وہ سیاسی مرکز موجود نہیں ہے۔اور یہ بات اب مسلمانوں میں بہت سے لوگوں نے بالکل بھلا دی ہے کہ مسلمانوں کا ایک مرکز ہونا چاہئے۔خود عرب مصنفین بھی اس کو بیان نہیں کرتے، کیوں بیان نہیں کرتے؟ شاید اس لئے کہ متعدد مسلم ممالک کے سیاسی اکابر اس کوتاہی بلکہ جرم میں شریک ہیں۔جب خلافت کے خلاف شریف

مکہ نے بغاوت کی تھی تو اس نے یہ یقین دہانی مغربی طاقتوں سے حاصل کی تھی کہ جب عثمانیوں کی حکومت ختم ہو جائے گی تو شریف مکہ کو خلافت کے منصب پر فائز کر دیا جائے گا۔ یوں اپنی دانست میں اس نے خلافت کا تسلسل یقینی بنانا چاہا تھا۔ میرے خیال میں شریف مکہ نے بڑی غداری کی تھی اور بہت بڑی غلطی کا مرتکب ہوا تھا۔ لیکن یہ بات بھی ایک حقیقت ہے کہ خلافت کے قیام و تسلسل کو اس نے یقینی بنانا چاہا تھا۔ انگریزوں نے بعد میں بہت سارے معاہدوں کی طرح اس کی بھی پروا نہیں کی۔ اس کے بعد جب شریف مکہ کا قصہ ختم ہو گیا۔ اور جزیرہ عرب میں سعودیوں کی حکومت قائم ہوئی تو سعودیوں نے پہلی دفعہ 1926ء، 1925ء میں تین چار مرتبہ بین الاقوامی مشاورت کی۔ ان مشاورتوں میں برصغیر کے اہل علم نے بھی شرکت کی، جن میں مولانا شبیر احمد عثمانی، مفتی کفایت اللہ، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا محمد علی جوہر کی سطح کے افراد شامل تھے۔ ان حضرات نے باصرار سلطان عبدالعزیز سے کہا کہ آپ اگر اپنی خلافت کا اعلان کر دیں تو پوری دنیا کے مسلمان آپ کی بیعت کرنے کو تیار ہیں۔ کسی اندرونی مجبوری کی وجہ سے یا کسی بیرونی طاقت کے دباؤ پر وہ اس کام کے لئے آمادہ نہ ہوئے۔ کیا ان سے بھی مغربی طاقتوں نے کوئی یقین دہانی حاصل کی تھی؟ اللہ بہتر جانتا ہے، البتہ خود وہ اچھے مسلمان بتائے جاتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے خلافت کے قیام اور احیاء میں دلچسپی نہیں لی۔ اگر وہ اپنے خلیفہ ہونے کا اعلان کر دیتے تو ایک اسلامی روایت اور اسلامی ادارے کے تحفظ کا اجر انہیں ملتا۔ اور تاریخ میں ان کا ایک بلند مقام ہوتا۔ ایک حد تک تاریخ میں ان کا اب بھی ایک قابل ذکر مقام ہے۔ لیکن اس وقت زیادہ بڑا مقام ہوتا، لیکن افسوس کہ انہوں نے کسی وجہ سے ایسا نہیں کیا۔ ان کے علاوہ بھی کسی اور مسلم حکمران نے یہ ہمت نہیں کی۔ اگر کوئی مسلم حکمران یہ ہمت کرتا اور اپنی خلافت کا اعلان کر دیتا تو شاید یہ ادارہ باقی رہ جاتا۔ یہ بات میں نے بعض بزرگوں سے سنی ہے، ممکن ہے صحیح ہو اور ممکن ہے صحیح نہ ہو، کہ بعض مسلمان قائدین نے کوشش کی تھی کہ افغانستان کے حکمرانوں کو اس بات کے لئے تیار کریں کہ وہ اپنی خلافت کا اعلان کر دیں، تاکہ کم از کم خلافت کا ادرہ اپنے نام اور اپنی دانست میں موجود رہے۔ اور کسی نہ کسی انداز میں اس کا تسلسل برقرار رہے۔ اس لئے کہ ادارہ ہوگا تو آئندہ قوی بھی ہو جائے گا۔ کسی زمانے میں قاہرہ کی خلافت عباسیہ بڑی کمزور تھی، لیکن اس نے ادارہ خلافت کے تسلسل کو برقرار رکھا۔ اس کے بعد ایک مرحلہ آیا کہ عثمانیوں نے اس کو طاقت بھی دی۔

کیا OIC اس کی جگہ لے سکتی ہے؟ OIC کے موجودہ حالات اور ماضی کی کارکردگی کو دیکھ کر تو یہ امید نہیں قائم ہوتی، لیکن ہو سکتا ہے کہ آئندہ ایسا ہو جائے۔ علامہ اقبال نے ایک Spiritual Common Wealth کا تصور پیش کیا تھا اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ مستقبل میں مسلمان ممالک کی ایک ''Spiritual Common Wealth'' وجود میں آئے جس کی اپنی ایک پارلیمنٹ بھی ہو اور جس کا اپنا ایک مرکز ہو۔ جو مسلمانوں کے فکری اتحاد کے لئے کام کرے، وہ ایک کارپوریٹ (Corporate) خلافت کی حیثیت سے کام کرے۔ کیا کارپوریٹ خلافت کا تصور قابل عمل ہے؟ کیا دنیائے اسلام کی موجودہ کمزور، نااہل اور مغرب کی کاسہ لیس قیادتیں اس کے لئے تیار ہوں گی؟ یہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن مسلمانوں کے دلوں میں ایک مرکز کے قیام کی خواہش اور ایک جذبہ موجود ہے۔ اس جذبہ کو زندہ رکھنا چاہئے۔ اس خواہش کو بیدار رکھنا چاہئے۔ خواہش بیدار رہے گی تو آئندہ کبھی حوصلہ بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ حوصلہ پیدا ہوگا تو ہو سکتا ہے کہ یہ خواب بھی پورا ہو جائے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: کیا دارالاسلام، دارالحرب، دارالکفر، یہ اصطلاحات شریعت کی اصطلاحات ہیں؟

جواب: یہ اصطلاحات نہ قرآن پاک میں آئی ہیں نہ سنت میں آئی ہیں۔ یہ اصطلاحات فقہاء کرام کی اصطلاحات ہیں اور انہوں نے اپنے زمانے کے حالات کے لحاظ سے جب اپنے زمانے کی صورتحال کو بیان کیا تو یہ اصطلاحات استعمال کیں۔ خود امام ابوحنیفہ (جنہوں نے دارالاسلام اور دارالحرب کی اصطلاحات استعمال کیں)، ان کے شاگردوں کے زمانے میں دارالعہد اور دارالصلح کی اصطلاحات بھی وجود میں آ گئیں اور پھر اس کے فوراً بعد ہی حنفی فقہاء کے ہاں دارالموادعہ اور دارالامان اور اس طرح کی متعدد اصطلاحات بھی آ گئیں۔ ان بہت سی اصطلاحات کے پے در پے ظہور سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا صرف دارالاسلام اور دارالحرب کی دوگانہ تقسیم تک محدود نہیں سمجھی گئی۔ بلکہ حسب ضرورت نئی صورتحال کے لئے نئے احکام وضع کیے جاتے رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اصطلاح ایک تصور کے تابع ہوتی ہے۔ اور تصور حالات کے تابع ہوتا ہے۔ جب کسی ظاہری صورت حال میں آپ شریعت کے احکام کا انطباق کریں گے تو اس انطباق کے عمل میں بہت سے نئے تصورات سامنے آئیں گے اور ان تصورات کے لئے نئی اصطلاحات بھی آپ کو وضع کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس وقت دنیا کے اکثر ممالک دارالعہد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ سب کے سب بین الاقوامی معاہدوں میں ایک دوسرے سے

وابستہ ہیں۔اس وقت بہت سے بین الاقوامی معاملات، بین الاقوامی معاہدات کے نتیجے میں انجام پا رہے ہیں۔اس وقت اقوام متحدہ کے ادارے، اقوام متحدہ کی تنظیمیں مل کر یہ سارے معاملات طے کر رہی ہیں۔ بے شمار مسائل ہیں جوان اداروں نے بین الاقوامی قانون سازی کے ذریعے طے کر دیے ہیں۔ پوری دنیا کے مسلمان اور غیر مسلم ممالک چاہے وہ اقوام متحدہ کو پسند کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں ان قوانین پر عملدر آمد کرنے پر مجبور ہیں۔اس لئے کہ ان پر عملدر آمد کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔مثال کے طور پر بین الاقوامی ٹریڈ کا نظام ہے۔ بین الاقوامی ڈاک کا نظام ہے۔ یہ جو انٹرنیٹ کے درجنوں سسٹم پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، یہ جو ہوائی جہازوں کی آمدورفت ہو رہی ہے۔ یہ سارے معاملات ایک نظام کے بغیر نہیں چل سکتے۔ یہ قوانین اقوام متحدہ کے اداروں نے بنائے ہیں۔ان کی تیاری میں سالہا سال لگے ہیں۔سیکڑوں لوگوں نے ان قوانین کی تیاری میں حصہ لیا ہے۔اس لئے یہ کہنا کہ ہمارا کوئی تعلق مثال کے طور پر برازیل سے نہیں ہے اور وہ ہمارے لئے دارالحرب ہے۔ یہ شاید درست نہیں ہوگا۔

پھر مزید برآں ایک اور بات بھی قابل غور ہے کہ جن علاقوں یا ممالک کو امام ابوحنیفہ اور ان کے ہم عصر علماء نے دارالحرب قرار دیا تھا، یہ وہ علاقے اور ممالک تھے جو مسلمانوں سے بالفعل یعنی عملاً برسر جنگ تھے اور ان سے دارالاسلام کی جنگ ہو رہی تھی۔ اس لئے ان کو دارالحرب قرار دیا جانا بالکل حق بجانب تھا۔لیکن خود امام صاحب کے زمانے میں ایسے علاقے موجود تھے جن سے مسلمانوں کے معاہدے تھے اور مسلمانوں کی ان سے کوئی جنگ نہیں ہو رہی تھی۔ ایسے علاقوں کو دارالحرب قرار نہیں دیا گیا۔مثال کے طور پر قبرص کا جزیرہ ہے، یہ جزیرہ ڈاکوؤں کا مرکز تھا۔ڈاکوؤں کی آماجگاہ تھا اور وہاں سے بحری قزاق نکل کر مسلمانوں کی تجارتی کشتیوں کو لوٹا کرتے تھے۔حضرت معاویہؓ کے زمانے میں ان کے خلاف فوجی کاروائیاں ہوئیں اور مسلمان بحری جہازوں نے ان پر حملہ کیا۔ وہاں کے لوگوں نے اس پر یہ معاہدہ کیا اور مسلمانوں سے وعدہ کیا کہ ہم قزاقوں کو یہاں پناہ نہیں دیں گے۔آپ کے جہازوں کی آمدورفت کو پرامن رکھیں گے، آپ ہمارے ساتھ ایک عدم جنگ کا معاہدہ کرلیں۔ چنانچہ ان سے عدم جنگ کا معاہدہ حضرت معاویہؓ کے زمانے میں ہوگیا۔ یہ تاریخ میں موجود ہے اور غیر مسلم مصنفین نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے کہ عدم جنگ کے اس معاہدہ پر چھ سو سال عمل ہوتا رہا۔حضرت امیر معاویہؓ کے زمانے سے لے کر-- حضرت معاویہ کا انتقال غالباً 60 ہجری میں ہوا تھا اور یہ معاہدہ ظاہر ہے کہ 60ھ سے پہلے ہی ہوا تھا۔اس کے بعد سے-- ساتویں صدی ہجری تک اس پر عمل ہوتا رہا، اس کو امام ابوحنیفہ نے دارالحرب نہیں کہا۔ یہ دارالحرب تھا بھی نہیں، اس لئے کہ وہاں کے لوگوں سے معاہدہ تھا۔اس کی پابندی ہو رہی تھی۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ امام ابوحنیفہ دارالاسلام سے باہر دنیا کے تمام ممالک اور علاقوں کو دارالحرب قرار دیتے تھے، میرے خیال میں درست نہیں ہے۔حبشہ کے بارے میں سنن نسائی کی روایت ہے کہ'' اترك الحبش ما تركوكم ''جب تک اہل حبشہ تم پر حملہ نہ کریں تم ان پر حملہ نہ کرو۔ چنانچہ اس زمانے سے لے کر آج اکیسویں صدی تک کے اس طویل دور میں کسی نے حبشہ پر کبھی حملہ نہیں کیا۔ حالانکہ حبشہ میں مسلمانوں پر بڑے بڑے مظالم ہوئے۔ ہیلا سلاسی کے مظالم معروف ہیں۔لیکن چونکہ حبشہ نے کسی مسلم ملک پر حملہ نہیں کیا تھا۔اس لیے کسی مسلم ملک نے آج تک حبشہ پر حملہ نہیں کیا۔اس لیے یہ کہنا کہ دارالاسلام سے باہر تمام دنیا کے علاقے دارالحرب ہیں، یہ میرے خیال میں درست نہیں ہے۔ دارالحرب ایک اصطلاح ہے جو اس وقت کے لحاظ سے ضروری محسوس کی گئی۔ دوسری اصطلاحات داالعہد، دارالصلح یا ایسی ہی دوسری نئی یا قدیم اصطلاحات میں آج کل کے مسائل کو بیان کیا جاسکتا ہے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: آج ایک مکمل اسلامی ریاست قائم کرنے کا سب سے آسان اور عملی طریقہ کیا ہے؟

جواب: اس کا سب سے آسان اور عملی طریقہ دعوت و تبلیغ اور رائے عامہ کی تیاری ہے۔مسلمان ممالک میں جتنی مضبوط اور وسیع رائے عامہ اسلامی ریاست کے حق میں ہوگی اتنی ہی جلدی اسلامی ریاست قائم ہوجائے گی۔ نہ صرف عامۃ الناس اس بارے میں شدید غفلت کا شکار رہے ہیں بلکہ اہل علم نے بھی ان کی مناسب راہنمائی اور تربیت میں خاصی کوتاہی کی ہے۔اگر اسلامی ریاست عامۃ الناس کا مسئلہ نہ ہو، عام لوگ اس سے الگ تھلگ رہیں اور کچھ محدود لوگ اسے اپنا مسئلہ قرار دے کر محدود انداز سے کام کرنے پر اکتفاء کریں تو اسلامی ریاست قائم نہیں ہوگی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ جو لوگ اس کام کے لئے اٹھیں گے وہ اپنی محدود تعداد اور عامۃ الناس کی عدم دلچسپی اور عدم شرکت کی وجہ سے امت سے الگ سمجھے جائیں گے۔ اور اسلامی ریاست کا مسئلہ ان کا گروہی مسئلہ قرار دیا جائے گا کہ یہ فلاں گروہ یا فلاں صاحب کا مسئلہ ہے۔لیکن اگر پوری امت کی رائے عامہ مکمل طور پر بیدار ہو اور پورے ملک کا یا پوری مسلم اقوام کا یہ مسئلہ ہو تو پھر اسے کسی طبقے کا مسئلہ قرار دے کر نظر انداز کر دینا

دشوار ہوجائے گا۔ ماضی میں ایسی کئی کاوشیں ہوئیں جو بہت مخلصانہ کوششوں پر مبنی تھیں۔لیکن چونکہ ان کے لئے عوام کو تیار نہیں کیا گیا تھا اس لئے وہ کوششیں کامیاب نہیں ہوئیں۔اگر ان کو ناکام نہیں کہا جاسکتا ہے تو کامیاب بھی نہیں کہا جاسکتا۔اس لئے کہ اس کے لئے جتنا ہوم ورک ہونا چاہئے تھا وہ نہیں ہوا۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال:اسلام میں آج کل کی سیاست کا کیا مقام ہے؟

جواب: آج کل کی سیاست تو دجل وفریب کا نام ہے، بلکہ اقبال نے تو اس کے حوالے سے تین چار چیزوں کا ذکر کرنے کے بعد کہا ہے۔''طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری'' یہ تو ایک افیون اور نشہ ہے جو اہل مغرب حقوق کے نام پر دے رہے ہیں۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: آج کل کے دور میں جو اقوام متحدہ کے کنونشنز ہیں یا دیگر بین الاقوامی معاہدے ہیں ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کو supermacy حاصل ہے۔ اس لئے کہ جب اقوام متحدہ کے چارٹر میں یہ کہا گیا ہے کہ انسان کو آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنے عقیدے کو تبدیل کرے تو مسلمانوں کو بھی اپنے تصورات اور طرز عمل پر نظر ثانی کرنی چاہئے۔ ہماری اسلامی نظریاتی کونسل کے لوگ اسی نظریے پر عمل پیرا ہیں۔اس بارے میں ذرا وضاحت فرمائیں۔

جواب: یہ بات کہ اقوام متحدہ کے معاہدات اور کنونشنز بالاتر اور مقامی قوانین اور ملکی دستور پر حاوی ہیں، میری ناچیز رائے میں ایسا نہیں ہے۔ ہر ملک کا قانون ہی اس ملک کے حوالے سے سپریم اور بالاتر ہوتا ہے۔ یہ بات مغربی اور یورپی ممالک کے بارے میں بھی سب کو معلوم ہے۔یہی وجہ ہے کہ بین الاقوامی قانون کو اندرون ملک rectify کروانے کی ضرورت پڑتی ہے۔جب کوئی بین الاقوامی کنونشن کسی ملک کی حکومت اور اسمبلی سے منظور ہوجاتا ہے تو اس وقت وہ ملک کے لئے واجب التعمیل ہوتا ہے ورنہ اس کی حیثیت ایک tentative وعدہ کی رہتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ خود حکومت پاکستان جیسی کمزور حکومت بھی مختلف کنونشنز کو اندرون ملک کی مقتدر رہ جات کے ذریعہ منظور کرتی رہی ہے اور کراتی رہی ہے۔ایسی مثالیں بھی میرے علم میں ہیں کہ بعض ممالک کی اعلیٰ عدالتوں نے کسی بین الاقوامی معاہدے کو اس لئے ماننے سے انکار کردیا کہ وہ ان کے دستور کی فلاں فلاں دفعہ سے متعارض تھا۔میرے علم کی حد تک سترہ یا اٹھارہ ممالک نے بین الاقوامی معاہدات پر اس شرائط کے ساتھ دستخط کیے ہیں:"subject to their constitution" اور "subject to their law" جس میں پاکستان بھی شامل ہے۔لہٰذا حقیقت یہ ہے کہ بین الاقوامی قوانین اور بین الاقوامی کنونشنز دستور پاکستان پر overriding effect نہیں رکھتے، بلکہ دستور پاکستان کے تابع ہوکر ہمارے لئے واجب التعمیل ہیں۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ دستور پاکستان اور قانون پاکستان کو overriding effect حاصل ہے جس میں شریعت، قرآن وسنت کو ملک کا بالاتر قانون بنایا گیا ہے۔اپریل ۱۹۹۱ء کے ''نفاذ شریعت ایکٹ'' میں بھی شریعت کو ملک کا سپریم لاء قرار دیا گیا ہے۔اس لئے کوئی معاہدہ خواہ اسے اسمبلی نے rectify بھی کردیا ہو، وہ پاکستان کے سپریم لاء کو کالعدم یا متاثر نہیں کرسکتا۔کم از کم میری سمجھ اور قانون کی فہم تو یہی ہے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: عقیدے کی آزادی کے بارے میں اسلام اجازت دیتا ہے۔لیکن تبدیلی عقیدے کی آزادی مسلمانوں کو نہیں دی گئی۔غیر مسلم اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ آپ کیا فرماتے ہیں؟

جواب: میرے فرمانے کی تو اس میں کوئی گنجائش یا موقع نہیں۔ یہ مسلمانوں کا متفقہ نقطہ نظر ہے کہ ارتداد ایک جرم ہے اور اس کی سزا موت ہے۔لیکن لادینیت یا آزاد خیالی کے حامی لوگوں کو یہ مسئلہ سمجھنے میں اس لئے دقت پیش آتی ہے کہ ان کے ہاں مذہب ایک پرائیوٹ یا محض ذاتی دلچسپی کی چیز ہے۔وہ فرد کا ذاتی معاملہ ہے۔کسی فرد کو گلاب کا پھول پسند ہے، کسی کو چنبیلی پسند ہے، گلاب والا چنبیلی والے پر اعتراض کرنے کا حق نہیں رکھتا۔چنبیلی والا گلاب پر اعتراض کرنے کا حق نہیں رکھتا۔اسی طرح ان کی نظر میں مذہب کا معاملہ بھی ہے۔کسی کو ایک مذہب پسند ہے تو کسی کو دوسرا۔اگرچہ یہ محض ایک زبانی بات ہے اور واقعتاً ایسا نہیں ہے۔ جہاں معاملہ اسلام کے حوالے سے پسند و ناپسند کا ہو، جہاں سوال ان کے عقیدے کو چھوڑ کر اسلام میں آنے کا ہو تو ان کے ہاں بھی اچھا خاصہ تعصب پایا جاتا ہے۔جس کی مثالیں آئے دن ہم

سنتے رہتے ہیں۔اس لئے یہ سمجھنا کہ اہل مغرب اس معاملے میں بہت کھلے دل کے یا وسیع الصدر ہیں اور محض مسلمان تنگ نظر ہیں، یہ بات درست نہیں ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اسلام ہمارے نظام کا اصل الاصول یعنی سب سے بڑی اساس ہے۔ قانونی اور آئینی اصطلاح میں یہ اسلام کے سارے نظام کا grundnorm ہے۔اسلام کے نظام کا سب سے بنیادی پتھر یہی ہے۔اسلام کا سارا نظام سیاست، اقتصادیات، تہذیب، ریاست، قانون و دستور، عدالت قضاء، عدل اجتماعی، عبادات، مذہب، ہر چیز کی اصل الاصول اللہ کی وحدانیت، اللہ کی حاکمیت اور اللہ کے رسول کی لائی ہوئی شریعت پر ایمان ہے۔ لہٰذا جیسے اپنے grundnorm کو مسترد کرنا کوئی قوم گوارا نہیں کرسکتی اسی طرح اسلام بھی اس کو گوارا نہیں کرتا۔خصوصاً اس شخص سے جو یہ عقیدہ رکھ چکا ہو کہ اسلام کا عقیدہ کامل، مکمل اور غیر مشروط صداقت ہے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ اہل مغرب کے ہاں مذہبی صداقتیں اضافی صداقتوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ان کے ہاں مذہب ایک tentative truth ہے۔اسلام اس کو tentative truth نہیں کہتا بلکہ The Truth کہتا ہے۔کسی ذاتی رائے یا ذاتی پسند ناپسند کے بارے میں نرمی اختیار کرنا اور کمپرومائز کر لینا اور بات ہے، لیکن کسی اجتماعی اور ملی نظام کے اصل الاصول کے بارہ میں نرمی یا مداہنت اختیار کرنا بالکل مختلف چیز ہے۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ جب اہل مغرب مذہب کے بارے میں یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ ہر شخص کو مذہب کی تبدیلی کا حق ہے تو وہ دراصل ایک ایسے مذہب کو تبدیل کر لینے اور چھوڑ دینے کا حق دے رہے ہیں کہ جس کے بارے میں وہ خود مانتے ہیں کہ یہ فرد کی شخصی رائے ہے اور محض ایک tentative چیز ہے۔اس کے برعکس جب اسلام اس پر پابندی لگاتا ہے تو وہ ایک حقیقت واقعہ اور اصل الاصول کا انکار کرنے سے روکتا ہے۔ یہ اس سوال کا ایک پہلو ہے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ دنیا کے ہر نظام حتیٰ کہ آج کے مغربی نظام میں بھی ایک اساس ہوتی ہے جس کے بارے میں وہ کوئی compromize نہیں کرتے۔ میری دانست میں آزاد معیشت (free market economy) اور لادینی جمہوریت (secular democracy) کوئی ایسی بنیاد نہیں ہے جس پر انسانوں کی کامیابی کا دارومدار ہو۔لیکن اہل مغرب نے اس کو اپنے نظام کی اساس بنایا ہے اور اس کے بارے میں وہ کوئی compromize کرنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ اس نظام کی حمایت کے لئے لاکھوں انسانوں کی گردنیں مارنے اور ہزاروں شہریوں کو تباہ کرنے کو تیار ہیں۔ اس لئے اگر free market economy اور secular democracy اتنی مقدس چیزیں ہیں کہ اس میں ہزاروں بستیوں کو تباہ و برباد کیا جا سکتا ہے، اور جس کی خاطر لاکھوں انسانوں کا خون بہایا جا سکتا ہے تو اسلام کی نظر میں اسلام کا عقیدہ اس سے کہیں زیادہ قیمتی چیز ہے۔

تیسرا پہلو یہ ہے کہ اسلام ایک معاہدہ اور ایک عقد ہے۔ یہ اللہ اور بندے کے درمیان میثاق ہے۔ پھر انسان اور معاشرے کے درمیان بھی ایک عقد ہے اور انسان اور ریاست کے درمیان بھی ایک عقد ہے۔ جب میں اسلام قبول کرتا ہوں تو میں تین جہتوں سے معاہدہ کرتا ہوں۔ایک میرا میثاق اللہ کے ساتھ ہے۔ایک میرا میثاق ریاست اور معاشرے کے ساتھ ہے اور ایک میرا میثاق بقیہ مسلمان بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ ہے۔اس میثاق اور معاہدے کے نتیجے میں مجھ پر ان کے کچھ حقوق عائد ہوتے ہیں، میرے حقوق ان پر عائد ہوتے ہیں۔ میں ان کے بھائی چارے میں داخل ہوتا ہوں۔ وہ مجھے اپنے بھائی چارے میں قبول کرتے ہیں۔ دنیا کے ہر نظام میں کسی معاہدے میں داخل ہونے کی آزادی تو مطلق ہوتی ہے، لیکن نکلنے کی شرائط پر کچھ پابندیاں ہر جگہ ہوتی ہیں۔آپ کوئی معاہدہ دنیا میں ایسا نہیں بتا سکتے کہ جس میں داخل ہونے کے بعد آپ کو آزادی ہو کہ جب چاہیں یکطرفہ طور پر چھوڑ کر بھاگ جائیں۔جس معاہدے کو یکطرفہ چھوڑ کر آپ باہر آسکتے ہوں اس طرح کا معاہدہ آج نہیں پایا جاتا۔حتیٰ کہ جو معاہدہ نکاح ہے اس میں بھی اب مغرب میں اتنی پابندیاں ہوگئی ہیں کہ فریقین پوری زندگی سسک سسک کر گزار دیتے ہیں۔اپنی زندگی ناکام کر دیتے ہیں، لیکن ان کو اس معاہدے سے نکلنے کی آزادی نہیں ہوتی۔ پابندیاں اتنی لگا دی گئی ہیں کہ ان پابندیوں کی پاسداری کرنا ہر ایک کے بس میں نہیں رہا۔ان مثالوں سے میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اگر دنیوی عقود میں، دنیوی معاہدات میں یہ پابندیاں ہیں کہ اس میں داخل ہونے کے لئے تو مطلق اور بے قید آزادی ہے لیکن نکلنے کی آزادی ویسی مطلق اور بے قید نہیں ہے جیسی داخلے کی تھی تو اسلام بھی ایک کثیر سطحی معاہدہ ہے۔اگر اس نے داخلے کی آزادی دے رکھی ہے اور نکلنے پر بندشیں لگائی ہیں تو یہ کوئی ایسی ان ہونی بات نہیں ہے جس کی مثال نہ ملتی ہو۔اس طرح کی پابندیاں دیگر نظاموں اور قوانین میں ہر جگہ پائی جاتی ہیں۔

پروفیسر خورشید احمد

محمود بھائی نے جو آخری نقطہ نظر معاہدے کے حوالے سے پیش کیا ہے، یہ بڑا اہم نقطہ ہے اور بالعموم جو مباحث اس سلسلے میں میری نظر سے گزرے ہیں ان میں اس پہلو

کو اس انداز میں نہیں دیکھا گیا۔ میں خود بھی اس کو بہت غور سے سنتا رہا ہوں۔ یہ دراصل ایک معاہدہ ہے اور اس معاہدہ میں اپنی جان کو ایک بار اللہ کے ہاں بیچ دینے کے بعد یہ اختیار کلیم کرنا کہ میں جب چاہوں لے سکتا ہوں یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اس مسئلے کو دیگر مسائل سے مختلف ڈیل کیا گیا ہے۔ رہے باقی دنیا کے قانونی نظام، تو اس میں آپ یہ غور کیجئے کہ آزادی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ایک آزاد شخص اپنی آزادی سے اپنے آپ کو غلامی میں بیچ دے۔ دنیا کے تمام نظام ہائے قانون آزادی کو کچھ حدود کے اندر آزادی مانتے ہیں اور اگر وہ حدود نہ ہوں تو آزادی بے معنی ہوجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خودکشی ایک جرم ہے اور ایک criminal offense ہے۔ وہ اس لئے کہ آپ کو اپنی جان پر اختیار ہے لیکن یہ اختیار نہیں ہے کہ آپ اس جان کو ضائع کر دیں۔ اگر آپ اپنی آزادی کو غلامی کے بدلے میں بیچ نہیں سکتے تو ایک مرتبہ اللہ کے ہاں بیچنے کے بعد پھر یہ اختیار کہ آپ کسی اور مذہب کے عقیدے کو بیچیں مختلف چیز بن جاتی ہے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: کیا وجہ ہے کہ خالصتاً اسلامی بنیادوں پر تیار کردہ معاشرہ کی بنیادیں ڈھونڈے نہیں ملتیں۔ خود پیغمبر اسلام کا تشکیل کردہ معاشرہ ۴۰ سال میں رنگ ڈھنگ بدلنے لگا اور نصف صدی سے قبل خلافت بادشاہت میں تبدیل ہوگئی؟

جواب: یہ واقعی بڑا مشکل سوال ہے۔ اس کی وجہ سے بڑی غلط فہمیاں بھی رہی ہیں اور بہت سی غلط فہمیاں عرصہ دراز سے پھیلی ہوئی ہیں۔ بعض مشاہیر کی تحریروں کے فہم ناقص یا عدم فہم کی وجہ سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی ہے۔

اسلام جس چیز کا علمبردار ہے یا اسلامی شریعت جس چیز کی متقاضی ہے وہ یہ ہے کہ ایک معیاری اور مثالی معاشرہ قائم ہو۔ وہ معاشرہ کچھ اقدار کا علمبردار ہو۔ کچھ قوانین پر کاربند ہو اور کچھ اہداف اور مقاصد کے لئے کام کرتا ہو۔ دراصل شریعت کا بنیادی ہدف یہی ہے۔ جو بات میں نے بار بار زور دے کر کہی ہے اور اب پھر عرض کرتا ہوں کہ اسلامی شریعت کا اولین اور سب سے اہم اجتماعی مطمح نظر اور نصب العین یہ ہے کہ ایک امت قائم ہو، یہ بات میں نے اسی غلط فہمی کا سدباب کرنے کے لئے عرض کی تھی کہ ریاست کا قائم کرنا اسلام کا مقصد اولین نہیں ہے۔ ریاست ایک وسیلہ ہے ایک بڑے مقصد کو حاصل کرنے کا۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک ریاست قائم کی، لیکن امت مسلمہ کی تشکیل کے بعد اور امت مسلمہ کو تحفظ فراہم کرنے کے لئے۔ امت مسلمہ کی اقدار اور روایات کے تحفظ کے لئے اور شریعت کے احکام پر عمل درآمد کو یقینی بنانے کے لئے۔ اس ریاست کے حوالے سے بعض عمومی اور اصولی ہدایات قرآن مجید میں دی گئیں، بعض ہدایات احادیث میں دی گئیں۔ لیکن ان ہدایات کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ وہ ریاست اس قانون شریعت کو نافذ کرے جو شریعت کا ایک حصہ ہے اور فقہ اسلامی کا ایک اہم باب ہے۔ یہ ریاست رسول اللہ ﷺ نے قائم فرمادی۔ صحابہ کرامؓ کے زمانے تک یہ ریاست حضور ﷺ کے براہ راست تربیت یافتہ حضرات کی نگرانی میں چلتی رہی۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کی تربیت یافتہ نسل کو ایک نہ ایک دن دنیا سے جانا تھا۔ خود حضور ﷺ تشریف لے گئے تو آپ ؐ کے صحابہ کرامؓ کیوں نہ جاتے۔ ان کو بھی اس دنیا سے جانا تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ تربیت کے اثرات میں یا تربیت کی کیفیت یا شدت میں کمی آنا ایک فطری بات ہے۔ آخر ہم سب مسلمان ہیں، لیکن ہم اس طرح کے مسلمان نہیں ہیں۔ جس طرح کے مسلمان صحابہؓ اور تابعین ہوتے تھے۔ لیکن ہمارے مسلمان ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ مجھے اپنے مسلمان ہونے میں الحمدللہ کوئی شک نہیں ہے، لیکن اس حقیقت میں بھی مجھے کوئی شک نہیں ہے کہ میں اس طرح کا پختہ اور کامل مسلمان نہیں ہوں جس طرح کے مسلمان صحابہؓ کے زمانے میں پائے جاتے تھے۔

اسی طرح بعد میں آنے والی ریاستیں تھیں۔ وہ اسی طرح کی اسلامی ریاستیں تھیں جیسے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی ریاست تھی، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ ان ریاستوں میں اسلامیت کی وہ سطح نہیں تھی اور نہ ہوسکتی تھی جو حضرات صحابہ کرامؓ کی سربراہی میں کام کرنے والی ریاست کی تھی۔ اس بنیادی فرق کے باوجود بعد کی اسلامی ریاست ہر اعتبار سے اسلامی ریاست تھی اور مسلمان ریاست تھی۔ وہ اسلامی قوانین پر کاربند تھیں۔

اب یہ بات کہ کوئی محقق یا مفکر یہ تعین کرنے کی کوشش کریں کہ مثلاً دور جدید کے زید، عمرو، بکر میں اور دور فاروقی کے عمرو، زید، بکر میں کیا فرق ہے تو یہ ایک تاریخی حقیقت ہوگی، کوئی فتویٰ نہ ہوگا۔ اس فرق کی نشاندہی کرنا چاہئے، جو ایک علمی ضرورت ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ محقق دور جدید کے زید، عمرو بکر کے مسلمان ہونے کا منکر ہے، یا بعد والوں کے اسلام کے بارے میں کسی شک وشبہ کا اظہار کرتا ہے۔ لہٰذا جن حضرات مثلاً ابن خلدون، یا شاہ ولی اللہ یا مولانا مودودی نے یہ نشاندہی کرنے کی کوشش کی کہ خلافت راشدہ کے بعد ریاست کی اسلامیت میں کیسے کمزوری پیدا ہوئی، یہ کوشش ایک علمی تحقیق تھی، یہ تاریخی ارتقاء یا تبدیلی کے عمل کو

سمجھنے کی کوشش تھی جو ایک تاریخی مفکر یا محقق کا کام ہے۔لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں اور نہ ہوسکتے ہیں کہ بعد میں آنے والی حکومتوں کے اسلامی کردار کا انکار کر دیا جائے۔نہ ان میں سے کسی مفکر نے انکار کیا اور نہ یہ حکومتیں غیر اسلامی حکومتیں تھیں۔ان سب ادوار میں اسلامی قوانین پر عمل درآمد ہورہا تھا۔حدیث وفقہ کے ذخائر قلم بند ہورہے تھے۔اسلامی فقہ کے احکام مرتب ہورہے تھے۔یہ بات کہ علم حدیث کی تدوین اسی زمانے میں ہوئی،فقہائے اسلام امام ابوحنیفہ،امام شافعی،امام مالک وغیرہ سب اسی زمانے میں فقہ اسلامی کی تدوین کے عظیم الشان کام کررہے تھے انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔فقہ اسلامی کی ریاست اور معاشرہ کو ضرورت تھی تو اس کی تدوین ہورہی تھی۔فقہ اسلامی معاشرے میں کاربند تھا تو اس کو مدون کیا جارہا تھا۔اگر اسلامی قوانین معاشرے کی ضرورت نہیں تھے تو ان فقہائے اسلام کو اس تدوین کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ قانون تو وہیں مرتب ہوتا ہے جہاں قانون کی ضرورت ہو۔یہ سارے حقائق خود اس بات کی دلیل ہیں کہ ریاست کا نظام اسلامی قوانین کے مطابق چل رہا تھا۔

حتیٰ کہ ہمارے ہندوستان میں مغل دور کے بالکل آخری زمانے میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت تقریباً قائم ہوگئی تھی اس وقت بھی ایسٹ انڈیا کمپنی نے شاہ عالم ثانی سے جو معاہدہ کیا تھا،اس میں یہ بات واضح طور پر لکھی گئی تھی کہ مسلمان عدالتیں مسلمان علماء کے ذریعے قائم کی جائیں گی۔اور وہاں اسلامی قوانین کے مطابق معاملات کا فیصلہ کیا جائے گا۔یہ بات تو ۱۸۵۷ء تک برصغیر میں جاری رہی۔لیکن ظاہر ہے جب ہم موازنہ کریں گے،بہادر شاہ ظفر کے دور کا،مثال کے طور پر حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دور سے یا ہارون الرشید کے دور سے تو ہمیں زمین وآسمان کا فرق نظر آئے گا۔یہ فرق فطری چیز ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ آئیڈیل ہمیشہ اتنا اونچا ہوتا ہے کہ پوری زندگی انسان کوشش کرتا رہتا ہے اور آئیڈیل تک سفر جاری رہتا ہے۔اگر آئیڈیل ایسا ہو کہ ہم ۱۰ سال کے بعد حاصل کرلیں تو پھر کیا ہوگا اس کے بعد کیا ہوگا؟ آئیڈیل کے حصول کے بعد تو یا ٹھہراؤ (یعنی stagnation) ہوتا ہے یا پھر زوال شروع ہوجاتا ہے۔اس لئے جو عروج ہے یعنی صوفیائے کرام کی اصطلاح میں وہ اتنا مسلسل ہونا چاہئے اور سیر فی اللہ اور سیر الی اللہ اتنی لامتناہی ہونی چاہئے کہ کبھی بھی اس میں توقف کا یا ٹھہراؤ کا مرحلہ نہ آنے پائے۔کیونکہ اس کے بعد زوال شروع ہوجاتا ہے۔اس مسلسل سفر اور پیہم تگ ودو کی اہمیت کو علامہ اقبال نے ایک جگہ بہت بلیغ اور لطیف انداز میں بیان کیا ہے۔بال جبرئیل میں ایک جگہ کہتے ہیں:

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگ آرزو، ہجر میں لذت طلب

جب قرآن پاک کی یہ آیت نازل ہوئی کہ آج دین مکمل ہوگیا تو جو مزاج شناس صحابہ تھے ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے کہ اب رسول اللہ ﷺ دنیا سے تشریف لے جائیں گے۔اس لئے کہ جو چیز مکمل ہوجاتی ہے اس کے بعد آگے پیش قدمی ختم ہوجاتی ہے۔پھر اس سفر کی واپسی ہوجاتی ہے۔لہٰذا اگر اسلامی ریاست کا معیار اتنا اونچا نہ ہوتا کہ لوگ اس کے حصول کے لئے چودہ سو سال سے کوشش کرتے رہتے تو پھر یہ ہوتا کہ جس اسلامی اور مثالی ریاست کا تصور آج موجود ہے اور دنیا بھر کے مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن بن چکا ہے،وہ ہمارے درمیان موجود نہ ہوتا۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: پاکستان میں یا کسی اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو اپنے مذہب کی تبلیغ کی اجازت نہیں۔جب کہ آج کی غیر مسلم ریاستوں میں بالعموم اسلام کی تبلیغ اجازت ہے۔کیا اس معاملہ میں انہیں اخلاقی برتری حاصل ہے؟

جواب: جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ آج کسی اسلامی ملک میں غیر مسلموں کو اپنے مذہب کی تبلیغ کی آزادی نہیں ہے درست نہیں ہے۔پاکستان کے آئین نے ان کو اس کی آزادی اور اجازت دی ہوئی۔متعدد مسلم ممالک کے قوانین میں اس کی اجازت موجود ہے اور وہ اس اجازت کا اس حد تک فائدہ اٹھا رہے ہیں کہ بعض حساس لوگوں کو یہ فائدہ ناجائز فائدہ معلوم ہوتا ہے۔ضرورت سے زیادہ ان کو آزادی اور مراعات ملی ہوئی ہیں،وہ مراعات بھی بعض مسلم ممالک میں غیر مسلموں کو دی گئی ہیں جو خود مسلمانوں کو نہیں ملی ہیں۔بلکہ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ بعض مغربی ممالک میں وہاں کے رہنے والے مسلمانوں کو وہ آزادی حاصل نہیں ہے جو آزادی غیر مسلم مشنری اداروں کو بعض مسلم ممالک میں دی گئی ہے۔

جہاں تک ماضی کا تعلق ہے،ماضی میں اس معاملہ کو ایک انتظامی مسئلے کے طور پر دیکھا گیا ہے۔بعض جگہ تو غیر مسلموں کو تبلیغ کی آزادی نہیں دی گئی۔لیکن اکثر جگہ یہ

آزادی دی گئی۔ مثلاً مصر میں غیر مسلموں کو تبلیغ کی آزادی ہمیشہ حاصل رہی۔ ترکی میں ان کو ہمیشہ آزادی حاصل رہی۔ برصغیر میں ان کو تبلیغ کی آزادی حاصل رہی اور وہ اپنے مذہب کی تبلیغ بھی کرتے رہے۔ شریعت نے صرف ایک جگہ پابندی لگائی ہے اور وہ پابندی جزیرہ عرب کی حدود میں رہی ہے۔ وہ پابندی یہ ہے کہ جزیرہ عرب میں مستقل طور پر غیر مسلموں کی آبادی کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ اس کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت نے قرآن مجید کے واضح اعلانات کے مطابق جزیرہ عرب اور خاص طور پر حجاز کو اسلام کا روحانی مرکز قرار دیا ہے۔ اسلام کا روحانی مرکز ہونے کی حیثیت میں وہاں کا سکہ رائج الوقت اسلام ہی ہوگا۔ کوئی غیر اسلامی نظام یا تصورات جزیرہ عرب میں رائج نہیں ہوں گے۔ قرآن مجید کی سورہ برأت میں یہ بات واضح کردی گئی ہے کہ مسجد حرام کے قرب وجوار میں غیر مسلموں کو آنے کی اجازت نہ دی جائے۔ ''لا یقربوا المسجد الحرام بعد عامهم هذا''۔ یعنی اس سال کے بعد وہ مسجد حرام کے قریب نہ آنے پائیں۔ اس قریب نہ آنے کی اور لا یقربوا کی تفسیر میں فقہاء نے بہت سی بحثیں کی ہیں۔ مفسرین قرآن نے بہت سی تشریحات کی ہیں۔ لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ علاقہ اب اسلام کا مرکز ہے اور ہمیشہ ہمیشہ جب تک اسلام ہے یہ علاقہ اس کا مرکز رہے گا۔ جزیرہ عرب یا حجاز کے علاوہ غیر مسلموں کی آبادیوں پر کوئی پابندی کبھی نہیں لگائی گئی۔ غیر مسلموں کی آبادی میں اضافہ بھی ہوتا رہا۔ تبلیغ بھی ہوتی رہی۔

لیکن غیر مسلموں کے حق تبلیغ میں اور کسی مسلمان کے اس حق میں کہ وہ اسلام چھوڑ دے، بہت فرق ہے۔ دونوں آپس میں لازم وملزوم نہیں ہیں کہ غیر مسلم کی آزادی مذہب کے معنی لازماً یہ لئے جائیں کہ مسلمان کو بھی آزادی ہو کہ جب چاہے دین حق سے مرتد ہو کر کفار کی صفوں میں جا ملے۔

غیر مسلم لوگ اس بات پر بہت اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام میں مسلمان کے مرتد ہونے کو جرم قرار دیا گیا ہے۔ ان کو اعتراض ہے کہ ارتداد کو جرم کیوں قرار دیا گیا، گویا وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان اس بات کی بھی آسانیاں اور سہولتیں فراہم کریں کہ غیر مسلم جب اور جہاں ان کا دل چاہے دوسرے مسلمانوں کو بھی مرتد بنادیں۔ گویا ہم اپنے بھائیوں کو اپنے مذہب اور برادری سے کاٹ کر باہر نکالنے میں مدد کیوں نہیں دیتے، یہ ایک بے بنیاد اور غیر عقلی اعتراض ہے۔ غیر مسلموں کی آزادی مذہب کا لازمی عقلی تقاضا یہ بالکل نہیں ہوا کرتا کہ ہم اپنے بھائیوں کو برادری سے نکالنے میں جوش وخروش سے دوسروں کی مدد کریں۔ ایک آزادی کا لازمی تقاضا یہ ہرگز نہیں ہے کہ آپ کو دوسرے امور میں بھی ویسی ہی آزادی حاصل ہو۔ آپ کو اپنے مذہب پر عمل درآمد کی آزادی ہے، وہاں آپ جو چاہئیں کریں۔

مثلاً بازار میں آپ کو کاروبار اور تجارت کی آزادی ہے، لیکن اگر ملکی، ملّی، تہذیبی یا اخلاقی مصالح کی خاطر حکومت وقت یہ طے کرے کہ آپ فلاں فلاں قسم کے لوگوں کو فلاں چیز فروخت نہیں کریں گے۔ کسی مصلحت کے تحت حکومت نے طے کر دیا تو یہ آزادی تجارت کے منافی نہیں۔ مثلاً کم سن بچوں کو بعض چیزیں فروخت کرنے پر پابندی دنیا کے بہت سے ممالک میں پائی جاتی ہے، لیکن ان اشیاء کے تاجروں کو آزادی ہے وہ مارکیٹ میں ان اشیاء کا کاروبار کرنا چاہیں تو کاروبار کریں، یہ دونوں ایک دوسرے سے جب تک لازم وملزوم سمجھے جائیں گے اس وقت تک اعتراض رہے گا۔ اگر دونوں کو الگ الگ اپنے اپنے سیاق میں دیکھا جائے تو پھر اعتراض کی گنجائش نہیں رہتی۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: قومی ریاست کے رائج الوقت تصور میں ریاست سے وفاداری (loyalty to the state) سب سے بڑی قدر ہے۔ اس صورت میں ریاست اور امت کے بین الاقوامی تصور میں توافق اور تطابق کی کیا صورت ہوسکتی ہے، خاص طور پر وہ کروڑوں مسلمان جو غیر مسلم اکثریت والی ریاستوں میں رہ رہے ہیں وہ ریاست سے وابستگی اور امت سے وابستگی میں ٹکراؤ کی صورت میں کیا طرز عمل اختیار کریں۔

جواب: یہ بات کہ امت مسلمہ کے ارکان وافراد کی حیثیت سے مسلمانوں کی ذمہ داریاں ریاست کے شہریوں کی ذمہ داریوں سے متعارض ہوں تو کیا کرنا چاہئے؟ اس کے بارے میں قرآن مجید نے واضح طور پر ہدایات دی ہیں۔ ان قرآنی آیات کی روشنی میں فقہائے اسلام اور قرآن کے مفسرین نے تفصیلی احکام بیان کر دیے ہیں۔ اسلامی ریاست کے باہر جو مسلمان رہتے ہیں ان کے بارے میں قرآن مجید نے کہا ہے کہ ''مالكم من ولا يتهم من شئ'' یعنی تم انتظامی طور پر یا سیاسی طور پر ان کے معاملات کے ذمہ دار یا مکلّف نہیں ہو۔ سیاسی اور انتظامی طور پر وہ اپنے معاملات کے خود ذمہ دار ہیں۔ لیکن جہاں تک دینی، ثقافتی، تہذیبی اور خالص مذہبی معاملات ہیں وہاں امت مسلمہ ایک ہے اور امت مسلمہ کا مفاد بھی ایک ہے۔ میں اس کی مثال میں یہ عرض کر سکتا ہوں کہ جس طرح ایک برادری ہوتی

ہے، امت مسلمہ بھی ایک برادری ہے، البتہ ایک چھوٹی برادری ہے اور ایک بڑی برادری ہے۔ مقامی برادری بھی ایک چھوٹی امت مسلمہ ہوسکتی ہے۔ جس طرح ایک برادری میں کچھ مفادات تو ایسے ہوتے ہیں جو مشترک ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ کچھ مفادات ایسے بھی ہوسکتے ہیں جو الگ الگ ہوں۔ ایک دادا کی اولاد میں اگر دو پوتے دو کاروبار کر رہے ہوں اور ایک ہی بازار میں بیٹھتے ہوں، ایک ہی طرح کا کاروبار کرتے ہوں تو ہوسکتا ہے کہ بعض حالات میں دونوں کے تجارتی مقاصد اور مصلحتیں ایک دوسرے سے متعارض ہوں ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہ ہوں۔ شریعت نہیں کہتی کہ ایک دادا کی اولاد کے تجارتی مفادات بھی ایک ہونے چاہئیں۔ وہ یہ نہیں کہتی کہ ان میں آپس میں کبھی اختلاف نہیں ہوگا۔ اختلاف بھی ہوسکتا ہے اور مفادات کا ٹکراؤ بھی ہوسکتا ہے۔ مصلحتوں کا ٹکراؤ بھی ہوسکتا ہے۔ اس مصلحتوں کے ٹکراؤ کے حل کرنے کے قواعد ہیں۔ عدل وانصاف کی روشنی میں ان کو مل جل کر معروف طریقہ کے مطابق طے کرنا چاہئے۔ قرآن مجید میں یہ کہیں نہیں ہے کہ مسلمانوں کی مادی اور دنیاوی مصلحتوں میں تعارض نہ ہونا چاہئے۔

لہٰذا یہ سمجھنا درست نہیں کہ شریعت کی رو سے پاکستانی مسلمانوں کے تجارتی مفادات اور مصر کے مسلمانوں کے تجارتی مفادات ایک ہونے چاہئیں۔ روئی وہاں بھی پیدا ہوتی ہے، روئی ہمارے ہاں بھی پیدا ہوتی ہے۔ انٹرنیشنل مارکیٹ میں روئی بیچنے وہ بھی جاتے ہیں، ہم بھی جاتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری روئی بکے، وہ چاہتے ہیں کہ ان کی روئی بکے۔ اس مسابقت میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ اگر وہ روئی بیچنے میں کامیاب ہوجائیں اور ہمارا مفاد متاثر ہو تو اس سے امت مسلمہ کی وحدت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یا اگر ہم اپنی کوئی چیز بیچ دیں اور ان کی کوئی چیز نہ بکے تو اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اگر مادی اور تجارتی مصالح میں مکمل ہم آہنگی دین وشریعت کا لازمی تقاضا قرار دے دیا جاتا تو کوئی بازار نہیں چل سکتا تھا۔ کیونکہ بازاروں میں بھی یہی افراد، مسلمان ہی بیٹھتے ہیں۔ صحابہ کرامؓ بھی بیٹھا کرتے تھے۔ صحابہ کرامؓ کی بھی دکانیں تھیں۔ ان کے تجارتی مفادات تھے۔ اس یہ سمجھنا کہ پوری امت مسلمہ کا تجارتی مفاد بھی ایک ہوگا، سیاسی مصلحت بھی ایک ہوگی، عسکری مقاصد بھی ایک ہوں گے، یہ درست نہیں ہے۔ مختلف علاقوں کے مقاصد مختلف ہوسکتے ہیں۔ لیکن انہیں حل کرنے کا کوئی ایسا طریقہ نہیں ہونا چاہئے کہ جس سے امت مسلمہ کے ہمہ گیر اہداف متاثر ہوں۔ امت مسلمہ کی دینی وحدت متاثر ہو۔ مسلمانوں کے دینی تشخص پر اس کا منفی اثر پڑے۔ اسلامی تہذیب کے پھیلاؤ میں رکاوٹ پیدا ہو۔ تبلیغ اسلام کے کام میں رکاوٹ پیدا ہو۔ اسلام کا تصور یا وژن جو لوگوں کے ذہنوں میں ہے وہ متاثر ہوجائے۔ یہ مصلحتیں مشترک رہیں گی اور اگر اس کے باوجود کوئی تعارض یا اختلاف ہوگا اس کو عدل وانصاف کی بنیاد پر حل کرنا چاہئے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: میرے دو سوالات ہیں۔ ایک سوال یہ ہے کہ آپ نے فرمایا تاتاریوں کے حملے کے بعد اور مسلمانوں نے جب شکست کھائی تو بہت جلد وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہوگئے یعنی ان کا خاندانی نظام مضبوط اور نظام تربیت مستحکم تھا۔ اور آج بھی مسلمان حملوں کا شکار ہیں۔ اور کمزور ہیں تو ان کو کس نے روکا ہے کہ وہ دوبارہ خاندانی نظام بہتر کریں۔ اور نظام تربیت مستحکم کر کے اپنے پیروں پر کھڑے ہوسکیں۔ یعنی خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں خوف کیوں ہے؟

دوسرا یہ کہ آپ نے فرمایا کہ ایک علم وہ ہے جو فرض عین کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں آپ نے فرمایا کہ ماتصح بالعقیدہ والعبادۃ اور ماتصح فی المعیشۃ کی معیشت کی اتنی اہمیت ہے کہ جتنی عقیدہ اور عبادت کی ہے، جب کہ ہمارے اس زمانے میں معیشت پر کچھ زیادہ ہی زور دیا جاتا ہے۔ یا کچھ تھوڑا عقیدہ، عبادہ اور معیشۃ میں کوئی درجہ بندی ہے؟

جواب: درجہ بندی تو میری اس ترتیب سے ہی ظاہر ہے کہ سب سے پہلا ماتصح بہ العقیدہ، پھر عبادت اور پھر معیشت ہے۔ لیکن یہاں معیشت سے مراد اردو کی معیشت یعنی اقتصادیات نہیں ہے، بلکہ یہاں عربی معیشت مراد ہے۔ عربی میں معیشت کے معنی ہیں زندگی گزارنے کا ڈھنگ۔ ان تینوں میں ترتیب بھی ہے اور ترجیحات میں اسی اعتبار سے ان تینوں چیزوں کو رکھا جائے گا۔

جہاں تک اس بات کی تعلق ہے کہ مسلمانوں میں خوف کیوں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں اپنی پے در پے کمزوریوں اور شکستوں کی وجہ سے پچھلے دو سو سال میں یہ احساس پیدا ہوگیا ہے کہ وہ مغرب کے مقابلے میں کھڑے نہیں ہوسکتے۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب کے مقابلے میں بہت سے مسلمان اپنے آپ کو کمزور محسوس کرتے ہیں۔ کمزور مادی اعتبار سے تو ہیں لیکن روحانی اور اخلاقی اعتبار سے مسلمان الحمدللہ کمزور نہیں ہیں۔ اگر روحانی اور اخلاقی اعتبار سے اپنی قوت اور اپنے پیغام کی معنویت کا

احساس ان میں پیدا ہو جائے اور اپنے مستقبل کے بارے میں یقین اور اعتماد پیدا ہو جائے تو اس سے ان کے اندر ایک نئی قوت پیدا ہو گی اور وہ قوت دوبارہ مسلمانوں کو ازسرنوغور کرنے پر مجبور کرے گی۔ یہی وہ چیز ہے جس کو علامہ اقبال خودی سے تعبیر کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں خودشعوری کا احساس پیدا کیا جانا چاہئے مسلمانوں میں یہ رویہ پیدا کیا جانا چاہئے کہ وہ مغربی طاقتوں کی بالادستی سے متاثر اور مرعوب نہ ہوں۔اس وقت تو صورتحال یہ ہے کہ مغربی دنیا کے ادنیٰ سے ادنیٰ کارندہ کے رعب سے بڑے بڑے مسلمان حکمرانوں کا پتہ پانی ہوتا ہے۔

مجھے کراچی میں ایک جگہ گفتگو کا موقع ملا۔ وہاں ایک نوجوان نے یہی سوال کیا کہ مسلمان مغرب سے متاثر کیوں ہیں۔ میں نے کہا اس وقت صورتحال یہ ہے کہ مغرب کے کسی بڑے ملک کا ایک سیکشن آفیسر ہمارے ہاں آتا ہے تو ہمارے بڑے سے بڑے قائدین، یعنی صدر سے اور نہ جانے کس کس سے اور باشاہوں سے، ملاقاتیں کرتا ہے۔اس ملاقات کے نتیجے میں حکمران اس طرح کانپ رہے ہوتے ہیں کہ جیسے کوئی پتا کانپتا ہے۔اس پر مجھے شبلی کا وہ شعر یاد آیا جو انہوں نے نور جہاں کے ایک واقعہ کے بارے میں لکھا تھا۔نور جہاں کے بارے میں شبلی نے لکھا ہے کہ

اس کی پیشانی نازک پہ جو پڑتی تھی گرہ
جا کے بن جاتی تھی اوراق حکومت پر شکن

تو کسی امریکی سیکشن آفیسر کی پیشانی پر جو گرہ پڑتی ہے وہ ہماری اور آپ کی حکومت کے اوراق پہ شکن بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہ ایک خوف کا رویہ ہے۔اس کو جلد سے جلد ختم ہونا چاہئے۔علامہ اقبال کی ایک بڑی زبردست رباعی ہے، آج ہمارے اکثر قائدین پر صادق آتی ہے، پیام مشرق میں انہوں نے کہا ہے:

دل بیدار راضر غام رنگ است
دل تر سندہ را آہو پلنگ است

اگر دل بیدار ہو تو شیر بھی بھیڑ معلوم ہوتا ہے۔اور اگر دل میں خوف ہو تو ہرن بھیڑیا نظر آنے لگتا ہے۔

اگر بیمے نداری بحر صحرا است
اگر ترسی بہر موجش پلنگ است

(اگر تمہیں خوف نہیں ہے تو سمندر کی لہروں پر بھی اسی طرح چل سکتے ہو جیسے صحرا پر چلتے ہو۔اگر خوف کا شکار ہو تو دریا کی ہر موج میں تمہیں ایک مگر مچھ نظر آئے گا)۔ ہمارے حکمرانوں کو بھی دریا کی ہر موج میں مگر مچھ ہی نظر آتا ہے۔ فالی اللہ المشتکی۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: آپ نے کہا مسلمانوں میں غلطی تسلیم کرنے کا رواج پیدا نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت کے قرآنی مفہوم کے بجائے عوام الناس میں رواجی، علاقائی رسوم کو شریعت کا نام دیا جا رہا ہے جس سے غلط فہمیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ اسلامی یونیورسٹی یا آئی پی ایس تمام اہل علم کو جمع کر کے شریعت کی جامع مانع تعریف پر متفق کر لیں اور پھر تمام مدارس اس تعریف کے علاوہ کسی اور تعریف کی تشہیر نہ کریں؟

جواب: شریعت کی کوئی نئی جامع مانع تعریف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ شریعت الحمدللہ معلوم و متعین ہے۔اس کی تعریف بھی ہر ایک کو معلوم ہے۔ یہ جو الجھنیں یا غلط فہمیاں ہیں وہ اس وجہ سے نہیں پیدا ہو رہی ہیں کہ کسی کی نظر میں شریعت کی تعریف غلط ہے۔غلط فہمیاں اس وجہ سے پیدا ہو رہی ہیں کہ بہت سے لوگ شریعت کا علم ہی نہیں رکھتے۔ جو لوگ ان ہنگاموں میں (جن کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے) مبتلا ہیں یا ان معاملات میں ملوث ہیں وہ شریعت کے علماء نہیں ہیں، اور نہ ہی غلط فہمی شریعت کے علماء کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہے۔ رونا تو یہ ہے کہ جو لوگ اس وقت کھڑے ہیں یا مختلف حرکتوں کی وجہ سے مسلمانوں کو بدنام کر رہے ہیں وہ شریعت کا ضروری علم بھی نہیں رکھتے۔ اگر شریعت کے علماء ہوتے تو غلط فہمی پیدا نہ ہوتی۔ اس لئے شریعت الحمدللہ متفق علیہ ہے۔اس کی تعریف بھی جامع مانع سب کو معلوم ہے۔ اس میں کسی اختلاف کی نہ پہلے گنجائش تھی نہ آج ہے۔اور نہ اختلاف موجود ہے۔مشرق سے مغرب تک تمام اہل علم متفق ہیں کہ شریعت سے مراد قرآن مجید اور سنت رسولؐ ہے۔اس میں کوئی اختلاف نہیں جہاں شریعت کی تعبیر میں ایک سے زائد نقطہ نظر کی گنجائش ہے، اس گنجائش کو سب تسلیم کرتے ہیں، جہاں نقطہ نظر میں اختلاف کی

گنجائش نہیں ہے وہاں اکثر اتفاق ہے کہ یہاں اختلاف رائے نہیں ہوسکتا۔
مزید برآں دنیائے اسلام میں اجتماعی اجتہادوتعبیر کے ادارے موجود ہیں مثلاً رابطہ عالم اسلامی کے تحت ایک فقہ اکیڈمی ہے۔ایک OIC کی فقہ اکیڈمی ہے۔ایک اسلامک ڈویلپمنٹ بینک ہے اس کا شریعہ بورڈ ہے اوراسی طرح کے بہت سے ادارے ہیں جوشریعت کے مطابق بہت سے معاملات اتفاق رائے سے طے کررہے ہیں اور وہاں کبھی اختلاف نہیں ہوا شریعت کی تعبیر کیا ہے۔اس لئے میرے خیال میں شریعت کی تعبیر میں کوئی اختلاف نہیں۔اختلاف تو شریعت سے ناواقفیت کی بناء پر پیدا ہوتا ہے۔

(عصرِ حاضراورشریعت اسلامی)

سوال: مغرب سے فرد کی مادر پدر آزادی یعنی لبرل ازم اورعقلیت پسندی یعنی Rationalism کا جوتصور آیا ہے اس نے مسلم نوجوان اورذہین طبقات کو مسحور کرلیا ہے۔اب کسی بھی اتھارٹی، باپ، خاندان، خدا، اور authenticity کا انکار سکہ رائج الوقت ہے۔ابلاغ عامہ کے ذرائع جو طاقت کے ظاہری سرچشمے ہیں، اس رجحان کوتقویت دینے میں لگے ہوئے ہیں۔اور ہر فرد سرسری ابلاغی معلومات کی بنا پرخود اپنی شریعت تصنیف کرنے کا حق مانگتا ہے۔اس صورتحال کی اصلاح کیا ہوسکتی ہے۔اسلامی مثالیہ کے مطابق انسان کی تربیت کیسے ہو۔خاندان، مدرسہ، خانقاہ کے روایتی ادارے تو الا ماشاءاللہ غیر موثر ہو چکے ہیں۔

جواب: میں اس الا ماشاءاللہ کو بھی حذف کرنا چاہتا ہوں۔میرے خیال میں سارے ادارے ہی غیر موثر ہو چکے ہیں۔یہی بڑا المیہ ہے امت مسلمہ کا۔اس وقت سب سے بڑا چیلنج جو ہمیں درپیش ہے وہ یہی ہے کہ تربیت کے ادارے بھی ختم ہو چکے ہیں۔تعلیم کے ادارے بھی کمزور پڑ چکے ہیں جو دینی تعلیم ہورہی ہے وہ ماضی کے ایک روایتی ورثے کی تعلیم ہورہی ہے۔یعنی ہم شریعت کی جو تعلیم دے رہے ہیں پاکستان کی حد تک میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک زندہ اور vibrant نظام کی حیثیت سے نہیں دے رہے ہیں، بلکہ ایک dead legacy کے طور پر دے رہے ہیں۔جس طرح مغربی قانونی تعلیم کے اداروں میں رومن لاء کی تعلیم دی جاتی ہے۔جس طرح مغربی دنیا میں قدیم یونانی علوم کی تعلیم ہورہی ہے۔ہندو لاء کی تعلیم ہوتی ہے، اسی طرح ہمارے دینی اداروں میں فقہ اور شریعت کی تعلیم ہورہی ہے۔رومن لاء، ہندو شاستر اور یونانی تصورات، یہ سارے کے سارے مردہ قوانین ہیں۔ہمارا انداز ابھی شریعت پڑھانے کا ایک مردہ قانون کی تعلیم وتدریس جیسا ہے۔ایک زندہ اور زندگی اور حرارت سے بھرپور نظام کی تدریس کا طریقہ اور ہوتا ہے اور کسی مردہ روایت کی تعلیم وتدریس کا طریقہ اور ہوتا ہے۔آثار قدیمہ کی تحقیق اچھی چیز ہے۔لیکن اگر زندہ چیزوں کو آثار قدیمہ سمجھ لیا جائے تو اس سے بڑی قباحتیں پیدا ہوتی ہیں۔لہٰذا تدریس شریعت کے پورے نظام کو از سرنو restructure کرنے کی ضرورت ہے۔جوامت مسلمہ کے ذمے ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔لیکن اس restructuring یا تشکیل نو کے لئے ضروری ہے کہ ضرورت کا پہلے احساس دلایا جائے۔احساس جب ہوگا تو یہ تشکیل نو خود بخود ہو جائے گی۔

یہ سلسلہ جو انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز نے شروع کیا ہے اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ ہمیں اپنے اداروں اور پروگرام پرنظر ثانی کی ضرورت کا احساس پیدا ہو اور جب یہ احساس پیدا ہو تو وہ برقرار بھی رہے۔اس میں وسعت پید ہوا ہو۔اس احساس کے نتیجے میں یہ داعیہ ہوگا کہ لوگ تعلیم کے تصورات پر از سرنو غور کریں اور از سرنو غور کرنے کے بعد پھر وہ تصور سامنے آئے گا جو ہم سب کا مقصود اور ہم سب کا ہدف ہے۔

(عصرِ حاضراورشریعت اسلامی)

سوال: ڈاکٹر صاحب، ایک اور سوال آپ کی گفتگو میں رہا۔یہ جو فرد اور خاندان کے حوالے سے تعلق کو پیش کیا گیا تو صرف فرد کو پیش کیا گیا۔فرد کا ایک عمومی تصور رہا ہے جس میں gender issue سامنے نہیں آسکا۔آج کی ہماری سوسائٹی کے اندر یہ ایشو بہت آگے بڑھ چکا ہے۔اس لحاظ سے gender issue کا موجودہ مباحثہ اور ڈائیلاگ ہمارے سامنے ہے۔اس ضمن میں اسلام خاندانی توازن کو برقرار رکھنے کے لئے اس gender issue کا حل کیسے تلاش کرتا ہے؟

جواب: جہاں تک gender issue کا تعلق ہے قرآن مجید اور احادیث کے متعلقہ احکام کا مطالعہ کرنے سے جو بات واضح طور پر سامنے آتی ہے۔وہ یہ ہے کہ دونوں صنفیں یکساں طور پر اللہ تعالیٰ کے احکام کی مکلّف ہیں۔دونوں ایک دوسرے کو اس کی ذمہ داریوں کی انجام دہی اور تکمیل میں مدد دینے کے لئے ہیں۔دونوں

ایک دوسرے کا تکملہ ہیں۔ جہاں خواتین کو اپنے فرائض کی انجام دہی میں مدد کی ضرورت ہوتو مرد مدد فراہم کریں۔ جہاں مردوں کو مدد کی ضرورت ہو وہاں خواتین مدد فراہم کریں۔اوران کے تعلق کی نوعیت یہی ہے جو قرآن پاک کی بعض آیات میں بڑی نمایاں ہے۔المؤمنون والمؤمنات بعضهم اولياء بعض ۔ مومن مرد اور مومن خواتین ایک دوسرے کے ولی اور مددگار ہیں۔

هُنَّ لباس لَّكم وانتم لباس لَّهُنَّ ؕ(تم ان کا لباس ہو وہ تمہارا لباس ہیں)۔

لباس کے بغیر انسان کی شخصیت مکمل نہیں ہوتی۔نہ خاتون کی شخصیت مکمل ہوتی ہے مرد کے بغیر، نہ مرد کی شخصیت خاتون کے بغیر پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہیں۔ایک پہلو تو یہ ہے۔دوسرا پہلو یہ ہے کہ سکینت ،مودت اور اطمینان ایک دوسرے سے حاصل ہو اور گھر کے اندر اور خاندان کے اندر ایک ایسا ماحول جنم لے جس میں دونوں اپنی شخصیت کی تکمیل کرسکیں۔اور اپنے نبوغ کا یا اپنی عبقریت کا مکمل طور پر اظہار کرسکیں۔انسان انفرادی طور پر زندگی نہیں گزارسکتا۔انسان ایک اجتماعی مخلوق ہے۔اس کو ایک معاشرتی حیوان کہا جاتا ہے،لیکن سوسائٹی میں جانے اور معاشرتی حیوان بننے سے پہلے وہ خاندانی حیوان ہے۔اس کو خاندان میں زندگی گزارنی ہے۔خاندان کے بعد وہ معاشرے میں زندگی گزارے گا۔اس لئے میرے خیال میں جو بنیادی فرق ہے موجودہ مغربی تصور میں اور اسلامی تصور میں وہ یہ ہے کہ مغربی تصور میں مرد و زن دو متحارب کیمپوں سے تعلق رکھنے والے دو آمادۂ پیکار ارکان ہیں جو ایک دوسرے کے خلاف ہر وقت برسر جنگ ہیں۔اور ایک دوسرے سے اپنے حقیقی یا موہومہ یا مفروضہ حقوق حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔جب کہ اسلامی تصور میں یہ دونوں ایک ہی برادرانہ اور خاندانی کیمپ کے ارکان ہیں۔دونوں کے فرائض ایک دوسرے کی مدد کرنے اور ایک دوسرے اور ایک دوسرے کی ذمہ داریوں کی تکمیل میں مدد دینے کے لئے ہیں۔جہاں تکمیل ہو وہاں conflict نہیں ہوسکتا۔یعنی complementarty کے ساتھ conflict ممکن نہیں ہے۔جو چیز complementary ہو وہ conflicting نہیں ہوتی۔جو conflicting ہو وہ ایک دوسرے کی تکمیل نہیں کرتی۔اس لئے اسلامی اور مغربی رویے بنیادی طور پر الگ الگ تصورات پر مبنی ہیں۔مغرب کا تصور اور ہے اور اسلام کا اور مسلمان کا تصور اور ہے۔

آج چونکہ مغربی تصورات کی بالادستی ہے۔مغرب کے تہذیبی رویوں کا غلبہ ہے،مغربی ذرائع ابلاغ سے ان تصورات کا طوفان اور سیلاب دن رات مسلمانوں کے ذہنوں میں انڈیلا جارہا ہے،اس لئے بہت سے مسلمانوں کے خیالات میں الجھن پیدا ہوتی ہے۔اس الجھن کو دور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسلام کے مئوقف کو بار بار بیان کیا جائے۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی اور خاص طور پر جو لوگ شریعت اسلامی کی درس وتدریس یا کسی اور نوعیت کی دینی خدمت سے وابستہ ہیں ان کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے یہ بات مانیں کہ ہمارے یہاں شریعت کی تعلیم سے روگردانی بھی بہت ہورہی ہے۔بعض طبقات کے ساتھ بعض پہلوؤں سے شدید زیادتیاں ہوئی ہیں۔خواتین کے خلاف رویے اور تعصّبات پائے جاتے ہیں۔مسلم دنیا میں بعض ایسے ممالک یا علاقے موجود ہیں جنہوں نے اپنے ذاتی ثقافتی پس منظر سے یا کسی علاقائی رواج کی وجہ سے یا کسی اور سبب سے خواتین کو وہ مقام اور مرتبہ نہیں دیا جو اسلامی معاشرے میں ان کو حاصل ہونا چاہئے۔

تاہم اگر حقیقت یا امر واقعہ کے طور پر کسی جگہ پر شریعت کے حکم کی خلاف ورزی کی وجہ سے خواتین یا کسی اور مظلوم طبقہ کی حق تلفی ہورہی ہے تو اس کی ذمہ دار مقامی ثقافت یا مقامی رواج ہے۔اس کو شریعت کے کھاتے میں نہیں ڈالنا چاہئے۔اگر شریعت کی رو سے وہ چیز ناقابل قبول ہے تو اس کو کھل کر بیان کرنا چاہئے کہ یہ رویہ غیر اسلامی ہے اور ناقابل قبول ہے۔بعض جگہ خواتین کی تعلیم کو لوگ ناجائز قرار دیتے ہیں۔حالانکہ قرآن وسنت کے سارے دفاتر اور پوری اسلامی تاریخ اور اسلام کی ساری روایت اس تصور کی مخالف ہے۔

شاید آپ کے علم میں ہو۔ڈاکٹر اکرم ندوی ایک محقق ہیں۔آکسفرڈ میں کام کررہے ہیں۔انہوں نے پچھلے دس بارہ سال کے دوران خواتین محدثات پر کام کیا ہے۔اور جتنی ایسی صاحب علم خواتین گزری ہیں جنہوں نے صرف علم حدیث میں کام کیا ہے انہوں نے ان کا تذکرہ مرتب کیا ہے۔اس تذکرہ پر میں نے حال ہی میں ایک review پڑھا ہے۔اصل کتاب ابھی تک چھپی نہیں ہے۔غالباً پچیس جلدوں میں شائع ہوگی اور کئی ہزار خواتین محدثات کا تذکرہ ہوگا۔یہ روایت تو ہر حدیث کی کتاب میں ملتی ہے اور سب شروح حدیث میں ملتی ہے کہ کس خاتون محدثہ سے کس کس مرد محدث نے کسب فیض کیا۔ اگر کسب فیض خواتین محدثات سے مرد محدث کرتے تھے، حجاب کے احکام کے ساتھ، شریعت کے احکام کی رعایت رکھتے ہوئے اور حیاء کے تقاضے ملحوظ رکھتے ہوئے، تو آج یہ کہنا کہ خواتین کو تعلیم دینا شریعت کے مطابق نہیں ہے، بہت بڑا ظلم بھی ہے اور اسلام کی علمی روایت سے مکمل ناواقفی کی دلیل بھی۔لہٰذا اگر کہیں ایسا ہورہا ہے تو وہ شریعت سے انحراف ہے۔اس ظلم کی ذمہ دار

شریعت نہیں ہے۔

لیکن چونکہ مسلمانوں میں یہ روایت اب باقی نہیں رہی کہ اپنی کمزوری کا اعتراف کریں اس لئے مسلمانوں کی ہر کمزوری شریعت کے کھاتے میں ڈالی جارہی ہے۔ یوں ہماری بہت سی کمزوریاں شریعت کے کھاتے میں ڈال دی گئی ہیں۔ بہت سی سرگرمیاں جو اسلام کے علمبردار کررہے ہیں وہ اسلام کا حکم نہیں ہیں۔اس لئے ان کے ذمہ دار وہ خود ہیں، شریعت نہیں۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: موجودہ دور میں بہت سارے دینی حضرات یہ خیال رکھتے ہیں کہ جو اسلامی ماڈل حضورﷺ نے آج سے پندرہ سو سال پہلے دیا تھا اس کو ہو بہو اسی شکل میں موجودہ زمانے میں نافذ و رائج کر دیا جائے! کیا شریعت میں کچھ internal dynamism ہے جو کہ اسے موجودہ دور میں لا سکے۔اور دوئم یہ کہ آپ نے خصائص کے حوالے سے بات کی، بہتر ہوتا کہ شریعت میں عقل کا جو مقام ہے کچھ اس کے اوپر بھی بات ہوتی۔ rationalism جو اسلام میں ہے کچھ اس کے بارے میں بھی ہمیں مستفید کیا ہوتا تو بڑا اچھا ہوتا؟ (جناب طارق جان)

جواب: جس چیز کو ہمارے ہاں بہت سے لوگ شریعت کا نظام کہتے ہیں اس میں تین طرح کی چیزیں شامل ہیں:

(۱) کچھ تو قرآن پاک اور سنت کے وہ اساسات اور بنیادی نصوص ہیں جن کے بارے میں، میں نے عرض کیا کہ وہ اسی طرح رہیں گی جس طرح وہ ماضی میں رہی ہیں اور ہر دور میں رہی ہیں اور آئندہ بھی رہیں گی۔

(۲) کچھ چیزیں وہ ہیں جو ائمہ مجتہدین یا مسلمان اہل علم کے فہم پر مبنی ہیں۔انہوں نے دلائل کے ساتھ شواہد کے ساتھ اپنی انتہائی حکمت اور فقہی بصیرت سے کام لیتے ہوئے بعض احکام کی تشریح کی۔اگر آج کے اہل علم دلائل و شواہد سے اور اسی طرح کی حکمت اور دانائی سے کام لیتے ہوئے ان میں سے کسی چیز سے اختلاف کرتے ہیں تو ان کو اس کا حق ہے کہ وہ نئی رائے قائم کریں۔اجتہادی امور میں دیانت دارانہ فہم کی بنیاد پر اختلاف کرنا چاہئے۔اور اختلاف ہوسکتا ہے۔

(۳) تیسری چیز وہ بھی ہے جسے بہت سے لوگ شریعت سمجھتے ہیں لیکن وہ شریعت نہیں ہے۔وہ مسلمانوں کے وہ تاریخی تجربات ہیں جو مختلف مسلم ممالک میں یا مسلم علاقوں میں انتظامی ضرورت یا کسی مصلحت کے تحت یا کسی عارضی حکمت کے تحت مسلمانوں نے اختیار کیے۔آج ان کو اختیار کرنا یا نہ کرنا مسلمانوں کے اختیار میں ہے۔مثال کے طور پر جب ماضی میں مختلف علاقوں میں مسلم حکومتیں قائم تھیں جہاں شریعت کے مطابق عمل ہوتا تھا وہاں بہت سے انتظامی فیصلے بھی ہوئے۔ مثال کے طور پر سلطنت عثمانیہ کی مثال لیں جو قریب ترین حکومت ہے، سلطنت عثمانیہ میں شریعت کے احکام کے مطابق فیصلہ ہوا کرتا تھا۔اس حد تک تو کوئی اختلاف نہیں کہ جب بھی کوئی اسلامی حکومت بنے گی شریعت کی بالا دستی اور شریعت پر عمل درآمد اس کی ذمہ داری ہوگی۔لیکن اس عمل درآمد کو یقینی بنانے کے لئے سلطنت عثمانیہ نے مثال کے طور پر شیخ الاسلام کا ایک منصب قائم کیا۔اس کے تحت انہوں نے مفتی اعظم کا تقرر کیا، مفتی اعظم نے مختلف علاقوں میں مختلف مفتی مقرر کیے۔ان مفتیوں نے اپنے اپنے علاقوں میں مثلاً کچھ ادارے قائم کیے۔ضروری نہیں کہ آج اگر پاکستان میں اسلامی نظام کا احیاء ہو تو ہم بھی لازماً ایک مفتی اعظم کا ادارہ قائم کریں، یا شیخ الاسلام کے نام پر کسی عالم کا تقرر کریں، اگر ہم تجربے سے، غور اور مشورہ سے یہ فیصلہ کریں کہ ایسا کرنا مفید ہے تو پھر کرنا چاہئے۔ اگر ہم یہ محسوس کریں کہ پاکستان کے حالات اور ضروریات کے لحاظ سے شیخ الاسلام کا عہدہ قائم کرنا کوئی ضروری نہیں یا غیر مفید ہے تو پھر ہمیں نہیں کرنا چاہئے۔ یہ ایک محض انتظامی چیز ہے۔اس کا شریعت کے براہ راست حکم ہونے یا نہ ہونے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ہمارے پڑوس میں ماضی قریب میں ایک تجربہ اپنے پورے اخلاص کے باوجود اس لئے مشکلات کا نشانہ بنا اور ان کو تنقید کا سامنا کرنا پڑا کہ ان فاضل اور مخلص حضرات نے ان تینوں قسم کے احکام کے درمیان فرق نہیں کیا۔ایسے بہت سے کام جو افغانستان میں پچھلی صدی میں ہوتے تھے، جو افغان علاقے کی ضروریات کے لحاظ سے اس وقت شاید ناگزیر تھے، افغان مزاج کے لحاظ سے ان کو انیسویں صدی میں ناگزیر سمجھا گیا۔ہمارے بھائیوں نے اکیسویں صدی کے شروع میں بھی یہ سمجھا کہ شریعت کا لازمی تقاضا ہے کہ ایسا کیا جائے۔حالانکہ ایسا ضروری نہیں تھا۔آج کل کے لحاظ سے نئے طریقے ہوسکتے ہیں۔

مثال کے طور پر سعودی حکومت میں ایک 'ہیئۃ کبار العلماء'، ہے، جس کا تقرر بادشاہ کرتا ہے۔کسی ممبر کے انتقال کی صورت میں جو موجودہ علماء ہیں وہ نئی ممبر شپ کے

لئے ایک پینل تجویز کرتے ہیں بادشاہ ان میں سے ایک آدمی کو نامزد کردیتا ہے۔ یہ لائف ممبر شپ ہوتی ہے۔ یہ لوگ فیصلہ کرتے ہیں کہ کوئی قانون شریعت کے مطابق ہے کہ نہیں یا کوئی چیز شریعت کے حکم کے تحت قابل قبول ہے کہ نہیں۔

ضروری نہیں کہ ہم پاکستان میں بھی یہی کریں۔ مصر میں بھی ایسا ہی ہے۔ وہاں بھی علماء کے ایسے ادارے موجود ہیں۔ مراکش میں ایک مجلس العلماء ہے۔ یہ انتظامی امور ہیں۔ اور انتظامی بندوبست، ہر ملک کے لحاظ سے مختلف ہوسکتا ہے۔ اگر انتظامی تجربے ماضی میں کسی خاص انداز کے ہوئے ہیں، اور آج اس سے مختلف انداز میں ہم کوئی نیا تجربہ کرنا چاہیں یا کسی دوسری قوم کے تجربے سے فائدہ اٹھانا چاہیں تو ہم اٹھا سکتے ہیں۔

سیدنا عمر فاروقؓ کے زمانے میں جب ایران فتح ہوا تو ایران کا پورا نظام قدیم فارسی زبان میں تھا۔ شام فتح ہوا تو وہاں کا سارا نظام ان کی مقامی زبان (سریانی) میں تھا۔ ان دونوں علاقوں میں مقامی نظم ونسق اور زمینوں کا بندوبست اسی طرح مقامی زبانوں میں چلتا رہا۔ غیر مسلم کارندے اس نظام کو چلاتے رہے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت امیر معاویہؓ نے ان میں سے کسی نے اس کو تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ لیکن اگر آج ایسا ہو کہ کسی مسلم ملک میں بہت سے غیر مسلم کام کر رہے ہوں اور غیر عربی یا غیر اردو میں کام ہو رہا ہو تو ہمارے، بہت سے لوگ اس کو اسلام کے خلاف سمجھیں گے۔ صحابہ کرامؓ نے اس کو اسلام کے خلاف نہیں سمجھا۔ عبدالملک بن مروان نے سب سے پہلے اس پورے نظام کو عربی میں مرتب کرایا۔ اس لئے کہ یہ محض انتظامی چیز تھی۔ اسی اسپرٹ کے تحت اگر ہم شریعت کے اصل احکام ومقاصد کو سمجھ لیں اور ان پر عمل درآمد کے لئے کیے جانے والے اجتہادات اور ان کو روبعمل لانے کے لئے کیے جانے والے انتظامی تجربات کو الگ الگ سمجھ لیں اور تینوں کے درمیان فرق کریں تو حالات بڑی آسانی سے ہمارے کنٹرول میں آسکتے ہیں۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: اسلامی شریعت ایک مکمل اور ہمہ پہلو محیط ضابطہ حیات ہونے کے باوجود ایک اسلامی معاشرہ قائم کرنے میں ناکام رہی ہے، کیوں؟

جواب: اسلامی شریعت ناکام نہیں رہی۔ پاکستان کے مسلمان اور دور جدید کے مسلمان ناکام رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پچھلے تقریباً دوسو سال سے دنیائے اسلام کا بڑا حصہ مغرب کی بالواسطہ اور بلاواسطہ غلامی میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ مسلمان مکمل طور پر ابھی تک آزاد نہیں ہوئے۔ سیاسی آزادی جزوی طور پر بیسویں صدی کے وسط میں حاصل ہوئی تھی، لیکن اب مسلمان قائدین کی کمزوریوں کی وجہ سے وہ سیاسی آزادی بھی تیزی کے ساتھ کم ہوتی جارہی ہے۔ آزادی کی جو نوید بیسویں صدی کے وسط کے لگ بھگ سنائی دی تھی، ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کی صورت میں، ۱۹۴۶ء میں انڈونیشیا کی آزادی کی صورت میں۔ اب وہ نوید کمزور ہوتی محسوس ہوتی ہے۔ اس لئے پہلے مرحلے کے طور پر مسلمانوں کو مکمل اور بغیر کسی آلائش کے ذہنی، فکری، تہذیبی، عسکری، اقتصادی اور سیاسی آزادی حاصل کرنی ہوگی۔ پھر علامہ اقبال کی اصطلاح کے مطابق اپنے آپ کو ایک روحانی ریپبلک میں تبدیل کرنا ہوگا۔ روحانی ریپبلک سے مراد ایسی جمہوریت ہے جس میں عامۃ الناس اسلام کے اساسی و اخلاقی اور روحانی تصور کے مطابق ایک معاشرہ قائم کریں۔ پھر جب دنیائے اسلام کے مختلف خطوں میں یہ روحانی ریپبلک قائم ہو جائے گی، پھر ان سب کے درمیان ایک روحانی common wealth وجود میں آئے گی۔ جب یہ مرحلہ مکمل ہو جائے گا تو پھر اسلامی تہذیب جنم لے گی۔ اس وقت اسلامی تہذیب کا احیاء ہوگا، پھر ایک مرحلہ آئے گا کہ وہ اسلامی زندگی اور آئیڈیل دوبارہ قائم ہو جائے گا جس کے لئے ہم اور آپ کوشاں ہیں۔ یہ ایک طویل اور جاں گسل راستہ ہے جس پر چل کر ہی منزل آسکتی ہے۔ اس منزل تک جانے کا شارٹ کٹ کوئی نہیں ہے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ شریعت کے نفاذ کا مطالبہ اسلام کا لازمی تقاضا نہیں ہے۔ بلکہ ماضی قریب کے بعض اہل علم نے اسے مطالبے کی شکل دے دی ہے۔ اسلام بنیادی طور پر اصلاً ایک مذہبی رویے کا نام ہے، وہ رویہ صرف اخلاق اور عبادات، اور زیادہ سے زیادہ عائلی امور تک محدود رہنا چاہئے جب اس مذہبی دائرے کو پھیلا کر اجتماعیت کے دائرے میں لایا جاتا ہے تو اس سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اسی لئے مغربی دنیا نے مذہب اور ریاست کے درمیان تفریق کر کے اس مشکل سے نجات حاصل کر لی ہے۔ اس بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: میری بلکہ اسلام کے تمام مستند شارحین اور جید ترین اہل علم کی قطعی رائے یہ ہے کہ دین و دنیا کی تفریق کا موجودہ مغربی تصور غلط ہے، یہ تصور شریعت کے مطابق نہیں ہے۔ شریعت پہلے دن سے ایک مکمل نظام زندگی ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ میں دعوت کا آغاز فرمایا تھا، جب ابھی صحابہ کرام کی تعداد تین چار سے زیادہ نہیں تھی اس وقت آپ ﷺ مکہ مکرمہ کی محفلوں میں یہ اعلان فرمایا کرتے تھے کہ ''اے لوگو! میں جس کلمہ کی دعوت دے رہا ہوں اسے قبول کرلو، اگر تم ایسا کرلو گے تو عرب وعجم تمہارے زیرنگیں ہوجائیں گے۔ (تخضع لکم بها العرب وتدین لکم بها العجم ''عرب تمہارے سامنے سرنگوں ہوجائیں گے اور عجم تمہاری قیادت کا سکہ تسلیم کرلیں گے'')۔

گویا عرب وعجم کے لئے قائدانہ کردار تو اسلام کی تعلیمات کا پہلے دن سے ایک حصہ تھا۔ یہ اسی وقت ہوسکتا ہے کہ جب اسلام کی تعلیم تہذیبی، تمدنی، ریاستی، قانونی اور زندگی کے دوسرے تمام معاملات پر محیط ہو۔ انسانی زندگی ایک اکائی ہے اس کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ انسان کوئی موٹر کار نہیں ہے کہ اس میں ٹائر بنانے اور لگانے والا مستری الگ ہو اور بجلی ٹھیک کرنے والا ماہر الگ ہو۔ اور پنکچر لگانے والا مزدور الگ ہو اور ان سب کا آپس میں کوئی تعلق نہ ہو۔ انسان ایک ہمہ گیر اور جامع حقیقت ہے۔ انسان ایک کل ہے اور جب تک اس کل کو سامنے نہیں رکھا جائے گا محض کسی جز کو سامنے رکھنے سے انسان کے مسائل حل نہیں ہوں گے۔ جن نظریات نے انسان کے اقتصادی مسائل ہی کو سب کچھ سمجھا اور محض اقتصادی معاملات کو حل کرنا چاہا اور اخلاقی اور روحانی پہلوؤں کو نظرانداز کیا، وہ نظریات ناکام ہوگئے۔ اسی طرح سے وہ نظریات جو انسان کی اخلاقی اور روحانی زندگی کو نظرانداز کر کے صرف مادی اور ظاہری آسائشوں کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں ان کی ناکامی کے نتائج اور ثمرات اب سامنے آرہے ہیں۔ علامہ اقبال نے انہی چیزوں کے مشاہدے کے پیش نظر پیش گوئی کی تھی کہ

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

وقتی طور پر کسی کی سیاسی قوت سے یا عسکری اثر ورسوخ سے متاثر نہیں ہونا چاہئے۔ اس طرح کی سیاسی قوت تو چنگیز خان نے بھی حاصل کرلی تھی، تاتاریوں کی عسکری قوت ضرب المثل تھی۔ تاتاری دوسو سال پوری دنیائے اسلام پر مسلط رہے۔ انہوں نے دنیائے اسلام میں جو جو مظالم کیے اور جو تباہی و بربادی پھیلائی اس کی تفصیلات آج پڑھیں تو یقین نہیں آتا۔ لیکن ان کے پاس کوئی تہذیبی نظام نہیں تھا۔ ان کی کوئی اخلاقی بنیادیں نہیں تھیں، اس لئے وہ بہت جلد ناکام ہوگئے۔ موجودہ قوتوں کی عسکری بالادستی بھی ایک وقتی چیز ہے اور بہت جلد ختم ہوجائے گی ان شاءاللہ۔ مسلمان اس کے جادو سے آزاد ہورہے ہیں۔ بہت سے مسلمانوں کے ذہن اس سحر سے تیزی سے نکل رہے ہیں جس کا وہ گزشتہ سو یا سوا سو سال سے شکار ہیں۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: بنگالیوں نے پاکستان کی خاطر قربانیں دی ہیں۔ اب اگر کوئی بنگالی اسلامی ملک پاکستان میں غیرقانونی طور پر آتا ہے اس کا کیا حکم ہے۔ کیا اسے سزا دی جائے گی؟

جواب: وہ پاکستان کا شہری ہے اسے اس کی سزا نہیں دی جاسکتی۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: توہین رسالت کے بارے میں اسلامی فقہ کیا کہتی ہے؟

جواب: توہین رسالت کا مرتکب واجب القتل ہے۔ اس کی یہی ایک سزا ہے جس کو نہ دوسری سزا سے بدلا جاسکتا ہے نہ اس کو معاف کیا جاسکتا ہے۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: ہماری حکومتوں نے نفاذ اسلام کے معاملے میں جو مجرمانہ غفلت برتی ہے اور اب بھی برتی جارہی ہے اس کے پیش نظر آپ نفاذ اسلام کے لئے کیا طریق کار تجویز کرتے ہیں؟

جواب: ہمارے ہاں ایک ایسا معاشرتی رویہ رواج پا گیا ہے جو اس معاشرے کا سب سے بڑا مسئلہ بن گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی شخص کسی بھی ذمہ داری کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ہم نے تمام ذمہ داریاں اپنے حکمرانوں پر ڈال دی ہیں۔ بلاشبہ یہ بات بڑی حد تک درست ہے کہ جو طبقہ اس وقت ہم پر حکمرانی کر رہا ہے وہ بڑی حد تک اسلام اور اسلامی روایات سے دور ہے۔ لیکن اس تمام بگاڑ کا صرف وہ طبقہ یا ان میں سے کوئی ایک فرد ذمہ دار نہیں ہے، بلکہ ہم میں سے ہر شخص اس انحطاط کا ذمہ دار ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ہم میں سے کسی نے بھی نہ ان ذمہ داریوں کا احساس کیا ہے اور نہ ہی ہم دنیائے اسلام کی تعمیر میں کوئی دلچسپی رکھتے ہیں۔ بلکہ ہمارے اندر اب شاید وہ جذبہ بھی موجود نہیں رہا جو اس کی تعمیر کے لئے ضروری ہے۔ اس کام کو کیسے کیا جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ تمام لوگ جو اس کام کی اہمیت کا احساس و ادراک رکھتے ہیں اور اس اہم ملی مسئلے کا حل بھی ان کے ذہن میں ہو وہ ایک رائے عامہ پیدا کریں، اس میں ہر شخص کو اور ہر طبقے کو اس کام کی اہمیت اور اس سلسلے میں اس کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا جائے اور ہر طبقہ یہ اندازہ کرلے کہ اس کے کرنے کا کام کیا ہے۔ جب تک اصلاح معاشرہ کی کوئی اجتماعی کوشش نہیں کی ہوگی کسی ایک طبقے کو موردالزام ٹھہرانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ آپ حکمرانوں کو پچاس سال سے برا کہہ رہے ہیں۔ جو بھی آیا آپ نے اسے برا کہا۔ میں کسی کی صفائی پیش نہیں کر رہا۔ ممکن ہے سارے برے ہوں، ممکن ہے سارے اچھے ہوں۔ لیکن معاملات کی بہتری کا یہ طریق کار قطعاً غیر موزوں اور بے نتیجہ ہے کہ ہم حکمرانوں کو موردالزام ٹھہرانے پر اکتفا کریں۔ جب ہم میں سے ہر شخص یہ سمجھنے لگے گا کہ میرے اور میرے ملک کے اور میری امت کے معاملات تب بہتر ہوں گے جب میں معاملات کو بہتر کرنا چاہوں گا اور ہر فرد اس کے لئے جب شعوری کوشش کرے گا اور ہر ایک صیغہ واحد متکلم میں بات کرے گا تو پھر بات آگے بڑھے گی۔ یہ ذمہ داری تو پاکستان کے اٹھارہ کروڑ مسلمانوں میں سے ہر ایک کی ہے۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں اور میری طرح ہر فرد کی یہی کیفیت ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ ذمہ داری میرے علاوہ جو سترہ کروڑ ننانوے لاکھ ننانوے ہزار نو سو ننانوے ہیں یہ صرف ان ہی کی ذمہ داری ہے۔ نیز میں ہی ایک صحیح ہوں باقی یہ سب غلط ہیں۔ جب یہ صورت حال ہر ایک پاکستانی کی ہوگی تو یقینی بات ہے کہ معاشرے کی گراوٹ کا یہی عالم ہوگا جواب ہے۔ اگر ہم میں سے ہر ایک سیدنا صدیق اکبرؓ کی طرح سوچے کہ اس معاملے میں میں کتنا ذمہ دار ہوں اور یہ کام یا یہ ذمہ داری مجھے یوں ادا کرنا ہے، تب جا کر بہتری کو توقع پیدا ہوگی اور اس معاشرے کو اسلامی معاشرہ بنایا جا سکے گا۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: مسلمانوں میں فرقہ بندی کی موجودگی میں اجتماعیت کا پیدا کرنا کیونکر ممکن ہے؟

جواب: اگر فرقہ بندی سے مراد ایسی فرقہ بندی ہے جیسی عیسائیوں میں تھی تو ایسی فرقہ بندی مسلمانوں میں موجود نہیں ہے۔ مسلمانوں میں صرف دو فرقے ہیں شیعہ اور سنی۔ لیکن اس سے کوئی قباحت اس لئے پیدا نہیں ہوتی کہ مسلم دنیا میں غالب اکثریت صرف ایک ہی فرقے کو حاصل ہے اور وہ سنی فرقہ ہے۔ مسلم ممالک میں صرف ایران میں شیعہ اکثریت ہے۔ اس لئے اگر یہ اصول اختیار کیا جائے جو ماضی میں ہمیشہ اختیار کیا گیا تھا کہ قانون جب بھی بنایا جائے یا عام مذہبی زندگی کی تشکیل کی جائے تو وہ اس علاقے میں موجودہ اکثریت کے نقطہ نظر کے مطابق کی جائے اور اقلیت کو اپنے معاملات منظم کرنے کی پوری آزادی ہو۔ اس سے کوئی شکایت یا مسئلہ نہ ماضی میں پیدا ہوا، نہ آج پیدا ہوگا۔ لیکن میں یہ عرض کروں گا کہ میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا کہ پاکستان میں فرقہ واریت کی وجہ سے اسلامی احکام نافذ نہیں ہو سکے۔ وطن عزیز میں Islamisation کے کام سے میرا بڑا تعلق رہا ہے اور میں کئی ایسی کمیٹیوں کا ممبر رہا ہوں جنہوں نے اسلامی احکام کی ترتیب میں حصہ لیا ہے۔ اس کام میں شیعہ بھی شریک رہے۔ پھر سنیوں میں سے مختلف مذہبی گروہوں کے لوگ بھی تھے۔ لیکن میرے علم میں کوئی موقع بھی ایسا نہیں ہے کہ کسی فقہی مسئلے یا جزیئے میں اس وجہ سے کوئی ایسا اختلاف پیدا ہوا ہو جس کو حل کرنے میں پریشانی کا سامنا ہوا ہو۔ ہمیشہ اتفاق رائے سے فیصلے ہوئے ہیں۔ آپ دیکھیں کہ وفاقی شرعی عدالت نے تقریباً چودہ سو قوانین پر نظر ثانی کی۔ ان کے سارے فیصلے اتفاق رائے سے ہوئے۔ بورڈ آف تعلیمات اسلامیہ، اسلامی مشاورتی کونسل اور اسلامی نظریاتی کونسل کے ناموں سے ہمارے ہاں ۱۹۵۰ء سے ایک ادارہ موجود ہے، یہ پہلے اسلامی لاکمیشن کہلاتا تھا اس سے قبل یہ ادارہ بورڈ آف تعلیمات اسلامیہ کہلاتا تھا۔ ۱۹۵۰ء سے لے کر آج تک ہزاروں معاملات میں اس نے اپنی سفارشات پیش کیں اور ان ہزاروں سفارشات میں سے کوئی دو تین بھی ایسی نہیں تھی جن میں فرقہ واریت کی وجہ سے کوئی لاینحل اختلاف پیدا ہوا ہو۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں سے اکثر و بیشتر پر کوئی عمل درآمد نہیں ہوا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ عمل درآمد نہ ہونے کے اسباب میں فرقہ واریت کا کوئی دخل نہیں۔ اس کے اسباب کچھ اور ہیں۔ اگر فرقہ بندی رکاوٹ ہوتی تو اسلامی نظریاتی کونسل یا اس جیسا کوئی دوسرا ادارہ یوں ہزاروں مسائل

میں حکومت کو رہنمائی پیش نہ کرسکتا۔ ہمارے ہاں اسمبلیوں میں نفاذ اسلام کے حق میں بہت سی قراردادیں پاس ہوئیں لیکن ان میں سے کسی پر عمل درآمد نہ ہونے کی وجہ فرقہ واریت نہیں بلکہ کچھ اور ہے۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: موجودہ دور میں مکر وفریب اور جھوٹ اور کذب کو ڈپلومیسی کا نام دیا گیا ہے جو پوری دنیا میں جاری ہے۔ اس صورت حال میں اسلامی مملکت کے لئے معاہدات کا طے کرنا اور ان پر عمل درآمد کرنا کس حد تک ممکن ہے۔ جب کہ خود مسلم ممالک اس مروجہ ڈپلومیسی کو اپنائے ہوئے ہیں؟

جواب: یہ درست ہے کہ موجودہ دور میں مکر وفریب کا نام ڈپلومیسی رکھ دیا گیا ہے اور جیسا کہ میں نے ایک سوال کے جواب میں چند روز پہلے عرض کیا تھا کہ وہاں دیانت داری بھی بطور اصول کے نہیں بلکہ بطور پالیسی کے اپنائی جاتی ہے۔ دیانت داری کو بطور وسیلہ اور گر کے اختیار کیا جاتا ہے۔ اس صورت حال میں یقیناً یہ بات دشوار ہے کہ اخلاق اور کردار کے اصولوں پر مکمل دیانت داری برتتے ہوئے سفارت کاری کی نئی روایا نیا رجحان پیدا ہوا کیا جائے۔ لیکن یہ رجحان جب بھی پیدا ہوگا تو دنیا خود بخود اس کی طرف مائل ہوگی، اس لئے کہ انسانوں کا مزاج عمومی طور پر اخلاق اور دیانت داری کو قبول کرنے کا ہے۔ انسان خواہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، مشرق کا ہو یا مغرب کا، وہ ہمیشہ مزاجاً اچھی چیزوں کو پسند کرتا ہے اور غلط چیزوں کو ناپسند کرتا ہے۔ اگر ایک مرتبہ چند مسلم مملکتیں ایک پالیسی کو اختیار کرلیں تو پوری دنیا پر اس کے اثرات اس طرح واضح ہوں گے کہ بین الاقوامی تعلقات میں بھی ایک واضح تبدیلی آجائے گی اور مکر وفریب کے مقابلے میں اخلاق وکردار کو یقیناً پسند کیا جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج کے دور میں اسلام کے پیغام پر عمل کرنا ماضی کے مقابلے میں زیادہ آسان اور موثر ہے، اس لئے کہ ماضی میں اسلامی مملکتوں کی تعداد ایک یا دو تھی آج ۵۴ ہے۔ یہ مملکتیں اگرچہ سابقہ بڑی مملکتوں کے مقابلے میں کمزور ہیں لیکن ان مملکتوں کی کثرت تعداد کی وجہ سے مسلمانوں کی آوازوں میں اضافہ ہوگیا ہے اور وسائل آمدورفت کی وجہ سے یہ بات ممکن ہوگئی ہے کہ ایک ملک کی پالیسی بہت جلد دوسرے ملکوں تک پہنچ جائے اور اس کے اثرات دوسرے ممالک میں بھی ظاہر ہوں۔ اس لئے اگر آج دنیائے اسلام کے مسلمان ایک عزم اور ادارے کے ساتھ اسلامی اصولوں پر عمل کرنا شروع کردیں تو پوری دنیا میں اس کے اثرات ہوں گے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ پوری دنیا مسلمانوں کے اس عزم سے متاثر نہ ہو۔ دنیا کے انسان حق کی تلاش میں ہیں۔ دنیا میں اکثریت ایسے بے خبر لوگوں کی ہے کہ جن تک صحیح بات نہیں پہنچی۔ اگر ان تک صحیح بات عقل کے ساتھ پہنچائی جائے تو وہ یقیناً اس انداز میں مخالفت نہیں کرسکیں گے جس انداز میں وہ اب کرتے ہیں۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: یہ سوال لیکچر سے متعلق نہیں معذرت خواہ ہوں۔ ہمیں اگر خلافت کی طرف لوٹنا پڑے تو صدارتی یا پارلیمانی نظام میں سے کون سا نظام اپنایا جائے۔ نیز خلیفہ کے چناؤ کی شکل کیا ہوگی؟ شکریہ۔

جواب: آپ نے دو الگ الگ سوال پوچھے ہیں، جب میں یہ کہتا ہوں کہ مسلمانوں کو خلافت کا ادارہ زندہ کرنا چاہئے تو میری مراد یہ ہوتی ہے کہ بین الاقوامی سطح پر تمام مسلم مملکتیں ایک ایسا مرکز بنائیں جو پوری دنیا کے مسلمانوں کی وحدت کا نشان ہوتا کہ مسلمان اخلاقی، تمدنی، مذہبی اور سیاسی طور پر ایک وحدت کے تصور سے شعوری طور پر متعارف ہوں اور اس طرح ان میں وحدت اور یکجہتی کے جذبات واحساسات پختہ تر ہوں۔ اس کی کیا شکلیں ہوسکتی ہیں۔ اس کے لئے مسلم مفکرین نے مختلف تجاویز دی ہیں جن پر غور ہونا چاہئے۔ علامہ اقبالؒ نے تو تجویز دی تھی اس کا میں ذکر کرچکا ہوں کہ مسلمان ایک کارپوریٹ Corporate خلافت کے تصور پر غور کریں کہ ممکن ہے یا نہیں۔ یعنی بجائے اس کے کہ ایک فرد خلیفہ ہو ایک پورا ادرہ ایسا قائم کرلیا جائے جس کو خلافت کی ذمہ داریاں سونپ دی جائیں، جو مسلم وحدت اور مرکزیت کا مظہر ہو، ایک شکل تو یہ ہوسکتی ہے۔ دوسرا تصور جس کا میں نے ذکر کیا وہ شام کے مشہور مفکر ڈاکٹر احسان حقی نے دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کے سیاسی مفادات باہم ٹکرا رہے ہیں اور مسلمان دو کیمپوں (اس وقت سوویت یونین موجود تھا) روس اور امریکہ میں تقسیم ہیں، اس بنا پر عسکری مفادات میں اشتراک دشوار ہے۔ اس لئے پہلے قدم کے طور پر مسلمانوں کو خالص مذہبی اور ثقافتی معاملات کے لئے خلافت کا ادرہ قائم کرنا چاہئے، اور ایک شخص کو خلیفہ مقرر کرکے اسے ایک مرکز (مثلاً مکہ مکرمہ) دے دیا جائے جو سارے مسلمانوں کے اخلاقی، دینی، تاریخی، تہذیبی معاملات کی اصلاح کرے، باہم تعاون کی کوشش کرے اور یکساں قسم کے تصورات

پیدا کرے۔اس کے بعد جب یہ ادارہ مفید ثابت ہوتو اس کا دائرہ اثر بڑھا کر دیگر شعبے بھی اس کے سپرد کیے جائیں۔یہ بھی ایک تجویز ہے جس پر غور کیا جاسکتا ہے۔ایک اور تجویز یہ تھی کہ تمام مسلم ممالک کی کامن ویلتھ بنائی جائے۔جب کامن ویلتھ بنے گی تو اس کا سربراہ بھی ہوگا۔جیسے برٹش کامن ویلتھ کی سربراہ ملکہ برطانیہ ہے۔کسی ایک سربراہ مملکت کو اس کا سربراہ بنالیا جائے اور یہ by rotation بھی ہوسکتا ہے۔اسی طرح سے یہ تجویز آئی تھی کہ مسلم ممالک ایک وفاق یا نیم وفاق بنالیں اور اس کا سربراہ کچھ عرصے کے لئے منتخب ہوتا رہے۔جنوری ۱۹۸۱ء میں امیر کویت نے تجویز پیش کی تھی کہ ایک بین الاقوامی اسلامی عدالت انصاف بنائی جائے جو اسلامی شریعت کے احکام کے مطابق مسلم مملکتوں کے اختلافات کو دور کرے۔ظاہر ہے کہ یہ عدالت اگر بنے گی تو اسلام کے قانون بین الممالک کے احکام پر ہی فیصلے کرے گی۔اس تجویز کو اسلامی سربراہ کانفرنس نے طائف میں قبول کرلیا تھا۔اس کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی جس کا کام یہ تھا کہ ان تفصیلات کو طے کرے جن کے تحت یہ عدالت بننا تھی۔لیکن پھر معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔پھر معلوم نہیں کہ اس کمیٹی نے کام نہیں کیا، یا اگر کام کیا تو شاید اس کی تجاویز پر غور نہیں کیا گیا۔ان تمام تجاویز سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں یہ احساس موجود ہے کہ مسلم اتحاد کے لئے کام ہونا چاہئے۔او آئی سی کا ادارہ اسی مرکزیت کا مظہر ہے اس کام میں تاخیر دنیائے اسلام کے لئے نقصان دہ ہوگی۔مسلمان جتنی جلدی ایک مرکزیت پر آجائیں اسی قدر ان کے لئے بہتر ہے۔مسلمانوں کو اس مرکزیت کی اہمیت کا اتنا احساس نہیں ہے جس قدر غیروں کو اس کی اہمیت کا احساس ہے۔خلافت کا نام جب بھی لیا جاتا ہے تو مخالفین یوں گھبرا اٹھتے ہیں جیسے کوئی ٹائم بم رکھ دیا گیا ہے، جو کسی وقت بھی پھٹ جائے گا۔اس سے مسلمانوں کو اندازہ ہوجانا چاہئے کہ خلافت کے ادارے کی کتنی اہمیت ہے!

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: بین الاقوامی تعلقات میں جہاں کھیل، تجارت، اور سفارت کاری کو بطور آلہ استعمال کیا جاتا ہے وہاں ثقافتی طائفوں سے بھی یہ کام لیا جارہا ہے۔اسلامی نقطہ نگاہ سے ان ثقافتی طائفوں کو بین الاقوامی رائے عامہ ہموار کرنے کے لئے استعمال کرنا کس حد تک درست ہے؟

جواب: پہلے تو یہ طے ہونا چاہئے کہ کیا ثقافتی طائفوں نے بین الاقوامی طور پر واقعی کوئی رائے عامہ بنائی بھی ہے۔میرے خیال میں تو ایسا نہیں ہوا۔مجھے کوئی ایسا مسئلہ نہیں ملا جہاں کسی ناچنے اور گانے والے نے یا کسی ڈانسر نے دنیائے اسلام کے حق میں کوئی رائے عامہ بنادی ہو، یا ان کی اجتماعی یا انفرادی کوششوں کی وجہ سے کسی یہودی یا عیسائی کی رائے دنیائے اسلام کے بارے میں بدل گئی ہو، یا کشمیر، بوسنیا وغیرہ کے بارے میں کسی ناچنے والی یا ناچنے اور گانے والے نے رائے پیدا کی ہو۔ایسا شاید کبھی نہیں ہوا۔اس لئے میری ناچیز رائے میں یہ مفروضہ ہی ہے کہ ثقافتی طائفے یہ کام کرسکیں گے۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: اسلامی مملکت کا فرد بھاگ کر دارالحرب میں چلا جائے۔کوئی جرم کرکے، یا خودساختہ جلاوطنی، اور وہاں بھارتی ٹینکوں پر بیٹھ کر پاکستان آنے کی بات کرے۔اس کے شہری حقوق کا کیا بنے گا؟ اگر اسے معاف کردیا جائے تو قانون مذاق بن کر رہ جائے گا۔دوسرا سوال کہ قادیانیوں کی شہریت پاکستان میں کس قانون کے تحت ہے؟ تیسرا سوال یہ ہے کہ حکومت پاکستان جو اپنے قیدی امریکا کے حوالے کررہی ہے، اس کی حیثیت کیا ہے؟

جواب: اگر کسی مسلم ملک کا کوئی شہری بھاگ کر چلا جائے تو اس کی شہریت ختم ہوسکتی ہے اور ختم ہونے کے بعد بحال بھی کی جاسکتی ہے۔یہ اسلامی حکومت کی صوابدید پر منحصر ہے۔اس میں انتظامی امور کا دخل زیادہ ہوتا ہے۔رہی قادیانیوں کی بات، تو یہ بات تو صحیح ہے کہ مرتد واجب القتل ہوتا ہے اسے غیر مسلم اقلیت قرار نہیں دیا جاسکتا۔البتہ مرتد کی اولاد اگر ماں باپ کے دین پر ہو تو وہ غیر مسلم اقلیت قرار دی جاسکتی ہے اور میری ذاتی رائے یہ ہے کہ موجودہ قادیانی طبقے کی واضح اکثریت مرتدین کی اولاد ہے۔اس لئے غیر مسلم کہلائی جاسکتی ہے۔تاہم عام قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے سے مجھے ذاتی طور پر اختلاف ہے۔اس طبقے کی بنیادی عمارت ہی ناموس رسالت کے منافی اور اسلامی سٹیٹ سے بغاوت پر مبنی ہے۔اس کا صحیح حل انہیں غیر مسلم اقلیت قرار دینا نہیں، بلکہ ان پر مکمل پابندی لگانا ہے۔جس طرح کسی زمانے میں کمیونسٹ پارٹی، نیشنل عوامی پارٹی، عوامی لیگ وغیرہ پر پابندیاں لگائی گئی تھیں اسی طرح ان پر مکمل پابندی لگا کے ان کا سارا لٹریچر ضبط کرنا چاہئے، کمیونسٹ ملک میں وہاں کے بنیادی نظریات کے خلاف بات کرنا اگر سٹیٹ کے خلاف جرم ہے تو یہاں بھی ریاست کی بنیادی اساس کے خلاف بات کرنا جرم ہونا چاہئے۔

۱۹۳۵ء میں قادیانیوں کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے مسلم اقلیت قرار دیے جانے کی جو بات کی تھی وہ اس دور میں صحیح تھی کہ حکومت ہی غیر اسلامی تھی۔لیکن یہاں مسلم ملک میں ایسا نہیں ہوسکتا۔رہا سوال مجاہدین عرب کا جو افغانستان میں لڑے۔واقعہ یہ ہے ان لوگوں کی واضح اکثریت نے افغان جہاد میں بڑا کام کیا ہے۔البتہ ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو وہاں جرم کر کے یہاں بھاگ آئے تھے۔حکومت مصر نے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا۔حکومت پاکستان نے ان لوگوں کو واپس کرنے سے انکار کر دیا۔اس بنا پر کہ مجرموں کے تبادلے کا قانون پاکستان اور مصر کے درمیان نہیں ہے۔حکومت مصر نے اس پر کہا کہ پاکستان میں ہی ان پر مقدمہ چلایا جائے۔حکومت پاکستان نے ان پر مقدمہ چلانا مناسب نہیں سمجھا۔چانچہ ان میں سے ایسے لوگ دیگر ممالک کو بھاگ گئے۔تو کسی بھی ایسے شخص کو جو کسی دوسرے ملک کا مجرم ہو اس کو واپس نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ دونوں ممالک کے درمیان باقاعدہ معاہدہ نہ ہو۔امریکہ سے بھی ہمارا ایسا معاہدہ نہیں ہے اس لئے اس کو بھی اپنا قیدی نہیں دے سکتے۔اگر ایسا ہوا ہے تو غلط ہے۔تاہم ان میں سے بعض ایسے ہیں جنہیں سپریم کورٹ کے حکم سے امریکا کے حوالے کیا گیا ہے اسے ہم غلط نہیں کہہ سکتے۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: بنگلہ دیش میں ہزاروں پاکستانی ایسے ہیں جو یہاں آنا چاہتے ہیں، جنہیں حکومت نہیں لا رہی۔کیا ان پاکستانیوں کی شہریت ختم ہوجائے گی؟ اگر ان کی شہریت ختم ہے تو کس اصول کے تحت؟ ان کی موجودہ شہریت کا تعین کیسے ہوگا؟

جواب: میں عرض کر چکا ہوں کہ اسلامی حکومت کسی مسلمان شہری کو اس کے حقوق شہریت سے محروم نہیں کرسکتی، الا کہ وہ خود اپنے ارادے سے ان حقوق سے محروم ہونا چاہے یا مرتد ہوجائے۔پاکستان یا کوئی اور اسلامی حکومت اپنے کسی شہری کو ملک میں آنے سے نہیں روک سکتی۔جو حکومت یا حکومتیں روکتی ہیں غلط کرتی ہیں۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: غیر مسلم کس طرح اسلامی شہریت حاصل کرسکتا ہے۔حالانکہ اس کا نکاح مسلم عورت سے نہیں ہوسکتا؟

جواب: یہ بات تو ہر مسلمان جانتا ہے کہ ایک غیر مسلم کا نکاح مسلم عورت سے نہیں ہوسکتا۔البتہ شہریت کے متعلق کئی صورتیں ممکن ہیں۔مثلاً ایک صورت یہ ہے جس کو فقہا نے بیان کیا ہے کہ ایک غیر مسلم میاں بیوی ویزا لے کر اسلامی حکومت میں داخل ہوئے ہوں۔اس قیام کے دوران ان میں سے ایک اسلام قبول کر لیتا ہے، مثلاً بیوی اسلام قبول کر لیتی ہے تو ان کا نکاح فوری طور پر کالعدم نہیں ہوگا، بلکہ وقتی طور پر تفریق کرائی جائے گی اور شوہر سے مطالبہ کیا جائے گا کہ وہ اسلام قبول کر لے، اگر وہ اسلام قبول کر لے تو دونوں کا نکاح باقی رہے گا اور دونوں کو شہریت بھی مل جائے گی۔اگر شوہر اسلام قبول کر لے لیکن شہریت اختیار نہ کرے تو ان کا نکاح ختم نہیں ہوگا اور ان کا شہریت حاصل کرنے کا حق فی الحال ختم ہوجائے گا۔آئندہ وہ جب چاہے دارالاسلام میں آ کر یہاں شہری بن سکے گا۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: جناب غازی صاحب: موجودہ دور ڈپلومیسی کا دور ہے۔جھوٹ ڈپلومیسی کا حصہ ہے۔مثلاً پاکستان مجاہدین کی مدد کرتا ہے۔لیکن پاکستان اسے تسلیم نہیں کرتا ہے۔یہ ڈپلومیسی جو جھوٹ ہے، اس بارے میں اسلام کیا کہتا ہے؟

جواب: جہاں تک جائز ڈپلومیسی اور پروپیگنڈے کا تعلق ہے، اسلام اس کی اجازت دیتا ہے۔اس دور میں اخبارات، رسائل، ریڈیو یا ٹیلی وژن، یہ پروپیگنڈے کا ذریعہ ہیں۔اس دور میں عرب شاعری اس کا ذریعہ تھی، اور اس ذریعے کو استعمال کیا جاتا تھا۔خود رسول اللہؐ نے بھی اپنے شعرا کو حکم دیا کہ اس ذریعے کو دشمن کے خلاف استعمال کیا جائے۔آپ نے حضرت حسان بن ثابتؓ کو اس کا حکم دیا۔عرب میں انصار کی حیثیت کو کم تر تسلیم کیا جاتا تھا اور قریش مکہ اپنے آپ کو برتر مانتے تھے۔اس کا جواب شاعری کے ذریعے دیا گیا۔لیکن اس پروپیگنڈے میں کوئی ایسا ذریعہ استعمال نہیں کیا جائے گا، نہ ایسا طریقہ اختیار کیا جائے گا جو اسلامی تعلیمات کے مطابق نہ ہو۔کفار اگر دجل وفریب سے کام لیں تو مسلمانوں کو اجازت نہیں ہے کہ وہ بھی دجل وفریب سے کام لینے لگیں۔اگر کوئی کسی کے مکان کو آگ لگا دے تو جوابی کارروائی میں اس کے مکان کو آگ نہیں لگائی جائے گی، کوئی کسی شخص کو گالی دے تو جواب گالی نہیں ہوگا، اس طرح اگر کافر مسلمان کے خلاف جھوٹ بولتا ہے تو مسلمان جواباً جھوٹ نہیں بولے گا۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: آج کی گفتگو سے واضح ہوا کہ اسلام معاشرتی انصاف و عدل پر مبنی نظام پیش کرتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا اور عدالتیں اپنے مقاصد پورے نہ کر سکیں، جیسا کہ ہمارے معاشرے میں ہوتا ہے، تو اس کی کیا وجوہات ہیں؟ نیز اس کا تدارک کیسے کیا جائے؟

جواب: دیکھیے! اگر کوئی اسلامی ملک ایسا ہو کہ وہاں عدالتیں انصاف نہ کرتی ہوں اور انصاف کے تقاضے پورے نہ ہوتے ہوں تو رسول اللہؐ کی تعلیم یہ ہے کہ صبر کرو اور تبلیغ و تلقین سے اس نظام کو بہتر بنانے کی کوشش کرو۔ ایک موقع پر رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا جس کے راوی حضرت عبادہ بن صامتؓ ہیں اور یہ بخاری اور مسلم دونوں کی متفق علیہ روایت ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جس میں بڑا ظلم ہوگا، اور بااثر لوگ ناجائز مراعات لیں گے۔ اس پر صحابہ نے عرض کیا: أفلا ننابذهم بالسيف؟ کیا ہم ایسے حکمرانوں کو تلوار کے زور سے اٹھا کر نہ پھینک دیں؟ جس پر آپ نے منع فرمادیا۔ پھر ایک صحابی نے ایک دوسرے موقع پر اسی طرح کی بات پوچھی تو آپ نے فرمایا: تم صبر کرو، انہیں ان کے جرائم کی سزا ملے گی۔ اس تعلیم اور صبر کی تلقین کی وجہ یہ ہے کہ ایسے حالات میں اگر مسلمان صبر نہیں کرے گا تو لاقانونیت پیدا ہوگی، انتظام سلطنت تباہ ہوگا اور فتنہ پیدا ہوگا جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: اگر دو اسلامی ریاستوں میں باہم اختلافات ہو جائیں اور وہ ایک دوسرے برسرِ پیکار ہو جائیں تو کیا کسی اسلامی ریاست کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی مدد کے لئے کسی غیر مسلم ملک کو بلائے۔ جیسے عراق اور کویت کے مسئلے میں سعودی عرب نے امریکا سے امداد طلب کی تھی۔ جواب کی درخواست ہے۔

جواب: دیکھیے اس قسم کے معاملات کے بارے میں کوئی دوٹوک اور قطعی رائے دینا بڑا دشوار ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ان معاملات میں ایک ہی چیز کو مختلف زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اور زاویہ نظر بدل جائے تو احکام کا فہم بھی بدل سکتا ہے۔ میں اپنی دانش میں ایک رائے دے سکتا ہوں۔ ضروری نہیں کہ وہ رائے درست ہو۔ میں اس قسم کی مدد کسی بالادست غیر مسلم طاقت سے طلب کرنے کو مناسب نہیں سمجھتا۔ سعودی عرب کے بہت سے اہل علم نے بھی اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اس کے برعکس بعض حضرات جن کا علم، اخلاص اور تقویٰ شک وشبہ سے بالاتر ہے، انہوں نے سعودی حکومت کے اس اقدام کو جائز قرار دیا ہے۔ اس جواز کے قائل وہ جس وجہ سے ہوئے وہ یہ تھی کہ ان کے سامنے سوال کی نوعیت وہ نہیں تھی جو بعض دوسرے لوگوں کے سامنے تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ اس جواز کے اس بنا پر قائل نہ تھے کہ ایک غیر مسلم طاقت کے ذریعے ایک مسلم قوت کو ختم کیا جا رہا ہے، بلکہ وہ اس سوال کو دوسرے پہلو سے دیکھ رہے تھے۔ اس سلسلے میں خود ایک بہت بڑے عالم نے جو وہیں سے تعلق رکھتے ہیں، مجھ سے پوچھا کہ اگر کوئی مسلم ملک خالص ظلم و زیادتی سے کام لیتے ہوئے کسی دوسرے مسلم ملک پر حملہ کر دے، وہاں کے شہریوں کو قتل کرے، ان کی جائدادوں کو لوٹ لے، عورتوں کی عزت کو تاراج کرے اور اس مجروح ملک کے پاس اتنی قوت نہ ہو کہ وہ اپنا دفاع کر سکے تو کیا کسی طاقت ور غیر مسلم دوست ملک سے مدد لینا جائز ہوگا؟ دیکھیے! اب سوال کی ترتیب اور نوعیت بدل گئی ہے۔ اب اثبات یا نفی میں فوری جواب دینا آسان نہیں رہا۔ سعودی عرب کے بعض علما نے اس مسئلے کو اسی دوسرے نقطہ نظر سے دیکھا اور اپنی حکومت کے اس اقدام کو جائز قرار دیا۔ لیکن کچھ اہل علم نے اس طرح دیکھا جیسے آپ اور میں دیکھتے ہیں۔ یہ اختلاف اس وجہ سے ہے کہ مسئلے کی نوعیت کو دیکھنے اور سمجھنے کا طریقہ اور انداز مختلف ہے۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: کسی مسلم ملک میں ہونے والی خانہ جنگی کی وجہ سے نقل مکانی کر کے آنے والے لوگ کیا مہاجر کہلائیں گے؟

جواب: دیکھیے، اگر کسی مسلم ملک میں کوئی داخلی کشمکش ہو، یعنی Civil war کی کیفیت ہو اور مسلمانوں کے گروہ آپس میں لڑ رہے ہوں، تو اس کے بارے میں اسلامی تعلیم تو قرآن نے یہ دی ہے کہ فاصلحوا بين اخويكم (الحجرات ۴۹:۱۰) کہ اپنے ان لڑنے والے بھائیوں کے درمیان صلح کرادو۔ اور یہ حکم سارے مسلمانوں کے لئے ہے۔ اگر دونوں میں سے کوئی ایک زیادتی کرے اور صلح کے لئے تیار نہ ہو تو پوری امت کا فریضہ ہے کہ اس زیادتی کرنے والے کے خلاف جنگ کرے اور جب تک وہ زیادتی سے باز نہ آجائے یہ جنگ جاری رکھی جائے۔ جب وہ آمادہ صلح ہو جائے تو اب اس کے خلاف لڑائی بند کر دی جائے گی۔ ان حالات

میں دور جدید کی سی منافقانہ پالیسی کی تو قطعاً اجازت نہیں۔اب اگر اس کے باوجود وہاں سے مسلمان نقل مکانی کر کے آتے ہیں تو وہ یقیناً مہاجر ہیں اور ان کی مدد کرنا بھی پوری قوم کا فرض ہے اور یہ فریضہ بھی قرآن نے عائد کیا ہے۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: قیام پاکستان کے وقت نقل مکانی کر کے آنے والوں کا اپنے آپ کو مہاجر کہلوانا اور اس نسبت سے حقوق مانگنا کس حد تک جائز ہے؟

جواب: مہاجر نہ تو کوئی قومیت ہے اور نہ کسی قسم کی سیاسی یا انتظامی شناخت ہے، نہ یہ خاندان اور قبیلہ ہے اور نہ ہی اس بنا پر کسی قسم کا کوئی حق مانگنا جائز ہے۔ یہ سب غیر اسلامی تعصّبات ہیں جن کی اسلام کے اندر گنجائش نہیں۔ مہاجر ہونا ایک روحانی اور اخلاقی مقام ہے جس کا بڑا اونچا درجہ ہے۔ اس کو مادی حقوق سے آلودہ کرنا اس کی توہین کرنے کے مترادف ہے۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: موجودہ دور میں غیر مسلم ممالک میں بھی مسلمان رہتے ہیں۔ ان غیر مسلم ممالک میں سے بعض کے ساتھ مسلم ممالک کے دوستانہ تعلقات بھی ہیں۔ ایسے غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے بارے میں مسلم ممالک کا رویہ کیسا ہونا چاہئے؟

جواب: مسلم حکمرانوں کا اولین طرز عمل تو یہ ہونا چاہئے کہ وہ عالم گیر امت کے علم بردار ہوں اور امت مسلمہ اور اسلام کے بین الاقوامی کردار پر کسی قسم کی مصلحت کا شکار نہ ہوں۔ قرآن پاک نے بار بار اس پر زور دیا ہے اور مظلوم مسلمانوں کی مدد کو مسلم حکمرانوں کی ذمہ داری قرار دیا ہے، کسی جگہ بڑے زجر و توبیخ کے انداز میں کہا گیا کہ **ما لکم لا تقاتلون فی سبیل الله** (النساء۴:۷۵) کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کے راستے میں ان کفار سے جنگ نہیں کرتے جنہوں نے مسلمانوں کو نکالا، کمزور کیا، نقصان پہنچایا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ سورہ انفال کے آخر میں ایک حکم اور بھی دیا: **و ان استنصروکم فی الدین فعلیکم النصر الا علیٰ قوم بینکم و بینھم میثاق** (الانفال ۸:۷۲) اگر تمہارے اور ان غیر مسلم ممالک کے درمیان کوئی معاہدہ ہو تو پھر اس معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے تم وہاں کی مسلم اقلیت کی کسی قسم کی ایسی کوئی مدد نہیں کرو گے۔ اس حکم کے تحت اگر کسی مسلم ملک کے غیر مسلم ملک سے معاہداتی تعلقات ہیں تو وہاں کی غیر مسلم اقلیت کا تحفظ اور اس تحفظ کے لئے کسی قسم کوئی کاروائی جس سے معاہدے کی خلاف ورزی ہوتی ہو مسلم حکومت کی ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ حکم خود قرآن نے دیا ہے اور رسول اللہؐ کے طرز عمل سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے، جب آپ نے معاہدہ حدیبیہ کی شرائط طے کر لیں اور اس میں یہ طے ہو گیا کہ اگر کوئی مسلمان مکے سے ہجرت کر کے مدینہ چلا جائے گا تو اس کو واپس کر دیا جائے گا۔ ابھی یہ معاہدہ ہوا ہی تھا کہ مکے سے دو صحابی ابو جندلؓ اور ابو بصیرؓ اس حال میں وہاں پہنچے کہ ان کا جسم زخموں سے چور چور تھا اور دونوں کے پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ رسول اللہؐ نے بنظر شفقت انہیں دیکھا اور اہل مکہ کے سفیر سہیل بن عمرو سے کہا کہ ابھی معاہدے پر باقاعدہ دستخط نہیں ہوئے اس لئے ان پر اس معاہدے کا اطلاق نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن سہیل بن عمرو نے نہ مانا اور کہا کہ آپ ابھی سے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ اس پر آپ نے دونوں صحابہ کو تسلی تشفی دے کر واپس کر دیا۔ یہ مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: موجودہ دور میں انتخابات کا طریق کار غیر اسلامی ہے۔ کیا مذہبی جماعتوں کو ان انتخابات میں حصہ لینا چاہئے۔ اس انتخابی طریق کار کو باقی رکھتے ہوئے کس طرح اسلامی قانون سازی کا کام ہو سکتا ہے؟

جواب: جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ موجودہ رائج الوقت انتخابی طریق کار مکمل طور پر اسلامی ہے یا نہیں۔ اس بارے میں کچھ کہنا دشوار ہے۔ اس نظام کو اصلاحی نقطہ نظر سے دیکھ کر اس کی غیر اسلامی چیزوں کو بدل کر یا ان کی اصلاح کر کے ان کو اسلامی رنگ دیا جا سکتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ اس قسم کی اصلاح کے بغیر اس انتخابی طریق کار میں حصہ لیا جائے یا نہ لیا جائے تو آج سے سو سال پہلے جب سے دنیائے اسلام میں جدید انداز کا مغربی طریق انتخاب متعارف ہوا ہے، علمائے کرام کی اس بارے میں دو آرا ہو گئی ہیں۔ بعض حضرات کا خیال یہ رہا ہے کہ اس انتخابی طریق کار میں حصہ نہ لیا جائے۔ اس لئے کہ اس انتخابی طریق کار میں حصہ لینے کا مطلب یہ ہے کہ

اس کو ہم نے تمام کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود تسلیم کرلیا ہے اور سند تسلیم ورضا بخش دی ہے۔ کچھ اور لوگوں کا خیال ہے کہ اس انتخابی طریق کار میں حصہ لینا چاہئے اور اندر جا کر ہمیں اس کی اصلاح کی کوشش کرنا چاہئے۔ یہ مسئلہ نصوص سے متعلق نہیں ہے، اجتہادی مسئلہ ہے۔ علمائے کرام اس کو حل کر سکتے ہیں۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: نہایت احترام سے گزارش ہے کہ عورت کی سربراہی کے بارے میں اپنی رائے بغیر کسی ابہام کے صاف اور دوٹوک الفاظ میں بیان فرمائیں۔ شکریہ۔

جواب: فقہا کی واضح ترین اکثریت جس میں استثنا نہایت معمولی اور واجبی ہے، شاید ایک دو افراد کا استثنا ہو، ورنہ شروع سے لے کر آج تک غالب اکثریت، اسلامی ریاست کی حکمرانی کے لئے مرد ہونا شرط قرار دیتی چلی آرہی ہے۔ یہ حضرات قرآن کی ایک بالواسطہ آیت (اس بارے میں کوئی صریح نص نہیں ہے) **الرجال قوامون علی النسآء** سے استدلال کرتے ہیں جو ایک بالواسطہ استدلال ہے اور اس کے ساتھ ایک حدیث ہے جو حضرت ابوبکرہؓ سے مروی ہے اور جنگ جمل کے موقع پر بیان ہوئی تھی۔ روایت ہے کہ رسول اللہؐ سے بیان کیا گیا کہ اہل ایران نے کسریٰ کے بیٹے کو قتل کر کے اس کی بیٹی کو بادشاہ بنالیا ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا: **لن یفلح قوم ولوا امرھم امراۃ** (ا) اس روایت کی بنا پر فقہا نے کہا ہے کہ عورت اسلامی ریاست کی سربراہ نہیں ہوسکتی۔ لیکن بعد میں جب ایسے عوامل پیش آئے کہ ریاست کی سربراہی اور حکومت کی سربراہی الگ الگ ہوگئی تو سوال یہ پیدا ہوا کہ کیا سربراہ حکومت پر بھی اس ممانعت کا اطلاق ہوتا ہے یا نہیں۔ چنانچہ بعض ممالک میں جب خلیفہ کے ماتحت سلطان ہونے لگے تو وہاں عورت کے تخت حکومت پر بیٹھنے کا سوال پیدا ہوا، جیسے ہندوستان میں رضیہ سلطان کی مثال، یا اس قسم کی دیگر مثالیں، تو اس میں بھی علما کی دورائیں ہوئیں۔ کچھ حضرات نے کہا کہ اس طرح کی ماتحت حکمران عورت ہوسکتی ہے۔ اکثریت نے اب بھی یہی کہا کہ نہیں ہوسکتی۔ نواب بھوپال کی وفات کے بعد جب محسوس کیا گیا کہ اس کی بیٹی کو تخت پر نہ بٹھایا گیا تو انگریز مسلمانوں کی اس ریاست کو ہتھیا لے گا۔ اس پر اس دور کے ایک بہت بڑے عالم حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فتویٰ دیا کہ سربراہ حکومت کا معاملہ اور ہے اور سربراہ ریاست کا معاملہ اور ہے۔ اور خاص طور پر ایسی سربراہ حکومت جہاں اختیار پارلیمنٹ کے پاس ہو اور وہ پارلیمنٹ کے مشورے کی پابند ہو، تحریری دستور کے مطابق کام کرنے کی پابند ہو۔ اس صورت حال میں عورت وہاں سربراہ حکومت ہوسکتی ہے۔ یہ فتویٰ مولانا کی کتاب **امداد الفتاوی** میں موجود ہے۔ اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ علما کی اکثریت نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ اس کے علاوہ دور جدید کے مشہور سکالر ڈاکٹر معروف دوالیبی کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس روایت کا عورت کی حکمرانی کے جواز یا عدم جواز سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ حضورؐ نے مردوں کی مذمت کی ہے کہ اس قسم کے معاشرے کے مرد بڑے نالائق ہوں گے کہ ان کے ہوتے ہوئے ایک عورت حکمران بنے۔ اس کی مثال ڈاکٹر معروف دوالیبی کی رائے میں یوں ہے کہ اگر کسی شخص کا باپ زندہ ہو اور اس کی کثیر اولاد ہو اور باپ کے بجائے ان کا چچا ان کی دیکھ بھال اور رکھوالی کرتا ہو تو کہا جائے گا کہ وہ باپ بڑا نالائق ہے کہ جس کے ہوتے ہوئے اس کی اولاد چچا کے ٹکڑوں پر پڑی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات چچا کے خلاف نہیں بلکہ باپ ہی کے خلاف سمجھی جائے گی۔ یہ نقطہ نظر ڈاکٹر معروف دوالیبی کا ہے۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: اسلام میں واضح طور پر فارم آف گورنمنٹ نہیں ہے، رسول اللہؐ کے دور کے بعد بھی کوئی ایسا سلسلہ دکھائی نہیں دیتا، اس کی وجہ کیا ہے؟

جواب: میں نے یہ بات بار بار دہرائی ہے کہ اسلام کے بنیادی اصول وکلیات میں ریاست کے عمومی کردار اور مقاصد کا تعین کیا گیا ہے جو ریاست کی بنیاد ہیں۔ نظام حکومت کا تفصیلی ڈھانچا اس لئے متعین نہیں کیا گیا کہ یہ بذات خود مطلوب نہیں ہے۔ یہ محض ایک طریق کار ہے جس سے وہ مقاصد حاصل کیے جاتے ہیں جو اسلامی سٹیٹ کی بنیاد ہیں، اس بنا پر حکومت کی کوئی متعین اور طے شدہ شکل بیان نہیں کی گئی۔ دوسرے یہ کہ حالات وزمانے کے بدلنے سے حکومت کی تشکیل کے تقاضوں میں تبدیلی ہوسکتی ہے۔ البتہ مقاصد ریاست تبدیل نہیں ہوسکتے، اس لئے کہ حکومت کی ظاہری شکل یا اس کے انتظامی ڈھانچے سے زیادہ اس کے مقاصد کو حاصل کرنا مطلوب ہے۔ اور وہ اسلام میں واضح طور پر بیان کر دیے گئے ہیں۔ رسول اللہؐ کے بعد سے لے کر سلطان عبدالوحید خان تک اسلامی حکومت قائم رہی ہے۔ ۱۹۲۶ء میں سلطنت عثمانیہ کے زوال تک اسلامی ریاست قائم تھی اور ان اسلامی مقاصد کو کسی نہ کسی حد تک پورا کر رہی تھی جو میں نے اسلامی ریاست کے حوالے سے اپنی گفتگو میں

بیان کیے ہیں۔لیکن جوں جوں مغربی طاقتوں کا اقتدار پھیلتا چلا گیا یہ خصوصیات و مقاصد ختم ہوتے چلے گئے۔آج خلافت کی بات کرنے والا بنیاد پرست کہلاتا ہے۔ خلافت پر بات کی جائے تو پوری دنیا کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔پچھلے سال میں لندن میں تھا جب بعض مسلمانوں نے وہاں ایک خلافت کانفرنس منعقد کی۔پورا برطانوی پریس، پولیس اور عوام اس طرح چوکنا ہو گئے، جیسے کہیں سے دہشت گرد یا لوٹ مار کرنے والے آ گئے ہوں جو پورے برطانوی معاشرے کو تباہ کر دینا چاہتے ہوں۔میں جب انگلستان میں داخل ہوا اور ائیر پورٹ پر اپنا پاسپورٹ پیش کیا تو مجھے دیکھ کر سمجھا گیا کہ یہ شخص شاید یہاں خلافت قائم کرنے آیا ہے۔انہوں نے میرے سامان کو اس طرح چیک کیا کہ شاید اس میں کوئی اسلامی بم چھپا ہوا ہے۔یہ رویہ جان بوجھ کر اختیار کیا جاتا ہے۔خود مسلمانوں کو خلافت کے بارے میں اتنا بے راہ رو، ژولیدہ فکر اور برگشتہ کیا جا رہا ہے کہ آج مغربی تعلیم یافتہ مسلمان خلافت کا نام لینے سے شرمانے لگے ہیں۔یہی حال رہا تو کل جہاد کا نام لینے سے شرمائیں گے اور پرسوں دوسرے احکام کی باری آئے گی۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: اسلامی ریاست کا قیام فرض کفایہ ہے تو تحریک پاکستان پر نظر دوڑانے سے پتا چلتا ہے کہ علما کی اکثریت نے اس تحریک کا ساتھ نہیں دیا تھا، کیا پاکستان کا قیام اسلامی شرائط پوری نہیں کرتا تھا یا وہ علما آپ کے اس بیان سے ناواقف تھے۔جواب عنایت فرمائیں گے؟

جواب: اصولاً تو یہ سوال ان علما سے ہی ہونا چاہئے جنہوں نے قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی۔میں ان کی طرف سے جواب نہیں دے سکتا۔لیکن میں آپ کی رائے سے اتفاق نہیں کرتا کہ علما کی اکثریت نے قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی۔یہ تاریخ کی ایک بہت بڑی غلط بیانی ہے۔علما کی اکثریت نے تو تحریک پاکستان کی حمایت کی تھی۔جن لوگوں نے اس تحریک کی مخالفت کی وہ محض گنتی کے چند نام ہیں۔یہ حضرات جنہوں نے مخالفت کی وہ مسلم امہ سے مکمل خلوص و ہمدردی رکھنے کے باوجود اور اپنے تقوے اور اخلاص کے باوجود اپنے جذبہ حب الوطنی کی بنا پر انگریز دشمنی میں اتنا آگے نکل گئے کہ آئندہ حالات کا تجزیہ ان کے لئے بہت مشکل ہو گیا۔انہوں نے یہ سمجھا، یا کسی نے ان کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی کہ انگریز ہی اپنی بقا اور اپنے اثر و رسوخ کے تسلسل کو باقی رکھنے کے لئے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہے اور اسی لئے کانگرس اور مسلم لیگ کو کھڑا کیا گیا ہے۔ان میں سے بعض حضرات کی تحریریں میں نے پڑھی ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے بعض خدشات صحیح تھے اور بعض غلط۔بہرحال جو لوگ دنیا سے چلے گئے ان کے بارے میں رائے زنی شاید مناسب بھی نہیں ہے۔لیکن تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے مجھے حق ہے کہ میں اس سلسلے میں کوئی رائے رکھوں، آپ کو بھی یہ حق ہے کہ آپ جو رائے درست سمجھیں اس پر قائم رہیں، لیکن اس تمام تر کے باوجود حقیقت یہ ہے علما کی اکثریت تحریک پاکستان کی حامی تھی۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: کیا پاکستان یا عالم اسلام کی کوئی ایسی تنظیم یا فرد، خلافت راشدہ کی روح کے مطابق قیام معاشرہ کی جدوجہد کر رہی ہے۔موجودہ دور میں اسلامی سٹیٹ کس طرح قائم ہو سکتی ہے؟

جواب: میں جب اسلامی ریاست کی بات کرتا ہوں تو میری مراد کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی جو کسی خلا یا فضا میں کہیں موجود ہے اور اسے زمین پر لا کر اس طرح لگا دیا جائے جیسے پودا لا کر زمین میں لگایا جاتا ہے۔اسلامی ریاست مسلم امہ کے اندر سے خود بخود پیدا ہوتی ہے اور الحمدللہ دنیا کے مختلف ممالک میں یہ کوشش ہو رہی ہے، یہاں پاکستان میں مسلم امہ کا ایک قابل ذکر حصہ موجود ہے، یہاں کے لوگ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ دور جدید میں اسلامی ریاست کا قیام وقت کا تقاضا ہے، یہاں کے لوگ اسلام کے مقاصد کو پورا کرنا چاہتے ہیں، اگرچہ ایمان کی کمزوری کے لحاظ سے ان میں اتنا ہی تفاوت ہے جتنا کہ عام مسلمانوں میں ہوتا ہے۔اس وجہ سے اس سلسلے میں زیادہ کامیابی نصیب نہیں ہو رہی۔تاہم مجھے یہ عرض کرنے دیجئے کہ پاکستان میں نفاذ اسلام کے سلسلے میں دیگر ممالک کی نسبت کوششیں زیادہ کامیاب رہی ہیں، مایوسی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔پاکستان میں اسلامی قانون سازی، اسلامی معاشی نظام کی تشکیل، دستور سازی اور تعلیم کے میدان میں اسلامی نقطہ نظر سے خاصا کام ہوا ہے۔تاہم دیگر اسلامی ممالک کے مقابلے میں تعلیم کے باب میں سعودی عرب میں نسبتاً زیادہ بہتر اور دیرپا کام ہوا ہے۔ایران میں اسلامی اقتصادیات کے

بارے میں، سوڈان میں معاشیات اور بینکاری کے بارے میں اور ملائیشیا میں اسلامی بینکاری اور انشورنس (تکافل) کے بارے میں قابل قدر کام ہوا ہے اور یہ مما لک ان معاملات میں دوسروں سے آگے ہیں۔

اگر امت کے افراد میں جذبہ اور خلوص موجود ہو تو اسلامی ریاست وجود میں آ کر رہے گی۔ اس کے لئے محض سیاسی میدان میں کام کرنا ہی کافی نہیں۔ اصل ضرورت تعلیم، رائے عامہ کی بیداری، مسلم ذہن کی تشکیل اور کردار سازی کے میدانوں میں کام کرنے کی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام کسی ایک فرد یا جماعت کے کرنے کا نہیں، بلکہ یہ پوری قوم کے کرنے کا کام ہے۔ پوری قوم کے دانش ور، معلمین، اخبار نویس، مصنفین، ادیب اور سیاسی قائد سب مل کر اس کام کو کریں گے تو یہ کام ہو گا۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: اسلامی ریاست اور مسلم سٹیٹ میں کیا فرق ہے؟

جواب: اسلامی ریاست تو وہی ہے جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ مسلم سٹیٹ کا اس کے علاوہ کوئی تصور اگر آپ کے ذہن میں ہے تو وہ کیا ہے۔ بہر حال مسلم سٹیٹ سے مراد وہ ریاست ہو سکتی ہے کہ جس کے قوانین کا ڈھانچا وہ نہ ہو جو ایک خالص اسلامی سٹیٹ کا ہوتا ہے، باوجود اس کے کہ عوام کی اکثریت اور حکمران دونوں مسلمان ہوں۔ اس تعریف کی رو سے آج کے دور کی مسلمان ریاستیں، مسلمان ریاستیں تو ہیں لیکن شاید ان کو اسلامی ریاستیں نہیں کہا جا سکتا، اس لیے کہ ان میں سے بیش تر اسلامی ریاست کے مذکورہ بالا تصور کو پورا نہیں کرتیں۔ (اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: آپ نے اسلامی ریاست کا ڈھانچا جس انداز میں بیان کیا وہ نہایت مکمل تھا اور جامع بھی۔ سوال یہ ہے کہ کیا خلافت راشدہ کے بعد بنوامیہ میں عمر بن عبدالعزیز اور سپین میں ہشام بن عبدالرحمٰن کے علاوہ کسی اور حکمران نے اس اسلامی سٹیٹ کی روح کو باقی رکھا؟ اور کیا خلافت راشدہ کے بعد کسی مسلم حکمران کے دور کو اسلامی ریاست کہہ سکتے ہیں؟

جواب: میرے خیال میں اسلامی ریاست کوئی تصوراتی ریاست نہیں ہے جو محض تصورات کی دنیا میں وجود رکھتی ہو اور حقائق کی دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ میں نے ان گفتگوؤں میں تاریخ کے بہت سے واقعات سے مثالیں دے کر عرض کیا ہے کہ اسلامی ریاست ایک واقعی اور تاریخی حقیقت ہے۔ میں مختصر طور پر اس کی وضاحت کر چکا ہوں کہ اسلامی ریاست رسول ﷺ نے کیسے قائم فرمائی، صحابہ کرامؓ نے اس کی توسیع کی اور ایک طویل عرصے تک اس کے بعد مسلمانوں نے اس کو کیسے چلایا۔ اس پورے دور میں اسلامی ریاست کے اجزائے ترکیبی اور بنیادی خصائص وہی رہے جو قرآن نے بیان کیے ہیں، یعنی اسلامی نظریے کی بالادستی، اس کا بین الاقوامی کردار، اندرونی معاملات میں اس کا طرز عمل اور افراد امت کے حقوق کا تحفظ وغیرہ۔ یہ سب کچھ اس تعلیم اور قانون کے مطابق جاری رہا جو قرآن اور صاحب قرآن نے عطا فرمایا تھا اور قائم کر کے دکھایا تھا۔ مسلمان حکمرانوں کے دور میں غیر مسلموں کے حقوق کا تحفظ بھی تھا اور انسانیت پھلتی پھولتی تھی۔ آج کے غیر مسلم بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہودیوں کو عباسیوں اور امویوں کے دور میں جو تحفظ حاصل رہا اس سے قبل کبھی بھی اپنے یا غیروں کے دور میں نہ رہا تھا۔ اگر ان لاتعداد مسلمان حکمرانوں میں سے چند کا کردار کسی کو قابل اعتراض دکھائی دیتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان برے حکمرانوں کے دور میں اسلامی ریاست اپنے بنیادی اصولوں سے ہٹ گئی تھی۔

دراصل جب کسی فرد یا معاشرے میں انحطاط آتا ہے تو اکثر و بیشتر اس انحطاط کے نقطہ آغاز کا تعین نہیں ہو پاتا۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ ایک شخص بڑا اچھا مسلمان ہوتا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد اس کے کردار میں تبدیلی آ جاتی ہے اور وہ اتنا اچھا مسلمان نہیں رہتا۔ لیکن یہ تبدیلی کب شروع ہوئی اس کا تعین بہت مشکل ہوتا ہے۔ یہی کیفیت ریاست پر بھی صادق آتی ہے۔ بعض ریاستیں اچھی مسلمان ہوتی ہیں اور بعض ریاستیں اتنی اچھی مسلمان نہیں ہوتیں۔ اسی طرح ایک ریاست کا ایک دور قابل فخر ہوتا ہے اور دوسرا دور اتنا قابل فخر نہیں ہوتا۔ اور یہ بتدیلی ریاست کے حکمرانوں اور دوسرے قائدین کے کردار کی وجہ سے ظہور میں آتی ہے جو اس دور میں برسر اقتدار یا بااثر ہوتے ہیں۔ اگر قائدین اچھے ہوں تو ان کے دور میں ریاست کا کردار بھی قابل تعریف ہوتا ہے اور اگر قائد اچھے مسلمان نہ ہوں تو ریاست کی مجموعی حیثیت بھی متاثر ہوتی ہے۔ اس لئے یہاں افراد کے کردار کو دیکھنے کے بجائے بنیادی طور پر دیکھا یہ ہوتا ہے کہ ریاست اپنے اصلی اور اساسی تصورات و کردار سے تو نہیں ہٹی۔ اگر

اپنے ان تصورات سے ریاست نے انحراف کیا ہے تو اس کی بنیادی وجوہ کیا ہیں۔

چنانچہ عام طور پر مسلمان فقہا اور مصنفین نے اس بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ریاست کے بگاڑ کے تین درجے ہوتے ہیں: ایک درجہ یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ ریاست کو چلا رہے ہیں انہوں نے اقتدار و حکومت کو اس طریقے سے حاصل نہ کیا ہو جو اسلام میں جائز طریقہ ہے، یعنی مسلمانوں کے اہل الرائے حضرات کی رضامندی اور بیعت سے، بلکہ وہ کسی ایسے طریقے سے برسر اقتدار آ گئے ہوں جو قابل اعتراض ہے۔ لیکن اس کے باوجود ریاست کے مقاصد وہی رہیں، ریاست کا قانون و دستور بھی اسلامی رہے، اور سوائے اس کے کہ بعض حکمرانوں نے بعض قوانین کو نظر انداز کر کے اقتدار بزور اپنے ہاتھ میں لے لیا ہو اور کوئی بڑی تبدیلی واقع نہ ہوئی ہو۔ یہ صورت حال ایسی ہے جس کو آپ جزوی بگاڑ کہہ سکتے ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک شخص مسلمان ہے، اسلام کو مانتا ہے لیکن اس سے کسی وقت اسلام کے حکم کی خلاف ورزی ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے ایسے شخص کو فاسق و فاجر کا طعنہ دے کر مطعون کرنے سے کام نہ چلے گا۔ صحیح اسلامی رویہ یہ ہوگا کہ اس کو طعنے دینے کے بجائے سمجھایا جائے اور تعلیم و تزکیے کے ذریعے راغب کیا جائے اور کوشش یہی کی جائے کہ جس حکم الٰہی کی اس سے خلاف ورزی سرزد ہوئی ہے آئندہ وہ اس سے باز رہے اور مزید خلاف ورزی نہ کرے۔

بگاڑ کی دوسری صورت یا بگاڑ کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ فرد یا حکمران جس راستے سے اقتدار میں آیا ہے وہ راستہ بھی قابل اعتراض تھا اور وہ شخص حکمرانی کا اہل بھی نہ تھا، لیکن حصول اقتدار کے بعد اس نے ریاست کے بنیادی اسلامی کردار اور معاشرے کے اساسی اسلامی ڈھانچے کو برقرار رکھا ہو اور اگر کہیں اسلام کے اور شریعت کے بعض احکام کی خلاف ورزی کی بھی ہو تو یہ خلاف ورزی ریاست کے بنیادی اصولوں یا شریعت کے عمومی مزاج کو مجروح نہ کرتی ہو۔

آخری درجہ بگاڑ کا یہ ہے کہ سیاسی اور ریاستی معاملات میں شریعت کے عمومی کردار ہی کا انکار کر دیا جائے اور ریاست کے اسلامی کردار ہی کو تسلیم نہ کیا جائے، اسلامی قوانین کی بنیادوں ہی کے ڈھانے کا عمل شروع کر دیا جائے۔ حضرت حسین بن علیؓ یا حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا جہاں تک معاملہ ہے، اس سلسلے میں میری ناچیز رائے یہ ہے (اور ہو سکتا ہے کہ آپ میری رائے سے اختلاف کریں) کہ ان دونوں جلیل القدر شخصیتوں کے دور میں جو تبدیلی رونما ہوئی تھی وہ جزوی بگاڑ تھا اور صرف پہلے درجے کا تھا۔ ان کے دور میں عدالتوں کا نظام قانون شریعت کے مطابق تھا، ریاست کا رائج الوقت دستور شریعت کے مطابق تھا، عدالتیں بھی اسلاف کے طریقوں کے مطابق کام کر رہی تھیں، قاضی صاحبان تک تقریباً وہی کام کر رہے تھے جو خلافت راشدہ کے دور سے چلے آ رہے تھے۔ صدقات اور ٹیکس وصول کرنے کے نظام میں کوئی فرق نہ پڑا تھا، لیکن حکمران وقت ایک ایسے طریقے سے حکومت میں آ گیا تھا جو ان محترم شخصیات کی نظر میں قابل اعتراض تھا۔ ان حضرات نے محسوس کیا کہ آج صحابہ کرامؓ کے جیتے جی انتخاب کے اس طریقے کو اگر تسلیم کر لیا جائے تو آئندہ کے لئے اس طریقے کو اسلامی طریقہ سمجھ لیا جائے گا، اس لئے انہوں نے اس طریقے سے اختلاف کیا اور اس کے خلاف نہ صرف آواز اٹھائی بلکہ تلوار لے کر میدان میں نکلے، صحابہؓ میں سے کچھ اور حضرات ایسے تھے جن کا مرتبہ ان حضرات سے کسی طرح کم نہ تھا، انہوں نے یہ محسوس کیا کہ یقیناً یہ ایک انحراف تو ہے اور شریعت کے ایک حکم کی خلاف ورزی تو ہے، لیکن یہ خلاف ورزی اتنی بڑی نہیں ہے کہ اس کو بنیاد بنا کر تلوار اٹھا لی جائے اور مسلمانوں کو حکمرانوں کے خلاف صف آرا کر دیا جائے۔ یہ حالات کو سمجھنے میں اختلاف تھا، یہ رائے اور اندازے کا تفاوت تھا، دونوں آرا اپنی اپنی جگہ قابل احترام ہیں۔ میری ناچیز تحقیق یہ ہے کہ اس دور کے اکابر (صحابہ و تابعین) کی غالب اکثریت نے دوسری رائے کا احترام کیا، جن کے نمائندہ حضرات میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی شامل تھے، جنہوں نے یہ کہا کہ ہم نے چونکہ ایک بار بیعت کر لی ہے، لہٰذا ہم اس کی پابندی کریں گے اور جہاں تک جزوی بگاڑ یا احکام الٰہی کی خلاف ورزی کا تعلق ہے اس کو ہم وعظ و نصیحت سے دور کرنے کی کوشش کریں گے اور اس کے خلاف تلوار نہیں اٹھائیں گے۔ ان حضرات کی یہ رائے غالباً اس لئے تھی کہ اگر جزوی انحراف پر تلوار اٹھانے کا طریقہ قائم ہو جاتا تو آئندہ آنے والے ادوار میں کوئی مسلم ریاست اطمینان سے کاروبار سلطنت کو انجام نہ دے سکتی اور امت اسلامیہ کے ان مقاصد کی خدمت نہ کر سکتی جن کے لئے ریاست وجود میں آئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ آنے والے دور میں مسلمان کمزور ہو کر رہ جاتے۔

ان دونوں آرا میں بلاشبہ بڑا وزن ہے۔ اب یہ وقت نہیں ہے کہ ہم یہ بحث چھیڑیں کہ ان میں سے کس رائے میں زیادہ وزن تھا اور کس رائے میں زیادہ وزن نہیں تھا، دونوں شخصیتوں کی اپنی اپنی آرا تھیں، دونوں اللہ کے ہاں پہنچ گئے، خلوص نیت کا اجر دونوں گروپ پائیں گے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ رائے قائم کرنے میں خلوص نیت کے باوجود غلطی ہو جائے تو اجر پھر بھی ملتا ہے۔۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: صحابہ کرام کے دور میں تبلیغ اسلام کے لئے تلوار کا سہارا لیا گیا۔ یہ بات کس حد تک درست ہے؟

جواب: میں اس نقطہ نظر کا قطعی طور پر حامی نہیں۔ میں پوری وضاحت سے اس کی تردید کروں گا کہ صحابہ کرام نے اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا تھا۔ اسلام کی ریاست جب معرض وجود میں آئی جب آپؐ نے اس ریاست کے قیام کے لئے تیرہ سال مکہ میں تبلیغ فرمائی۔ اور اسی تبلیغ کے نتیجے میں مدینے کے لوگ بھی مسلمان ہوئے۔ پھر اس کے بعد مدینے کی اسلامی ریاست وجود میں آئی۔ اس کے لئے دیگر اقوام کے ساتھ ''میثاق مدینہ'' ہوا۔ اس وقت تک کسی کا خون نہیں بہا۔ خون اس وقت بہا جب باہر سے ایک طاقتور دشمن نے حملہ کیا۔ سردار مکہ ابوجہل تین سو آدمیوں کے ساتھ ہجرت کے چند ہی ماہ بعد مدینہ منورہ پر حملہ آور ہوا۔ مسلمانوں نے حضرت امیر حمزہ شیر خدا کی سربراہی میں اس کو روکا۔ پھر ایسے متعدد حملے ہوئے۔ بالآخر مکہ کے ایک سردار کرز بن جابر الفہری نے مدینے کے باہر ڈاکہ ڈالا۔ دو صحابہ کو شہید کیا اور بیت المال کے اونٹ لے کر فرار ہو گیا۔ اس کی گرفت کے لئے حضورﷺ نے چند صحابہ کا ایک دستہ بھیجا جس کے سربراہ خود حضورﷺ تھے۔ اور اس وقت پہلی مرتبہ کفار مکہ کی طرف سے خون بہانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ لیکن اس کے بعد پھر جلد ہی چند معرکوں کے بعد صلح حدیبیہ ہو گئی۔ اس کے بعد رسول اللہﷺ نے دنیا کے فرمان رواؤں کو تبلیغی خطوط لکھے تو آپ نے قیصر روم کے باج گزار عیسائی حکمران شرحبیل بن عمرو کو بھی خط لکھا۔ لیکن بصرہ کے حاکم نے آپ کے سفیر حضرت حارث بن عمیرؓ کو شہید کر دیا۔ سفیر کا قتل ایک ایسا جرم تھا جو اس دور کے قانون بین الاقوام کے مطابق بھی ممنوع تھا۔ کوئی بھی غیرت مند حکمران اپنے سفیر کا قتل برداشت نہ کر سکتا تھا۔ آپ نے اس کے خلاف حضرت خالد بن ولیدؓ اور حضرت زیدؓ بن حارثہ کی سرپرستی میں ایک دستہ بھیجا، جس کا مقصد قصاص کا مطالبہ تھا، لیکن یہ دستہ دشمن کی بہت بڑی فوج سے معرکے کے بعد واپس آ گیا۔ اس کے بعد غزوہ تبوک ہوا۔ ظاہر ہے کہ ان سب کا مقصد بڑھتی ہوئی جارحیت کو روکنا تھا۔ جب رسول اللہﷺ کا انتقال ہو گیا اور دور دراز کے علاقوں میں عیسائیوں، یہودیوں اور مشرکین عرب کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے بغاوتیں ہوئیں تو ان کے خلاف ایکشن کے لئے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فوجیں بھیجیں۔ جس سے یہ سلسلہ چلا جو حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں بھی جاری رہا۔ اس سلسلے میں حضرت عمرؓ کا قول طبری نے نقل کیا ہے کہ کاش ہمارے اور رومیوں کے درمیان آگ کا ایک ایسا سمندر حائل ہو جائے کہ نہ وہ آدھر آ سکیں اور نہ ہم ادھر جا سکیں۔ ایک طاقتور مسلم حکمران کا یہ قول واضح طور پر ثابت کرتا ہے کہ مسلمانوں کے مزاج میں جارحیت نہیں تھی، بلکہ جارحیت کے خلاف دفاع تھا۔ اور ظاہر ہے کہ جب جنگ شروع ہو جائے تو جنگ کو یک طرفہ طور پر ختم کرنے کا مطلب قومی خودکشی ہے جو کوئی قوم بھی نہیں کر سکتی۔ دور خلافت راشدہ سے لے کر بعد کی کئی صدیوں میں مسلمانوں کی عسکری قوت اتنی تھی کہ وہ آرام سے یورپ میں داخل ہو سکیں۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ پھر جن علاقوں کو مسلمانوں نے فتح کیا وہاں صدیوں غیر مسلموں کی اکثریت رہی۔ اگر اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا جاتا تو مسلم مفتوحہ علاقوں میں یہ اکثریت اقلیت کی صورت میں بھی نظر نہ آتی۔ ہندوستان میں ہزار سال مسلمانوں کی حکومت رہی۔ لیکن ہندوؤں کو اپنی رعایا سمجھ کر ان کے حقوق کا تحفظ کیا گیا۔ دہلی جو آٹھ سو سال مسلمانوں کا دارالحکومت رہا، جہاں سے سارے ہندوستان پر حکومت کی گئی اس شہر میں مسلمان ۱۲ فیصد تھے۔ حیدر آباد دکن میں جہاں پانچ سو سال مسلمانوں کی حکمرانی رہی وہاں مسلمان ۱۵ فیصد سے زیادہ نہ تھے۔ اگر مسلمان تلوار چلاتے تو یہاں آج کوئی ہندو نظر نہ آتا۔ انڈونیشیا، ملائیشیا میں تو مسلمانوں نے کبھی تلوار نہیں چلائی۔ وہاں مسلمان واضح اکثریت میں کیوں دکھائی دیتے ہیں۔ چین اور افریقا میں مسلمانوں نے کبھی تلوار نہیں چلائی، وہاں مسلمان کبھی فاتح کے طور پر نہیں گئے۔ لیکن وہاں کروڑوں کی تعداد میں مسلمان موجود ہیں۔ آج امریکا میں مسلمان ہیں۔ برطانیہ اور فرانس میں لاکھوں کی تعداد میں مسلمان ہیں۔ کیا وہاں بھی مسلمانوں نے تلوار چلائی تھی۔ فرانس کے سابق صدر متراں کا انٹرویو میں نے پڑھا تھا۔ مسلمانوں کا ایک وفد ان سے ملنے گیا جس میں ڈاکٹر معروف دوالیبی بھی شامل تھے۔ جس میں صدر متراں نے کہا: آج آپ فرانس میں مسلمانوں کے لئے مراعات مانگنے کے لئے میرے پاس آئے ہیں۔ ممکن ہے اکیسویں صدی کے اندر میں یا میرے ہم مسلک لوگ یہاں فرانس میں عیسائیوں کے لئے مراعات مانگنے آپ کے پاس آئیں اور آپ یہاں کے حکمران ہوں''۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: آپ نے بیان فرمایا کہ دور جدید کے قانون کا ماخذ رومن ایمپائر کا قانون ہے۔ اگر یہی بات ہے تو نیو ورلڈ آرڈر کے معنی کیا ہیں؟ جواب عنایت فرمائیں گے؟ شکریہ۔

جواب: جس چیز کو آج نیو ورلڈ آرڈر قرار دیا جاتا ہے وہ کوئی قانون نہیں ہے، وہ بین الاقوامی قانون کی کوئی نئی تعبیر یا اس کی دفعات نہیں ہیں، بلکہ اس سے مراد دنیا کی آئندہ سیاسی صورت حال کے بارے میں آج کی بالا دست قوتوں کی سوچ کا ایک انداز ہے۔ آج کی طاقتور قوتیں مستقبل میں دنیا کو جس طرح چلانا چاہتی ہیں اس کا نام ورلڈ آرڈر ہے۔ اس نئے مستقبل کے عالمی نظام میں سکہ کس کا چلے گا؟ بات کس کی سنی جائے گی؟ کون بے عزت ہو کر رہے گا اور کون باعزت ہو کر رہے گا؟ ان سب چیزوں کا وہ ایک نیا نقشہ ترتیب دے رہے ہیں۔ ماضی میں بھی ایسی کوششیں ہو چکی ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد دنیا کے چند بڑوں نے دنیا کا ایک نقشہ بنایا تھا اور اس نقشے کے مطابق دنیائے اسلام کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ یہ نظام سلطنت برطانیہ نے ترتیب دیا تھا۔ اسی طرح دوسری جنگ عظیم کے بعد پھر ایک نیا نقشہ بنایا گیا۔ وہ بھی ایک ورلڈ آرڈر تھا۔ وہ نقشہ اب بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ اب امریکا اور اس کے حامی مل کر ایک نیا نقشہ اپنی بالا دستی کی بقا کے لئے ترتیب دے رہے ہیں۔ امریکا، برطانیہ اور فرانس مل کر پوری دنیا کو بالعموم اور مسلم دنیا کو بالخصوص اپنی مرضی کے مطابق چلانا چاہتے ہیں۔ یہی نیو ورلڈ آرڈر ہے۔ مسلم دنیا کے بارے میں ان کا فارمولا یہ ہے کہ دنیائے اسلام میں کوئی ایسی آزاد مملکت قائم نہ ہونے دی جائے جس کے پاس اس کی اپنی آزادانہ طاقت ہو۔ دنیائے اسلام میں کوئی ایسی حکومت نہ رہنا چاہئے جو مذہب کی بنیاد پر قائم ہو اور اسلامی دنیا کو مذہب کی بنیاد پر اکھٹے کر سکے۔ دنیائے اسلام کو کوئی ایسی ٹیکنالوجی فراہم نہ کی جائے کہ جس کے بل بوتے پر وہ جرمنی، جاپان، سوئٹزرلینڈ کی طرح آزاد، طاقت ور اور خوش حال ہو سکیں۔ دنیائے اسلام میں ایسے عناصر کو ختم کر دیا جائے جو کسی وقت بھی ان بڑوں کے حکم کی خلاف ورزی کر سکیں۔ دنیائے اسلام میں مضبوط اور کثیر تعداد میں کوئی فوجی قوت باقی نہ رہنے دی جائے جس سے کام لے کر کوئی مسلم ملک اپنی آزاد پالیسی بنا اور چلا سکے۔ یہ ہے نیو ورلڈ آرڈر کا تصور! اس پر عمل ہو رہا ہے۔ عالم اسلام کے بعض ممالک جو جغرافیائی طور پر بڑے ہیں وہ اس ورلڈ آرڈر کے لئے خطرہ بن سکتے ہیں۔ اس لئے ان کا بٹوارا کیا جائے گا۔ جن ممالک کے پاس ٹیکنالوجی یا تیل کی قوت ہے ان کی دولت کو کسی نہ کسی طرح بے اثر یا تباہ کر دیا جائے گا اور انہیں ایسے سیاسی خلفشار سے دوچار کر دیا جائے گا کہ وہ اپنی بقا کی جدوجہد ہی میں مصروف رہیں۔ ایسے ممالک جن میں ان بڑی طاقتوں کی فوجیں موجود ہیں اگرچہ وہ ممالک مکمل طور پر ان کے ساتھ ہیں، لیکن ان کو اتنا طاقتور نہیں ہونے دیا جائے گا کہ وہ کسی وقت ان بڑوں کے لئے ہی خطرہ بن جائیں۔ اسی کے ساتھ مسلمانوں کے اندرونی اختلافات کو بڑھا کر مسلم معاشروں کو تباہ کیا جا رہا ہے۔ جیسے پاکستان میں شیعہ سنی اختلافات ہمارے سامنے ہیں۔ یہ ملک کو مستقبل میں کمزور کرنے کے لئے ہیں۔ اگر خدانخواستہ یہ اختلافات کی آگ آگے بڑھتی ہے تو اس کے اثرات یہاں سے آگے دوسرے مسلم ممالک میں پھیلائے جاسکتے ہیں۔ مصر، افغانستان، سعودی عرب سب اس کی زد میں آسکتے ہیں۔ اس سلسلے میں مسلم معاشروں میں موجود عناصر کو ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ کبھی کسی کے مذہبی جذبات کو بلیک میل کر کے، کبھی کسی کی انا کو ابھار کر، کبھی کسی کو روپے کے بل بوتے پر۔ میں کسی ایک فرقے یا مسلک کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتا۔ میں مسلم معاشروں کا عمومی جائزہ پیش کر رہا ہوں۔ اس لئے کہ میرے لئے سب قابل احترام ہیں۔ غرضیکہ غیر مسلم دنیا کے عزائم کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلم دنیا میں کوئی ہلچل سرے سے موجود نہیں ہے۔ یہی اس ورلڈ آرڈر کی تعمیل و تکمیل ہے۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: جناب! آپ نے کہا کہ دنیا کی ہر قوم نے اپنے قانون کو بہتر سمجھا۔ آخر کیوں؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ اسلام کے نفاذ قانون میں inner sanction کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس کی چند مثالیں بیان فرما دیجئے تاکہ بات زیادہ وضاحت سے سمجھی جا سکے۔

جواب: جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ دنیا کی ہر قوم اپنے قانون کو بہتر کیوں سمجھتی ہے؟ اس کا جواب تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ احساس برتری ہر قوم میں پایا جاتا ہے، کم و بیش شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ انسان جس چیز کا علم رکھتا ہے اس کو بہتر جانتا ہے اور جس کا علم نہیں رکھتا اس کو کمتر سمجھتا ہے۔ چونکہ ہر قوم اپنے قانون سے پوری طرح واقف ہوتی ہے اور دوسرے قوانین سے اس کی واقفیت اس درجے کی نہیں ہوتی، اس لئے وہ اپنے قانون کو ہی بہتر اور برتر قرار دیتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ احساس تفاخر اس نفسیاتی مسئلے کی بنا پر ہو۔

جہاں تک اس سوال کے جواب کا تعلق ہے کہ اسلامی قانون میں inner sanction پایا جاتا ہے اور Outer sanction کم ہے یا نہیں ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ inner sanction کے ساتھ ساتھ Outer sanction بھی ہر معاشرے میں موجود ہوتا ہے۔ اسلامی ریاست جب قائم ہوتی ہے تو اس میں عدالتیں، پولیس، سزائیں یعنی نفاذ قانون کے پورے عناصر موجود ہوتے ہیں۔ نفاذ قانون کے یہ عناصر ظاہر ہے کہ صرف نماز، روزے کے قیام کے لئے نہیں

ہوتے، بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں اسلامی قانون کی پابندی کے لئے ہوتے ہیں، خواہ وہ ملک کے اندرونی قوانین کی پابندی کا مسئلہ ہو، یا بیرونی معاملات میں، یعنی عالمی سطح پر قانون کی پابندی کا مسئلہ ہو۔ سورہ انفال اور سورہ توبہ میں زیادہ تر اسلامی بین الاقوامی قانون کے احکام بیان ہوئے ہیں جو اسی طرح واجب التعمیل ہیں جس طرح قرآن پاک کے دیگر احکام واجب التعمیل ہیں۔ اب اگر کوئی حاکم یا فرد یا اسلامی مملکت کا کوئی افسران بیان کردہ احکام کی خلاف ورزی کرے گا تو یہ خلاف ورزی محض ملکی قانون کے احکام کی نہیں بلکہ قرآن کے ایک حصے کی ہوگی۔ اور ظاہر ہے کہ جس طرح نماز نہ پڑھنے والا قرآن کے ایک حکم کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے اسی طرح قانون بین الاقوام کی خلاف ورزی کرنے والا بھی قرآن کے ایک حصے (انفال وتوبہ) کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے۔ میں اپنی بات پھر دہراتا ہوں کہ عالمی اور بین الاقوامی سطح کے قوانین کے پیچھے کوئی قوت نافذہ ہے یا نہیں؟ مسلمانوں کے ہاں یہ سوال کبھی پیدا نہیں ہوا۔ جو قوت میونسپل لا کی پابندی کراتی ہے۔ وہی قوت بین الاقوامی قوانین کی بھی پابندی کراتی ہے۔ ۱۹۴۸ء میں اقوام متحدہ نے جو چارٹر قوانین کا بیان کیا تھا۔ اس پر آج تک عمل درآمد نہیں ہوا۔ کشمیر، بوسنیا، چیچنیا کے معاملات کو دیکھ لیجئے۔ البانیہ کا مسئلہ ہو یا صومالیہ وعراق کا معاملہ، کہیں بھی اقوام متحدہ اپنے قانون پر عمل درآمد نہیں کرا سکتی۔ اس کی وجوہات میں اوپر بیان کر آیا ہوں۔ جب کہ اسلام میں ایسا نہیں ہوا ہے۔ مسلم حکمرانوں نے اپنے ضمیر کی آواز inner sanction پر عالمی سطح پر بھی قوانین نافذ کیے ہیں۔ اور یہی وہ بنیادی چیز ہے جو یورپ میں نفاذ قانون کے سلسلے میں موجود نہیں ہے۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: نفاذ قانون کے لئے قوت جابرانہ کی ضرورت کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ عالمی سطح پر نفاذ قانون بھی ظاہر ہے کہ مسلم حکمرانوں کے ذریعے ہی ہوگا تو کیا اس طرح اسلام کا نقطہ نظر جارحانہ تو نہیں ہو جاتا۔ جب کہ قرآن بھی کہتا ہے: **هو الذی ارسل رسوله بالهدی ودین الحق لیظهره علی الدین کله ولو کره المشرکون** (التوبہ۹:۳۳)۔

جواب: جزوی طور پر اس سوال کا جواب عرض کیا جا چکا ہے۔ لیکن مزید وضاحت کے لئے عرض ہے کہ نہ صرف بین الاقوامی قانون کے بارے میں اسلام کا قانون بلکہ اس کی دونوں اقسام کے قوانین کا نفاذ قوت ہائے نافذہ پر منحصر ہے۔ سب سے پہلے اسلام کا قانون اپنے نفاذ کے لئے جس چیز سے قوت حاصل کرتا ہے وہ مسلمانوں کی رائے عامہ کی قوت ہے یا ان کی inner sanction ہے، خدانخواستہ مسلمانوں کا یہ اجتماعی شعور یا انفرادی ضمیر اگر مر جائے تو کسی طرح بھی قانون پر عمل درآمد نہیں کرایا جا سکتا۔ لیکن آج کے دور میں دنیا کی متمدن اقوام میں بھی آپ دیکھیے کہ قانون کا نفاذ ریاست کی ذمہ داری سے زیادہ عوام کے شعور واحساس سے تعلق رکھتا ہے۔ آج پاکستان میں جو قانون کی خلاف ورزی ہو رہی ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ حالانکہ قوت نافذہ اپنے سارے ساز وسامان اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی صورت میں یہاں موجود ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ عام آدمی کے ضمیر کی قوت inner sanction کمزور پڑ چکی ہے۔ مغرب، یورپ، امریکا کہیں چلے جائیے عام آدمی قانون پر عمل درآمد کو اپنے لئے لازمی سمجھتا ہے اس لئے قانون کی پابندی ہو رہی ہے۔ ریاست کی قوت جابرانہ تو اس صورت میں حرکت میں آتی ہے جب inner sanction کمزور پڑ چکا ہو۔ اگر ایسا ہو جائے تو ریاست کی قوت جابرانہ بھی قانون کی پابندی نہیں کرا سکتی۔ اس لئے ریاست کی طرف سے قوت کے استعمال کا ایک ہدف، ایک حد اور ایک طریقہ ہے۔ دنیا کی تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ عوام نے قانون کی پابندی چھوڑ دی اور ریاست اپنی تمام تر قوت نافذہ کے باوجود اپنے قوانین اور احکام (writ) کو منوانے میں ناکام ہوگئی۔ ابھی شہنشاہ ایران کی مثال دیکھیے۔ اسی طرح ہندوستان میں انگریز کی سلطنت اسی طرح ختم ہوگئی۔ قانون پر عمل درآمد ضمیر کی آواز سے وابستہ ہے۔ ضمیر کی آواز ہے تو قانون ہے، ورنہ نہیں۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: جناب ڈاکٹر صاحب! یورپ میں ہر قانون کی بنیاد معاشرتی رسوم ورواج کو مانا جاتا ہے۔ لیکن برطانیہ کا مشہور قانون دان پیٹن Paton یہ کہتا ہے کہ:

The Orthodox natural law theory based on absolutes of the revealed truths of religion.

کیا یہ رائے صرف پیٹن کی ہے یا وہاں کے قانون دانوں کی اکثریت یہی کہتی ہے۔ اگر ایسا ہے تو کیا یہ اسلام کے اثرات کا نتیجہ ہے؟ شکریہ

جواب: جہاں تک پیٹن کی اس رائے کا تعلق ہے میں نہیں سمجھتا کہ اس نے اسلام کے اصول قانون سے متاثر ہو کر یہ بات کہی ہوگی۔ اس لئے کہ اس نے جو کچھ کہا یہ

یورپ کے تمام نظریاتی گروہوں کی طرف سے نہیں بلکہ صرف آرتھوڈوکس مکتب فکر کی بات کی ہے اور ان کے ہاں قانون کی بنیاد بلاشبہ مذہب ہی ہے۔ لیکن اس کے برعکس دیگر رائج الوقت مکاتب فکر نہ یہ رائے رکھتے ہیں اور نہ ہی ان کا یہ مسلک ہے۔ اگرچہ اسلام کے اصول قانون کا مغرب کے قانونی افکار پر خاصا اثر ہے، اس کے علاوہ فرانس کے اصول قانون کی یورپ نے بڑا عرصہ نقالی کی ہے، خصوصاً قانون کا وہ ضابطہ جو نپولین کے دور سے نافذ تھا، اس کے بارے میں بعض معاصر علما نے لکھا ہے کہ وہ امام مالکؒ کی کتاب **المدونۃ الکبریٰ** سے ماخوذ ہے جو امام سحنون کی تصنیف ہے۔ اس کی بنیاد پر افریقا، سپین، پرتگال وغیرہ میں غیر مسلم دنیا نے قانون سازی کی ہے۔ پھر سپین کے علمی ماحول نے فرانس کو بہت متاثر کیا ہے۔ اس سلسلے میں کئی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ جس میں ایک نمایاں مثال انگلستان کے نظام عدالت کی دی جاسکتی ہے جس میں دو متحارب فریق برابر کی سطح پر عدالت کے سامنے پیش ہوتے ہیں، اور عدالت ثالث کی حیثیت سے ان کا موقف سن کر فیصلہ کرتی ہے۔ یہ چیز دیوانی مقدمات میں اسلام کے قانون عدالت کا حصہ ہے۔ اس کے برعکس فوجداری مقدمات میں فرانس کا احتسابی inqueisitorial نظام ہے جو بلاشبہ فقہائے اسلام کے مرتب کردہ دیوانی جرائم کے احکام کی بازگشت ہے۔ بہرحال یورپ اور خصوصاً فرانس اگرچہ اسلام کے اصول قانون سے متاثر ہوئے ہیں، میں نہیں سمجھتا کہ پیٹن کی مذکورہ بالا رائے اسلامی قانون کے مطالعے کا نتیجہ ہے۔ ایک قدیم مصری مصنف نے آج سے نوے سال پہلے ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام تھا "**المقارنات والقابلات**" جس میں انہوں نے **المدونۃ** اور فرانس کے سول کوڈ کا موازنہ کر کے بتایا تھا کہ **المدونۃ** نے براہ راست یورپ کے نظام قانون کو متاثر کیا ہے۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ متعدد مغربی زبانوں میں قانون اور نظام حکومت سے متعلق بہت سی اصطلاحات عربی الاصل ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جسٹس کا لفظ خود عربی الاصل ہے اگرچہ بعض حضرات نے اسے رومی الاصل قرار دیا ہے، لیکن اسے رومی الاصل قرار دینا کمزور ہے۔ اس لئے کہ یہ لفظ عربی "**قسط**" سے ماخوذ ہے جو قرآن پاک میں استعمال ہوا ہے۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: آپ نے سیکولرازم کے جزوی فوائد کا ذکر کیا ہے۔ ذرا ان فوائد کی وضاحت فرما دیں۔

جواب: اگر آپ نے قرون وسطیٰ کی مسیحی تاریخ کا مطالعہ کیا ہو اور عیسائیوں کے ہاں مذہبی باز پرسی (inquisition) کی تاریخ پڑھی ہو، جس میں کئی سو سال تک نسل انسانی کو مذہب کے نام پر تشدد کا نشانہ بنایا گیا، ہزاروں افراد کو زندہ جلایا گیا، لاکھوں انسانوں کو بے گھر کیا گیا اور قوموں کو جبراً ان کے مذہب، ثقافت اور شناخت سے محروم کیا گیا اور لوگوں کے عقائد اور ذاتی کردار کے بارے میں ایسے ایسے سوالات اٹھانے کا چرچ کو حق دے دیا گیا جن کے معاملے میں وہ صرف اللہ کے سامنے جواب دہ تھے، تو آپ کو بخوبی اندازہ ہوگا کہ سیکولرازم یورپ میں کیسے آیا اور کیوں آج کا یورپ سیکولرازم کو ایک بڑی نعمت اور ایک قیمتی دریافت بلکہ نسل انسانی کی ایک مشترکہ میراث سمجھتا ہے۔ سیکولرازم نے یورپ کو پادریوں کے جبر سے نجات دلائی اور مذہب کے نام پر مفاد پرست طبقے کی اجارہ داری کو ختم کیا۔

یورپ کا سیکولرازم دراصل انکویزیشن (مذہبی باز پرس) کی اس ہولناک تحریک کا ردعمل تھا جو یورپ میں بالعموم اور اسپین میں بالخصوص دو سو سال جاری رہی۔ اس تحریک کے ہاتھوں نسل انسانی پر مذہب کے مقدس پردے میں جو مظالم روا رکھے گئے، آج ان کے تصور سے انسانوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے اندلس کے شہروں قرطبہ، غرناطہ اور اشبیلیہ میں وہ مقامات دیکھے ہیں جہاں سال ہا سال آگ دہکتی رہی اور مسلمانوں کو اس میں جلایا جاتا رہا۔ ان شہروں میں ایسی سڑکیں، چوراہے اور مقامات موجود ہیں جن کے نام عربی لفظ محرقہ (آتش کدہ) سے ماخوذ ہیں۔ ان جگہوں پر آگ دہکتی رہتی تھی اور مذہبی باز پرس کے نتیجے میں جس مسلمان کو سزائے موت دینا مقصود ہوتا اسے وہاں لاکر زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ اندلس کے بعض مقامی مسلمانوں نے بتایا کہ بعض جگہ یہ آگ سو سو سال ڈیڑھ ڈیڑھ سو سال دہکتی رہی اور جس شخص کے قبضے سے عربی زبان میں لکھا ہوا کوئی مخطوطہ یا کتاب یا تحریر ملتی تھی یا کوئی شخص کسی عربی تحریر کا احترام کرتا ہوا پایا جاتا تھا اس کو وہاں لاکر جلا دیا جاتا تھا۔ بعض اوقات مسلمانوں کو آزمانے کے لئے قرآن پاک کے اوراق سڑکوں پر بکھیر دیے جاتے تھے اور حکومت کے خفیہ کارندے نگرانی کرتے رہتے تھے کہ کون شخص بچ بچ کر چل رہا ہے اور ان اوراق کو پاؤں میں روندنے سے مجتنب ہے۔ جوں ہی کوئی ایسا شخص ملتا زندہ نذر آتش کر دیا جاتا۔ ان محرقاؤں میں زندہ انسانوں کے علاوہ لاکھوں کی تعداد میں کتابیں بھی جلائی گئیں۔

اس سے یہ نہ سمجھئے گا کہ یہ ظلم محض مسلمانوں ہی کے ساتھ ہوا۔ خود عیسائیوں کے مختلف فرقوں نے ایک دوسرے کے ساتھ یہی کیا۔ رومن کیتھولک عیسائیوں نے

پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے ساتھ جو جو مظالم روا رکھے وہ مسیحی تاریخ کے طلبہ سے مخفی نہیں ہیں۔ سیکولرازم اسی صورت حال کا فطری ردعمل تھا جس کو لامذہب لوگوں نے مزید ہوا دی اور عامۃ الناس کی ناراضی اور نفرت کو (جو اصلاً کسی ایک فرقے کے مذہبی پادریوں کے خلاف تھی) بڑی چالاکی اور عیاری سے خود مذہب کی طرف موڑ دیا۔ اس چیز سے قطع نظر سیکولرازم کا ایک جزوی مثبت پہلو یہ ہے کہ اس نے اس مذہبی انتہا پسندی کو ختم کر دیا۔

اسلام میں پہلے ہی سے یہ مثبت پہلو موجود ہے۔ اسلام کو کسی سیکولرازم کی ضرورت نہیں۔ اسلام میں 'مزاجاً اور طبعاً' کسی انتہا پسندی کی گنجائش نہیں (بشرطیکہ اسلامی تعلیم مکمل حاصل ہو)۔ اسلامی فقہ میں جیسا کہ آپ نے دیکھا دونوں طرح کے احکام موجود ہیں۔ وہ بھی جو صرف فرد کے کرنے کے ہیں، اور وہ بھی جن میں ریاست کو مداخلت کرنے کا حق ہے۔ آپ نے فقہ کی کتابوں میں پڑھا ہوگا کہ بعض معاملات کا فیصلہ قضاء ہوتا ہے، بعض کا دیانتاً اور بعض کا دونوں اعتبار سے۔ بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں جو صرف اللہ اور بندے کے درمیان ہوتے ہیں، یعنی **فی ما بینہ و بین اللہ**۔ اور بعض معاملات وہ ہوتے ہیں جو آپس میں صرف بندوں کے درمیان ہوتے ہیں **فیما بینہ و بین الناس**۔ آپ فقہ کی کتابیں اٹھا کر دیکھیں تو پتا چلے گا کہ بیسیوں مسائل ایسے ہیں جن کا فیصلہ ایک انسان کو خود کرنا ہوتا ہے اور وہ خالصتاً اللہ کے حضور جواب دہی کا احساس کرتے ہوئے ان کا فیصلہ کرتا ہے اور کسی اور شخص کو ان میں دخل اندازی کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ ایسے نازک شخصی معاملات میں اگر دوسروں کو مداخلت کا حق دے دیا جائے تو اس سے وہی الجھنیں پیدا ہوں گی جو ہندوؤں میں پیدا ہوئیں، عیسائیوں میں پیدا ہوئیں، اور دوسری بہت سی اقوام میں پیدا ہوئیں۔

علامہ اقبالؒ نے خطبہ الٰہ آباد میں اس سوال کا بڑی تفصیل اور بالغ نظری سے جواب دیا ہے کہ اسلام میں کسی لوتھر کے ظہور کی کیوں ضرورت پیش نہیں آئی۔ علامہ اقبال نے فرمایا: اسلام کا مزاج ایسا ہے کہ وہ خود بخود بدلتے ہوئے حالات کو اپنے اندر سموتا رہتا ہے اور اس میں ایسا بڑا اختلاف پیدا ہونے کا امکان ہی نہیں جس کے ردعمل کے طور پر پروٹسٹنٹ انداز کی کوئی تحریک مسلمانوں میں پیدا ہو۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: کیا اسلام میں نظریہ ضرورت کی کوئی گنجائش ہے؟ اگر ہے تو اس کی وضاحت فرمادیں۔

جواب: اسلام میں عدل و انصاف کے کچھ اصول وضوابط مقرر ہیں جس سے کوئی شخص بھی چاہے وہ حکمران ہو، جج ہو یا کوئی قاضی ہو، نہ باہر جا سکتا ہے اور نہ اسے باہر جانے کی اجازت ہے۔ ضرورت کے معنی یہ ہیں کہ بنیادی ضرورت خمسہ یعنی تحفظ دین، تحفظ جان، تحفظ نسل انسانی، تحفظ عقل انسانی اور تحفظ مال کو خطرہ لاحق ہو جائے اور اس کو بچانے کے لیے فوری طور پر کوئی اقدام ناگزیر ہو، اس صورت حال میں کسی ایک مقصد کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے، مثال کے طور پر ایک شخص کی جان خطرے میں ہے، اگر فوری طور پر اس کے لئے علاج اور دوا کا بندوبست نہ کیا گیا تو اتلاف جان کا خطرہ ہے، یہ فوری ضرورت کی کیفیت ہے۔ اسی طرح ایک شخص کی دکان میں آگ لگ جاتی ہے اس آگ کو بجھانے میں اگر کچھ مالی نقصان بھی ہو جائے تو قباحت نہیں۔ ضرورت کے تین بنیادی اصول ہیں:

۱۔ ایک اصول ہے: **الضرورات تقدر بقدرھا**۔ کہ ضرورت پر اسی حد تک عمل کیا جائے گا کہ جس حد تک عمل کرنا شدید ناگزیر ہو، جیسے ہی ضرورت پوری ہو جائے گی مسئلے کی نوعیت بھی بدل جائے گی۔ فرض کریں ایک شخص شدید پیاس کی وجہ سے لب مرگ ہے اور پانی دستیاب نہیں ہے، البتہ شراب دستیاب ہے، تو اس حالت میں اسی قدر شراب پینے کی اجازت ہوگی جس سے کہ جان بچ جائے، اگر ایک گھونٹ سے جان بچتی ہے تو دوسرا گھونٹ اس کے لئے جائز نہ ہوگا۔ اگر دو گھونٹ سے کام چلے تو تیسرا گھونٹ حرام ہوگا، یہ مراد ہے "**الضرورات تقدر بقدرھا**" سے۔

۲۔ دوسرا اصول "**ان تکون الضرورۃ قائمۃ لا مقدرۃ**" کہ وہ ضرورت جس کی بنا پر استثنا حاصل کیا جا رہا ہے وہ فی الوقت موجود ہو، یہ نہ ہو کہ اس کے وجود کی محض توقع ہے۔

۳۔ تیسرا بنیادی اصول یہ ہے کہ ضرورت پر عمل کرنے کی صورت میں کسی دوسرے کے حقوق متاثر نہ ہوتے ہوں، مثلاً جیسا کہ میں نے کہا کہ اگر بندے اور اللہ کے حقوق میں کہیں تعارض واقع ہو جائے، تو بندے کے حق کو ترجیح دی جائے گی۔ لیکن جب خود بندوں کے باہمی حقوق کی بات ہو تو کسی ایک کے حق کو کسی دوسرے کے حق پر ترجیح نہیں دی جائے گی، اس کے لئے کلیہ ہے: "**الاضطرار لا یبطل حق الغیر**" کہ کسی ایک انسان کے اضطرار کی وجہ سے دوسرے انسان کا حق باطل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً

ایک شخص بستر مرگ پر ہے اور اس کے لئے کسی انجکشن کی ضرورت ہے اور وہ انجکشن کسی دوسرے مریض کے پاس ہے جس کو ابھی فی الوقت اس انجکشن کی ضرورت نہیں ہے تو اس کا انجکشن اس جاں بلب مریض کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس انجکشن کی قیمت بہرحال ادا کرنا ہو گی۔ ان تینوں کلیوں کی بنا پر فتح سمرقند کے سلسلے میں قاضی کے لئے یہ درست نہ تھا کہ وہ فتح کو جائز قرار دیتا، اس لئے کہ یہ تینوں کلیے نہ پائے جاتے تھے۔ اس لئے کہ کسی کی جان، مال، عزت و آبرو خطرے میں نہ تھی۔ ہمارے ہاں نظریہ ضرورت پر بہت کچھ لکھا اور کہا گیا ہے، اس نظریے کا تعلق کس حد تک شریعت سے ہے، آپ اس مختصر تشریح سے خود اندازہ کر سکتے ہیں۔

(اسلام کا قانون بین المما لک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: تاریخ اسلام سے کیا مراد ہے؟ اگر مراد دور فاروقی ہے تو ٹھیک، ورنہ حضرت معاویہؓ کے دور کی قرآن کا نیزوں پر اٹھایا جانا، عبدالملک بن مروان کا حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو قتل کرانا، سلیمان بن عبدالملک کا موسیٰ بن نصیر اور محمد بن قاسم کے ساتھ رویہ کس طرح اسلام میں داخل ہے؟ جواب دیں۔

جواب: دیکھیے، پہلی بات تو یہ ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ میں جو لوگ گزرے ہیں وہ سب کے سب سو فیصد فرشتے نہیں تھے کہ ان سے غلطی سرزد ہی نہیں ہونا تھی، یہ بات کوئی بھی نہیں کہتا اور نہ ہی میں اس کا قائل ہوں۔ اسی طرح یہ بھی کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ہر مسلمان کا ہر عمل اسلام کے معیار کے مطابق ہمیشہ ہی پورا اترتا ہے۔ آپ نے عبدالملک کا ذکر کیا ہے، عبدالملک کے بارے میں دو باتیں بیان کر سکتا ہوں۔ یہ جو مثالیں آپ نے دی ہیں متنازعہ مثالیں ہیں، اس بارے میں جس طرح آپ ایک رائے رکھتے ہیں، اسی طرح مجھے بھی حق ہے کہ میں رائے رکھوں اور ممکن ہے کہ وہ رائے آپ کی رائے سے مختلف ہو۔ لیکن ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسے صحابی جلیل کا احترام نہ کرتا ہو اور امام مالکؒ جیسے فقیہ اور امام اہل مدینہ سے عقیدت نہ رکھتا ہو۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ بستر مرگ پر تھے۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ کے بعد علمی اور دینی معاملات میں رہنمائی کے لئے کس کی طرف رجوع کیا جائے؟ آپ نے فرمایا: عبدالملک بن مروان کی طرف۔ اس سے عبدالملک کے علمی اور دینی مقام کا آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں۔ مؤطا میں امام مالکؒ نے کئی جگہ سنت کا لفظ استعمال کیا ہے اور اس سے عبدالملک بن مروان کا طرز عمل مراد لیا ہے۔ عبدالملک کا ذاتی طرز عمل چاہے آپ کے نزدیک سنت نہ ہو، لیکن فقہا کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے اور محدثین کی بھی ایک تعداد ایسی ہے جو صحابہ و تابعین کے اجتماعی طرز عمل کو سنت سمجھتے ہیں، اس لئے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ صحابہ و تابعین کا اجتماعی طرز عمل سنت کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا۔ انفرادی طور پر غلطی کے امکان کے باوجود، عبدالملک نے بحیثیت حکمران ایک اقدام کیا۔ عوام الناس نے اسے قبول کیا۔ اس دور میں بہت سے صحابہ حیات تھے اور تابعین کی بہت بڑی تعداد موجود تھی۔ وہ خیر القرون کا دور تھا، ان سب نے اس پر خاموشی اختیار کی اور گویا سنت تقریری سے اس کو حق بجانب قرار دیا، لہٰذا اس کے عمل سے ذاتی اختلاف تو کیا جا سکتا ہے، لیکن اس کو بالکل غلط نہیں کہا جا سکتا۔ سلیمان نے زیادتی کی اور محمد بن قاسم، اور موسیٰ بن نصیر کے ساتھ بظاہر انصاف نہیں کیا۔ اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس لئے کہ میرے سامنے سلیمان کے طرز عمل کے سلسلے میں اس کا اپنا نقطہ نظر یا وضاحت موجود نہیں ہے۔ اور ہمارے علمائے تاریخ نے بھی اس کے نقطہ نظر کو بیان نہیں کیا جو یقیناً اس کے ساتھ زیادتی ہے۔ اس صورت حال میں بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ سلیمان نے غلط کیا۔ لیکن اگر اس بارے میں سلیمان کا نقطہ نظر ہمارے سامنے ہوتا تو ہم زیادہ وثوق سے کچھ کہہ سکتے۔ اس کے باوجود جو مثالیں دی گئی اس بارے میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان حکمرانوں میں سے بعض کا طرز عمل غلط تھا، اس سے یہ استدلال کرنا کہ سب مسلمان حکمرانوں کا بحیثیت مجموعی طرز عمل اسلام سے انحراف پر مبنی تھا، غلط ہے۔ مسلمان حکمرانوں کے مجموعی طرز عمل پر آج کے متعصب عیسائی اور یہودی مورخین بھی تعریفی کلمات ہی استعمال کرتے ہیں۔ انفرادیت کو بنیاد بنا کر اجتماعیت کی نفی میں مجھے کوئی معقولیت دکھائی نہیں دیتی۔ حضرت معاویہؓ کے قرآن پاک نیزوں پر اٹھانے کے اقدام کو میں کیسے غلط کہہ دوں جب کہ حضرت معاویہؓ کے اس طرز عمل نے مسلمانوں میں خون ریزی ختم کرا دی، نیز اس سے یہ استدلال کہ نعوذ باللہ یہ توہین قرآن کی گئی ہے بڑی زیادتی ہے۔ حضرت معاویہؓ پر آج تک یہ الزام تو کسی نے نہیں لگایا کہ انہوں نے توہین قرآن کا ارتکاب کیا۔ صحابیت، قرابت رسول اور ان کی علمی اور بحیثیت حکمران خدمات اس طرح کی بدگمانی کی اجازت نہیں دیتیں۔ اس سے حضرت معاویہؓ کی نیت پر شبہ کرنے کا کوئی جواز نہیں کہ نیت پر شبہ کرنا کافر کے بارے میں بھی جائز نہیں۔ کسی کی نیت کے بارے میں اس طرز عمل کی حضور ﷺ نے اجازت نہیں دی۔ حضرت اسامہؓ نے ایک جنگ میں ایک کافر کو قتل کیا جب کہ اس نے تلوار کی زد پر آنے کے بعد کلمہ پڑھ لیا تھا۔ اس پر حضور ﷺ کی انتہائی ناراضگی ہمارے سامنے ہے۔ جب کافر کی نیت پر شبے کی اجازت نہیں تو حضرت معاویہؓ تو آخر صحابی رسول ہیں۔ ان کی نیت پر شبہ کیوں اور کیسے کیا جائے!

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: آپ نے فرمایا کہ تمام انبیا صرف قیام عدل وقسط کے لئے آئے تھے۔ کیا لفظ ''صرف'' واقعتاً موجود ہے۔ اگر ایسا ہے تو کیا توحید عدل وانصاف میں شامل ہے؟

جواب: سورہ حدید میں ہے: **لقد ارسلنا رسلنا بالبین وانزلنا معھم الکتب والمیزان لیقوم الناس بالقسط (الحدید۵۷:۲۵)** ''اور بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو واضح نشانیاں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب ومیزان اتاری، تا کہ لوگ انصاف پر قائم ہو جائیں''۔ یہاں تاکید کے دو حروف استعمال ہوئے ہیں اور اسلوب عربی کے مطابق لام اور قد حروف تاکید یکجا ہوں تو حصر کے معنی دیتے ہیں۔ اس بنا پر میں نے صرف کا لفظ استعمال کیا۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: مسلمان کس طرح اور کس قسم کے مال کو مال غنیمت قرار دیتے تھے؟ لوٹ کے مال اور مال غنیمت میں کیا فرق ہوگا؟ براہ کرم جواب سے نوازیں۔

جواب: وہ جائداد جو مفتوحین کا متروکہ مال ہو اور ایک باقاعدہ قانونی نظام کے تحت جنگ کرنے کے بعد فتح کے نتیجے میں حاصل کی گئی ہو اور بعد میں حکومت کی طرف سے فاتحین میں تقسیم کی جائے مال غنیمت کہلاتا ہے۔ یہ تقسیم ضروری نہیں، اس کی صرف اجازت ہے۔ فاتح فوج میں یہ تقسیم شدہ مال، مال غنیمت کہلائے گا۔ یہ حکومت کی صوابدید پر منحصر ہے، حکومت اس سلسلے میں کوئی مناسب فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے اس سلسلے میں کئی طرز عمل منقول ہیں، مثلاً ایسا بھی ہوا کہ مال غنیمت رسول اللہ ﷺ نے مفتوحین کو واپس کرا دیا اور اس کے نتیجے میں سارا قبیلہ مسلمان ہو گیا۔ اس کو آپ تالیف قلب کی مثال بھی کہہ سکتے ہیں۔ ایسی بھی مثالیں ہیں کہ غیر منقولہ جائداد یعنی زمینیں مفتوحین کو لوٹا دی گئیں۔ اس انتظام کے ساتھ کہ زمینیں ریاست کی ملکیت رہیں اور مفتوحین بطور کاشت کار اس پر کام کرتے رہیں، اور ان سے ایک مناسب حصہ ریاست کے حق کے طور پر لے لیا جائے۔ یہ حصہ کاشت کار کا حالت اور زمین کی حیثیت کے مطابق مقرر کیا جاتا تھا۔ ایسی مثالیں بھی ہیں کہ مال غنیمت میں بے شمار اسلحہ ہاتھ لگا اور اسے تقسیم نہیں کیا گیا بلکہ مکمل طور پر حکومت کی ملکیت قرار پایا۔ اس صوابدید کو تمام فقہا نے تسلیم کیا ہے۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

(معاشیات)

سوال: آپ نے مضاربہ کی مسنونیت کے متعلق دلائل کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ بعثت سے قبل حضورﷺ کی حضرت خدیجہ کا مال مضاربت پر لے جایا کرتے تھے۔ کیا نبوت سے پہلے کے اعمال وافعال شریعت کا حصہ ہیں؟

جواب: رسول اللہﷺ نے نبوت سے پہلے کے تمام کاروباری معاملات، عادات اور تجارتی طور طریقوں کو اس حد تک جائز قرار دیا جس حد تک وہ شریعت کے کسی حکم سے متعارض نہ ہوں۔ ان میں جو چیز شریعت سے متعارض تھی وہ آپ نے واضح فرمادی اور اس کی ممانعت فرمادی۔ باقی معاملات اسی طرح جاری رہے اور آج بھی اسی طرح جاری ہیں جس طرح ہمیشہ سے جاری رہے۔

معاملات کے بارے میں میں نے پہلے بھی عرض کیا کہ اگر ان میں کوئی چیز شریعت سے متعارض نہیں ہے تو وہ جائز ہے اور اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ شریعت کے احکام واضح ہیں۔ محرمات بھی واضح ہیں۔ واجبات اور فرائض سب واضح ہیں۔ ان کی روشنی میں ہر شخص فیصلہ کرسکتا ہے کہ شریعت کی رو سے کون سی چیز جائز ہے اور کون سی ناجائز۔

رہا نبوت سے پہلے کا رسول اللہﷺ کا اپنا عمل تو وہ ملت ابراہیمی کے مطابق تھا، اس میں کوئی چیز ملت حنیفیہ سے متعارض نہیں تھی۔ لیکن ایسے کسی عمل کی بنیاد پر حلال وحرام کے احکام مرتب نہیں کئے گئے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: مسلمانوں کو یہودیوں کے معاشی تسلط سے آزادی کے لئے کیا راہ اختیار کرنی چاہئے؟

جواب: وہی راہ جو حضورﷺ نے اختیار کی۔ امام مالک نے فرمایا تھا کہ **'لا یصلح آخر ھذہ الامۃ الاما صلح بہ اولھا'** جس طریقہ کار سے اس امت کے آغاز میں اصلاح ہوئی تھی اسی طریقہ کار سے انتہا میں بھی اصلاح ہوگی۔ اس لئے وہی طریقہ اختیار کریں۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: مدینہ منورہ میں کرنسی کا نظام کیسا تھا؟

جواب: مدینہ منورہ میں پیپر کرنسی تو نہیں تھی۔ سونے چاندی اور درہم ودنانیز کا نظام تھا۔ دنانیز کا پیمانہ حضورﷺ نے مقرر کردیا تھا کہ یہ مکہ کے معیار کے مطابق قبول کئے جائیں گے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: موجودہ دور میں بعض حضرات خواہشمند کاروباری حضرات کو نقد رقم دیتے ہیں جس پر انہیں پہلے سے طے شدہ منافع دیا جاتا ہے؟

جواب: یہ جائز نہیں ہے۔ طے شدہ منافع ہی تو سود ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ کہے کہ اس وقت میں ایک یا دو ہزار روپے ماہوار دوں گا اور سال کے ختم ہونے پر جب کاروبار کا سالانہ حساب کریں گے تو اس وقت یہ معاملہ بھی طے کرکے حساب برابر کردیں گے۔ یہ جائز ہے۔ بجائے اس کے کہ آپ پورا سال نفع کا انتظار کریں اگر پہلے سے کوئی رقم بطور ایڈوانس کے ملتی رہے وہ متعین رقم بھی ہوسکتی ہے اور سال کے اخیر میں فیصد کے حساب اس کا حساب صاف کرلیا جائے تو اس کی اجازت ہے لیکن متعین رقم لینا سود ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: ربا الفضل میں، جو حدیث میں آیا ہے، جس میں چھ چیزوں کا ذکر ہے۔ یہ لازمی نہیں کہ ان چیزوں کو کوالٹی برابر ہو؟

جواب: معیار ایک جیسا ہو یا نہ ہو لیکن مقدار ایک ہونی چاہئے۔کوالٹی تو برابر نہیں ہوتی تھی۔جب کمی بیشی ہوتی تھی تو چیزوں کی کوالٹی ہی کے فرق کی بنیاد پر ہوتی تھی۔ اس کی حضورﷺ نے ممانعت فرمادی۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: موجودہ بنکاری کے ہوتے ہوئے سود سے کیسے بچا جا سکتا ہے؟

جواب: بالکل بچا جا سکتا ہے۔سود سے بچنے کی شکل یہی ہے کہ آپ سودی کاروبار میں پیسہ نہ لگائیں۔حتی الامکان سود میں ملوث نہ ہوں۔ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک زمانہ آئے گا کہ جو سود سے بچنا چاہے وہ بھی سود کے غبار سے نہیں بچ سکے گا۔تو آج کل وہی زمانہ ہے۔سود کے غبار سے بچنا مشکل ہے۔اس کے لئے وہ کام کریں جو امام مالک نے کیا تھا۔

امام مالک سے کسی نے پوچھا کہ آپ تو بڑے قیمتی کپڑے پہنتے ہیں۔حالانکہ اہل اللہ تو بہت سادہ ہوتے ہیں۔(لوگ بھی طرح طرح کے سوال پوچھ لیتے ہیں۔ امام مالک جیسی بزرگ شخصیت کو بھی نہیں چھوڑا)۔انہوں نے کہا کہ نفعل و نستغفر، کہ جی غلطی بھی کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ استغفار بھی کرتے ہیں۔تو اگر غبار آپ تک پہنچتا ہو تو **نفعل و نستغفر** پر عمل کریں۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: حضرت عمر کے دور میں حالات اتنے اچھے ہوگئے کہ کوئی زکوٰۃ لینے والا نہ رہا۔تو انہوں نے کیا طریقہ معیشت اختیار کیا تھا؟ اور ایسی اچھی حالت حضور اکرمﷺ اور سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور میں کیوں نہیں آئی؟

جواب: بڑے کاموں کے اثرات کو ظاہر ہونے میں وقت لگتا ہے۔رسول اللہﷺ کا پورا دس سالہ مدنی دور اصلاحات کا دور ہے۔آپؐ نے ایک ایک کر کے تدریجی اصلاحات فرمائیں۔آخری اصلاح ربا کے دعاوی کو کالعدم قرار دینے کا فیصلہ تھا۔اس کے بعد اس کے ثمرات ایک ایک کر کے ظاہر ہونے شروع ہوئے۔حضرت ابوبکر صدیقؓ کا تو دو سال کا زمانہ ہے، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں یعنی حضورﷺ کی ان اصلاحات کے آٹھ دس سال بعد ان کی برکات اور ثمرات آنا شروع ہوگئیں۔آج بھی جب آپ یہ اصلاحات مکمل کرلیں گے تو اس کے ثمرات سامنے آنا شروع ہو جائیں گے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: کیا اسٹاک ایکسچینج کا تصور نبی کریمﷺ کے دور میں تھا؟

جواب: میرے خیال میں تو نہیں تھا۔اسٹاک ایکسچینج تو کارپوریٹ فنانسنگ کی ایک شکل ہوتی ہے۔کارپوریٹ فنانسنگ کا یہ تصور اس زمانے میں نہیں تھا۔ collective financing البتہ ہوتی تھی۔لیکن کارپوریٹ فنانسنگ کا تصور نیا ہے۔اس میں کوئی چیز شریعت سے متعارض نہیں۔ابھی میں نے عرض کیا کہ تین چار قواعد کی پابندی کی جائے تو اس کو شریعت کے مطابق چلایا جا سکتا ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: کسی مکان کو کرائے پر یا ایک خاص رقم کو سود پر دیا جائے تو دونوں میں کیا فرق ہے؟

جواب: سود کے یہ معنی نہیں کہ جہاں بھی جس چیز پر بھی زائد رقم وصول کی جائے وہ سود قرار دے دیا جائے۔کرایہ مکان اور سود دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔شریعت کا اصول یہ ہے کہ آپ اس چیز کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں جس چیز کا نقصان بھی آپ اٹھا سکیں۔ابھی میں نے حدیث عرض کی کہ الخراج بالضمان ۔جب آپ کسی کو سود پر قرض دیتے ہیں تو آپ کی اصل رقم بالکل محفوظ رہتی ہے۔اگر مقروض کے گھر چوری ہو جائے، ڈاکہ پڑ جائے یا سیلاب آجائے تو آپ کی رقم آپ کو ہر صورت میں واپس ملے گی۔آپ اس نقصان کے ذمہ دار نہیں ہوتے۔لیکن جب آپ کوئی چیز کرائے پر دیتے ہیں۔آپ کار خرید کر ٹیکسی

کے طور پر کرائے پر دے دیں تو اس کا جو ویئر اینڈ ٹیئر ہوگا، حادثہ ہوگا، خرابی ہوگی اور مسائل ہوں گے، وہ سارے تاوان آپ کے ذمہ آئیں گے، آپ اس کے نقصان کے ذمہ دار ہیں اس لئے آپ اس کا فائدہ کرایہ کی صورت میں لے سکتے ہیں۔

مکان جب آپ کرائے پر دیتے ہیں تو استعمال سے وہ پرانا بھی ہوگا۔ اس کی چیزیں بھی استعمال ہوں گی۔ اس میں خرابی بھی پیدا ہوگی۔ آپ کو اس میں وقتاً فوقتاً کام بھی کروانا پڑ سکتا ہے۔ مرمت بھی ہوگی۔ مکان کا ٹیکس بھی ادا کرنا ہوگا۔ زلزلہ میں گر گیا تو نقصان بھی ہوگا۔ یہ سارا نقصان آپ کو برداشت کرنا پڑے گا۔ اس لئے آپ اس کے فائدے کے بھی حقدار ہیں۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: رسول اللہ ﷺ نے اپنے دور میں بلند و بالا گھر بنانے کی جو ممانعت فرمائی کیا اس میں دوسری عمارتیں بھی شامل ہیں؟

جواب: اس زمانے میں دوسری عمارتیں زیادہ نہیں ہوتی تھیں۔ لوگ گھر ہی بناتے تھے اور گھروں کے علاوہ کوئی اور تجارتی دفتر یا عمارتیں بنانے کا رواج نہیں تھا۔ اس لئے ہدایات گھروں ہی کے بارہ میں دی گئیں کہ رہائش سادہ ہونی چاہئے۔ سادگی کا تعین ہر زمانے کے حالات کے مطابق ہوگا۔ سادگی کا ایک تصور اسلام آباد میں ہے۔ ایک تصور ان قصبوں میں تھا جو آج سے پانچ سو سال پہلے یہاں آباد تھے۔ جس زمانے اور علاقے میں آپ ہیں اس کے لحاظ سے سادہ عمارتیں ہونی چاہئے۔ پیسے اور دولت کا اظہار نہیں ہونا چاہئے۔ یہی اس پابندی کا مقصد معلوم ہوتا ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: جب سود کو حرام قرار دیا گیا تو سود کی وہ رقمیں جو کفار کی تھیں اور مسلمانوں کے ذمہ واجب الادا تھیں تو ان کا کیا معاملہ ہوا؟

جواب: سود کو تین مراحل میں حرام قرار دیا گیا تھا۔ پہلے مرحلہ میں سابقہ واجب الاداد عاوی ادا کئے جاتے تھے اور وصول بھی کئے جاتے تھے۔ لیکن حضور ﷺ نے حج الوداع کے موقع پر یہ اعلان کیا تھا کہ آج سے تمام سابقہ سودی دعاوی کالعدم ہیں اور سب سے پہلے جس سود کو میں کالعدم قرار دیتا ہوں وہ میرے چچا عباسؓ بن عبدالمطلب کا سود ہے۔ اس وقت سے سابقہ سودی دعاوی سابقہ کی ممانعت کر دی گئی، چاہے مسلمانوں کے ہوں یا غیر مسلموں کے ہوں۔

سود کو ایک دم اس لئے حرام قرار نہیں دیا گیا کہ لوگوں کے مالی معاملات میں کئی پیچیدگیاں ہوتی ہیں۔ کئی کئی سالوں کے معاہدے چل رہے ہوتے ہیں۔ اگر آپ اس کو بیک جنبش قلم منع کر دیں گے تو اس سے بہت سارے مسائل پیدا ہوں گے اور لوگوں کے لئے مشکلات کا سبب بنیں گے۔ اور بہت سے لوگوں کے لئے معاشی نقصان کا برداشت کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ کسی فارسی شاعر نے کہا تھا کہ

اگر	جان	طلبی	مضائقہ	نیست
اگر	زر طلبی	سخن	درین	است

اگر جان مانگتے ہو تو کوئی مضائقہ نہیں، دینے کو تیار ہوں۔ پیسہ مانگتے ہو تو سوچنا پڑے گا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: کیا موجودہ بنکوں میں پیسہ رکھوانا جائز ہے؟

جواب: میرے خیال میں جائز ہے۔ اس لئے کہ اس کا سر دست کوئی اور متبادل نہیں ہے۔ اب اسلامی بنک بن رہے ہیں۔ کچھ بن چکے ہیں آپ اپنا پیسہ ان میں رکھوا دیں۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: کیا بنک کی کمائی حلال ہے؟

جواب: بنک کے ان شعبوں کی کمائی جہاں براہ راست سودی کاروبار نہیں ہوتا، قابل اعتراض معلوم نہیں ہوتی۔ شریعت میں اس کی گنجائش ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: کیا ہم اسلام کے اقتصادی نظام کو controlled capitalism کہہ سکتے ہیں؟

جواب: اصطلاح کی بات ہے۔ اگر آپ یہ اصطلاح استعمال کرنا چاہیں تو آپ کی مرضی۔ لیکن کنٹرول کی تعریف کی ضرورت ہوگی کہ اس سے کیا مراد ہے؟ What shall be the extent of the control? what would be the kind of the control? who will control and under what law? کنٹرول اگر شریعت کے مطابق ہوگا تو ٹھیک ہے۔ لیکن کنٹرولنگ اتھارٹی اگر شریعت کے مطابق نہ ہو تو اس کو اسلامی اکانومی کہنا مشکل ہوگا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: Free Access to market کے حوالہ سے سوال ہے کہ آج کل مختلف حوالوں سے ملٹی نیشنل کمپنیوں کی مصنوعات پر پابندیوں کا مطالبہ کیا جا رہا ہے؟ اسلامی تعلیمات کی رو سے یہ کہاں تک درست ہے؟

جواب: یہ اس لئے درست ہے کہ جن ممالک کی کمپنیوں کے بائیکاٹ کا مطالبہ کیا جا رہا ہے یہ وہ ممالک ہیں جو مسلمانوں کے خلاف ہر معاملہ میں پیش پیش رہتے ہیں۔ اسرائیل کی لبنان میں مظالم کا آج بیسواں دن ہے، سینکڑوں مسلمان شہید ہو چکے ہیں، آج تک اسرائیل کی مذمت تو کیا کرتے، ان ممالک نے اسرائیل کی تائید میں بھی کمی نہیں کی۔ اس لئے جو ہمارے بھائیوں کا خون بہا رہے ہوں۔ جو دن رات ہمارے بھائیوں کو قتل کر رہے ہوں، وہ ان کی تائید کر رہے ہوں اور ہم ان کا اتنا بھی بائیکاٹ نہ کریں، میرے خیال میں یہ تو غیرت کا کم سے کم درجہ ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: جیسا کہ آپ نے ریاست مدینہ کی معیشت و معاشرت کو بیان کیا۔ پاکستان کو مدنظر رکھ کر ہم اس کو آئیڈیل اسٹیٹ کس طرح بنا سکتے ہیں؟

جواب: پاکستان کو آئیڈیل اسٹیٹ بنانے کیلئے ضروری ہے کہ قیام پاکستان کے مقاصد پر اخلاص، جذبہ اور محنت سے عمل کیا جائے۔ جن مقاصد کے لئے پاکستان بنایا گیا تھا ان کو پورا کیا جائے۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ نے بار ہا فرمایا تھا کہ ہم پاکستان کو اسلام کی ایک تجربہ گاہ بنانا چاہتے ہیں اور دنیا کو دکھانا چاہتے ہیں کہ اسلام کے اصول آج بھی اسی طرح موثر ہیں جس طرح چودہ سو سال پہلے موثر تھے۔ قائداعظم نے یکم جولائی 1948 کو اپنی زندگی کی جو آخری تقریر فرمائی تھی اس میں انہوں نے کہا تھا کہ دنیا کے دو بڑے معاشی نظاموں نے انسانیت کو مصائب اور مشکلات کے سوا کچھ نہیں دیا۔ اب زمانہ آ گیا ہے کہ اسلام کے معاشی نظام کو زندہ کیا جائے اور اسلام کی بنیاد پر معیشت اور بنکاری کا ایک نیا نظام قائم کیا جائے تا کہ دنیا کو ان مصائب سے نجات دلائی جا سکے۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ کی یہ وصیت پوری قوم کے لئے ہے۔ ہم سب کو اس کام کے لئے آگے آنا چاہئے۔ میرا اور آپ سب کا فریضہ ہے کہ ہم سب مل کر اس کام کو کریں۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: کیا سودی بنک میں انٹرن شپ جائز ہے؟

جواب: میرے خیال میں اگر کسی بنک کے ایسے شعبہ میں آپ کام کریں جو براہ راست سودی معاملات سے وابستہ نہ ہو تو شاید اس کی گنجائش ہے۔ بنک بہت سے کام ایسے کرتے ہیں جو سودی نہیں ہوتے۔ مثلاً بنک ایل سی کھولنے میں مدد کرتا ہے۔ آپ امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار کر رہے ہوں تو آپ کو ایل سی کھولنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایل سی کھولنا جائز ہے۔ بنک consultancy کرتا ہے اور لوگوں کو مشورے دیتا ہے۔ کاروباروں کی assesment کرواتا ہے۔ feasability report تیار کرواتا ہے۔ اس طرح کے معاملات میں حصہ لینا میرے خیال میں درست ہوگا۔ جو معاملات ناجائز ہیں ان میں حصہ لینا بھی ناجائز ہوگا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: جب ہم اسلامی معاشی نظام کی بات کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسلام کا نظام نافذ ہونا چاہئے تو کیا تمام مسائل کے حل کے لئے قرآن و حدیث میں مختلف

جگہوں پر احکام دیئے گئے ہیں، کسی نے ان کو جمع کیا ہے کہ ہم دکھا سکیں۔

جواب: یہ احکام بارہا جمع کئے گئے ہیں۔ان پر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اسلامی ریاست کے معاشی تقاضوں پر لوگوں نے تحقیقات کر کے کتب خانے تیار کر دیئے ہیں۔ اسلام کے معاشی نظام کے نفاذ کے لئے قوانین بھی تیار کئے جا چکے ہیں۔ یہ بات نہیں کہ ہم تیار نہیں ہیں۔ یہ تو خوئے بدرا بہانہ بسیار والا معاملہ ہے۔جو نہ کرنا چاہے اس کے لئے کچھ بھی تیار نہیں ہے اور جو کرنا چاہئیں ان کے لئے سب کچھ تیار ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: اسلام اور اشتراکیت دونوں مساوات فراہم کرتے ہیں۔ بنیادی فرق بتا دیجئے۔علامہ اقبال نے بھی مساوات کی بات کی ہے۔

جواب: اشتراکیت وہ مساوات فراہم کرتی ہے جو جیل خانہ میں تمام قیدیوں کو میسر ہوتی ہے۔جیل خانہ میں سارے قیدی برابر ہوتے ہیں۔سب کو دو وقت کی دال روٹی ملتی ہے۔سب کو کوٹھے میں بند کر دیا جاتا ہے۔اسلام جس مساوات کا درست دیتا ہے وہ آزادی، تحفظ اور عزت کے ساتھ ہے۔ جو مساوات آزادی اور عزت کے ساتھ نہ ہو وہ مساوات نہیں ہے۔ پھر مساوات میں آپ نے علامہ اقبال کا حوالہ دیا ہے۔علامہ اقبال اشتراکیت سے متاثر نہیں تھے۔کسی نے غلط کہا ہے۔علامہ اقبال نے تو اشتراکیت پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ کارل مارکس مساوات بطون پر مساوات قلوب واذہان کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے جو غلط ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے لیے الگ بازار بنایا لیکن آج کے دور میں مسلمانوں کے لیے الگ بازار بنانا چاہیے یا اصل مارکیٹ میں کاروبار کرنا چاہیے؟

جواب: نبی ﷺ نے مسلمانوں کے لئے اس وجہ سے علیحدہ بازار بنایا تھا کہ یہودی اپنے بازار میں مسلمانوں کو پنپنے نہیں دیتے تھے۔آج کی انٹرنیشنل مارکیٹ میں بھی یہی حال ہے۔مسلمان ممالک کو اپنی انٹرنیشنل مارکیٹ الگ بنانی چاہئے اور مسلمانوں کو انٹرنیشنل مارکیٹ کی محتاجی سے آزاد کرانا چاہئے۔ یہ آزاد مسلم ممالک اور خاص طور پر باوسیلہ مسلم ممالک کا فرض ہے کہ وہ یہ کام کریں۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: اگر کوئی شخص دوسرے کو قرض دیتا ہے اور وہ سود نہیں لیتا تو time value of money کے تصور کے مطابق اس کی قدر کم ہو جاتی ہے۔تو قرض دینے والے کے نقصان کی تلافی کیا ہے؟

جواب: دیکھئے! اشیاء کی قیمتوں میں کمی بیشی تو ہر دور میں ہوتی رہی ہے۔اسلام نے اس کمی بیشی کو درخوا عتنا نہیں سمجھا۔جب لوگ جو اور کھجوریں قرض دیا کرتے تھے تو جس زمانے میں کھجوروں کی فصل آنے میں دیر ہوتی تھی تو کھجوریں مہنگی ہو جاتی تھیں اور فصل پہنچنے کے بعد سستی ہو جاتی تھیں۔لیکن کھجور کی قیمتوں میں کمی بیشی سے قطع نظر آپؐ نے اس مقدار کو برابر رکھنے کا حکم دیا کہ جتنا لیا ہے اتنا ہی دو۔ جتنا لیا ہو اس سے زیادہ نہ دینے کی اجازت ہے نہ لینے کی۔قیمتوں میں کمی بیشی تو ہوتی رہتی ہے۔

ایک اور بات یاد رکھئے کہ قرآن مجید کا ایک اصول ہے 'لاتزر وازرۃ وزر اخریٰ' کوئی شخص دوسرے شخص کی غلطی کا بوجھ اٹھانے کا مکلّف نہیں ہے۔لہٰذا اگر کسی چیز یا کرنسی کی قیمت کم ہو رہی ہے تو کیا وہ قرض لینے والے کی کسی کمزوری یا غلطی سے کم ہو رہی ہے؟ اگر وہ قرض نہ لیتا تو کیا قیمت کم نہ ہوتی۔ جب قیمت کم ہونے میں قرض لینے والے کی کوئی غلطی نہیں ہوتی تو وہ کیوں اس کا تاوان دے۔اگر آپ کے پاس آج سو روپے ہیں اور دس سال کے بعد اس سو روپے کی قیمت پچاس روپے رہ جائے گی تو اگر یہ سو روپے آپ کے میں ہوتے تو تب بھی قیمت میں یہ کمی ہوتی اور اگر آپ نے کسی کو قرض دے دئے تو تب بھی اس میں یہ کمی ہونی تھی۔اس میں قرض لینے والے کا تو کوئی قصور نہیں ہے۔چونکہ قیمت قرض لینے سے کم نہیں ہوئی اس لئے قرض دار پر کیوں تاوان ڈالا جائے۔یہ قرآن پاک کے اصول کے خلاف ہے۔

پھر اسلام کا ایک اصول ہے 'الخراج بالضمان' جس چیز کا آپ فائدہ اٹھا سکتے ہیں اس چیز کا نقصان بھی آپ کو اٹھانا چاہئے۔تو اگر inflation کی بجائے deflation ہو جائے تو کیا قرضدار اصل رقم سے کم لینے کو تیار ہوگا؟ ہر گز نہیں۔جس طرح پاؤنڈ اسٹرلنگ میں deflation ہوئی ہے۔1984 میں پونڈ اسٹرلنگ

17 روپے کا تھا آج 117 روپے کا ہے۔تو اگر اس زمانے میں کسی نے پونڈ اسٹرلنگ میں قرض لیا ہوتا تو کیا قرض دینے والا اس کے لئے تیار تھا کہ وہ ستر روپے کے حساب سے آج اپنا قرض وصول کرلے۔کیا جس نے اس وقت ایک ہزار روپے کی مالیت کے اٹھاون پونڈ دیئے تھے وہ آج کے ماحول میں نو دس پونڈ لینے پر تیار ہوجائے گا؟ ظاہر ہے کہ کوئی قرض دینے والا اس کے لئے تیار نہیں ہوگا۔تو اگر تفریط زر کی شکل میں ہونے والا کوئی نقصان وہ اٹھانے کو تیار نہیں ہے تو افراط زر کی صورت میں فائدہ اٹھانے پر کیوں مصر ہے؟

یہ معاملہ شریعت کے بہت سارے اصولوں سے ٹکراتا ہے۔پھر اس کا حل یہ نہیں ہے کہ آپ افراط زر کو دور کرنے کی بجائے اس کے نام پر سود کا راستہ کھول دیں۔آپ افراط زر کو روکیں۔بعض ممالک نے یہ کام کامیابی سے کیا ہے۔اس کے معاشی طریقے ہیں۔برازیل، ارجنٹینا اور سعودی عرب میں کامیابی سے روکا گیا ہے۔سعودی عرب میں روپے پیسے کی اتنی ریل پیل اور بہتات کے باوجود میں پچھلے تیس سال کا ذاتی تجربہ بتاتا ہوں۔میں گزشتہ تیس سال سے تقریباً ہر سال دو تین مرتبہ سعودی عرب جاتا ہوں۔تیس سال پہلے چائے کی ایک پیالی کی قیمت ایک ریال تھی۔آج بھی ایک ریال ہے۔تیس سال پہلے ٹھنڈے مشروب کا ڈبہ ایک ریال میں ملتا تھا، آج بھی ایک ہی ریال میں ملتا ہے۔جو چیز تیس سال پہلے جس قیمت پر ملتی تھی آج بھی اسی قیمت پر ملتی ہے۔وہاں کیوں افراط زر نہیں ہوا؟ لوگ کہتے ہیں کہ پیسے کی کثرت سے افراط زر ہوتا ہے، لیکن سعودی عرب میں ایسا نہیں ہوا۔انہوں نے اپنی پالیسیوں سے اس کو کنٹرول کیا ہے۔ہمارے ہاں چیزوں پر کنٹرول نہیں ہے۔حکومتیں اپنی کوتاہیوں کا اعتراف اور ان کی اصلاح کی بجائے ان کے نتائج بد کا ملبہ شریعت پر ڈالنا چاہتی ہے۔کوتاہی حکومت کی ہے۔مالیاتی پالیسی حکومت کی ناکام ہوئی ہے لیکن اس کا ملبہ شریعت پر ڈالنا چاہتے ہیں کہ شریعت نے inflation کے اس خود ساختہ حل کو حرام قرار دیا ہے ورنہ ہم یہ کر دیتے اور وہ کر دیتے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: سود اسلام میں منع ہے جب کہ ایک ملازم کی تنخواہ بنک میں آتی ہے تو وہ ملازم جس ادارہ میں ملازمت کرتا ہے وہ بھی بنک سے ٹرانزیکشن کرتا ہے تو اس صورت میں اسلام کیا کہتا ہے؟

جواب: اسلام یہ کہتا ہے کہ آپ کی تنخواہ بالکل ٹھیک ہے۔آپ بلا جھجک بنک سے تنخواہ وصول کریں۔بنک ہی میں اپنا اکاؤنٹ رکھیں۔گھر میں رکھنا غیر محفوظ ہے۔یہ ایک ایسی خدمت ہے جو جائز ہے۔اس کے بدلے میں بنک آپ سے کوئی معاوضہ نہیں لیتا۔اس لئے اگر آپ کو یہ تامل ہو کہ موجودہ پی ایل ایس اکاؤنٹ شریعت کے ساتھ سو فیصد مطابق نہیں ہے تو آپ کرنٹ اکاؤنٹ میں اپنا پیسہ رکھیں۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: مسلمانوں کے بازار آباد کرنے کے لئے حضورﷺ نے بہت سے اقدامات کئے۔ان میں ایم این سیز (ملٹی نیشنل کمپنیوں) کا کیا رول تھا۔کیا ہمیں ان کی مصنوعات نہ خرید کر انہیں اس طرح نقصان پہنچانا چاہئے؟

جواب: بہت سی ملٹی نیشنل کمپنیاں ایسے ممالک سے تعلق رکھتی ہیں جو مسلمانوں کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ایسی کمپنیوں میں جن سے آپ لاتعلق رہ سکتے ہیں ان سے لاتعلق رہنا چاہئے۔ان کے بجائے مسلمانوں کی اپنی کمپنیوں کو موقع دینا چاہئے۔مسلمان تاجر اور ممالک اگر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں گے اور باہمی تجارت میں حصہ لیں گے تو ملٹی نیشنل کمپنیوں کا کردار اسلامی ممالک میں کم ہو جائے گا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: فتح خیبر میں صرف مہاجرین میں 1800 برابر حصے تقسیم ہوئے۔اس کے بعد شاید مواخات ختم کر دی گئی، کیونکہ مہاجرین کو کافی حصہ مل گیا۔تو وراثت مواخات سے الگ ہوگئی۔ہاں وصیت میں ثلث کی گنجائش رکھی گئی تاکہ مہاجرین اور لے پالک اولاد کو وصیت سے حصہ مل سکے۔سوال یہ ہے کہ کیا ربا کو ختم کرنے میں اصل مقصد معیشت میں مساوات کو قائم رکھنا ہے۔اس کی وضاحت فرمائیے۔

جواب: میرے خیال میں آپ کی بات بالکل درست ہے۔ ربا کا مقصد یہ ہے کہ معیشت میں لوگوں کو برابر کے مواقع حاصل ہوں۔کسی شخص کو وسائل کی بنیاد پر دوسروں کو محروم کرنے کا موقع نہ ملے۔ ہر شخص کو کاروبار اور تجارت کی آزادی ہو۔اس حدتک حرمت ربا کا نظام آزادی دیتا ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: ملٹی نیشنل کمپنیوں اور خاص طور پر یہودیوں کی کمپنیوں کی پیداوار سے آج کل بائیکاٹ کی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔کیا یہ بائیکاٹ شرعاً جائز ہے؟

جواب: میرے خیال میں تو دشمنان اسلام کا اقتصادی مقاطعہ کرنا شرعاً مطلوب ہے اور لازمی ہے۔ایسے ممالک اور اقوام کا ضرور بائیکاٹ ہونا چاہئے۔جو قومیں مسلمانوں کے مقدس شعائر کا لحاظ نہیں کرتیں۔جو قومیں مسلمانوں کی انتہائی محترم شخصیات کی شان میں گستاخی کرنے والوں کو تحفظ دیں،تو مسلمانوں کو ان کا کم از کم بائیکاٹ تو کرنا چاہئے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: Explain access in Riba

جواب: ربا میں چاہے ایکسس ہو یا نہ ہو، ربا دونوں صورتوں میں حرام ہے۔ ربا وہ ہے جس میں کسی قرض دار یا کسی ایسی رقم پر جو کسی کے ذمہ دار واجب الاداہو، کوئی ایسا اضافہ وصول کرنا جو وقت کی توسیع کے مقابلہ میں ہو، وہ ربا کہلاتا ہے۔اس میں اگر ایک فی ہزار اضافہ ہے تو یہ بھی ربا ہے اور اگر اس سے زیادہ ہے تو وہ بھی ربا ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: When gold is exchanged with gold it should be equal in quantity. When gold is exchanged with silver the quantity may vary, but counter values will be exchanged simultaniously. Is it correct?

جواب: یہ بات آپ نے صحیح کہی ہے۔اگر یہ دونوں الگ الگ کرنسیاں یا سونا چاندی ہوں تو ان کا آپس میں لین دین نقد بنیادوں پر کمی بیشی کے ساتھ جائز ہے۔ سونے کا چاندی کے ساتھ۔ایک کرنسی کا دوسری کرنسی کے ساتھ یہ اسی حدیث میں اجازت دی گئی ہے جو میں نے ابھی آپ کے سامنے بیان کی ہے۔اسی کے الفاظ ہیں 'فاذا ختلفت الاصناف فبیعوا کیف شئتم' جب صنفیں مختلف ہوں تو جس طرح چاہو بیچو۔'اذا کانت یدابید' اگر وہ ہاتھ در ہاتھ ہوں۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: اسلامی معیشت میں منافع خوری کس حدتک جائز ہے؟

جواب: منافع خوری ایک ایسا لفظ ہے جو اردو میں منفی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔تجارت کرنے کا مقصد ہی منافع کمانا ہوتا ہے۔ ہر دکاندار نفع لیتا ہے۔اگر کمایا جانے والا نفع جائز حدود میں ہو۔ مارکیٹ کے نرخوں کے مطابق ہو۔ بازار میں رائج نفع کی سطح کے مطابق ہو۔اس میں دھوکہ اور ظلم نہ ہو، کسی کا استحصال نہ ہوتو یہ جائز ہے۔اس کو اردو میں منافع خوری نہیں کہتے۔منافع خوری بازار کی سطح سے زیادہ قیمت لے کر نا جائز نفع کمانے کا کہتے ہیں۔ یا ذخیرہ اندوزی کر کے زبردستی زیادہ نفع وصول کرنے کو منافع خوری کہتے ہیں۔ یا لوگوں کو دھوکہ دے کر زیادہ نفع کمانے کو منافع خوری کہتے ہیں۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: اسلام کے معاشی نظام کی روشنی میں اسلامی بنکاری کا مختصر خاکہ بیان کر دیجئے۔ چونکہ بنک کے اخراجات، تنخواہیں، مشینری، کمپیوٹر، ائرکنڈیشن وغیرہ کے اخراجات بہت کم ہوتے ہیں۔

جواب: اس پر تو الگ سے ایک سلسلہ خطبات کی ضرورت ہے۔ یہ خاکہ ایک آدھ لیکچر میں بھی بیان نہیں ہوسکتا۔ اسلامی بنکاری کے خاکے بار ہا بیان ہوئے ہیں۔ اس پر بہت سا کام ہوا ہے۔ اس پر بہت سی دستاویزات تیار ہوئی ہیں۔ اب تو بات خاکے سے بہت آگے چلی گئی ہے۔ خاکہ کا سوال آج سے ستر اسی سال پہلے پیدا ہوا تھا۔ اب تو اسلامی بنکاری کے میدان میں عملاً کام ہو رہا ہے۔ دنیا میں ساڑھے تین چار سو اسلامی بنک کام کر رہے ہیں۔ پاکستان میں 14 اسلامی بنک موجود ہیں جو اسلام کے مطابق کام کر رہے ہیں۔ ان کی تفصیلات، دستاویزات اور مصنوعات بھی تیار ہوگئی۔ آپ کے علم میں ہوگا کہ اسٹیٹ بنک آف پاکستان نے فنانسنگ کے تمام essential modes کے بنیادی عناصر واضح کر دیئے ہیں۔ اسٹیٹ بنک نے ایزینشل پروڈکٹس کے بنیادی فیچرز بھی ڈیفائن کر دیئے ہیں۔ اس پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔ دنیا بہت آگے نکل چکی ہے۔ خاکے وغیرہ کی بات تو اب بہت پرانی ہوگئی ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: آج کل کا یہ گندا معاشی نظام جس کے نتیجہ میں غریب غریب سے غریب تر اور امیر امیر تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ کیا حضور ﷺ کے زمانے میں بھی یہ نظام موجود تھا؟

جواب: جی ہاں حضور ﷺ کے زمانے میں بھی یہ ظالمانہ نظام موجود تھا۔ اور اسی کی اصلاح کرنے کے لئے حضور ﷺ تشریف لائے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ نفع خور سرمایہ دار ہر زمانے میں ہوتے ہیں۔ یہودی اس زمانے میں بھی تھے۔ اس زمانے میں بھی یہودیوں نے سود کے ذریعے دنیا کے معاشی نظام کو اپنے قابو میں رکھا ہوا تھا۔ آج بھی دنیا کا مالیاتی نظام اور معاشی زندگی یہودیوں کے کنٹرول میں ہے۔ اس وقت بھی سود ان کا سب سے بڑا ہتھیار تھا۔ آج بھی سود ان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ جو اصلاحات حضور ﷺ نے اس وقت فرمائی تھیں وہ آج دوبارہ نافذ ہونی چاہئیں۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: ہول سیل اور ایجنسی سسٹم میں شریعت میں کیا حیثیت ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب: ہول سیل اور ایجنسی سسٹم میں شرعاً کوئی چیز قابل اعتراض نہیں ہے۔ ایجنسی سے مراد اگر یہ ہے کہ اگر آپ کسی پروڈیوسر یا کسی مینوفیکچرر کے نمائندے کے طور پر اس کا مال بیچیں اور وہ اس پر آپ کو معاوضہ دے یا پرسینٹیج کے حساب سے آپ کو پیسے دے تو یہ جائز ہے۔ اس میں کوئی چیز حرام نہیں ہے۔ مثال کے طور پر کوئی بڑے پیمانے پر فرنیچر بنانے والا ہے۔ آپ اس کے ایجنٹ کے طور پر کام کرتے ہیں۔ کسی اور شہر میں دکان کھول لیتے ہیں۔ وہ قیمت مقرر کر کے آپ کو دس فیصد نفع لینے کی اجازت دے دیتا ہے۔ آپ اپنا خرچہ نکالنے اور نفع کے حصول کے لئے یہ خرید و فروخت کریں تو یہ بالکل جائز ہے۔

ایجنسی کی جائز شکلیں یہی ہیں۔ ہول سیل کا کاروبار بھی جائز ہے۔ ہول سیل میں صرف یہ ہوتا ہے کہ بڑے پیمانے پر ایک سپلائر سامان خریدتا ہے اور چھوٹے تاجروں کو فراہم کر دیتا ہے۔ چونکہ وہ بڑے پیمانے پر خریدتا ہے اس لئے اس کے نفع کا ریشو نسبتاً کم ہوتا ہے۔ اور چھوٹا تاجر چھوٹے پیمانے پر بیچتا ہے اس لئے نفع کا ریشو نسبتاً زیادہ رکھتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان جو فرق ہے وہ ریٹیلر اور ہول سیلر کے درمیان نفع کا سبب بنتا ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: مخابرہ، مضاربہ، مساقاہ اور مزارعہ کی وضاحت فرمائیں۔

جواب: یہ موضوعات بڑی لمبی بحث کے متقاضی ہیں۔ یہ سارے کے سارے نفع میں شراکت کی بنیاد پر ہونے والے کاروبار ہیں۔ ہوتا یہ تھا کہ مالک زمین کسی شخص کو مزارعت پر زمین دے دیا کرتا تھا۔ اس کے ساتھ یہ طے ہوتا تھا کہ جو پیداوار ہوگی اس کا آدھا تمہارا اور آدھا ہمارا، یا ایک تہائی تمہارا وغیرہ۔ اس بنیاد پر سودا ہو جاتا تھا۔ ان میں سے بعض شرائط اور پابندیوں کے ساتھ کچھ قسموں کی حضور ﷺ نے اجازت دے دی۔ بعض لوگ یہ کرتے تھے کہ وہ یہ طے کرتے تھے کہ جو پیداوار ہوگی اس میں سے ایک ہزار من ہمارا ہوگا باقی تمہارا ہوگا۔ یہ جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ تمام پیداوار ہی ایک ہزار من ہو۔ متعین مقدار کے ساتھ کسی ایک فریق کے حق میں شرط رکھنا جائز نہیں ہے فیصد کے حساب سے جائز ہے۔ اسی طرح سے اگر زمین مزارعہ پر دی ہے اور آپ کہیں کہ زمین کے اس حصہ کی ساری پیداوار فلاں

فریق کی ہوگی۔اور دوسرے حصہ کی دوسرے فریق کی ہوگی۔ یہ بھی جائز نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اسی حصہ میں پیداوار ہو اور دوسرے حصہ میں پیداوار نہ ہو۔ فیصد کے حساب سے بعض شرائط کے ساتھ جائز ہے۔اسی بندوبست کی مختلف قسموں کے نام ہیں: محاقلہ، مزارعہ، مساقاہ۔

مساقاہ کے معنی یہ ہیں کہ آپ کسی شخص کو مقرر کریں کہ وہ آپ کی زمین کو پانی دے دیا کرے اور اس کے معاوضہ میں آپ اس کے لئے پیداوار کی ایک پرسینٹیج مقرر کردیں۔ یہ بھی جائز ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: موجودہ دور میں اگر کسی دور کے مضافات میں تیار ہونے والی چیز اگر اس وجہ سے سستے داموں بیچی جائے کہ مارکیٹ تک پہنچانے میں انفرادی طور پر خرچہ زیادہ آتا ہو تو اس کا لینا کیا حرام ہوسکتا ہے جبکہ بیچنے والے کو مارکیٹ کی اصل قیمت کا اندازہ ہو؟

جواب: ظاہر ہے کہ حدیث میں جس چیز کی ممانعت کی ہے وہ اس صورت میں ہے کہ جہاں کسی شخص کو مارکیٹ کی اصل قیمتوں کا اندازہ نہ ہو اور اس کی ناواقفیت کا استحصال کرتے ہوئے اس کو جائز منافع سے محروم رکھنے کی کوشش کی گئی ہو۔ جہاں یہ بات نہ ہو تو وہاں ایسا کرنا جائز ہوگا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: بعض اسلامی رسالے جو کہ نقد قیمت پر کم اور قسطوں پر زیادہ ہوتے ہیں۔اس کا اسلام میں کیا حکم ہے؟

جواب: آج کے علما اور فقہا کی بڑی تعداد اس کو جائز قرار دیتی ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر کسی چیز کی نقد قیمت الگ سے متعین ہو اور کم ہو۔اور بالاقساط قیمت الگ سے متعین ہو اور وہ زیادہ ہو تو یہ جائز ہے۔ بشرطیکہ خریدار پہلے سے طے کرے کہ وہ بالاقساط قیمت پر خرید رہا ہے یا نقد قیمت پر خرید رہا ہے۔اس صورت میں اس کی ممانعت نہیں ہوگی۔لیکن اگر معاملہ ایسا ہو کہ متعین طور پر یہ طے نہ ہو کہ وہ کس انداز کی قیمت اور کس انداز کی ادائیگی کی بنیاد پر معاملہ کر رہا ہے تو ایسا کرنا جائز نہیں ہوگا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: اسٹاک ایکسچینج کا شرعی متبادل کیا ہوسکتا ہے؟

جواب: اسٹاک ایکسچینج کے شرعی متبادل کی بات تب ہوگی جب اسٹاک ایکسچینج کے سارے کاروبار کو آپ ناجائز قرار دیں گے۔ میرے خیال میں اسٹاک ایکسچینج کا سارا کاروبار ناجائز نہیں ہے۔اسٹاک ایکسچینج تجارتی کمپنیوں کے حصص کی خرید و فروخت کے لئے ایک سہولت ہے۔حکومت نے اس کو ریگولیٹ کیا ہے۔اگر اس میں ایسے حصص فروخت ہو رہے ہوں (۱) جو کسی ناجائز کاروبار کے نہ ہو۔(۲) ان حصص میں بیع الدین بالدین کی ممانعت کے اصول کی خلاف ورزی نہ ہو رہی ہو۔(۳) زر کی فروخت زر کے ساتھ کمی بیشی کے ساتھ نہ ہو رہی ہو۔اور (۴) جس میں قمار اور سٹہ نہ ہو۔ اگر یہ خرابیاں نہ ہوں تو یہ کاروبار جائز ہے۔قواعد وضوابط کی رو سے ان خرابیوں کو ختم کرنا چاہیئے۔اگر یہ خرابیاں اسٹاک ایکسچینج کے کاروبار میں نہ ہوں تو اس کی موجودہ شکل کے برقرار رہنے میں شرعی طور پر کوئی قباحت نہیں ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: کیا مدینہ کے یہودی مسلمانوں کا مال ومتاع خریدا کرتے تھے یا نہیں؟

جواب: یہودی مسلمانوں کے بازاروں میں اپنا مال ومتاع لایا کرتے تھے۔اس کی ممانعت نہیں تھی۔کسی بھی شخص کو کبھی مسلمانوں کے ساتھ کاروبار کرنے یا ان کے بازار میں بیٹھنے سے نہیں روکا گیا۔ ہر دور میں غیر مسلم تاجر مسلمانوں کے بازاروں میں تجارت کرتے رہے ہیں۔ یہ چیز شرعاً جائز نہیں ہے۔ اگر کوئی غیر مسلم اسلامی ریاست کا شہری ہے تو اس کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو مسلمانوں کو حاصل ہیں۔سیدنا علیؓ بن ابی طالب کا قول ہے کہ **'لھم مالنا وعلیھم ما علینا'** جو ہمارے حقوق ہیں وہ ان کے بھی ہیں اور جو ہماری ذمہ داریاں ہیں وہ ان کی بھی ہیں۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: جب مقامی لوگوں کو اپنے اپنے وسائل کے حقوق حاصل ہوں گے تو مرکز کے ذرائع آمدنی کیا ہوں گے؟

جواب: مرکز کو زکوٰۃ کی آمدنی سے حصہ ملے گا۔ اس کو ٹیکس لگانے کا اختیار ہوگا۔ کسٹم ڈیوٹی مرکز کو جائے گی۔ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں کسٹم ڈیوٹی مرکز کو جایا کرتی تھی۔ زکوٰۃ کا نظام حضور ﷺ کے زمانے سے یہ چلا آرہا ہے کہ اس کا ایک حصہ مرکز کو ملتا تھا۔ مرکز کے پاس انشاء اللہ وسائل کی کمی نہیں ہوگی۔ اسلام پر عمل درآمد سے وسائل میں کمی نہیں آئے گی۔ اسلام سے انحراف کے نتیجے میں مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اسلام سے وابستگی کی صورت میں مسائل پیدا نہیں ہوں گے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: کیا رسول اللہ ﷺ نے بنکاری کا کوئی نظام متعارف کرایا ہے؟

جواب: میرے علم میں تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن جو مقاصد آج کل بنکاری نظام سے حاصل کئے جاتے ہیں وہ اسلامی تعلیم کے مطابق اس وقت بھی حاصل کئے جاتے تھے۔ لوگ اپنی دولت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے تھے۔ تجارت کے لئے قرضہ بھی حاصل کرتے تھے۔ مضاربہ اور مشارکہ کی صورت میں مشترکہ کاروبار بھی ہوتے تھے۔ ان سب کی مثالیں عہد نبوی میں ملتی ہیں۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: کریڈٹ کارڈ کے بارے میں بتائیں کہ کیا ان کا استعمال کیا جا سکتا ہے کہ نہیں؟

جواب: کریڈٹ کارڈ میں بعض تفصیلات ہیں جس میں اگر سود نہ ہو استعمال جائز ہے۔ اگر ادائیگی ایک خاص مدت کے بعد کی جائے اور اس پر سود ہو تو یہ جائز نہیں ہے۔ اگر فوراً ادائیگی کر دیں اور بعض ادارے اس پر سود وصول نہیں کرتے تو یہ جائز ہے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: ہمارے علاقے میں بڑے زمیندار اپنی اجاڑ اور بے کار زمین کو چھوٹے کسانوں کو دو یا پانچ سال کے لئے ٹھیکے پر دیتے ہیں اور اس پر سالانہ ایک مخصوص رقم وصول کرتے ہیں، مثلاً سو کنال پر سالانہ پچاس ہزار عام ریٹ ہے۔ مدت اور رقم کا تعین زمین کی حالت پر مختلف ہو سکتا ہے جب کہ زمین پر محنت اور بیج کسان کا ہوتا ہے۔ اس مدت کے دوران اگر زمیندار یہ سمجھتا ہے کہ اس کی زمین اس کی توقع سے زیادہ نفع مند ہے تو مقررہ مدت ختم ہونے پر وہ اپنی زمین کسان سے واپس لے سکتا ہے یا اسی کسان کو زیادہ رقم پر دے دیتا ہے۔ مقررہ مدت کے دوران وہ کسان سے اپنی زمین واپس نہیں لیتا۔ یہ سارا معاملہ دونوں فریقوں کی باہمی رضامندی سے ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ سود ہی کی کوئی قسم ہے یا شرعی طور پر جائز ہے؟

جواب: یہ جائز ہے اور سود کی کوئی قسم نہیں ہے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: آج کل بینکوں سے لیز پر جو گاڑیاں لی جاتی ہیں کیا درست ہیں؟

جواب: لیز میں بہت سی چیزیں ہیں جو دیکھنے کی ہیں۔ ایک بنیادی چیز ہے کہ لیز کے بارے میں کوئی عمومی بات اس وقت تک نہیں کہی جا سکتی جب تک کسی متعین لیز کی دستاویزات نہ دیکھی جائیں۔ گاڑیوں کی لیز کا جو کام میزان بینک والے کرتے ہیں وہ جائز ہے۔ میں نے اس کی دستاویزات دیکھی ہیں اس کے مطابق لیز شرعاً درست ہے۔ بقیہ بینک بھی لیزنگ کا کاروبار کرتے ہیں، لیکن میں ان کی دستاویزات دیکھے بغیر کچھ کہہ نہیں سکتا۔ باقی چیزیں چھوٹی ہیں۔ البتہ ایک بڑی بنیادی چیز ہے کہ جو لیزڈ پراپرٹی ہے اس کا رسک اور اس کا encumberance لیسور کے پاس ہونا چاہیئے۔

(محاضراتِ حدیث)

If the lessor undertakes to pay the encumberance and the risk of the lesson property, then the lease is parmissible.

جواب: ایسی لیز جائز ہے اور اگر سارا رسک لیسی پر ہے تو وہ جائز نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اور تفصیلات بھی ہیں جو دستاویزات دیکھ کر معلوم کی جا سکتی ہیں۔

(محاضرات حدیث)

سوال: کیا ہمارا بنکنگ سسٹم سود سے پاک ہو جائے گا؟

جواب: مجھے یقین ہے کہ جو تجاویز اب آ رہی ہیں اور جو نیا لیگل فریم ورک اسٹیٹ بنک نے جاری کیا ہے، اس سے بلاسود بنکاری کے عمل میں مدد ملے گی اور ملک میں ایک نئی بنیاد پڑ جائے گی جس کے نتیجے میں اسلامی تجارت اور کاروبار کا ایک نیا دور شروع ہو گا۔ لیکن اس کا دارومدار صرف اسٹیٹ بنک یا کسی اور ادارے پر نہیں ہے۔ بلکہ اس کا اصل دارومدار کاروباری اور تاجر طبقہ پر ہے۔

مجھے کئی سال قبل سیالکوٹ کے چیمبر آف کامرس نے بلایا تھا کہ میں وہاں بلاسود بنکاری پر لیکچر دوں۔ بہت پہلے کی بات ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں بات شروع کرنے سے پہلے آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ توجہ سے وہ بات سنیں گے۔ وہ یہ ہے کہ بلاسود کاروبار اس ملک میں بہت آسان ہے اور بہت مشکل بھی ہے۔ ہمارے ملک میں بلاسود بنکاری اتنی ہی آسان ہے کہ جس طرح ایک سوئچ آن کرنے سے پورا کمرہ روشن ہو جاتا ہے، اسی طرح ایک سوئچ آن کرنے سے غیر سودی کاروبار ملک میں شروع ہو سکتا ہے۔ اسی طرح یہ کام اتنا مشکل ہے جیسے کسی جنگل میں بجلی کا کوئی انتظام ہی نہ ہو اور آپ سوئچ آن کر کے بلب روشن کرنا چاہیں تو یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔

آسان راستہ اور آسان حل تو یہ ہے کہ آج ہی تمام تاجر طے کر لیں کہ وہ صرف غیر سودی کاروبار کریں گے۔ جس لمحہ وہ یہ طے کر لیں گے اسی لمحے ملک میں غیر سودی کاروبار شروع ہو جائے گا۔ میں ذاتی طور پر ایسے تاجروں کو جانتا ہوں۔ ایک دو نہیں درجنوں کو جانتا ہوں جنہوں نے زندگی میں کبھی ایک پیسہ کا سود بھی نہیں لیا اور نہ ہی ایک پیسہ کبھی بنک میں رکھا ہے۔ لیکن ان کا کروڑوں کا کاروبار ہے۔ میں نے خود جا کر ان کے کاروبار دیکھے ہیں۔ ان سے ملا ہوں۔ ان حضرات کا کام دیکھ کر یقین پختہ ہو جاتا ہے کہ کاروبار کے لئے سود ناگزیر نہیں ہے۔ اگر آج راجہ بازار، راولپنڈی اور اسلام آباد کے سارے تاجر طے کر لیں کہ ہم سود نہیں لیں گے، تو راولپنڈی اور اسلام آباد سے سود ختم ہو جائے گا۔ آج بھی اسلام آباد اور راولپنڈی کے بہت سے تاجر نہ سود لیتے ہیں اور نہ دیتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود کاروبار چل رہے ہیں۔ تو یہ سمجھنا کہ سود کے بغیر کاروبار نہیں چل سکتا یہ غلط بات ہے۔ ٹھیک ہے ایک سطح تک کاروبار میں دقت ہوتی ہے۔ لیکن اس سطح سے نیچے کے کاروبار سو فیصد سود کے بغیر چل سکتے ہیں۔

اس میں اصل ذمہ داری اور فیصلہ کرنا تاجر کا ہے۔ فرض کیجئے کل حکومت قانون بنا دے اور تاجر اس کی پروا نہ کریں تو جو حشر بقیہ قوانین کا ہوا ہے اس طرح کا حشر اس قانون کا بھی ہو گا۔ اگر دو تاجر چپکے سے آپس میں سودی لین دین کر لیں اور یہ سودی لین دین قانون کی رو سے ناجائز ہو تو قانون کیا کر لے گا۔ جیسے بقیہ قوانین کی مٹی پلید ہو رہی ہے اس طرح اس کی بھی ہو گی۔

(محاضراتِ فقہ)

Is there any institue which is teaching accounting and auditing according to Islamic point of view or are there any organizations which are practising Islamic accountcancy?

جواب: ابھی تک تو کوئی ایسا ادارہ میری معلومات کی حد تک موجود نہیں ہے جس میں اسلامک اکاؤنٹینسی کی تربیت ہوتی ہو۔ لیکن اسلامک اکاؤنٹینسی کی دستاویزات آیوفی نامی ادارے نے تیار کی ہیں۔ ہمارے ہاں انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی میں ہم نے کچھ کورسز ڈیزائن کئے ہیں جن کو ہم عنقریب لانچ کرنے والے ہیں۔ ان میں چار ہفتے کے کورس بھی ہیں، دو ہفتہ کے اور شارٹ دورانیہ کے کورس بھی ہیں جو مختلف سطحوں کے بنکرز اور دوسرے لوگوں کے لئے جاری کئے جائیں گے۔ اکاؤنٹینسی کے

کچھ کورس دنیا میں ہوتے ہیں۔ کچھ قطر میں ہوتے ہیں۔ انگلینڈ میں بھی اسلامی بنکاری کا ایک ادارہ ہے جس کے سربراہ معظم علی صاحب ہیں۔ وہاں بھی یہ کورس ہوتا ہے۔ ابھی ہم نے معظم علی صاحب کے ادارہ سے ایک معاہدہ کیا ہے۔ جس کے تحت ہم ان کے تعاون سے اکاؤنٹنگ کے کچھ کورس کریں گے۔ اکاؤنٹنگ کے کورسوں میں ہمیں بنیادی طور پر دو چیزیں بتانی ہوتی ہیں۔ ایک فقہ کے بنیادی احکام اور شریعت کی اہم ہدایات، جو جدید کاروبار کے لئے ناگزیر ہیں۔ دوسرے اکاؤنٹینسی کے وہ طریقے جو اسلامی اداروں کی اکاؤنٹینسی کے لئے ناگزیر ہیں۔

اسلامی یونیورسٹی میں ہم نے ایک پروگرام ایم ایس سی اور اسلامک بنکنگ اور فنانس میں ایک پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ شروع کیا ہے۔ اس میں اسلامک اکاؤنٹینسی پر بھی ایک کورس ہے۔ جو حضرات ڈپلومہ کرنا چاہیں وہ دس مہینوں میں ڈپلومہ کر سکتے ہیں اور جو ایم ایس سی کرنا چاہتے ہیں وہ ڈپلومہ کے بعد ایک سال مزید لگا کر ایم ایس سی کر سکتے ہیں۔ یہ پروگرام بہت کامیاب ہے۔ شام کو ہوتا ہے۔ بڑی تعداد میں لوگ آ رہے ہیں۔ شام سے لے کر رات نو بجے تک اس کی کلاسیں ہوتی ہیں۔ اب تک اس میں تین بیچ کام کر رہے ہیں۔ ایک پاس آؤٹ ہو چکا ہے۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: براہ کرم انشورنس پر کوئی لیکچر ضرور دیں۔ میرے گھر والوں نے میرے نام پر بہت بڑی رقم کی انشورنس کرائی ہے۔ اب اس کی ایک ہی قسط جمع کرائی ہے۔ میں بہت کہتی ہوں کہ یہ جائز نہیں۔ لیکن گھر والے نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ زمانے کے ساتھ چلنا پڑتا ہے۔ بتایئے میں کیا کروں۔ کیا اس رقم کو ہدیہ یا صدقہ کرنا درست ہے یا گھر والوں کو ان کی مرضی کرنے دوں؟

جواب: یہ آپ مجھے الگ سے لکھ کر بتائیں کہ آپ کے گھر والوں نے کہاں اور کس ادارے میں انشورنس کی رقم جمع کروائی ہے اور اس ادارہ کی انشورنس کی تفصیلات کیا ہیں۔ اس کو دیکھ کر ہی میں کچھ بتا سکتا ہوں کہ آپ کو کیا کرنا چاہئے۔ اور کس طرح کرنا چاہئے۔

انشورنس کی بعض قسمیں جائز ہیں۔ بعض ناجائز ہیں اور بعض کو اضطراراً اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ری انشورنس ہے۔ اس کے جتنے ادارے ہیں وہ سب پاکستان سے باہر ہیں۔ کسی مسلم ملک میں ری انشورنس کا ادارہ نہیں ہے۔ ری انشورنس آج کل بہت ضروری ہوگئی ہے۔ مثال کے طور پر جتنے ہوائی جہاز فضا میں اڑ رہے ہیں ان کی ری انشورنس ضروری ہے۔ کوئی ایرلائن اس وقت تک کام نہیں کر سکتی جب تک وہ اپنے جہازوں کی ری انشورنس نہ کرا لے۔ ایسی صورت میں یا تو آپ ری انشورنس کرائیں یا پھر پی آئی اے کو بند کر دیں۔ دو ہی شکلیں ہیں۔ اس لئے پی آئی اے کو مجبوراً ری انشورنس کروانی پڑتی ہے۔ یہ اتنی بڑی رقم کا معاملہ ہے کہ کوئی مسلم ملک ابھی تک ری انشورنس کمپنی قائم ہی نہیں کر سکا ہے۔ تجویزیں آتی رہتی ہیں کہ سارے مسلم ممالک کو مل کر ایک بڑی ری انشورنس کمپنی بنانی چاہئے۔ جتنے بحری جہاز ہیں وہ ری انشور ہوتے ہیں۔ تو یہ واقعی ایسی صورت حال ہے جہاں واقعی مجبوری ہوتی ہے۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: ہاؤسنگ اسکیموں کے پلاٹس تعمیر سے قبل ہی فروخت ہونے لگتے ہیں۔ بلکہ لوگ ایڈوانس میں فارم فروخت کرتے ہیں۔ کیا یہ درست نہیں ہے؟

اگر کسی ہاؤسنگ اسکیم میں پلاننگ ہوگئی ہے اور آپ کے نام کوئی متعین پلاٹ الاٹ ہو گیا اور اس کے کاغذات آپ کو مل گئے ہیں تو اس کو آپ فروخت کر سکتی ہیں۔ یہ آپ کی ملکیت کے مترادف ہے۔ لیکن اگر ابھی وہاں پلاننگ نہیں ہوئی اور آپ کا ملکیتی پلاٹ متعین نہیں ہوا تو اس کی آگے فروخت جائز نہیں ہے۔

جواب: مثال کے طور پر ہمارے ہاں انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی میں ایک سوسائٹی بنی تھی جو ادھر بحریہ ٹاؤن کے قریب تھی۔ وہاں مجموعی طور پر تو سوسائٹی کی زمین متعین ہے۔ اس کی بہت سی قسطیں بھی لوگوں نے دے دی ہیں۔ لیکن ابھی بحریہ فاؤنڈیشن نے پلاننگ کر کے متعین نہیں کیا کہ یہ حصہ اسلامی یونیورسٹی کا ہے اور یہ کسی اور کا ہے۔ لہٰذا وہاں افراد کا الگ الگ حصہ بھی متعین نہیں ہوا۔ ایسا پلاٹ بیچنا جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ نہ وہ زمین ابھی تک میری ملکیت میں آئی ہے اور نہ میرے قبضہ میں ہے اور نہ ہی کاغذات مجھے ملے ہیں نہ وہ میری ملک تام ہے۔ جب میرا حصہ متعین ہو جائے گا کہ یہ پلاٹ نمبر میرا ہے اور اس کی فائل میرے ہاتھ میں آ جائے تو وہ بیچنا جائز ہوگا۔ اس لئے کہ کاغذات کا قبضہ میں آنا پلاٹ کے قبضہ میں آنے کے مترادف ہے۔ پلاٹ کے گلے میں تو آپ زنجیر باندھ کر نہیں رکھیں گے۔ نہ اس کو

الماری میں رکھ سکتے ہیں۔ پلاٹ کا قبضہ اس کے کاغذات پر قبضہ سے سمجھا جاتا ہے۔ یا تو اس کی دستاویز آپ کے ہاتھ میں آ گئی یا آپ نے دیوار بنا کر چوکیدار رکھ دیا۔ دونوں صورتوں میں آپ کا قبضہ مکمل ہے۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: ناجائز تجارتوں کی اقسام میں پرائز بانڈز کس زمرے میں آتے ہیں؟

جواب: پرائز بانڈ میں قمار بھی ہے، ربو بھی ہے اور میسر تو لازماً ہے۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: بنک یا مختلف کمپنیوں سے جو شیئرز خریدے جاتے ہیں کیا وہ جائز ہیں؟

جواب: شیئرز خریدے جانے کی تین شرائط ہیں۔ یاد رکھیں کہ یہ تین شرائط پوری ہوتی ہوں تو شیئرز خریدنا جائز ہے۔ اور نہیں ہیں تو ناجائز ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ جس کمپنی کے شیئرز خریدے جا رہے ہیں وہ کمپنی جائز کاروبار کر رہی ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ جس کمپنی کے شیئرز خریدے جا رہے ہیں اس کمپنی کے پاس tangible physical assests موجود ہوں۔ تیسری شرط یہ ہے کہ شیئرز کی فیوچر سیل نہ کی جائے۔ اگر تینوں شرائط ہوں تو شیئرز کی خرید و فروخت جائز ہے۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: مشارکہ کی تعریف بتا دیں۔ کیا نفع نقصان کی شراکت پر جو لوگ بنک سے نفع لیتے ہیں وہ سود ہوگا؟

جواب: مشارکہ کی تعریف یہ ہے کہ دو یا دو سے زیادہ آدمی مل کر پیسہ لگائیں۔ ان میں سے کچھ یا سب مل کر اس کاروبار کا انتظام کریں اور جو نفع ہو وہ متعین شرائط کے مطابق تقسیم ہو۔ اور اگر نقصان ہو تو لوگوں کی رقوم کے برابر ہو۔ اصول یہ ہے کہ نفع ہوگا تو وہ آپس کی شرائط کے مطابق طے کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ نے پچاس روپے لگائے۔ دوسرے نے پچیس روپے لگائے، تیسرے نے بیس لگائے اور چوتھے شخص نے پانچ روپے لگائے۔ جس نے پانچ روپے لگائے ہیں وہ کاروبار کا ماہر ہے جبکہ آپ کاروبار کے ماہر نہیں ہیں۔ اب وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ میری رقم تو پانچ روپے ہے لیکن میں نفع میں سب کو برابر رکھوں گا اور سب پچیس پچیس روپے نفع لیں گے۔ یہ کرنا جائز ہے۔ اس لئے کہ ہو سکتا ہے جس نے پچاس روپے لگائے ہیں وہ کاروبار کا ماہر نہ ہو۔ جس نے پانچ لگائے ہیں وہ ماہر ہے۔ اس لئے اصول یہ ہے کہ 'الربح علی ما شرطا' نفع کا تعین ان شرائط پر ہوگا جو فریقین نے طے کی ہیں۔ 'والوضیعة علی قدر المالین' اور اگر نقصان ہوگا تو جس نے جتنا پیسہ لگایا ہے اس کے مطابق نقصان میں حصہ دار ہوگا۔ جس نے پانچ فیصد پیسہ لگایا ہے اس کا پانچ فیصد نقصان ہوگا اور جس نے پچیس فیصد لگایا ہے اس کا پچیس فیصد نقصان ہوگا۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: جو لوگ نفع نقصان کی بنیاد پر بنکوں سے نفع لیتے ہیں کیا وہ واقعی نفع ہے یا ربا ہے؟

جواب: بنک سے ملنے والا منافع موجودہ حالات میں تو ربا ہی کے قریب قریب ہے۔ کیونکہ بنک جو آگے روپیہ دے رہا ہے وہ نفع نقصان پر نہیں دے رہا بلکہ متعین اور گارنٹی شدہ نفع پر دے رہا ہے۔ اگر بنک آگے بھی وہ رقم نفع نقصان کی شراکت پر دے رہا ہے تو ٹھیک ہے۔ لیکن بنک یہ کرتے ہیں کہ آپ سے جو روپیہ لیتے ہیں اس کو آگے سود پر دیتے ہیں۔ مثلاً دس فیصد اگر وہ سود لیتا ہے تو پانچ فیصد آپ کو دے گا اور پانچ فیصد خود رکھے گا۔ یہ بنکوں کے کاروبار کا عام انداز ہے۔ یہ جائز نہیں۔ جو بنک آگے بھی بغیر سود کے پیسے دیتے ہیں ان میں آپ سرمایہ لگا سکتے ہیں۔ لہٰذا جو اسلامی بنکاری ہے۔ جو کمرشل بنک ہیں ان میں سے کچھ بنکوں نے اسلامی بنکنگ

شروع کر رکھی ہے۔ وہ جائز ہیں۔ یہ آپ کو الگ الگ چیک کرنا پڑے گا کہ کس بنک کا کاروبار شریعت کے مطابق ہے اور کس کا نہیں۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: کیا انشورنس ناجائز ہے؟

جواب: انشورنس میں جو کوآپریٹیو انشورنس ہے اس کی بیشتر شکلیں جائز ہیں۔ جو دوسرا انشورنس ہے اس کی بیشتر شکلیں ناجائز ہیں۔ لیکن انشورنس کی تمام اقسام کو جائز یا تمام اقسام کو ناجائز نہیں کہا جاسکتا۔ آپ کو الگ الگ پتہ کرنا پڑے گا۔ کواپریٹیو انشورنس کی اکثر شکلیں جائز ہیں۔ اور جو دوسرا انشورنس ہے اس کی اکثر قسمیں ناجائز ہیں۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: اگر کسی زمین پر کسی کا ناجائز قبضہ ہو، تو کیا اس زمین کو کسی شخص کے ہاتھ اس شرط پر فروخت کیا جاسکتا ہے کہ وہ قبضہ خود چھڑا لے اور اس کے خدمت کے عوض اس سے قیمت کم لی جائے؟

جواب: میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا لیکن میرا خیال ہے کہ یہ جائز نہیں ہے۔ اس میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ پہلے آپ اس شخص کو قبضہ چھڑانے میں اپنا وکیل بنادیں۔ آپ بے شک اس کے ساتھ وعدہ کرلیں کہ آپ یہ زمین اس کو فروخت کردیں گے۔ اور جب وہ آپ کے وکیل کی حیثیت سے قبضہ حاصل کرلیں تو آپ اس کو فروخت کردیں۔ یہ شکل زیادہ بہتر معلوم ہوتی ہے۔ باقی میں اس کے جائز یا ناجائز ہونے کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھے اس میں تامل محسوس ہوتا ہے۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: کیا اسٹاک ایکسچینج کا کاروبار کیا جاسکتا ہے؟

جواب: ابھی میں وضاحت کرچکا ہوں کہ اسٹاک ایکسچینج میں جو لسٹڈ کمپنیاں ہیں یا کوٹڈ شیئرز ہیں وہ ان تین شرائط کے ساتھ جائز ہیں جن کا میں پہلے ذکر کرچکا ہوں۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: ہمارے بنکاری نظام میں ربوٰ کی نشاندہی کردیں کہ کس طرح اس سے بچا جاسکتا ہے؟

جواب: ربوٰ کی نشاندہی تو میں نے کردی ہے۔ یا تو آپ اپنا روپیہ کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھیں۔ اس میں ربوٰ نہیں ہے۔ یہ نہیں کرنا چاہتے تو سیف ڈپازٹ میں جاکر رکھ لیں۔ یہ بھی جائز ہے۔ سیف ڈپازٹ کرائے پر لینا بھی جائز ہے۔ اگر یہ دونوں ممکن نہ ہوں تو اسلامی بنکنگ کی برانچیں ہر جگہ کھل رہی ہیں۔ وہاں روپیہ رکھیں۔ وہاں بھی ممکن نہ ہو تو کم سے کم اتنا کرلیں کہ پی ایل ایس اکاؤنٹ میں رکھیں۔ پی ایل ایس اکاؤنٹ پر بھی بڑے اعتراضات ہیں لیکن یہ کم از کم بقیہ چیزوں سے بہتر ہیں۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: جس اکاؤنٹ میں فکس ڈپازٹ پر رقم رکھی ہو اس کا منافع جائز ہے کہ ناجائز؟

جواب: میرے خیال میں تو یہ ربوٰ کی ایک شکل ہے اور ناجائز ہے۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: کیا انشورنس کرنا غلط اور ناجائز ہے؟

جواب: میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ روایتی انشورنس کی بیشتر شکلیں ناجائز ہیں، اور کوآپریٹیو انشورنس کی بیشتر شکلیں جائز ہیں۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: بازار میں جو انعامی اسکیمیں نکلتی ہیں، جیسے کہ آپ نے مثال دی، اور کوئی شخص اس پروڈکٹ کو خریدتا ہے، لیکن نہ کوپن بھرتا ہے اور نہ اسکیم میں حصہ لیتا ہے اور نہ

ہی انعام لینا چاہتا ہے،تو کیا ایسا کیا جا سکتا ہے؟

جواب: میرے خیال میں انعامی اسکیموں سے بچتے ہوئے محض کموڈیٹی خریدنا جائز ہے۔آپ کو ایک خاص چیز خریدنی اور ہو آپ کو اس خاص کموڈیٹی میں دلچسپی ہو تو لے لیں اس میں مجھے کوئی قباحت معلوم نہیں ہوتی۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: کچھ لوگوں کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ لوڈو کھیلنا بھی جوئے کی ایک شکل ہے؟

جواب: نہیں، لوڈو کھیلنا جوئے کی شکل نہیں ہے۔اگر اس میں ہار جیت پر پیسہ لگایا ہے تو پھر یہ جوا ہے اور اگر پیسہ نہیں لگایا تو پھر تو کوئی بھی کھیل جوا نہیں ہے۔جو کھیل کھیلنا چاہیں، چاہے وہ جسمانی ہو، ذہنی ہو، اگر اس میں پیسہ لگایا ہے کہ جیتنے والے کو اتنے روپے ملیں گے اور ہارنے والے کو نہیں، تو یہ قمار یا جوا ہے۔لیکن اگر نہیں لگایا ہے تو جائز ہے۔

(محاضراتِ فقہ)

Is medical insurance allowed?

جواب: اس کا بھی وہی اصول ہے کہ اگر اس میں تینوں چیزیں پائی جاتی ہیں، یعنی ربوا، قمار اور غرر، ناجائز اور اگر نہیں پائی جاتی تو جائز ہوگا۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: وراثت کی تقسیم جب ہوتی ہے تو اس وقت تو سربراہ فوت ہو چکا ہوتا ہے۔تو بعد والے مال و دولت کو تقسیم کرتے ہیں۔تو غلط تقسیم کی سزا فوت ہونے والے کو کیوں ملے گی؟

جواب: یہ کس نے کہا ہے کہ فوت ہونے والے کو سزا ملے گی۔نہیں، فوت ہونے والے کو دوسروں کی کوتاہی کی کوئی سزا نہیں ہوگی۔یہ کس نے کہا کہ فوت ہونے والے کو سزا ملے گی؟ فوت ہونے والا تو چلا گیا۔اگر ورثا میں کسی نے وراثت کو شریعت کے مطابق تقسیم نہیں ہونے دیا تو غلطی اس نے کی۔جس نے بھی ایسا کیا، سزا اس کو ملے گی۔وہ مرنے والا ہو یا مرنے والے کے بعد ایسا کرنے والا۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: آپ نے فرمایا کہ جو کمپنی ابھی لانچ نہیں ہوئی اس کے شیئرز خریدنا جائز نہیں۔کیا وہ کمپنی جو چل رہی ہے اور اس کی مارکیٹ اسٹیک سب کو معلوم ہو، اس میں شیئرز خریدے جا سکتے ہیں؟

جواب: میں نے یہ کہا ہے کہ اگر کوئی کمپنی ابھی لانچ ہوئی ہے اور اس کے پاس صرف liquidity ہے اور tangible assests نہیں ہیں۔اس کے شیئرز خریدنے کے معنی یہ ہیں کہ زر کی خرید و فروخت زر کے مقابلہ میں ہو رہی ہے جو اگر ادھار یا کمی بیشی کے ساتھ ہو تو شریعت میں جائز نہیں ہے۔شریعت میں روپے پیسے کی خرید و فروخت روپے پیسے کے ساتھ اس صورت میں جائز ہے جب on the spot ہو اور par value پر ہو۔حدیث میں آیا ہے یَداً بیدٍ مثلاً بمثلٍ۔ہاتھ در ہاتھ اور برابر برابر۔

اس لئے اگر اس میں ہاتھ در ہاتھ نہ ہو یا برابر سرابر یعنی پار ویلیو par value نہ ہو تو جائز نہیں ہے۔اگر آپ کسی کمپنی کا شیئر پار ویلیو خرید رہی ہیں تو یہ ہر صورت میں جائز ہے۔بہ شرطیکہ کاروبار جائز ہو۔لیکن اگر اس کمپنی کے tangible assests نہیں ہیں تو اس کا شیئر پار ویلیو کے علاوہ نہیں خریدا جا سکتا۔پار ویلیو نہ خریدنے کے معنی یہ ہیں کہ آپ دس روپے چھ روپے میں لے رہی ہیں یا دس روپے بارہ روپے میں لے رہی ہیں تو یہ دونوں صورتیں جائز نہیں ہیں۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: مکان کرایہ پر دے کر ہم ہر مہینے بغیر کسی محنت کے کرایہ وصول کرتے ہیں اور مکان بھی ویسے کا ویسا واپس مل جاتا ہے۔اس طرح بنک میں ہم جو پیسہ جمع کرتے ہیں ہر ماہ منافع لیتے ہیں اور وقت آنے پر پوری کی پوری رقم بھی مل جاتی ہے۔تو ان دونوں میں فرق کیا ہوا؟

جواب: آپ نے میری بات غور سے نہیں سنی۔میں نے دو مرتبہ اس کی وضاحت کی تھی۔میں نے کہا تھا کہ جب آپ کسی سے کوئی چیز لیتی یا دیتی ہیں۔تو وہ چیز دو میں سے ایک طرح کی ہوگی۔یا تو وہ ہوگی جو آپ کو وہی چیز واپس مل جائے گی۔جیسے میں نے قلم، کتاب، گاڑی، سائیکل کی مثال دی تھی۔یہ چیزیں استعمال کے بعد آپ کو مل جاتی ہیں۔وہی چیز ملتی ہے جو آپ نے دی تھی۔

کچھ چیزیں وہ ہیں جو آپ استعمال کر کے ختم کر دیتے ہیں اور پھر اس طرح کی ایک اور چیز واپس دیتے ہیں۔'اُس' اور 'اُس جیسی' میں بہت فرق ہے۔زمین آسمان کا فرق ہے۔جب آپ نے مکان کرائے پر دے دیا تو وہی مکان آپ کو مل گیا۔کوئی اور مکان نہیں ملا۔یہ نہیں ہوتا کہ آپ نے ایف ایٹ میں مکان کرایہ پر لیا اور جب کرایہ دار نے خالی کیا تو ایف ٹن والا مکان آپ کو دے دیا۔یہ کرایہ داری نہیں ہے۔

جب آپ نے چینی دی، یا پیسہ دیا۔تو آپ کو وہی چینی یا وہی پیسہ واپس نہیں ملے گا۔وہ تو خرچ ہو کر کہیں کا کہیں چلا گیا وہ چیز تو ختم ہوگئی۔اب آپ کو اس جیسی رقم یا اس جتنی چینی واپس ملے گی۔وہ چیز نہیں ملے گی جو آپ نے دی ہے۔دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔دونوں کا حکم ایک نہیں ہوسکتا۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: میں نے دس برس کے لئے اپنے بیٹے کی خاطر ڈیفنس سرٹیفکیٹس خریدے ہیں، کیا وہ جائز ہیں؟

جواب: افسوس ہے کہ وہ جائز نہیں ہیں۔بہتر یہ ہوتا کہ آپ کوئی مکان خرید کر کرائے پر دے دیتیں۔آپ کے مکان کی قدر و قیمت بڑھتی اور آپ کو کرایہ بھی ملتا۔مکان نہیں تو کوئی دکان خرید لیں۔یہ ایک tangible assests ہے جو موجود رہے گا۔اس میں ربٰو کا خطرہ بھی نہیں ہے اور جائیداد کی قیمت ہر جگہ بڑھتی رہتی ہے اور پیسے کی قیمت گھٹتی رہتی ہے۔اس لئے وہ چیز لیں جس میں دین کا بھی فائدہ ہو اور دنیا کا بھی فائدہ ہو۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: استہلاکی اور استعمالی چیزوں کے بارے میں دوبارہ بتا دیں۔

جواب: انسان کی ملکیت میں جو چیزیں ہوتی ہیں اور مال کی جتنی بھی قسمیں ہیں ان کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ایک مال وہ ہے جس کو آپ نے خرچ کر کے ختم کر دیا۔یعنی consume کر دیا اور وہ ختم ہوگیا۔جیسے یہ پانی میں نے آپ سے ادھار لیا تھا۔اس کو میں نے پی لیا اور یہ ختم ہوگیا۔اب اگر اس پانی کو واپس مانگیں تو میں آپ کو واپس نہیں دے سکوں گا۔اس لئے کہ وہ تو ختم ہوگیا اور میں اس کو واپس نہیں کر سکتا۔میں اس جیسا کچھ اور پانی آپ کو واپس کر سکتا ہوں۔اسی مقدار میں واپس کروں گا۔یہ دودھ ہوسکتا ہے، شہد ہوسکتا ہے یا کوئی اور بھی چیز ہوسکتی ہے۔یہ چیزیں استہلاکی چیزیں ہیں۔اس کو آپ نے خرچ کر کے ختم کر دیا، صرف کر دیا، اور consume کر دیا۔استہلاکی کی مراد consumable۔دوسری چیز ہے استعمالی یعنی usable۔مثلاً میں نے یہ گلاس آپ سے عاریۃً مانگا اور استعمال کر کے واپس دے دیا۔جیسا لیا تھا ایسا ہی واپس کر دیا، جو چیز لی تھی وہی چیز واپس کر رہا ہوں، اس جیسی کوئی چیز واپس نہیں کر رہا ہوں۔ربٰو کی مثال میں نے یہ دی تھی کہ ربٰو ان چیزوں کے لین دین میں ہوتا ہے جو استہلاکی ہوں۔استعمالی چیزوں کے لین دین میں اکثر ربٰو نہیں ہوتا۔یہ ایک عام اصول ہے اور اس میں بعض مستثنیات بھی ہیں۔ربٰو کے اکثر و بیشتر احکام استہلاکی چیزوں میں جاری ہوتے ہیں، استعمالی چیزوں میں جاری نہیں ہوتے۔

(محاضراتِ فقہ)

سوال: آپ نے فرمایا کہ جب برائی کو برائی نہ سمجھا جائے تو پھر اس کو روکنا فرض عین ہو جاتا ہے۔سود کے بارے میں فرمائیں کہ آج کل لوگوں نے اس کو جائز کرنے کی صورتحال نکال لی ہیں۔مثلاً stock exchange banking وغیرہ وغیرہ۔

جواب: سٹاک ایکسچینج کے کاروبار کو سود کہنا تو صحیح نہیں ہے۔ اس کا سود سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ تو ایک ایسا بازار ہے جہاں فہرست میں درج یعنی لسٹڈ کمپنیوں کے شیئرز کی خرید وفروخت ہوتی ہے۔ یہ کمپنیاں ہر طرح کی ہوسکتی ہیں۔ وہ ایسی بھی ہوسکتی ہیں جو جائز کام کر رہی ہوں۔ اور ایسی بھی ہوسکتی ہیں جو ناجائز کام کر رہی ہو۔ الحمدللہ پاکستان میں کوئی listed کمپنی ایک آدھ کے علاوہ ایسی نہیں ہے کہ جو ناجائز کام کرتی ہو۔ یہاں ساری listed کمپنیاں جائز کام کرتی ہیں۔ اس لئے اگر کسی listed کمپنی کے شیئرز کی خرید وفروخت ہو رہی ہے اور اس کمپنی کے پاس زر کے علاوہ بھی سامان یا تمسکات موجود ہیں جن کی بیع وشرا اور خرید وفروخت ہو رہی ہو۔ وہ خرید وفروخت بالکل جائز ہے۔ البتہ اس کے مفصل احکام ہیں جس کو یہاں بیان کرنے کا موقع نہیں۔ جن صاحب کا یہ مسئلہ ہو وہ مجھ سے الگ سے گفتگو کر لیں۔

جہاں تک اس کا تعلق ہے کہ سود کو کچھ لوگ جائز قرار دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تو اس کی ذمہ داری تو ہم سب پر عائد ہوتی ہے۔ سود کیا ہے؟ سب کو معلوم ہے۔ سود کا مفہوم بالکل متعین ہے۔ سود کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، بہت کچھ کہا جا چکا ہے اور یہ بات کہ موجودہ بنک انٹرسٹ ''ربوٰ'' ہے اس پر اب کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اکا دکا چند افراد جو اس کے خلاف رائے رکھتے ہیں ان کی رائے کی کمزوری دلائل سے بار بار واضح کی جا چکی ہے۔ دنیائے اسلام میں ہر جگہ اس رائے کو رد کیا جا چکا ہے۔ حتیٰ کہ پاکستان میں حکومت پاکستان نے دستور پاکستان میں یہ وعدہ کیا تھا کہ ریاست کی بنیادی ذمہ داریوں میں سے ایک سود سے پاک نظام کا قیام بھی ہے۔ یہ ہمارے دستور میں آج بھی لکھا ہوا ہے۔ موجودہ ۱۹۷۳ء کے اور ماضی کے دستوروں میں بھی لکھا ہوا تھا کہ ربا کی بیخ کنی ریاست کی بنیادی ذمہ داری ہے۔

پھر ریاست نے شریعت کے نفاذ کے لئے، شریعت کی تعبیر کے لئے، جو دو ادارے بنائے ہیں اس میں سے ایک اسلامی نظریاتی کونسل ہے اور دوسرا وفاقی شرعی عدالت ہے۔ یہ دونوں ادارے ایک مرتبہ نہیں ایک سے زائد مرتبہ متفقہ طور پر رائے دے چکے ہیں کہ بنک کا منافع ربا ہے۔ یہ نقطہ نظر پاکستان میں بھی مانا جاتا ہے اور پاکستان سے باہر بھی مانا جاتا ہے۔ اسی نقطہ نظر کے مطابق اس وقت اسٹیٹ بنک آف پاکستان نے ایک لیگل فریم ورک جاری کیا ہوا ہے جو ڈاکٹر عشرت حسین نے جاری کیا تھا۔ جس میں انہوں نے اسلامی بنکاری کو پاکستان میں عام کرنے کے لئے ایک بندوبست کیا تھا۔ اسلامی بنکاری کی اجازت دینے اور اس کے لئے لیگل فریم ورک جاری کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اسٹیٹ بنک نے یہ تسلیم کیا ہے کہ موجودہ بنک کا منافع ربوٰ ہے اگر موجودہ بنک کا منافع ربوٰ نہ ہو تو پھر سارے بنک اسلامی ہیں۔ ان بنکوں کی موجودگی میں ایک لیگل فریم ورک آرڈر جاری کرنا اور اسلامی بنکوں کی اجازت دینا اور اس کے لئے شریعہ بورڈ بنانا اس کے لئے قواعد جاری کرنا اس کے لئے regulations جاری کرنا، اس کے لئے اسٹیٹ بنک میں ایک شعبہ اسلامی بنکاری بنانا، یہ سب کچھ اس بات کی دلیل ہے کہ ریاست بنک کے منافع کو ربوٰ سمجھتی ہے۔ یہ صرف پاکستان کا معاملہ نہیں ہے بلکہ ملائیشیا، انڈونیشا، بحرین، کویت، مصر اور بہت سے غیر مسلم ممالک میں بھی بنک کے منافع کو ربوٰ ہی سمجھا جا رہا ہے۔ اس وقت اسلامی بنکاری کے تین سو کے قریب ادارے دنیا بھر میں کام کر رہے ہیں، وہ اسی بنیاد پر کام کر رہے ہیں کہ بنک کے منافع کو ختم کر کے نفع نقصان میں شراکت کے نظام کو رائج کرنا ہے۔ اس لئے میرے خیال میں اب اس معاملہ میں کوئی التباس یا غلط فہمی نہیں ہے کہ بنک منافع ربوٰ ہے کہ نہیں۔ اس کا ربوٰ ہونا بالکل واضح ہو چکا ہے۔ ماہرین معاشیات نے معاشی دلائل سے اور شریعت کے ماہرین نے شرعی دلائل سے یہ بات اچھی طرح ثابت کر دی ہے۔ اگر آپ خالص علمی اور فنی انداز میں معاشی دلائل جاننا چاہیں تو ایک بہت عمدہ کتاب ابھی چند سال پہلے آکسفرڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کی ہے۔ پروفیسر شیخ محمود احمد کی لکھی ہوئی Man and Money۔ اس میں انہوں نے بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے کہ بنک منافع ربوٰ ہے اور اس میں وہ ساری خرابیاں پائی جاتی ہیں جو ربا میں پائی جاتی تھیں۔ اور یہ کہنا کہ usury اور interest میں فرق ہے یہ محض ایک غیر علمی، غیر عقلی، غیر حقیقی اور بے بنیاد بات ہے۔

(عصرِ حاضر اور شریعت اسلامی)

سوال: جس ملک کی معیشت سودی نظام پر مبنی ہو تو اس کے شہریوں کی کیا حیثیت ہے؟

جواب: اس ملک کے شہری مسلمان ہیں اور ایک مسلمان ملک کے شہری ہیں۔ البتہ مسلم ملک میں سود ایک لعنت ہے جس کو ختم ہونا چاہئے۔ ہم حکومت کو الزام دیتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم میں سے ہر شخص آج طے کر لے کہ سود نہ دینا ہے نہ لینا ہے تو یہ نظام ایک دن ختم ہوسکتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں مسئلہ یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص سود لیتے ہوئے اس کے جواز یا حرمت کی بحث میں نہیں پڑتا۔ ہاں جب سود دینا ہو تو شریعت کے احکام کا خیال آتا ہے۔ یہ رویہ غلط ہے اور جب تک یہ رویہ ہے سود ختم نہیں ہوسکتا۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹرمحمود احمد غازی)

سوال: زکوٰۃ کی کٹوتی کے بعد اسلامی ریاست میں انکم ٹیکس کا کیا جواز ہے؟

جواب: زکوٰۃ کے علاوہ حکومت کوٹیکس لگانے کا اختیار آج بھی ہے، گزشتہ کل بھی تھا، اور آئندہ کل بھی رہے گا۔ اس لئے کہ ریاست کی ذمہ داریاں بہت ہیں۔ ریاست عدالتیں قائم کرتی ہے۔ ملک کی سرحدوں کا دفاع کرتی ہے۔ اس قسم کے اور بیسیوں ادارے بھی قائم کرتی ہے جو نظام مملکت چلانے کے لئے ضروری ہیں۔ یہ سارے کام زکوٰۃ کی رقم سے نہیں چل سکتے۔ اس لئے دیگر ٹیکس لگائے جاسکتے ہیں، قرآن مجید، حدیث شریف، تعامل صحابہ اور اجماع امت سے یہ بات ثابت ہے، جو اختلاف ہے وہ صرف اتنا ہے کہ کیا زکوٰۃ کے علاوہ بھی کوئی دائمی اور نا قابل تغیر ٹیکس مسلمانوں پر واجب ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں۔ دیگر ٹیکس بدل بھی سکتے ہیں، کم وبیش بھی ہو سکتے ہیں اور اگر حالات اجازت دیں تو معاف بھی ہو سکتے ہیں۔ رہا دوسرا سوال جو میں خود آپ سے کرتا ہوں کہ کیا موجودہ ٹیکسوں کا نظام عادلانہ اور منصفانہ ہے۔ میرا جواب ہے کہ نہیں۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹرمحمود احمد غازی)

سوال: معذرت خواہ ہوں کہ میرا سوال موضوع سے ذرا ہٹ کر ہے۔ وہ یہ کہ حکومت پاکستان مکان بنانے کے لئے قرضہ فراہم کرتی ہے اور بیس سال کی مدت میں قسطوں میں وصول کرتی ہے، اگر اس دوران مقروض صاحب نصاب ہو جائے تو کیا وہ اس سے زکوٰۃ ادا کرے گا، حالانکہ وہ قسطیں ادا کر رہا ہے۔

جواب: میں سوال کی نوعیت اور مقصد کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکا، جو کچھ سمجھ سکا ہوں عرض کرتا ہوں۔ ایک شخص کے ذمہ قسطیں واجب الادا ہیں، مثلاً ایک ہزار روپے ماہانہ کے حساب سے وہ قسطیں ادا کر رہا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک ہزار روپیہ ماہوار بچت بھی کر رہا ہے۔ یہ بچت سارا سال اس کے پاس رہتی ہے۔ اب اگر اس جمع شدہ رقم سے وہ قرضہ ادا کر دے تو وہ صاحب نصاب نہیں رہتا۔ اس صورت میں اس پر زکوٰۃ کی ادائیگی واجب نہیں۔ اور اگر قرضہ ادا کر کے بھی وہ صاحب نصاب رہتا ہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹرمحمود احمد غازی)

سوال: آپ نے فرمایا ہے کہ زکوٰۃ کی شرح اور زکوٰۃ کے مال میں حکومت وقت کمی بیشی نہیں کر سکتی۔ مختلف بچت سکیموں پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں سے زکوٰۃ نہیں کاٹی جائے گی۔ اس بارے میں آپ کیا فرمائیں گے؟

جواب: جب سنہ ۹ ہجری میں زکوٰۃ فرض کی گئی تھی تو اس وقت مختلف جائدادوں کے بارے میں واضح کر دیا گیا تھا کہ اگر فلاں جائداد اتنی ہوگی تو اس پر اتنی زکوٰۃ ہوگی، جس دن سے زکوٰۃ فرض کی گئی صحابہ نے اس دن سے زکوٰۃ ادا کرنا شروع کر دی۔ اور اس میں کبھی زکوٰۃ لینے اور زکوٰۃ دینے والے کے درمیان اختلاف نہ ہوا۔ زکوٰۃ دینے والوں نے ہمیشہ پوری ذمہ داری سے زکوٰۃ ادا کی اور زکوٰۃ وصول کرنے والوں نے ہمیشہ بڑی دیانت داری سے زکوٰۃ وصول کی۔ صحابہ کرام، تابعین حتی کہ بنی عباس کے دور تک ایسی مثالیں تو ملتی ہیں کہ زکوٰۃ ادا کرنے والا زیادہ دینا چاہتا ہے اور وصول کنندہ کہتا ہے کہ تم پر اتنی نہیں بنتی بلکہ اس سے کم زکوٰۃ واجب الادا ہے۔ گویا اختلاف اس پر تو ہوا کہ دینے والا زیادہ دینا چاہتا تھا، لیکن ایسی مثال کوئی نہیں ملتی کہ دینے والا کم رقم دینا چاہتا ہو اور لینے والا زیادہ رقم کا مطالبہ کرتا ہو۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں جب سلطنت کا دائرہ بہت پھیل گیا تو ان کے پاس ایک شکایت آئی کہ فلاں علاقے میں ایک شخص کے بارے میں یہ شبہ کیا جا رہا ہے کہ اس نے اپنے مال میں سے کچھ چھپایا ہے اور اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کی۔ اور ہمیں خطرہ ہے کہ اس طرح لوگ مال چھپا کر زکوٰۃ کم دیا کریں گے۔ سیدنا عثمانؓ نے فوراً اس مسئلے کی نوعیت اور اس میں مضمر خطرات کو بھانپ لیا۔ اور صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا اور بحث وتمحیص کے بعد مال کی دو اقسام بیان کر دی گئیں: اموال ظاہرہ اور اموال باطنہ۔ اموال ظاہرہ تو وہ ہیں جو سب کے سامنے موجود ہیں یا جن کا معلوم کرنا نہایت آسان ہے۔ جسے چھپایا نہیں جا سکتا، جیسے کھیتی، سامان تجارت، جانور یا جیسے آج کل کے دور میں بینک اکاؤنٹس ہیں، ان کو ایک قسم قرار دیا گیا۔ اموال باطنہ وہ اموال قرار پائے جو لوگوں کے پاس خفیہ طور پر عام لوگوں کی نظروں سے ہٹ کر کہیں محفوظ ہوں۔ جیسے زیورات وغیرہ۔ حضرت عثمانؓ نے فیصلہ کیا کہ آئندہ سے اموال ظاہرہ کی زکوٰۃ وصول کرنا حکومت کی ذمہ داری ہوگی اور اموال

باطنہ میں زکوٰۃ دینا خود فرد کی ذمہ داری ہوگی۔ اس لئے کہ اگر اموال باطنہ کی زکوٰۃ وصول کرنے اور ان کا کھوج کرید کر کے پتا لگانے کا حکومتوں اور ان کے کارندوں کو اختیار دیا گیا تو اس سے بہت زیادہ گھمبیر مسائل پیدا ہوں گے اور بدعنوانی، دھوکا اور کرپشن کے راستے کھل جائیں گے۔ اس لئے حضرت عثمانؓ نے بڑی حکمت اور بصیرت سے کام لیتے ہوئے اس راستے کو بند کر دیا۔ اب اگر حکومت کسی اکاؤنٹس پر زکوٰۃ وصول نہیں کرتی اور اسے اموال باطنہ فرض کر لیتی ہے تو اس کی فرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ خود اس کی زکوٰۃ ادا کرے۔ آج سے تقریباً تین یا ساڑھے تین سال پہلے اپریل ۱۹۹۱ء میں اس وقت کے سیکرٹری زکوٰۃ وعشر سے میں نے پوچھا تھا کہ کیا یہ درست ہے کہ پاکستان میں جب زکوٰۃ کٹنے لگتی ہے تو لوگ بینکوں میں سے رقمیں نکلوا لیتے ہیں اور حکومت کو زکوٰۃ نہیں دیتے۔ اس پر انہوں نے مجھے اعداد وشمار دکھائے تھے اور بتایا تھا کہ پاکستان میں کل چھیاسی لاکھ اکاؤنٹ ہولڈرز ہیں۔ ان میں سے بمشکل تین یا چار فیصد ایسے ہوں گے جو اپنی رقوم بینک سے نکلوا لیتے ہیں ورنہ سب خوشی سے زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

(تاریخ اسلام)

سوال: عہد حاضر میں یہود نواز علما فرماتے ہیں کہ بیت المقدس میں جہاں پہلے ہیکل سلیمانی تھا۔اسلامی رواداری کی بنیاد پر وہاں یہودی عبادت گاہ کی تعمیر کا حق تسلیم کیا جانا چاہئے۔

جواب: مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔جب حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں بیت المقدس مسلمانوں کے ہاتھ آیا تھا۔اس وقت عیسائیوں سے ایک معاہدہ ہوا تھا۔اس معاہدہ پر سیدنا عمر فاروقؓ،حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح،حضرت خالدؓ بن ولید اور حضرت معاذؓ بن جبل جیسے بڑے بڑے صحابہ کے دستخط تھے۔اس میں عیسائیوں کے کہنے پر یہ شرط رکھی گئی تھی کہ یہودیوں کو بیت المقدس میں داخلہ کی اور آباد ہونے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔یہ شرائط نامہ 'عہدہ عمریۃ' کہلاتا ہے۔دستاویز آج بھی موجود ہے۔مسلمانوں نے اس دور سے لے کر 1908ء میں سلطان عبدالمجید خان کی خلافت کے خاتمہ تک اس کی پابندی کی۔اس کے بعد مغربیت اور روشن خیالی کے نام پر اس معاہدہ کی خلاف ورزی شروع ہوئی جس کے نتائج آپ کے سامنے ہیں۔

ہیکل سلیمانی یا بیت المقدس پر یہودیوں کا کوئی حق نہیں ہے۔اگر یہودیوں کا کوئی حق تھا تو عیسائی یہ حق کب کا ان سے لے چکے تھے۔مسلمانوں نے ایک معاہدہ کے تحت بیت المقدس کا قبضہ عیسائیوں سے لیا تھا اور مسلمانوں کو اس معاہدہ کی پابندی کرنی چاہئے۔اگر آج کچھ پست ہمت اور پست حوصلہ لوگ تاریخ کو بھلانا چاہتے ہیں تو یہ ان کی پست حوصلگی اور بزدلی کی دلیل ہے۔قوموں کی تاریخ میں چالیس پچاس سال کوئی مدت نہیں ہوتی۔چین کے ایک جزیرے پر پانچ سو سال سے پرتگال کا قبضہ ہے۔ایک دوسرے جزیرے پر چار سو سال تک انگریزوں کا قبضہ رہا۔لیکن چین نے اس قبضہ کو تسلیم نہیں کیا اور بالآخر وہ جزائر خالی کرالئے گئے۔جزیرہ مکاؤ پر پانچ سو سال تک قبضہ رہا۔پانچ سو سال گزرنے کے بعد خالی کرالیا گیا۔فاکس لینڈ پر برطانیہ دوسو برس سے قابض ہے لیکن ارجنٹائن نے اس کو تسلیم نہیں کیا ہے۔یہ تو بزدل اور پست ہمت مسلمان قیادتیں ہیں جو دو چار پانچ دس سال ہی کے بعد حوصلہ ہار کر مسلمانوں کی ہر چیز دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔یہ مسلمانوں کے مقدس علاقے ہیں،کسی مسلمان لیڈر کی ذاتی یا خاندانی جاگیر نہیں ہیں۔نہ کسی بزدل اور پست حوصلہ لیڈر کے فیصلہ کی دنیائے اسلام پابند ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: حضرت عباس بیعت عقبہ ثانیہ کے وقت حضورﷺ کے ساتھ تھے۔نتیجہ کے طور پر وہ مسلمان شمار کئے جاتے تھے۔پھر کفار مکہ کی طرف سے لڑتے ہوئے قیدی کیوں بنے؟ کیا ان دونوں باتوں میں تضاد نہیں ہے؟

جواب: ممکن ہے آپ کو ان دونوں باتوں میں تضاد نظر آتا ہو۔لیکن جب وہ بدر میں کفار مکہ کی فوج کے ساتھ تشریف لا رہے تھے تو حضورﷺ نے فرمایا تھا کہ عباس قریش کے ساتھ بادل نخواستہ آرہے ہیں۔اس لئے اگر کسی شخص کی زد میں آجائیں تو اس پر حملہ نہ کرے۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضورﷺ کو ان کی اصل حیثیت اور کارکردگی کے بارے میں علم تھا۔کسی بھی خفیہ کارندے کے بارے میں یہ اعلان نہیں کیا جاسکتا کہ فلاں شخص ہمارا خفیہ کارندہ ہے،لہٰذا اس کے ساتھ اپنوں والا سلوک کیا جائے۔اس لئے اگر وہ بطور مسلمان کے خفیہ طور پر مکہ میں رہے تو یہ بات صرف رسول اللہﷺ کے علم میں ہوسکتی تھی۔اگر وہ کفار مکہ کے ساتھ واپس جانے سے انکار کردیتے تو ان کا اعتماد متاثر ہوتا۔اس لئے ساتھ روانہ ہوگئے۔میرے خیال میں اس میں کوئی قباحت یا تعارض نہیں ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: کیا حضورﷺ کے زمانے میں مدینہ اور خیبر کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی یہودی آباد تھے؟

جواب: حضورﷺ کے زمانے میں مدینہ اور خیبر سے باہر بھی بڑی تعداد میں یہودی آباد تھے۔مدینہ اور جزیرہ عرب میں تو یہودیوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں کچھ لوگ ان کا ساتھ چھوڑ کر جزیرہ عرب میں آکر آباد ہوگئے تھے اور یہ ان کی اولاد ہے۔یہ کہا جاتا ہے، ممکن ہے صحیح ہو۔یہودیوں کی بڑی تعداد بہرحال جزیرہ عرب سے باہر آباد تھی۔اس لئے مدینہ منورہ پر ان کا دعویٰ کسی بھی اعتبار سے درست نہیں ہے۔اگر سابقہ ملکیتوں

کودعووں کی بنیاد مان لیا جائے تو اسپین پر مسلمانوں کا دعویٰ ہونا چاہئے۔ پرتگال اور یہاں تک کہ امریکہ پر مسلمانوں کا دعویٰ ہونا چاہئے۔ امریکہ کو سب سے پہلے مسلمانوں نے دریافت کیا تھا اور وہاں ایک قوم جو سو فیصد مسلمان تھی اور مدجنین کہلاتی تھی، آباد تھی۔ اس کا وجود ابھی کچھ دن پہلے دریافت ہوا ہے۔ انگریزی میں اس کو ملنجز کہتے ہیں۔ ملنجز میں تبلیغ اسلام کا کام بڑے زور وشور سے ہورہا ہے۔ اگر پرانی تاریخی روایات کے حوالے سے ملکوں کی قسمت کے فیصلے ہونے لگیں تو پوری دنیا کا نقشہ بدلنا پڑے گا۔ اس کے لئے دنیا شاید تیار نہ ہو۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: کیا واقدی شیعہ تھے؟ اگر نہیں تو بعض تذکرہ نگاروں نے ان کو شیعہ کیوں لکھا ہے؟

جواب: اس زمانے میں تشیع اور مفہوم کا ہوتا تھا۔ سنی شیعہ حضرات میں بعد میں جو شدت پیدا ہوئی، یہ اس زمانے میں نہیں تھی۔ اس زمانے میں ہر وہ شخص جو حضرت علیؓ یا اہل بیت سے زیادہ محبت رکھتا تھا وہ شیعہ کہلاتا تھا۔ واقدی کے بارے میں بھی بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ وہ شیعہ تھے۔ ان کی کتاب کو پڑھ کر معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کسی فرقہ وارانہ مفہوم میں شیعہ ہوں گے۔ کتاب میں کئی ایسی چیزیں بھی ہیں جو شیعہ روایات کے خلاف ہیں۔ مثلاً شیعہ روایت یہ ہے کہ مرحب کا قتل حضرت علیؓ نے کیا تھا۔ واقدی نے لکھا ہے کہ محمد بن مسلمہ نے کیا تھا۔ عمرو ابن عبدود کے بارے میں شیعہ روایت ہے کہ اس کو حضرت علیؓ نے قتل کیا تھا۔ واقدی کی روایت یہ ہے کہ کسی اور صحابی نے قتل کیا تھا۔ اگر واقدی ہمارے ہاں رائج معنوں میں شیعہ ہوتے تو اس طرح کی روایات کو بیان نہ کرتے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: طبقات صحابہ کے بارے میں آپ نے جن تین کتابوں کا ذکر کیا ہے ان کے نام دوبارہ بتائیں؟

جواب: وہ تین کتابیں یہ ہیں:

(۱) علامہ ابن عبدالبر کی 'الاستیعاب فی معرفة الاصحاب'

(۲) حافظ ابن حجر کی 'الاصابه فی تمییز الصحابه'

(۳) علامہ ابن اثیر کی 'اسد الغابه فی معرفة الصحابه'

(محاضراتِ سیرت)

سوال: خطیب بغدادی نے امام اعظمؒ کے بارے میں بہت کچھ جھوٹ لکھا ہے۔ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟

جواب: یہ تو خطیب بغدادی سے پوچھیں کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔ میں نے یہ عرض کیا تھا کہ خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں یا ابن عسا کر نے تاریخ دمشق میں وہ تمام روایات جمع کی ہیں جن میں بغداد یا دمشق کا حوالہ ہے۔ آپ نے شاید خود خطیب بغدادی کی کتاب نہیں دیکھی۔ بلکہ آپ نے خطیب بغدادی کے بارے میں ذرا متشدد احناف کا تبصرہ ہی پڑھا ہے۔ خطیب بغدادی نے دونوں روایات جمع کی ہیں۔ جنہوں نے امام صاحب پر تنقید کی ہے وہ بھی جمع کی ہیں اور جنہوں نے امام صاحب کے حق میں بات کی ہے وہ بھی جمع کی ہیں۔ میرے خیال میں اگر آپ کا خیال یہ ہو کہ ان کو وہ روایات بیان نہیں کرنی چاہئیں جو امام صاحب پر تنقید میں ہیں تو یہ ایک وقیع رائے ضرور ہے۔ لیکن خطیب بغدادی کو اس سے اتفاق نہیں تھا۔ ممکن ہے کہ خطیب بغدادی نے اس کو objectivity کے خلاف سمجھا ہو۔ خطیب بغدادی کی ان روایات کا بہت سے اہل علم اور مورخین نے جائزہ لیا ہے۔ خاص طور پر البانیہ کے رہنے والے ایک بزرگ تھے، شیخ محمد زاہد الکوثری، جو عثمانیوں کے آخری دور میں استنبول میں شیخ الاسلام کے دفتر کے سربراہ تھے۔ انہوں نے ایک کتاب 'تانیب الخطیب' لکھی تھی جس میں خطیب بغدادی کی ان تمام روایات کا جائزہ لیا گیا تھا۔ یہ بڑی ضخیم کتاب ہے اور کئی بار چھپی ہے۔ میرے خیال میں خطیب بغدادی نے جو کچھ کہا ہے اس کا اس کتاب میں بہت مؤثر جواب دے دیا گیا ہے۔ اب ان کو مطعون کرنا شاید مناسب نہ ہو۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: کیا یہ بات درست ہے کہ بنی لاوی کے پاس لکھی ہوئی تورات تھی؟

جواب: بالکل درست ہے۔ جب تورات کی تختیاں لکھی ہوئی حضرت موسیٰ کو ملیں تو وہ حضرت ہارونؑ کے پاس تھیں اور بعد میں ان کے جانشینوں کے پاس آئیں۔ ان کا خاندان بنی لاوی کہلاتا ہے ان کے پاس تھیں لیکن جب ضائع ہوگئیں تو سب کی ضائع ہوگئیں۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: کیا عبدالملک کا علم، تقویٰ اور بزرگی خلافت پر فائز ہونے سے پہلے اور بعد میں برابر ہے یا اس میں علما کا اختلاف ہے؟

جواب: میرے نزدیک تو دونوں صورتوں میں اس کا درجہ اور مقام و مرتبہ ایک ہی تھا۔ خلیفہ بننے کے بعد بھی وہ ایسا ہی تھا جیسے پہلے تھا۔ آپ کو اختلاف ہے تو آپ کو اختیار ہے کہ دلائل اور تاریخی شواہد کی بنیاد پر اس سے اختلاف کریں۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: کل آپ نے فرمایا تھا کہ عرب میں کوئی قانون نہیں تھا۔ آج کے لیکچر میں آپ نے منافرہ کا ذکر کیا ہے جو ایک قسم کا قانون ہے۔

جواب: منافرہ کوئی مدون قانون نہیں تھا۔ آپ اس کو ایک رواج کہہ سکتے ہیں۔ کل جب میں نے کہا تھا کہ عرب میں کوئی قانون نہیں تھا تو میری مراد یہ تھی کہ جزیرہ عرب کے علاقوں مدون اور مرتب قانون کی کوئی روایت نہیں تھی۔ ایسے قانون کی جو پورے عرب کے علاقوں کے لئے مشترکہ طور پر قابل قبول ہو۔ جیسے جسٹینین کا کوڈ تھا جو پوری رومن سلطنت کے لئے ایک مشترک قانون کی حیثیت رکھتا تھا۔ یا دنیا کے کچھ دوسرے حصہ میں اور طرح کے مدون قوانین تھے، ایسا کوئی قانون عرب میں نہیں تھا۔ عرب میں مختلف قبائل کے اپنے اپنے رواجات تھے۔ منافرہ کا رواج قبیلہ قریش اور اس کے موالی میں تھا۔ اس کو اول تو قانون نہیں کہا جاسکتا کیونکہ یہ محض ایک رواج تھا۔ اگر اس کو قانون کہا جائے تو پورے عرب کے لئے نہیں تھا۔ عرب کے بیشتر علاقوں میں اس عمل درآمد نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے میری کل کی بات کی آج کی گفتگو سے تردید نہیں ہوتی۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: محمد بن قاسم کے ساتھ کون کون سے صحابہ کرامؓ یہاں آئے اور کہاں کہاں انہوں نے قیام کیا؟ کچھ ارشاد ہو۔

جواب: ان صحابہ کرامؓ کے نام یاد رکھنا تو بہت دشوار ہے۔ اس سلسلے میں میرے محدود مطالعے کے بموجب دو کتابیں لکھی گئی، ایک تو مشہور مورخ اور محقق قاضی اطہر مبارک پوری کی ہے جنہوں نے سندھ اور ملتان کی ابتدائی اسلامی تاریخ پر بڑا وقیع کام کیا ہے۔ وہ ہندوستان کے ضلع اعظم گڑھ میں واقع بستی مبارک پور میں رہتے ہیں، انہوں نے قدیم تاریخ پر بہت کام کیا ہے اور ایک درجن سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں، انہوں نے عربی میں ایک کتاب لکھی تھی جو میں نے آج سے پچیس چھبیس سال پہلے پڑھی تھی۔ جس کا موضوع ہی سندھ تشریف لانے والے صحابہ کرامؓ کا تذکرہ تھا۔ انہوں نے آٹھ یا نو صحابہ کرامؓ کے نام لکھے تھے جنہوں نے اس علاقے میں قیام فرمایا، ان میں سے ایک صحابی نے تو شاید آپ کے اس شہر بہاول پور یا اچ کے قریب قیام کیا تھا۔ مجھے اصل جگہ کا نام یاد نہیں رہا۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

(جہاد)

سوال: غزوہ بدر کے بارے میں شبلی نعمانی کا طرزِ عمل مستشرقین کے سبب شاید نہ ہو۔ کیونکہ حالیہ دور میں شائع ہونے والی اور سعودی عرب سے اول انعام پانے والی کتاب الرحیق المختوم میں بھی غزوہ بدر کے واقعات کو پڑھ کر وہی تاثر ابھرتا ہے جو مستشرقین نے تحریر کیا ہے۔ براہ کرم غزوہ بدر کے پس منظر پر اجمالاً روشنی ڈالئے جو آپ کے خیال میں مستند بھی ہو۔

جواب: اس سوال کا تفصیلی جواب دیا جائے تو بات بڑی لمبی ہو جائے گی۔ اس لئے اختصار سے جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ اصل میں واقعہ یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ملی کہ کفارِ مکہ مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کے خلاف بہت بڑا لشکر تشکیل دینا چاہتے ہیں اور اس غرض کے لئے انہوں نے فنڈ ریزنگ کا کام شروع کیا ہے اور ایک تجارتی قافلہ اسی کام کے لئے شام بھیجا ہے کہ جب وہ تجارت کر کے آئے تو اس سے آنے والے منافع کا ایک حصہ مسلمانوں کے خلاف جنگ کے لئے استعمال کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس تجارتی قافلہ کو روکنا چاہا۔ ایسا کرنا حالت جنگ میں بالکل جائز ہے۔ اس پر کوئی قدغن نہیں ہے کہ حالت جنگ میں آپ دشمن پر معاشی دباؤ ڈالیں اور دشمن فوج تک ایسے وسائل کی آمد اور رسائی روکیں جو آپ کے خلاف استعمال ہو سکتے ہوں۔ دنیا کا ہر قانون اس کی اجازت دیتا ہے۔ آج کا بین الاقوامی قانون بھی اس کی اجازت دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی اپنا جائز دفاع کرنے کی خاطر اس کو روکنا چاہا۔

جب آپ اس کو روکنے کے ارادے سے مدینہ منورہ سے باہر نکلے تو معلوم ہوا کہ وہ قافلہ تو بچ کر نکل گیا ہے لیکن قریش کی ایک فوج مسلمانوں سے لڑنے کے لئے آن پہنچی ہے۔ دراصل جونہی قریش کو یہ اطلاع ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ لشکر لے کر نکلے ہیں تو قریش بھی ایک ہزار کا لشکر لے کر مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ اب مسلمانوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ اس فوج کا مقابلہ کریں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے بغیر کسی تیاری اور بے سروسامانی کے اس کا مقابلہ کیا۔ حضور ﷺ تو چونکہ کسی فوجی لشکر کا مقابلہ کرنے نہیں آئے تھے۔ اس لئے آپ کے پاس عسکری تیاری نہ ہونے کے برابر تھی۔ بہت سے صحابہ جو آ سکتے تھے وہ موجود نہیں تھے۔ صحابہ کرام کے پاس اسلحہ بھی پورا نہیں تھا۔ لیکن انہوں نے جرات اور ہمت سے مقابلہ کیا اور انہیں کامیابی ہوئی۔

یہ غزوہ بدر کی تفصیل ہے جو قرآن پاک میں بیان ہوئی ہے۔ یہی تفسیر ہے جو سیرت کی کتابوں میں بھی آئی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے یہ چاہا کہ وہ یہ ثابت کریں کہ رسول اللہ ﷺ قافلہ کو روکنے کے ارادے سے نہیں نکلے تھے۔ اس کے لئے انہیں بہت سے واقعات کی تاویل اور توجیہ کرنی پڑی جو بہت کمزور ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: غزوہ خیبر کے بنیادی اسباب کیا تھے؟

جواب: غزوہ خیبر کے بنیادی اسباب یہ تھے کہ خیبر کے یہودیوں نے کفارِ مکہ کا ساتھ دیا تھا۔ غزوہ احزاب کے بڑے حصہ کے اخراجات برداشت کئے تھے۔ اس لئے ان کے معاشی زور کو توڑنا ضروری تھا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: غزوہ بدر کے اسباب میں کچھ مورخین نے اہل مکہ کے تجارتی قافلہ میں رکاوٹ ڈالنے کی بات کی ہے یہ بات کہاں تک مستند ہے؟

جواب: غزوہ بدر سے پہلے کفارِ مکہ نے حضور ﷺ کے خلاف جنگی تیاریوں کا آغاز کر دیا تھا۔ وہ مسلمانوں کو زک پہنچانے کے لئے لشکر کی تیاری کر رہے تھے۔ دشمن پر معاشی دباؤ ڈالنا دنیا کے ہر بین الاقوامی قانون کے مطابق جائز ہے۔ اس لئے اس میں کوئی قباحت نہیں تھی کہ قریش پر معاشی دباؤ ڈالا جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے قریش پر اقتصادی دباؤ ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ دنیا کے ہر قانون کے مطابق آپ کو یہ حق حاصل تھا۔ اس لئے اس میں شرمانے کی کوئی بات نہیں۔ بعض مصنفین نے اگر کسی وجہ سے اس کو ماننے میں کسی تامل کا اظہار کیا ہے تو میں اس کی وجہ نہیں جانتا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: آپ نے فرمایا کہ قیدیوں کو قتل کرنا منع تھا تو بدر سے واپسی پر امیہ جاہلیت کے زمانے کے قتل کے بدلہ میں قتل کر دیئے گئے تھے۔اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: دیکھیں! جنگی مجرموں کا مسئلہ دوسرے قیدیوں سے مختلف ہوتا ہے۔جنگی مجرموں کا قتل دنیا کے ہر قانون میں جائز ہے۔حضور نے غزوہ بدر، فتح مکہ اور اس طرح کے کچھ اور مواقع پر کچھ لوگوں کو جنگی مجرم قرار دیا تھا۔تین چار آدمی جو جنگی مجرم تھے ان کو قتل کیا گیا۔عام قیدیوں کو حضور کے زمانے میں کبھی بھی قتل نہیں کیا گیا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: حضور رحمت للعلمین ﷺ تھے تو ان کو غزوات کی کیا ضرورت تھی؟

جواب: حضور رحمت للعلمین ﷺ ہی کا تقاضا ہے کہ بدمعاشوں، بدکرداروں اور ظالموں کے خلاف تلوار اٹھائی جائے۔یہ رحمت کے خلاف ہے کہ آپ ظالم اور مظلوم کے ساتھ ایک ہی طرح کا معاملہ کریں۔جس نے چوری کی ہے اور جس کے ہاں چوری ہوئی ہے ان دونوں کو ایک ہی ترازو میں تولنا، جس نے قتل کیا ہے اور جو قتل ہوا ہے ان دونوں کو ایک نظر سے دیکھنا عدل کے خلاف ہے۔حضور رحمت للعلمین ﷺ تھے۔آپ کی رحمت کا سب سے بڑا تقاضا عدل ہے۔جس کے قرآن میں بار بار اشارے ہیں۔عدل اور رحمت کا تقاضا ہے کہ بدکاروں کے خلاف تلوار اٹھائی جائے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: دشمن افواج کو گرفتار کرنے کے بعد اگر مسلمان افواج کے پاس جگہ نہ ہو، یا ارد گرد دشمن کی فوج موجود ہو اور حالات نازک ہوں تو ایسی صورت میں کیا کرنا چاہئے۔

جواب: میں کیا کہہ سکتا ہوں۔امیر البحر موجود ہیں ان سے پوچھیں میں نے تو کبھی فوج کی کمان نہیں کی اس لئے مجھے نہیں معلوم کہ ایسی صورت میں کیا کرنا چاہئے۔اسلامی احکام وہ ہیں جو میں نے بیان کئے۔ان احکام کی روشنی میں جو آسان اور قابل عمل حل ہو وہ اختیار کرنا چاہئے۔کسی زخمی کو قتل نہیں کیا جائے گا۔کسی قیدی کو سزائے موت نہیں دی جائے گی۔کسی بھاگنے والے کا پیچھا نہیں کیا جائے گا۔عورتوں اور بچوں کا قتل نہیں کیا جائے گا۔دشمن کے فوج کے ساتھ جو طبی دستہ ہے اس پر حملہ نہیں کیا جائے گا۔یہ احکام ہیں ان کے مطابق جو مناسب انتظام ہو وہ کرنا چاہئے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: میثاق مدینہ کے بعد حضور ﷺ کے حکم پر صحابہ کرام کی چھاپہ مار کاروائیاں کس حد تک درست تھیں؟

جواب: ابھی میں کہہ چکا ہوں کہ جس چیز کو آپ چھاپہ مار کاروائیاں کہہ رہے ہیں وہ غزوہ بدر کے بعد شروع ہوئیں غزوہ بدر کی صورت میں مسلمانوں کے خلاف اعلان جنگ ہو چکا تھا۔اس کے بعد چھاپہ مار کاروائیاں درست تھیں۔

کل میں نے عرض کیا تھا کہ اگر پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جنگ شروع ہو جائے اور پاکستان کی نیوی یہ محسوس کرے کہ ہندوستان کا کوئی تجارتی جہاز پاکستان کے خلاف استعمال کرنے کے لئے اسلحہ لے جا رہا ہے اور پاکستان کی نیوی اس کو روکے تو یہ بالکل حق بجانب ہوگا۔دنیا کے ہر قانون اور اخلاق کی رو سے اس کی اجازت ہوگی۔اس لئے حضور ﷺ نے قریش کے جو تجارتی قافلے روکے وہ جائز تھے اور ہیں۔لیکن یاد رہے کہ جو قافلے روکے گئے وہ صرف دو تھے۔حضور ﷺ اصلاً جس قافلہ کو روکنے کے لئے نکلے تھے یہ وہ قافلہ تھا جو بدر کو فنانس کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔اس کے علاوہ کوئی ایسا بڑا واقعہ پیش نہیں آیا کہ تجارتی قافلے روکے گئے ہوں اور ان سے بہت مال و دولت حاصل کی گئی ہو۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: حضور ﷺ نے جو مہمات غزوہ بدر سے پہلے بھیجی تھیں وہ اس بات کی علامت تھیں کہ قریش مکہ کے ساتھ لڑائی کا آغاز نبی ﷺ نے کیا تھا۔حالانکہ اصل مقصد دین کا غلبہ تھا۔

جواب: میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ میں پہلے بھی اس کی وضاحت کر چکا ہوں کہ ہجرت کے فوراً بعد جو مہمات بھیجی گئیں وہ سب پرامن سفارتی مہمات تھیں۔ ان کا مقصد جنگ یا ہتھیار کا استعمال نہیں تھا۔ ہتھیار کا استعمال تو قرآن پاک کی اس آیت کے بعد کیا گیا جس میں فرمایا گیا کہ **اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا**، یہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھیں جب حضورﷺ غزوہ بدر کے لئے نکل رہے تھے۔ اس سے پہلے تو اجازت ہی نہیں تھی۔ اس لئے ہجرت کے فوراً بعد کے مہینوں میں کسی فوجی اور عسکری دستے کا بھیجا جانا اسلام کے مزاج اور رسول اللہﷺ کے طریقہ کار کے مطابق نہ ہوتا۔ اس وقت جو مہمات بھیجی گئیں وہ خالصتاً پرامن اور سفارتی تھیں۔ ان کو صرف اصطلاحاً غزوہ یا سریہ کہا جاتا ہے۔ وہ فوجی مہمات نہیں ہیں۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: غزوہ سے مراد raiding کے ہیں، خیر سگالی کے وفود یا قبائل کے ساتھ دوستانہ مراسم قائم کرنے کے لئے مہمات کو غزوات میں شامل کرنا اس ٹرم کے مترادف نظر نہیں آتا؟

جواب: ممکن ہے لغوی اعتبار سے ایسا ہی ہو، لیکن تمام محدثین اور سیرت نگاروں نے غزوات کے باب میں مہمات کو بھی شامل کیا ہے۔ مثال کے طور پر امام بخاری کی کتاب صحیح بخاری' میں 'کتاب المغازی والجہاد' میں ان مہمات ابھی ذکر ہے جو انتہائی پرامن تھیں۔ اسی میں صلح حدیبیہ کا بھی ذکر ہے، تبلیغی مہمات کا ذکر بھی ہے، بئیر معونہ کے جو 70 شہدا تھے اور تبلیغی مشن پر جا رہے تھے، ان کا بھی ذکر ہے۔ یہ ایک عمومی اصطلاحی ہے۔ عربی زبان میں تغلیب کا اصول ہے کہ اگر ایک سے زائد چیزوں کا ذکر کرنا ہو اور ان میں سے ایک چیز کسی ایک وقت میں نمایاں ہو تو دونوں کے لئے اس لفظ کو بیان کر دیتے ہیں۔ مثلاً ظہرین عصر اور ظہر کی نماز کے لئے اور مغربین مغرب اور عشاء کی نماز کے لئے عام طور پر استعمال کرتے ہیں۔ عمرین حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ دونوں کو کہتے ہیں۔ تو تغلیباً اگر تمام مہمات کے لئے غزوات کا لفظ استعمال ہو تو ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ پھر ویسے بھی اصطلاح میں کوئی اختلاف نہیں ہوا کرتا۔ لا مشاحة فی الا صطلاح۔ ہر شخص کو اپنی اصطلاح وضع کرنے کا اختیار ہے۔ اگر محدثین اور سیرت نگاروں نے یہ اصطلاح وضع کی اور اس کے مطابق کتابیں مرتب کیں تو میرے خیال میں ہمیں اعتراض کرنے کا حق نہیں۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: آخری سوال کہ اسلام کا قانون جنگ یہ ہے کہ دشمن کو تکالیف دے کر قتل نہ کیا جائے اور لاشوں کی بے حرمتی نہ کی جائے۔ یزید کے دور میں مدینے میں تین دن کا قتل عام، سیدنا حسینؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ کے بارے میں حکومتی رویہ، کیا مسلمانوں نے خود اپنے قانون جنگ کی خلاف ورزی نہیں کی؟

جواب: اگر واقعی ایسا ہوا ہے تو یہ غلط ہوا ہے، جس کی تائید نہیں کی جا سکتی۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: آپ نے کہا کہ حکومت کی اجازت کے بغیر فوج کشی جائز نہیں۔ اگر حکومت جان بوجھ کر جہاد سے اجتناب کرے تو اس صورت میں کیا مسلمانوں کو کفار کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جائے۔ جیسا کہ کشمیر میں ہو رہا ہے۔ کیا اس صورت میں جہاد فرض نہیں ہوتا؟

جواب: جو اصول ہے وہ نے عرض کر دیا کہ: لا تسری سریة بغیر اذن الامام۔ اب اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ اسلامی ملک موجود ہے۔ اسلامی قیادت موجود ہے۔ تو اس قیادت کی اجازت ضروری ہے۔ اس کے بغیر فوجی مہم کی اجازت نہ ہوگی۔ اگر کوئی علاقہ ایسا ہے کہ وہاں مسلمان بڑی تعداد میں موجود ہیں اور دشمن نے اس پر قبضہ کر لیا ہے جیسے کشمیر پر ہندوستان نے کیا ہے تو وہاں کے مسلمانوں کے لئے جائز ہے، بلکہ فرض ہے کہ وہ اپنی قیادت قیادت منتخب کر لیں اور جہاد کے لئے کھڑے ہو جائیں، جیسے سید احمد شہید کو ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک تعداد نے لیڈر منتخب کیا بلکہ مختلف علاقوں میں مختلف لیڈر منتخب کیے گئے اور ان کی امارت میں جہاد کیا گیا۔ جیسے حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کو ان کے علاقے کے مسلمانوں نے لیڈر منتخب کیا اور ان کی امارت میں جہاد کیا گیا۔ اس لئے جہاد اور امارت لازم وملزوم ہیں۔ جہاں تک یہ سوال ہے کہ کوئی مسلمان سلطنت جہاد کے بارے میں غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کرے، پڑوس میں مسلمانوں پر مظالم ہو رہے ہوں اور سلطنت کوئی اقدام نہ کرے تو وہاں کے مسلمانوں کو

کیا کرنا چاہیئے، میرے خیال میں ایسی صورت میں حکومت پر دباؤ ڈالنا چاہیئے کہ وہ جہاد کے بارے میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرے۔لیکن اگر وہ حکومت ایسا نہیں کرتی تو مقبوضہ علاقے کے مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ خود اپنے امیر کا انتخاب کر کے جہاد شروع کر دیں، جیسا کہ کشمیر میں ہو رہا ہے۔ اس صورت حال میں پاکستان کے مسلمان ان کشمیری قائدین کی قیادت میں جہاد کر سکتے ہیں، یا فرض کیجیے بوسنیا میں جہاد ہو رہا ہے یا چیچنیا میں جہاد ہو رہا ہے تو انفرادی طور پر مسلمان اس طرح کے دور دراز کے علاقوں میں وہاں کی قیادت کے تحت جہاد کر سکتا ہے اگر حالات اجازت دیں اور وہ بھی اسلامی جہاد ہو گا۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: آپ نے اپنے خطبات میں فرمایا ہے کہ حکومت کی اجازت کے بغیر فوجی دستے بھیجنا جائز نہیں ہے۔ موجودہ حالات میں پاکستان کے اردگرد کے حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے دستے نہ بھیجنا جہاد کی کمزوری کا باعث ہے۔ جیسا کہ حکومت وقت کی پالیسی ہے، اس کی اپنی مصلحتیں ہیں۔ اسی طرح ۱۹۴۸ء کی جنگ کشمیر کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: اس کی وضاحت کر چکا ہوں کہ جہاں جہاد ہے وہاں لیڈر شپ موجود ہے، اس قیادت کے تحت جہاد کیا جائے گا۔ اگر ریاست اس ذمہ داری میں کوتاہی کرتی ہے تو اس پر دباؤ ڈالا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ کہنا دشوار ہے کہ ریاست اپنی ذمہ داریاں انجام نہیں دے رہی ہے۔ میری ناقص معلومات کے مطابق کسی نہ کسی حد تک ریاست یہ ذمہ داری انجام دے رہی ہے، اس کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں جس کا عام آدمی کو ادراک نہیں ہوتا۔ بعض اوقات ایسی صورتحال ہوتی ہے کہ اس کا اظہار کرنا مناسب نہیں ہوتا۔ عالمی دباؤ ہوتا ہے جس کی وجہ سے علی الاعلان کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ۱۹۴۸ء کی جنگ کشمیر ہر اعتبار سے جہاد تھی۔ آج کی جنگ کشمیر بھی جہاد ہے۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

سوال: آپ نے خطبے میں فرمایا کہ اسلام میں دھوکا دہی نہیں، لہٰذا جنگ میں دھوکا دہی سے کام نہ لینا چاہیئے۔ لیکن کیا جنگی حکمت عملی کے تحت دشمن کو ناکام کرنے اور اس کا زور توڑنے کے لئے ایسا قدم نہیں اٹھایا جا سکتا، مثلاً پروپیگنڈے کے ذریعے یا کسی اور ذریعے سے، جب کہ قرآن کہتا ہے کہ کافر مسلمانوں کو دھوکا دیتے ہیں، لیکن اللہ ان کو دھوکا دیتا ہے لیکن انہیں علم نہیں۔ دوسرا سوال اسی کے ساتھ ہے کہ آپ نے فرمایا ہے کہ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جائے گا جس کے تحت دشمن کی تمام فوج ختم ہو جائے، مثلاً ایسے ہتھیار استعمال نہ کیے جائیں گے یا ان کے پانی وغیرہ میں کوئی زہر نہ ملایا جائے گا۔ کوئی خطرناک گیس استعمال نہ کی جائے گی۔ اگر یہ اقدام نہیں کیے جا سکتے تو پھر اس قسم کے حالات میں کیا کیا جا سکے گا؟

جواب: اسلام میں جہاں یہ تعلیم ہے کہ دھوکا دہی ممنوع اور ناجائز ہے وہاں اسلام میں دوسری تمام جائز تدابیر اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ دھوکا تو یہ ہے کہ آپ میدان جنگ میں یا جنگی صورت حال میں ایک معاہدہ کریں اور پھر اس معاہدے کی خلاف ورزی کریں۔ حکمت عملی یہ ہے کہ آپ نے دشمن سے کوئی معاہدہ نہیں کیا ہے لیکن دشمن کے خلاف کوئی ایسی تدبیر کی، جس سے دشمن مفتوح ہو گیا، یہ دھوکا دہی نہیں۔ حکمت عملی کی ایک دلچسپ مثال سید احمد شہید کے ایک معرکے میں سامنے آتی ہے۔ ایک بار ان کے مجاہدین نے کسی قلعے کا محاصرہ کیا ہوا تھا، قلعہ فتح نہیں ہو رہا تھا۔ یکا یک ایک روز رات کے وقت ان کے قریبی رفیق ملا لعل محمد قندھاری نے چلا چلا کر پشتو میں کہا: ''اندر پائی راوڑا''، یعنی سیڑھی لاؤ۔ اس ایک جملے سے دشمن سمجھا کہ شاید مسلمانوں کی تازہ دم فوج آ گئی ہے اور سیڑھیاں لگا کر قلعے میں کود آئیں گے۔ یہ سوچ کر انہوں نے ہتھیار پھینک دیے۔ مسلمانوں نے وہی ہتھیار اٹھائے اور قلعہ فتح کر لیا، یہ حکمت عملی ہے۔ دھوکا دہی نہیں ہے۔ دھوکا دہی تب ہے کہ کسی معاہدے کی خلاف ورزی کی گئی ہوتی، ان سے جھوٹ بولا گیا ہوتا، یا ان کو غلط تاثر دانستہ دے کر اس سے انحراف کیا گیا ہوتا۔ اس طرح دشمن کی جنگی چالوں اور ان کے ارادوں سے واقفیت بھی دھوکا دہی نہیں بلکہ حکمت عملی ہے۔

(اسلام کا قانون بین الممالک، ڈاکٹر محمود احمد غازی)

(حدیث)

سوال: کیا یہ بات صحیح ہے کہ سرسید کا تعلق منکرین حدیث سے تھا؟

جواب: میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ مجھے معلوم نہیں کہ سرسید کا تعلق منکرین حدیث سے تھا کہ نہیں تھا۔ البتہ ان کے بہت سے مذہبی خیالات سے مجھے اتفاق نہیں تھا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: ایک صاحب نے پھر سرسید کے بارے میں پوچھا ہے کہ ان کی خدمات کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ کیا وہ انگریزوں کے ایجنٹ تھے؟

جواب: میں ان کو انگریزوں کا ایجنٹ نہیں سمجھتا۔ میری ناچیز رائے میں سرسید کے خیالات سے اور ان کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن کسی کو انگریز کا ایجنٹ کہنا بری بات ہے۔ اس طرح کی رائے دینے سے اجتناب کرنا چاہئے۔ انہوں نے ممکن ہے دیانت داری سے یہ سمجھا ہو کہ مسلمان ان حالات میں انگریز سے نہیں لڑ سکتے۔ لڑیں گے تو اپنا نقصان کریں گے۔ مسلمانوں کو انگریزوں کے وجود اور قبضہ کو حقیقت مانتے ہوئے اپنے لئے راستہ تلاش کرنا چاہئے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: جیسا کہ آپ نے کہا ہے کہ ابن اسحاق اور واقدی کے بارے میں محدثین نے کلام کیا ہے اور ان مآخذ کو مشکوک گردانا ہے تو اس کے بعد علما اور تاریخ دان حضرات کن مآخذ سے استفادہ کرتے رہے؟ کیا ان حضرات کے کام کو مشکوک قرار دینے سے مسلمانوں کے علمی کام کا بڑا حصہ مشکوک نہیں ہو جائے گا؟

جواب: اصل میں بات یہ ہے کہ سیرت کا جو بنیادی ذخیرہ ہے وہ تو قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے پوری طرح ثابت ہے۔ واقدی اور ابن اسحاق نے جزوی تفصیلات بہت کثرت سے دی ہیں۔ ان تفصیلات کے بارے میں ہر صاحب علم اپنی تحقیق کے بعد رائے قائم کرتا ہے۔ آپ نے تحقیق سے ایک بیان کو درست سمجھا اور اس کو قبول کر کے اپنی کتاب میں شامل کر لیا۔ لیکن ممکن ہے کہ دوسرا محقق اس بیان کو درست نہ سمجھے۔ یہ سلسلہ تو چلتا رہے گا۔ اس سے ابن اسحاق اور واقدی کے کام کی اہمیت کم نہیں ہوگی۔ واقدی نے جو بڑا اور اصل کام کیا ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے غزوات نبوی کے مقامات کو خود جا کر دیکھا۔ خود جا کر ان غزوات کے مقامات کا نقشہ بنایا۔ اس کام کو آج تک کسی نے مشکوک قرار نہیں دیا۔ یہ کام آج تک مستند مانا جاتا ہے۔ لیکن تفصیلات میں جزوی طور پر اختلاف رائے رہا ہے وہ آئندہ بھی رہے گا۔

میں ذاتی طور پر نہ تو واقدی کے سارے کام کو بے اعتنا قرار دے کر دریا برد کرنے کے حق میں ہوں نہ ہی واقدی کے سارے کام کے درجہ استناد کو امام بخاری کے کام کے برابر سمجھتا ہوں۔ امام بخاری اور ان جیسے دوسرے اکابر محدثین کا کام استناد کے اعتبار سے ظاہر ہے کہ سب سے زیادہ اونچا ہے۔ کوئی بھی بیان اگر اس کے مقابلہ میں آتا ہے اور بخاری اور مستند محدثین کی روایات سے متعارض ہے تو اس پر بار بار غور کرنا پڑے گا۔ اس لئے واقدی اور دوسرے سیرت نگاروں کے بارہ میں توازن سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ نہ کلی طور پر رد کرنا مناسب ہے اور نہ ہی کلی طور پر اس کو سو فیصد مستند سمجھنا درست ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: آپ نے سرسید کا بہت اچھا ڈھانچہ پیش کیا ہے......ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ منکر حدیث ہیں تو یہ بات کس حد تک ٹھیک ہے؟

جواب: میں سرسید کا ڈھانچہ پیش نہیں کیا، سرسید کے کام کا ایک جائزہ پیش کیا ہے۔ یہ بات کہ وہ منکر حدیث تھے یا نہیں تھے یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ لیکن ان کے بہت سے مذہبی خیالات سے اہل علم کی بڑی تعداد حتی کہ ان کے اپنے رفقاء کو بھی اتفاق نہیں تھا۔ یہ مذہبی خیالات کمزور دلائل کی بنیاد پر اختیار کئے گئے تھے۔ ان خیالات سے مجھے بھی اتفاق نہیں ہے۔ سرسید کے بہت سے مذہبی خیالات ایسے تھے جو صرف مغرب سے مرعوبیت کا نتیجہ تھے۔ اس لئے ایک حد تک ان کو معذور بھی سمجھا جانا چاہئے۔ بہر حال میری ذاتی رائے میں سرسید ہوں، سید امیر علی ہوں یا انیسویں صدی کے دوسرے اہل علم، ان کے بارے میں احتیاط سے کام لینا چاہے۔ ان کے کام کے جو مثبت پہلو ہیں ان کو سراہنے میں کسی بخل اور تامل سے کام نہیں لینا چاہے۔ انہوں نے مسلمانوں کے لئے بہت سی خدمات انجام دی ہیں۔ سیرت نگاری اور دفاع سیرت کے سلسلہ میں ان کا یہ

کام بڑے نیک جذبے پرمبنی تھی۔اس کا اعتراف ہونا چاہئے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: ایک سوال ہے کہ روایت اور درایت میں کیا فرق ہے؟

جواب: حدیث میں روایت سے مراد یہ ہے کہ کسی حدیث کا جائزہ لے کر یہ طے کرنا کہ اس کی صحت کا معیار روایت کے نقطہ نظر سے کیا ہے۔اس کا راوی کون ہے، بیان کرنے والے راویوں کا درجہ کیا ہے۔ان کا حافظہ اور کردار کیسا تھا۔وہ سچے تھے کہ نہیں تھے۔یہ روایت کہلاتا ہے۔

درایت یہ ہے کہ حدیث کے اندر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس پر آپ عقلی انداز سے غور کریں کہ کیا یہ واقعہ ہو بھی سکتا تھا۔جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ غالباً خلیفہ منصور کے پاس کچھ یہودی ایک دستاویز لے کر آئے اور دعویٰ کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں یہ مراعات دی تھیں اور اس دستاویز پر سعد بن معاذ اور حضرت امیر معاویہؓ دونوں کے نام بطور گواہ لکھے ہوئے تھے۔خلیفہ منصور نے امام اوزاعی سے رائے مانگی تو انہوں نے ایک نظر ڈالتے ہی کہہ دیا کہ یہ جعلی ہے۔اس لئے کہ جب حضرت معاویہؓ ایمان لائے تھے تو حضرت سعد بن معاذ کا انتقال ہو چکا تھا۔تو یہ دونوں بیک وقت ایک دستاویز کے گواہ نہیں ہو سکتے۔اس کو درایت کہتے ہیں۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: موضوع احادیث کیوں گھڑی گئیں اور وہ کون لوگ تھے جو اس فعل بد میں شامل تھے؟

جواب: موضوع احادیث میں کئی طرح کی احادیث شامل ہیں۔کچھ احادیث تو وہ ہیں جن کے راوی جھوٹے تھے۔مثلاً کسی راوی کے بارے میں ثابت ہو گیا کہ یہ جھوٹا آدمی تھا یا غلط بیانی کرتا تھا۔اگر ایک واقعہ میں کسی راوی کی غلط بیانی کسی محدث کے سامنے ثابت ہو گئی تو اس کی تمام روایات کو موضوع قرار دے دیا گیا۔

کچھ لوگوں نے دیانت داری سے،لیکن غلط فہمی کی وجہ سے، کسی بات کو رسول اللہ ﷺ سے منسوب کر دیا۔بات اچھی ہونا اور چیز ہے اور اس کا ارشاد نبوی ہونا اور چیز ہے۔کسی نے کوئی اچھی بات سن کر غلط فہمی کی بنیاد پر یہ سمجھا کہ یہ شاید حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔محدثین نے چیک کر کے بتا دیا کہ یہ حضور ﷺ کا ارشاد گرامی نہیں ہے۔یہ حدیث بھی موضوع حدیث ہے۔

کچھ لوگوں نے کسی سیاسی غرض سے بد دیانتی یا کسی ذاتی غرض یا گروہی مقصد کے لئے کوئی بات حضور ﷺ سے منسوب کر دی۔بنو عباس کا ایک خلیفہ تھا،جن کا نام مجھے یاد نہیں، وہ بیٹھا ہوا کہ اس کے سامنے کوئی شخص کبوتر اڑا رہا تھا۔وہاں پر ایک شخص نے کہا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ "**لا سبق الا فی حافر او خف**" یعنی حضور ﷺ نے فرمایا کہ صرف دو چیزوں میں مقابلہ کرانا جائز ہے یعنی اونٹ اور گھوڑوں کا۔چونکہ خلیفہ بیٹھا ہوا تھا اور دلچسپی سے دیکھ رہا تھا کہ کوئی صاحب کبوتر اڑا رہے ہیں۔اس نے سوچا کہ یہ خلیفہ کی توجہ حاصل کرنے کا اچھا موقع ہے۔اس نے ایک لفظ بڑھا دیا: **او طائر**: یا پرندوں کے درمیان۔لیکن خلیفہ بھی کوئی آج کل کے حکمرانوں کی طرح شریعت سے بالکل نابلد نہیں تھا۔اس کو علم تھا کہ اصل حدیث کیا ہے۔اس لئے فوراً کہا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو، اگر آئندہ ایسی حرکت کی تو میں تمہیں سزا دوں گا۔یہ حصہ حدیث میں شامل نہیں ہے۔اس طرح کے خوشامدی لوگ ہر دور میں ہوتے ہیں۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: حضرت عائشہ صدیقہؓ کی عمر شادی کے وقت کیا تھا۔آپ نے مورخین کی رائے تو بتا دی لیکن صحیح عمر نہیں بتائی۔

جواب: میں نے عرض کیا نا کہ ہمارے ارباب حدیث اور ارباب سیر کی اکثریت یہ سمجھتی ہے کہ حضرت عائشہؓ صدیقہ کی عمر شادی کے وقت نو سال تھی۔وہ یہ کہتے ہیں کہ عرب کے ماحول میں لوگ جلدی grow کیا کرتے تھے۔لہٰذا بچوں کی شادیاں کم سنی میں ہو جاتی تھیں۔بیسیوں صحابہ کرام کے بارے میں تذکرہ ملتا ہے کہ انہوں نے بارہ تیرہ سال کی عمر میں شادیاں کیں۔اس لئے عام محدثین اور سیرت نگار اس کے قائل ہیں۔اس کے برعکس کچھ لوگوں نے تحقیق سے ثابت کیا کہ جن روایات کی بنیاد پر نو سال کی عمر ثابت کی جاتی ہے، وہ کمزور ہیں یا ان میں کوئی بات محل اعتراض ہے،لیکن بعض دوسرے شواہد سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی عمر زیادہ تھی۔یہ اقلیت کی رائے تھی۔اس لئے میں نے بیان کیا کہ علامہ ابن عبدالبر جیسے مستند آدمی کی کتاب میں بھی ارشارۃً وہی رائے موجود ہے جو اقلیت کی رائے تھی۔لیکن یہ ان کی رائے ہے

میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: آپ نے بتایا کہ روایت بالمعنیٰ نہیں ہونی چاہئے، لیکن معاشرہ میں عام لوگوں سے ہٹ کر بعض اوقات علمائے کرام بھی یہ فرماتے ہیں کہ ایک حدیث کا مفہوم یہ ہے اور پھر وہ بیان کر دیتے ہیں۔

جواب: جب روایت بالمعنیٰ کی ممانعت کی جارہی تھی تو یہ وہ زمانہ تھا جب علم حدیث مدون ہو رہا تھا اور حدیث کی کتابیں لکھی جارہی تھیں۔ اس لئے خطرہ تھا کہ اگر روایت بالمعنیٰ کی اجازت دے دی گئی تو احادیث کچھ سے کچھ ہو کر ہم تک پہنچیں گی۔ اب ساری احادیث مکمل اور مرتب ہو چکی ہیں۔ ان میں کسی تحریف کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس لئے اب علماء اس کی اجازت دیتے ہیں کہ اگر کوئی اپنی یادداشت سے اپنی زبان میں اور اپنے الفاظ میں حدیث بیان کرے تو اس کی گنجائش ہے۔ اگرچہ بہتر اب بھی یہی ہے کہ جو کچھ حضورﷺ کی زبان مبارک سے نکلا تھا وہی بیان کیا جائے۔ لیکن ہر شخص کو احادیث کے الفاظ یاد نہیں ہوتے اور اگر یہ شرط لگا دی گئی تو کوئی بھی شخص حدیث کا مفہوم بیان نہیں کر سکے گا اور حضورﷺ کے پیغام کی اشاعت محدود ہو جائے گی۔ اس لئے میرے میں اس زمانے کے لحاظ سے یہ اجازت ہونی چاہئے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: کیا ابن کثیر نے تمام قسم کی اسرائیلیات کو قبول کرنے پر پابندی لگائی ہے؟

جواب: اسرائیلیات کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل ذہن میں رہنی چاہئے۔ اسرائیلیات تین قسم کی ہیں۔ کچھ تو وہ ہیں جو سو فیصد اسلامی روایات کے مطابق ہیں اور قرآن پاک اور احادیث صحیحہ میں دیئے گئے بیانات سے ان کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت ابراہیمؑ کے دو صاحبزادے تھے حضرت اسماعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ۔ یہ بات اسرائیلیات میں بھی شامل ہے اور بائبل میں بھی ہے۔ ظاہر ہے اس میں اور قرآن پاک کے بیان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ بیان بالکل صحیح ہے اور اس کو بیان کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

کچھ بیانات ایسے ہیں جو صریحاً قرآن پاک اور حدیث سے متعارض ہیں۔ مثلاً انبیاء علیہم السلام کے بارے میں بعض پر اخلاقی نوعیت کے الزامات ہیں۔ یہ بیان کرنا بالکل غلط اور ناجائز ہے۔

کچھ بیانات ایسے ہیں جو نہ تو قرآن پاک سے بالکل متعارض ہیں اور نہ موئید ہیں۔ ایسی روایات کے بارے میں اختلاف ہوا ہے۔ ممکن ہے ایک محقق کی نظر میں اسرائیلیات کی ایک روایت قرآن کی مخالف نہ ہو۔ دوسرے محقق کی رائے میں وہ قرآن کے خلاف ہو۔ جو جتنی گہرائی میں غور کرے گا اس کو اتنے ہی پہلو نظر آئیں گے۔ اس طرح کی روایات کے بارے میں اختلاف ہے۔ اسرائیلیات کے بارے میں شدومد سے جو اختلافات اور بحث و تمحیص ہے وہ اسی درمیانے درجہ کی روایات کے بارے میں ہے۔ پہلے درجہ کی روایات کے بارے میں اتفاق ہے کہ ان کو قبول کر لیا جائے۔ دوسری قسم کی روایات کے بارے میں بالاتفاق یہ رائے ہے کہ اسے مسترد کر دیا جائے۔ جو اختلاف ہے وہ تیسری قسم کے بارے میں ہے۔

پہلی قسم کے بارے میں حضورﷺ نے فرمایا تھا کہ 'حدثوا عن بنی اسرائیل و لا حرج'۔ بنی اسرائیل سے کوئی روایت بیان کرو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: مؤرخانہ اسلوب رکھنے والی وہ قدیم کتابیں جن میں کسی بیان کردہ واقعہ کا کوئی حصہ ایسا ہو جس کا ثبوت حدیث نبوی سے نہ ہو سکے، اسے میں اور آپ تسلیم کر لیں گے۔ لیکن ایک مستشرق کے اعتراضات کے جواب میں اس کا دفاع کیسے کریں گے؟

جواب: مستشرقین میں جو لوگ نسبتاً معتدل مزاج کے ہیں اور ایک معروضی رویہ رکھتے ہیں وہ تو معقول بات کو مان لیتے ہیں۔ لیکن جو متعصب اور شدت پسند ہیں وہ تو قرآن پاک کو بھی نہیں مانتے۔ احادیث کو بھی نہیں مانتے انہوں نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ رسول اللہﷺ حضرت اسماعیل کی اولاد سے ہیں۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ سورج نہیں نکل رہا۔ پاکستان نام کا کوئی ملک اس دنیا میں ہے ہی نہیں۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ نام کا کوئی آدمی نہیں تھا۔ اگر کوئی ان طے شدہ امور، روشن

حقائق اور واضح اور بدیہی چیزوں کو انکار کرے تو اس کو آپ مرفوع القلم سمجھیں گے۔ اس لئے میں ایسے مستشرقین کو مرفوع القلم سمجھتا ہوں اور ان لوگوں کی ایسی باتوں کو قابل توجہ نہیں سمجھتا جو بدیہیات کا انکار کرتے ہیں۔ ان میں جو مستند اور ذمہ دار لوگ ہیں وہ ایسی چیزوں کا انکار نہیں کرتے۔ اگر کسی نے انکار کیا ہو اور اس کو دلائل سے قائل کر لیا جائے تو وہ بعض اوقات مان بھی لیتے ہیں۔

مستشرقین کی کتابوں سے استفادہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن دو باتیں پیش نظر رہنی چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ مستشرقین مسلمان نہیں ہیں اس لئے ان سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیئے کہ وہ سیرت بیان کرتے وقت ہمارے عقائد ہی کے مطابق بات کریں گے۔ اور دوسری بات یہ کہ ان کی بعض تحریریں گمراہی کا موجب ہوتی ہیں، یہ بات خطرناک بھی ہے اور اس سے برائی پھیلتی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں میں سے وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے علم دیا ہے، وہ انگریزی اور مغربی زبانوں میں اسی انداز سے ان امور کو بیان کریں جس انداز سے مستشرقین بیان کرتے ہیں تاکہ تعلیم یافتہ طبقہ کے سامنے دونوں نقطہ نظر موجود ہوں اور کوئی شخص اگر مستشرقین کی رائے سے متاثر ہوا ہے تو اس کے سامنے دوسری رائے بھی موجود ہو۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: آپ نے فرمایا کہ کاتبان وحی کو حدیث کے لکھنے سے منع کیا گیا تھا جب کہ حضرت علی کاتب وحی بھی تھے اور اپنا صحیفہ حدیث بھی رکھتے تھے۔

جواب: کتابت حدیث سے رسول اللہ ﷺ نے صرف شروع شروع میں منع کیا تھا، جب قرآن پاک کی اچھی طرح تدوین کا عمل مستحکم نہیں ہوا تھا۔ حضرت علیؓ کو حضور کے دنیا سے تشریف لے جانے سے چند مہینے پہلے سن 10 ھ کے آغاز میں گورنر بنا کر بھیجا گیا۔ اس وقت قرآن پاک لکھا جا چکا تھا۔ حضرت علیؓ کے بارے میں یہ شبہ نہیں تھا کہ ان کو قرآن پاک کے بارے میں کوئی التباس ہو سکتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ صحیفہ حدیث ان کے پاس بالکل الگ تھا اور قرآن پاک کے کسی نسخے پر لکھا ہوا نہیں تھا۔ اس لئے اس روایت میں کوئی تأمل نہیں کرنا چاہیئے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: امام زہری کے بارے میں بہت سے لوگ اعتراضات کرتے ہیں۔ یہ اعتراضات کہاں تک درست ہیں؟

جواب: میرے خیال میں امام محمد بن شہاب زہری اکابر اسلام میں سے ہیں۔ تمام بڑے محدثین نے ان سے کسب فیض کیا ہے۔ ان کے شاگردوں میں امام مالک جیسے بڑے بڑے اور اہل تقویٰ لوگ شامل ہیں۔ اس لئے امام زہری کا مستند ہونا اور ایک امام حدیث ہونا ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ تاہم رائے اور اجتہاد کے معاملہ میں ہر آدمی کی تحقیق سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ آپ کو امام زہری کی کسی تحقیق سے اختلاف ہو تو اس اختلاف کو بیان کرنے کا آپ کو حق ہے۔ لیکن اگر کسی شخصیت کی کسی بات سے کوئی اختلاف ہو اور اس کے نتیجے میں اس شخص کی شخصیت اور کردار کے بارے میں ناروا شکوک کا اظہار کیا جائے تو یہ مناسب رویہ نہیں ہے۔ اگر ان کے معاصر محدثین نے ان کو مستند سمجھا ہے تو آج کے کسی آدمی کے لئے ان کے بارے میں شک کا اظہار کرنا مناسب نہیں ہے۔ میں یہی کہہ سکتا ہوں۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: آپ نے بتایا کہ میثاق مدینہ حدیث کی کتابوں میں مذکور ہے۔ لیکن ڈاکٹر اکرم ضیا عمری کی کتاب 'مدنی معاشرہ' ادارہ تحقیقات اسلامی نے حال ہی میں شائع کی ہے۔ انہوں نے میثاق مدینہ پر بڑا کلام کیا ہے اور کہا ہے کہ اس دستاویزات کی مکمل تفصیلی شقیں حدیث کی کسی مستند کتاب میں موجود نہیں ہیں۔ صرف سیرت کی کتابوں میں اس کا ذکر ہے۔ اکرم ضیا عمری کا سوال ہے کہ اگر یہ میثاق اتنا ہی مشہور و معروف تھا تو حدیث کی کسی کتاب میں اس کی تفصیل کیوں مذکور نہیں؟

جواب: جہاں تک حدیث کی کتابوں کا تعلق ہے تو متعدد کتابوں میں اس میثاق کا تذکرہ موجود ہے اور یہ بیان موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک تحریر مرتب کی اور یہودیوں کے ساتھ ایک معاہدہ کیا۔ سنن ابی داود میں یہ تذکرہ موجود ہے۔ حدیث کی کئی دوسری کتابوں میں اس کا تذکرہ ہے جس سے یہ تصدیق تو ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دستاویز مرتب کی تھی اور مدینہ کے مختلف قبائل کے ساتھ معاہدہ کیا تھا۔ جہاں تک اس کے مکمل متن کا تعلق ہے تو سیرت کے باب میں ابن ہشام کی کتاب اتنی ہی مستند ہے جتنی کہ حدیث کے معاملہ میں حدیث کی کوئی بھی کتاب۔ ابن ہشام نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔ ابوعبید نے کتاب الاموال میں اور ابن سعد

نے طبقات میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ سب سیرت کی مستند کتابیں ہیں۔اس لئے میثاق مدینہ شک وشبہ سے بالاتر ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: مغربی محققین مسلمانوں کے مرتب کردہ مغازی اور حدیث کے اتنے بڑے مجموعے کو غیر مستند کہتے ہیں۔ان کے تعصب کے علاوہ اس کی بنیادی وجہ کیا ہے؟ حالانکہ وہ اس میدان میں تحقیق بھی کرتے ہیں۔اس وجہ کو دور کرنے کے لئے کیا کچھ کیا جاسکتا ہے اور کیا کچھ کیا جارہا ہے؟

جواب: مغربی محققین میں تین طرح کے لوگ ہیں۔ کچھ تو وہ ہیں جو پریسٹ یا پادری ہیں یا رہے ہیں۔ان میں ایک گہرا مذہبی تعصب موجود ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو حکومتوں اور خاص طور پر انٹیلی جنس ایجنسیوں کے لئے کام کرتے رہے ہیں۔ کچھ لوگ اور ہیں جن کی تعداد ماضی میں بہت کم تھی لیکن اب بڑھ گئی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خالص علمی اور تحقیقی ذوق سے کام کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے objectively تحقیقی انداز میں سیرت پر کام کیا ہے، ان کے رویہ میں بڑی تبدیلی آئی ہے اور ان میں سے بہت سے اہل علم نے سیرت کے مآخذ کو مستند مانا ہے۔ ابھی میں نے جوزف ہورووٹس کی مثال دی جس نے ستر اسی سال پہلے ایک کتاب لکھی تھی۔اس میں بڑے جامع اور غیر جانبدارانہ انداز میں اس بارے میں کلام کیا ہے اور ان مآخذ کے بارے میں رائے دی ہے۔اسی طرح مآخذ کے بارے میں کئی لوگوں کا رویہ خاصا معتدل ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ تبدیلی آ رہی ہے۔ مستشرقین کے تأمل اور شک کی ایک وجہ اور بھی ہوسکتی ہے جس کا ہمیں اعتراف کرنا چاہئے۔ وہ یہ کہ ہمارے ہاں چوتھی پانچویں صدی ہجری کے بعد کے مصنفین نے سیرت کے نام پر بہت سا کمزور مواد اور رطب و یابس مسالہ جمع کر دیا ہے۔ بعض ایسی روایات جو بہت غیر مستند ہیں اور علم حدیث اور سیرت کے اصولوں کی روشنی میں قابل قبول نہیں ہیں، وہ بہت کثرت سے سیرت کی کتابوں میں جمع کر دی ہیں۔اس کی وجہ سے بہت سے مغربی محققین کو سیرت کے تمام ذخائر پر شک کرنے کا موقع ملا۔

اگر خود مسلمان محققین معروضی طور پر اس سارے ذخیرے کا جائزہ لے کر رطب و یابس کو الگ الگ کر دیں تو جو غیر جانبدار اور معتدل مزاج مغربی مصنفین ہیں ان کے طرز عمل میں تبدیلی آجائے گی۔ جو متعصب مصنفین ہیں وہ تو پہلے بھی نہیں مانتے تھے، اب بھی نہیں مانیں گے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: آپ نے ہند بن ابی ہالہ کی جو روایت بیان کی ہے اس میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ راہ چلتے وقت اپنے اصحاب کو آگے رکھتے تھے اور خود پیچھے رہتے تھے جب کہ قرآن میں سورۃ الحجرات میں آیا ہے کہ ' **لا تقدموا بین یدی اللہ ورسولہ**'.

جواب: لا تقدموا سے physical تقدم مراد نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ کے آگے زیادہ بڑھ بڑھ نہ کرو، زیادہ بولو مت اور حضور ﷺ کے آگے اپنی بات نہ کہو، بلکہ ان کی بات سنو۔ یعنی جسمانی طور پر آگے پیچھے ہونا مراد نہیں ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے نماز پڑھائی۔ حضور ﷺ نے آکر پیچھے نیت باندھی۔ ایک مرتبہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نماز پڑھا رہے تھے اور حضور ﷺ پیچھے تھے۔ قافلوں میں حضور ﷺ جایا کرتے تھے تو کچھ لوگ آگے ہوتے تھے اور کچھ پیچھے ہوتے تھے۔ دنیا میں جو ہوگا تو کوئی اس کے آگے ہوگا کوئی پیچھے ہوگا۔ یہ حضور ﷺ کی زندگی میں بھی ہوتا تھا اور آج بھی ہوتا ہے۔ یہ ایک اضافی بات ہے کہ آپ آگے پیچھے کس کو کہتے ہیں۔ اگر مغرب کو آگے کہتے ہیں تو پوری دنیائے مغرب حضور ﷺ کے آگے کھڑی ہے۔اس لئے **لا تقدموا** کا محض لغوی مفہوم یہاں مراد نہیں ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: بعض احادیث کے بارے میں علماء کا خیال ہے کہ یہ حدیثیں خود بنائی گئی ہیں اور حقیقی نہیں ہیں۔ کچھ احادیث کو علماء درست قرار دیتے ہیں اور کچھ کو نہیں۔ایسی صورت حال میں کیا کرنا چاہئے؟

جواب: احادیث کا جو بے مثال ذخیرہ آج ہمارے پاس موجود ہے وہ آج نہیں بلکہ تیرہ سو سال پہلے مرتب ہوا تھا۔ اور پچھلے تیرہ سو سال کے دوران ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں اہل علم اس پر غور کرتے آرہے ہیں۔ جتنی بھی احادیث ہیں ان کی اتنی چھان پھٹک ہو چکی ہے کہ اس سے زیادہ چھان پھٹک کا تصور بھی ممکن نہیں۔ جو صحیح اور مستند احادیث ہیں ان کو بھی الگ کر دیا گیا ہے۔ جو نسبتاً کمزور ہیں لیکن صحیح ہونے کے زیادہ قریب ہیں وہ بھی الگ ہو گئی ہیں اور جو بالکل کمزور اور غلط ہیں وہ بھی معلوم اور

متعین ہیں۔ بہت سے حضرات نے غلط اور موضوع احادیث کے الگ مجموعے بھی مرتب کر دیئے ہیں تا کہ ایک ہی نظر میں واضح ہو جائے کہ یہ صحیح احادیث نہیں ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی طرف غلط طور پر منسوب ہیں۔

اس کے علاوہ کچھ احادیث ایسی بھی ہیں جن کے بارے میں اختلاف ہمیشہ موجود رہے گا۔ مثلاً میری تحقیق میں ان میں سے کچھ احادیث قابل قبول ہوں گی۔ آپ کی تحقیق میں قابل قبول نہیں ہوں گی۔ اس اختلاف سے کوئی فرق اس لئے نہیں پڑتا کہ سیرت کا جو اصل core اور بنیادی ڈھانچہ ہے اس کی اساس قرآن پاک، صحیح احادیث اور مستند روایات پر ہے۔ جو بنیادی احادیث ہیں وہ سب متفق علیہ ہیں اور ان کی صحت کے بارہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جزوی طور پر اگر کوئی اختلاف ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر آپ ان کو مانیں تو بھی فرق نہیں پڑے گا اور نہ ماننے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

مثال کے طور پر جب رسول اللہ ﷺ اپنے بچپن میں حلیمہ سعدیہؓ کے یہاں قیام فرما تھے تو روایات میں آتا ہے کہ شق صدر کا واقعہ ہوا۔ اب شق صدر سے مراد مجازی معنوں میں شق صدر ہے یا اس سے مراد کوئی physical شق صدر ہے، تو اس پر اختلاف رہا ہے۔ جو لوگ زیادہ عقلیت پسند ہیں وہ physical شق صدر کو نہیں مانتے اور اس کو شرح صدر قسم کی ایک چیز سمجھتے ہیں۔ جو حضرات نبوت اور معجزات کے پہلو کو زیادہ نمایاں رکھتے ہیں وہ اس کو physical معنوں میں شق صدر مانتے ہیں اب ان دونوں چیزوں میں آپ جس کو بھی درست مانیں اس کو اختیار کر لیں۔ اس سے فی نفسہ اس اصل حقیقت پر کوئی فرق نہیں پڑتا کہ رسول اللہ ﷺ کی تربیت اللہ تعالیٰ نے کی تھی۔ وہ شق صدر ہو یا شرح صدر ہو، دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کا سینہ حق کے لئے کھول دیا تھا۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ بوجھ کو اٹھانے کے لئے حضور ﷺ کی تربیت بچپن سے ہو رہی تھی۔ اس پر دونوں تعبیریں متفق ہیں۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: گولڈن احادیث کتنی ہیں؟

جواب: گولڈن احادیث کے بارے میں مختلف لوگوں کی رائے مختلف ہیں۔ کہ کس کو گولڈن چین کہتے ہیں۔ عام طور پر ایک تو وہ روایت ہے جو موطاء امام مالک میں ہے اور جسے میں دہرا چکا ہوں، مالک عن نافع عن ابن عمرؓ، لوگ اس کو گولڈن چین کہتے ہیں۔ یعنی یہ سب سے مختصر ترین روایت ہے جو امام مالک کو دو واسطوں سے ملی۔

اس کے علاوہ بھی بعض روایات کے بارے میں لوگوں نے کہا ہے کہ یہ گولڈن چین ہے۔ ایک روایت ایسی ہے جو مجھے پوری یاد نہیں لیکن اس میں امام احمد، امام شافعی اور امام مالک تینوں کے نام آجاتے ہیں۔ تو تین فقہا کے نام ایک سند میں آئے ہیں اس کو بھی بعض لوگوں نے گولڈن چین کہا ہے۔ اس پر بڑی لمبی بحثیں ہیں اور ہر محدث نے اپنی رائے یا اپنے فہم کے مطابق گولڈن چین قرار دیا ہے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: حدیث کی جگہ جو فرق حدثنا اور اخبرنا میں ہے تو ان دونوں میں کیا فرق ہے؟

جواب: حدثنا یہ ہے کہ استاد نے حدیث پڑھی اور طالب علم نے سنی، تو جب طالب علم اس کو آگے بیان کرے گا تو حدثنا سے بیان کرے گا۔ اخبرنا یہ ہے کہ طالب علم نے حدیث پڑھی اور استاد نے سن لی اور سن کر اجازت دے دی، یہ اخبرنا ہے۔

یہ اصطلاح سب سے پہلے امام مسلم نے شروع کی تھی۔ امام بخاری کے ہاں یہ اصطلاح نہیں ہے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: عبداللہ ابن عمر کے شاگرد نافع عبداللہ ابن عمرو ابن العاص کے ہیں یا عبداللہ ابن عمر ابن الخطاب کے؟

جواب: نافع عبداللہ بن عمر بن خطاب کے شاگرد ہیں عبداللہ بن عمرو بن العاص کے نہیں ہیں۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص عین کے زبر کے ساتھ ہے اور پہچان کے لئے آخر میں واو لگایا جاتا ہے جس کی وجہ سے اردو دان لوگ اکثر اس کو عُمرو پڑھتے ہیں یہ عُمرو نہیں ہے اس کو عَمر پڑھا جاتا ہے۔ اور اگر واو نہ ہو تو اس کو عُمَر پڑھا جائے گا۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: صحیح اور ضعیف احادیث کو پڑھ کر ہم ان میں فرق کیسے کریں؟

جواب: آپ وہ مجموعے پڑھیں جن میں صحیح احادیث کا ذکر ہے۔ صحیح بخاری، صحیح مسلم کا ترجمہ پڑھیں۔ اردو میں ایک کتاب ہے جس کا انگریزی ترجمہ بھی ملتا ہے، اگرچہ بہت معیاری نہیں ہے، وہ 'الـلـؤلـؤ والمرجان فی ما اتفق علیه الشیخان' ہے۔ جس میں صحیح بخاری اور مسلم دونوں کے متفق علیہ احادیث کو بیان کیا گیا ہے۔ وہ موجود ہے اس کو پڑھیۓ اس میں ضعیف ہونے کا انشاءاللہ امکان نہیں ہے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: شرح بیان کرنے کا طریقہ کب اور کیوں شروع ہوا؟

جواب: شرح بیان کرنے کا طریقہ اسی وقت سے شروع ہوا جب احادیث کی تدوین کا کام مکمل ہوا۔ ابھی میں نے امام ابوعیسیٰ ترمذی کی تعلیق آپ کو پڑھ کر سنائی۔ امام ترمذی جب یہ کتاب مرتب کر رہے تھے اسی کے ساتھ انہوں نے بعض پہلوؤں کی تشریح کا کام بھی شروع کر دیا تھا۔ اسی طرح سے بقیہ محدثین نے بھی تشریح کا کام شروع کر دیا۔ پھر جب محدثین اس کام سے فارغ ہوئے تو باقی حضرات نے شرح کا کام شروع کر دیا تھا۔ ضرورت اس لئے پڑی کہ لوگوں کو یہ بتایا جائے کہ حدیث کا مفہوم کیسے نکالا جائے۔ اس کی تعبیر وتشریح کیسے کریں۔ غلط تعبیر کے راستے کو کیسے روکیں۔ اس لئے ضرورت پیش آئی کہ کتب حدیث کی مستند شرحیں تیار کی جائیں۔
جو شخص علم حدیث کو جانتا ہو، شریعت کا علم رکھتا ہو وہی شرح کر سکتا ہے اس میں رسمی طور پر اجازت دینے یا نہ دینے کا کوئی سوال نہیں۔ مسلمانوں کا مزاج ایسا ہونا چاہئے کہ وہ مستند آدمی ہی کی شرح سے استفادہ کریں اور غیر مستند آدمی کی شرح کو قبول نہ کریں۔ جب غیر مستند آدمی کی شرح کو پذیرائی نہیں ہوگی تو وہ شرح نہیں لکھے گا۔

سوال: المعجم المفہرس جو مستشرقین نے لکھی اس کا محرک کیا تھا۔

(محاضراتِ حدیث)

جواب: میرے خیال میں علمی فائدہ (Academic interest) ان کا محرک تھا۔ بہت سے لوگ خالص علمی جذبہ سے بھی کام کرتے تھے۔ انہوں نے علمی سہولت کے لئے یہ کام کیا۔ یہ ایک اچھا ٹول ہے، ایک اچھا وسیلہ ہے جس سے کام لے کر حدیث کی کتابوں سے استفادہ آسان ہو جاتا ہے۔
ایک اور بہن نے دعا کی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسے مواقع اور بھی دے۔ آمین

(محاضراتِ حدیث)

سوال: صحیح بخاری کے ابواب میں جو احادیث بیان ہوئی ہیں کیا وہ سب صحیح ہیں؟

جواب: جی ہاں وہ سب صحیح ہیں۔ اس میں کوئی حدیث ضعیف یا حسن کے درجہ کی نہیں ہے وہ سب کی سب صحیح ہیں۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: اس بات کی کیا دلیل ہے کہ مثلاً صحیح بخاری وغیرہ کے یہ مجموعے ہم تک بغیر تحریف کے پہنچے ہیں؟

جواب: یہ جو بارہ دنوں میں اتنی داستان بیان کی یہی تو بتانے کے لئے بیان کی۔ ہر دور میں ہزاروں انسانوں نے ان کو زبانی یاد کیا، لاکھوں انسانوں نے ایک ایک آدمی کا نام محفوظ کیا جس کے ذریعے یہ ان تک پہنچا ہے۔ ان میں سے ہر آدمی کی تاریخ محفوظ ہے۔ ہر دور کے تحریری مجموعے موجود ہیں۔ ہر دور کے مخطوطات موجود ہیں۔ اس کے بعد اگر یہ ہو کہ یہ مستند نہیں ہیں تو پھر یہ بھی مستند نہیں ہے کہ ہم اسلام آباد میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے یہ ٹوکیو ہو، غلط فہمی سے کسی نے اس کو اسلام آباد کہہ دیا۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: ایک حدیث میں آتا ہے ''ح'' اس سے کیا مراد ہے؟

جواب: یہ امام مسلم کی اصطلاح ہے۔ وہ جب کوئی سند بیان کرتے ہیں تو آگے جا کر وہ سند دو حصوں میں تقسیم ہو جائے، یا آغاز میں دو سندیں ہوں اور اوپر جا کر ایک ہو جائیں تو وہاں امام مسلم تحویل کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں جس کا مخفف ہے 'ح'۔ ابھی میں نے عرض کیا تھا کہ مدار سند کسی حدیث کی سند میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ مثلاً چار سندیں امام مسلم سے جا رہی ہیں۔ اور ان سب کا ایک مدار سند ہے۔ تو امام مسلم جب مدار تک پہنچ جائیں گے تو پھر کہیں گے 'ح'، یعنی تحویل، یعنی میں دوبارہ دہراتا ہوں، وحدثنا سے پھر سند شروع کریں گے، پھر مدار تک آئیں گے، ح، تعویل یعنی Reversion، پھر دوبارہ۔ یعنی پہلے کے جو چار حصے ہیں وہ بیان کرنے بعد مدار سے آگے چلیں گے۔ یہ ح اور تحویل کا مطلب ہے۔ اس کو جب پڑھتے ہیں تو ح یا تحویل بھی پڑھ سکتے ہیں۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: آج کے دور کے برصغیر کے محدثین کے بارے میں بیان کر دیں۔

جواب: وہ اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا تذکرہ کرنا بڑا دشوار ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی کاوشوں میں برکت دے۔ لیکن اس درجہ کا کوئی آدمی نہیں ہے جس درجہ کے علامہ انور شاہ کشمیری یا علامہ شمس الحق عظیم آبادی، یا مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری تھے۔ ابھی ایک بزرگ ہندوستان میں ہیں اور غالباً حیات ہیں اور بہت معمر ہوں گے۔ ان کی ایک شرح بخاری 'انوار الباری' کے نام سے چھپی ہے۔ کراچی میں بھی چھپی ہے۔ بہت اچھی کتاب ہے۔ یہ مولانا انور شاہ کشمیری کے داماد اور شاگرد تھے۔ انہوں نے ان کی تقریروں کے نوٹس مرتب کئے ہیں۔ جو مجھے بہت اچھے معلوم ہوئے۔ اگر چہ اس میں مسلکی چیزیں بہت ہیں جو نہیں ہونی چاہئے تھیں لیکن اس کے باوجود کتاب بہت اچھی ہے۔ ایک ہمارے دوست مولانا تقی عثمانی ہیں۔ انہوں نے مولانا شبیر احمد عثمانی کی شرح صحیح مسلم کی تکمیل کی ہے۔ فتح الملہم مولانا شبیر احمد عثمانی کے قلم سے صحیح مسلم کی شرح ہے۔ یہ نامکمل تھی اور کتاب الرضاع تک ہی لکھی جا سکی۔ اس کی بقیہ جلدیں مولانا محمد تقی عثمانی نے لکھی ہیں۔ اسی طرح اور حضرات کی کتابیں بھی ہیں جن کی تفصیل بیان کرنے کا موقع نہیں ہے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: علوم الحدیث کی کسی جامع کتاب کا نام بیان کر دیں۔

جواب: اس موضوع پر سب سے جامع کتاب ڈاکٹر خالد علوی کی ہے جس کا نام علوم الحدیث ہے اور دو جلدوں میں ہے۔ ایک جلد اس کی چھپ چکی ہے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: حدیث کے تعارض میں جو ترجیحی وجوہ تلاش ہوئے اس میں مفہوم کے اعتبار سے جو ہیں اس کی وضاحت کر دیں۔

جواب: اگر دو احادیث میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہو تو اس کو دور کرنے کے چار وجوہ یا چار طریقے ہیں۔ ان میں سے ایک سند ہے، دوسرا متن ہے، تیسرا مفہوم ہے اور چوتھا خارجی امور ہیں۔ مفہوم میں بھی چار پانچ چیزیں شامل ہیں۔ مفہوم کا ایک اصول یہ ہے جو سب سے پہلے محدثین نے وضع کیا بعد میں دنیا کے سب لوگ اس کو ماننے لگے۔ وہ یہ ہے کہ ایک حدیث میں کوئی چیز عمومی انداز میں بیان ہوئی ہے، جنرل مفہوم ہے جس کو اصطلاح میں 'حدیث عام' کہا جاتا ہے۔ اور ایک دوسری حدیث خاص ہے اور وہ کسی خاصی حالت کو بیان کرتی ہو۔ تو بظاہر ان میں تعارض ہوگا لیکن دراصل ان میں تعارض نہیں ہے۔ جو عام بیان کرتی ہے وہ عام مسائل کو بیان کرتی ہے جو خاص ہے وہ اس خاص particular categary کو regulate کرتی ہے۔ تو ہم یہ کہیں گے کہ یہ جو خاص حدیث ہے یہ اس عام کے اس پہلو کو مستثنیٰ کر دیتی ہے جس کا ذکر اس حدیث میں کیا گیا ہے۔ یہ دو احادیث کے درمیان تعارض دور کرنے کا ایک طریقہ ہے۔

اس سلسلہ میں ایک مثال عرض کرتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ 'لا تبع ما ليس عندك' یہ سنن کی اکثر کتابوں میں موجود ہے۔ کہ وہ چیز مت بیچو جو تمہارے پاس موجود نہیں ہے۔ یہ ایک عام حدیث ہے۔ آپ گندم بیچیں اور آپ کے پاس موجود نہ ہو مت بیچیں۔ آپ کے پاس جوتا نہیں ہے تو جوتا مت بیچیں، میز نہیں ہے تو میز مت بیچیں، گلاس نہیں ہے تو گلاس مت بیچیں۔ یہ ایک عام چیز ہے۔ لیکن ایک خاص چیز ہے کہ کسی کے پاس فیکٹری لگی ہوئی ہے۔ وہ مثلاً فرنیچر بناتا ہے اور آپ

پیسے دیں کہ یہ پیسے لیجئے اور مجھے سو تپائیاں بنا کر دے دیں۔ پیسے آپ نے دے دیئے، خرید و فروخت مکمل ہوگئی اور تپائیاں اس شخص کے پاس موجود نہیں ہیں۔ تو اس حدیث کی رو سے وہ آپ کو تپائیاں نہیں بیچ سکتا۔ نہ آپ سے پیسے لے سکتا ہے۔ پہلے وہ تپائیاں بنائے، جب بن جائیں تو پھر آپ کو فروخت کرے۔ لیکن ایک طریقہ شروع سے یہ رائج رہا ہے کہ جو لوگ سپلائرز ہیں یا مینوفیکچرز ہیں، اسلام سے پہلے بھی ایسا ہوتا تھا آج بھی ہوتا ہے۔ آپ مینوفیکچر یا سپلائیر سے کوئی معاملہ کر لیں اور پہلے اس کو پیسے دے دیں۔ وہ جس طریقے سے سپلائی کرتا ہے آپ کو سپلائی کردے گا۔ اس وقت وہ چیز موجود نہیں ہے لیکن بعد میں موجود ہو جائے گی۔ وہ آپ کو دے دے گا۔ یہ ایک خاص حکم ہے جو اس خاص صورت حال کے لئے۔ ہے۔ یہ اس عام حکم سے مستثنیٰ ہے۔ اب آپ کہیں گے کہ بظاہر تو تعارض ہے۔ وہ چیز موجود نہیں ہے تو وہ کیسے بیچے گا۔ لیکن یہ ایک خاص حدیث ہے ایک خاص صورت حال کو بیان کرتی ہے۔ مینوفیکچر یا Grower کو آپ کہیں کہ فلاں تاریخ کو آپ مجھے دس من گندم دے دیں۔ یا قصائی ہے جانور خرید کر لاتا ہے اور گوشت سپلائی کرتا ہے۔ آپ کے ہاں کوئی تقریب ہے اور آپ اس سے کہیں کہ فلاں تاریخ کو دو من گوشت سپلائی کر دو تو وہ کر دے گا اس لئے کہ سپلائر ہے۔ تو سپلائر، مینوفیکچر یا Grower کے لئے حضورؐ نے اجازت دی ہے اس لئے کہ یہ طریقہ چلا آ رہا تھا۔ یہ مخصوص صورت حال ہے اور اس کو اسی پر محدود رکھا جائے گا اور بقیہ عام حدیث بقیہ معاملات پر منطبق ہوگی۔ ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں رہا۔ یہ ہے مفہوم کے لحاظ سے تعارض کو دور کرنا۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: کیا میں علامہ سیوطی کے بارے میں جان سکتی ہوں؟

جواب: علامہ سیوطی کے بارے میں دو تین جملے عرض کرتا ہوں۔ ان کا پورا نام جلال الدین سیوطی ہے۔ دسویں صدی ہجری کے اوائل میں ان کا انتقال ہوا۔ اپنے زمانہ کے ہر فن مولا امام تھے۔ پانچ سو سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ علم حدیث میں ان کی بڑی بنیادی کتابیں ہیں۔ علم حدیث سے متعلق انہوں نے کم و بیش پچاس ساٹھ کتابیں لکھیں اور ایک خاص بات ان میں اور برصغیر کے ایک اور بزرگ، جن کا نام لینا میں بھول گیا، ہمارے ٹھٹھہ کے ایک بزرگ تھے جو غالباً 1238ھ میں فوت ہوئے ہیں، علامہ ابوالحسن محمد بن عبدالوہاب ٹھٹھوی السندی، ان کا یہ ایک عجیب و غریب کارنامہ ہے کہ صحاح ستہ کی ہر کتاب پر ان دونوں کی ایک ایک شرح موجود ہے۔ صحیح بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ، ان چھ کی چھ کتابوں کی انہوں نے شرحیں لکھیں جو اکثر مطبوعہ موجود ہیں ایک دو غیر مطبوعہ ہیں۔ اسی طرح سے علامہ سیوطی نے بہت سی کتابوں کی شرحیں لکھیں جن میں صحاح ستہ کی ہر کتاب کی شرح بھی شامل ہے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: کیا صحیح بخاری میں ایک ہی باب کے اندر آنے والی دو قولی احادیث کے الفاظ ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتے ہیں؟

جواب: ایسا ہو سکتا ہے، اس کا امکان موجود ہے کہ ایک باب میں ایک ہی صحابیؓ سے آنے والی روایت کے الفاظ مختلف ہوں۔ اس کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں۔ ایک سبب تو یہ ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہی ایک بات کوئی بار بیان فرمایا ہو۔ دو صحابہ نے دو مختلف اوقات میں اس کو سنا اور دونوں الفاظ نوٹ کر کے یاد کر لئے اور آگے بیان کر دیا۔ لیکن زیادہ ایسا ہوا ہے کہ کسی فعلی معاملہ کو، یعنی حضورؐ کے قولی ارشاد کو نہیں بلکہ کسی طرز عمل کو صحابہ نے دیکھا اور ایک صحابیؓ نے اپنے الفاظ میں بیان کر دیا اور دوسرے نے اپنے الفاظ میں۔ تو واقعہ تو ایک ہے لیکن دیکھنے والے صحابیؓ اس کو ایک سے زیادہ قسم کے الفاظ میں بیان کر سکتے ہیں۔ صحابیؓ کے لئے ضروری نہیں ہے کہ جو واقعہ وہ دیکھے اس کے لئے بھی ایک ہی طرز بیان اختیار کرے۔ مثلاً عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ میں غزوہ بدر میں گیا تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے اور میرے ساتھ کئی لوگوں کو کمسنی کی بنیاد پر واپس کر دیا۔ اس اب واقعہ کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ جب بھی بیان کریں گے ضروری نہیں کہ ایک ہی طرح کے الفاظ میں بیان کریں۔ لیکن ان سے جو تابعی سنیں گے وہ انہی الفاظ میں لکھیں گے جن الفاظ میں ان سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بیان کیا ہے۔ ان الفاظ میں وہ تابعی اپنی طرف سے کوئی ردو بدل نہیں کریں گے۔ البتہ جس صحابیؓ نے اپنی آنکھوں سے ایک واقعہ دیکھا ہے اس کے الفاظ میں ردو بدل ہو سکتا ہے۔ اس طرح ایک ہی واقعہ کے الفاظ میں فرق ہو سکتا ہے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: سنن سے کیا مراد ہے لفظی اور اصطلاحی دونوں معنی بتا دیں۔

جواب: سنن سنت کی جمع ہے۔اس کے دو معنی ہیں۔ایک تو ان احادیث کا مجموعہ جن سے کوئی سنت ثابت ہوتی ہو۔دوسرے معنی کے لحاظ سے سنن سے مراد حدیث کی وہ کتاب ہے جس کی ترتیب فقہی احکام پر ہو۔اور سنن کے ایک اور معنی ہیں سنتوں کا مجموعہ، وہ کتاب یا وہ کتاب حدیث جس میں بہت ساری احادیث لکھی ہوئی ہوں۔اس اعتبار سے حدیث کی ہر کتاب سنن کا مجموعہ ہے اس لئے کہ ہر کتاب میں حدیثیں لکھی ہوئی ہیں۔لیکن خاص طور پر علمائے حدیث کی اصطلاح میں حدیث کی وہ کتاب جس کی ترتیب فقہی احکام پر ہو وہ سنن کہلاتی ہے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: صغار تابعین کی روایت کس طبقہ کے صحابہ سے ہیں؟

جواب: صغار تابعین کی روایات کبار تابعین اور صغار صحابہ سے ہیں۔صحابہ میں جن کا انتقال بہت بعد میں ہوا، وہ پہلی صدی ہجری کے اواخر تک زندہ رہے۔ان سے روایتیں صغار تابعین کی ہیں اور بقیہ روایات کبار تابعین سے ہیں۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: شرح کی Term کو واضح کریں؟

جواب: شرح سے مراد ہے Commentary، یا تشریح۔یعنی Commentary of the Hadith.

There are many commentries of the Ahadith and almost right from the begining, from the days the Ahadith were compiled in book from, the process of writing commentaries and explainations on those Ahadith had been started. There are thousands of commentries of the Ahadith writen during the course of last one thousand years.

(محاضراتِ حدیث)

سوال: امام ابن ماجہ کی کتاب میں ضعیف احادیث کی کثرت کی کیا وجہ ہے؟

جواب: وجہ یہ ہے کہ وہ احادیث امام ابن ماجہ کے نزدیک ضعیف نہیں تھیں۔امام ابن ماجہ ایک راوی کو صحیح سمجھتے تھے،ضعیف نہیں سمجھتے تھے۔اس لئے انہوں نے وہ احادیث نقل کر دیں۔لیکن بقیہ اہل علم نے مزید تحقیق کی تو انہوں نے امام ابن ماجہ کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: کیا کوئی ایسی کتاب ہے جو منکرین حدیث کو دی جائے یا اس میں ان کے سوالات کے جوابات ہوں جو آپ نے ذکر کئے ہیں تا کہ بحث کی جائے اور ان کو کتاب دی جائے۔

جواب: منکرین حدیث میں دو طرح کے لوگ ہیں۔کچھ وہ ہیں جن کو واقعی کوئی غلط فہمی ہے۔ان کو تو کئی کتابیں دی جا سکتی ہیں۔مثال کے طور پر شام کے ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی کی ایک عربی کتاب ہے 'السنۃ ومکانتھا فی التشریع الاسلامی'۔اس کے دو اردو تراجم ہیں۔ایک پروفیسر غلام احمد حریری کا کیا ہوا اور دوسرا ڈاکٹر احمد حسن کیا کیا ہوا ہے۔یہ دونوں کتابیں آپ ان کو دے سکتی ہیں۔ایک ہمارے دوست اور میرے بزرگ اور فاضل رجل مولانا محمد تقی عثمانی کی انگریزی کتاب ہے The Authority of Sunnah، وہ آپ منکرین حدیث سے متاثرہ افراد کو دے سکتی ہیں۔اسی طرح سے ایک چھوٹی سی کتاب ہے مولانا بدر عالم مہاجر مدنی کی، ان

کی کتاب کا نام ہے 'حجیت حدیث' وہ بھی اس سلسلہ میں مفید ہے۔لیکن بہترین کتاب Studies in the Early Hadith Literture ہے جو ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی کی ہے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: زمانہ کے اعتبار سے صحابہ کرامؓ کے جو طبقات ہیں اس کا علم تو ان لوگوں کے پاس بھی ہوسکتا ہے جو جھوٹی حدیثیں روایت کرتے ہیں۔تو ایسے میں اگر وہ زمانے کی صحیح تعین کر دیں تو اس میں کیا طریقہ اختیار کیا جاتا تھا؟

جواب: ضعیف یا موضوع حدیث کو معلوم کرنے کے تو درجنوں طریقے تھے۔صرف یہی ایک طریقہ نہیں تھا کہ صحابہ کے زمانہ سے طے کر لیا جائے۔یہ تو اس کام کے لئے ایک ابتدائی قدم تھا۔اس کے بعد ایک پورا سفر ہوتا تھا،فرد کا ذاتی کردار،اس کا علمی اور دینی مقام،اس کی شخصیت کے بارہ میں عام تصور،لوگ اس راوی کے بارے میں کیا کہتے ہیں،اس نے علم حدیث کہاں سے حاصل کیا،اس کے استاد سے تحقیق،پھر علم رجال کے بارے میں تفصیلات،اس کے لئے اتنی کاوش کی جاتی تھی کہ لوگوں کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ جعل سازی کر سکیں۔اگر چہ کچھ لوگوں نے اس کی کوشش کی کہ جعلی حدیثیں گھڑ گھڑ کر مسلمانوں میں پھیلا دیں لیکن علما اسلام نے اس فتنہ کو روکنے کا اہتمام پہلے سے کیا ہوا تھا۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: آپ نے کہا کہ امام ترمذی راویوں کے بارے میں نرمی سے کام لیتے تھے۔اس وجہ سے باقی اماموں نے کہا کہ کسی راوی کو امام ترمذی نے ٹھیک کہا ہے تو اس بارے میں مزید پڑتال کر لینی چاہئے۔کیا اس کا یہ مطلب ہے کو جو حدیث امام ترمذی کی سند سے ہے اس کو نہیں ماننا چاہئے؟

جواب: نہیں نہیں۔امام ترمذی نے اپنی کتاب میں ہر حدیث کا جرحہ بیان کر دیا ہے۔اس لئے امام ترمذی کے ہاں جو احادیث ہیں وہ ساری کی ساری قابل قبول ہیں۔اس میں کوئی پینتیس چھتیس احادیث کے بارے میں اختلاف ہے جس کی وضاحت موجود ہے۔ان پینتیس چھتیس کی مزید تحقیق کر لیں۔باقی کے بارے میں اکثر و بیشتر تحقیق ہو چکی ہے آپ کو اب نئے سرے سے تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔علمائے حدیث نے اتنا کام کر دیا ہے کہ ہمارے لئے پکی پکائی چیز موجود ہے،آپ جو کتاب چاہیں اٹھا کر دیکھ لیں اور کوئی بھی شرح اٹھا کر دیکھ لیں اس میں ساری بحث آپ کو مل جائے گی آپ اس کے مطابق عمل کریں۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: حصول علم حدیث کے لئے سفر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں مسلمانوں کے عروج اور ترقی کی وجہ کیا تھی۔ان کے اندر علم طلب اور تڑپ تھی۔بد قسمتی سے آج یہ طلب اور تڑپ برائے نام رہ گئی ہے۔اس لئے عروج بھی ختم ہو گیا۔

جواب: ہاں واقعی ختم ہو گیا۔مسلمانوں میں علمی ذوق ختم ہو گیا ہے اس لئے مسلمانوں کا عروج زوال میں بدل گیا۔مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ کے لئے ان کی علمی زندگی کا احیا ضروری ہے۔سب سے پہلے علوم دین میں اس کے بعد باقی علوم میں جب تک علمی اور فکری نشأت الثانیہ نہیں ہوگی،اس وقت تک مسلمانوں کا عروج دوبارہ نہیں آ سکتا۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: بعض حضرات کہتے ہیں کہ حضرت فاطمہؓ سے احادیث کیوں روایت نہیں کی گئیں؟

جواب: میں یہ بات پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ احادیث کو بیان کرنے کا زیادہ موقع اس وقت ملا جب صحابہ کرامؓ ایک ایک کر کے دنیا سے اٹھتے جا رہے تھے۔صحابہ کرامؓ کو آپس میں احادیث بیان کرنے کا بہت کم موقع ملتا تھا،اس لئے کہ انہیں اس کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔احادیث بیان کرنے کی زیادہ ضرورت اس وقت پیش آئی جب تابعین کی تعداد بڑھتی گئی اور صحابہ اکرام کی تعداد کم ہوتی گئی۔حضرت فاطمۃ الزہراؓ کا انتقال رسول اللہ ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے چھ ماہ کے اندر

اندر ہو گیا تھا اوران چھ مہینوں میں انہوں نے جس پریشانی اور کرب میں اپنا وقت گزارا وہ سب کو معلوم ہے۔وہ چھ ماہ کے اس زمانے میں جو اشعار وقتاً فوقتاً پڑھا کرتی تھیں ان میں سے ایک یہ تھا۔

صبت علی مصائب لوانھا

صبت علی الایام صرن لیا لیا

مجھ پر جو مصائب آن پڑے ہیں اگر وہ دنوں پر پڑتے تو دن راتوں میں تبدیل ہو جاتے۔

حضرت فاطمہؓ کسی سے ملتی جاتی نہیں تھیں۔دن رات اپنے گھر میں رہا کرتی تھیں۔اور چھ ماہ کے بعدان کا بھی انتقال ہو گیا۔اس لئے ان کو احادیث بیان کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: تدوین حدیث میں خواتین کا ذکر نہیں آیا؟

جواب: ابھی میں نے آپ کے سامنے عمرہ انصاریہ کا ذکر اسی لئے تو کیا ہے کہ جب خواتین کا ذکر ہو رہا ہے تو خواتین کی کم از کم ایک مثال سامنے آجائے۔خواتین سے بہت سی احادیث روایت ہوئی ہیں۔مسند عائشہؓ الگ سے چھپی ہوئی موجود ہے،وہ احادیث جو حضرت عائشہؓ نے روایت کیں وہ الگ مجموعہ کی شکل میں مرتب ہیں اور پاکستان کی ایک قابل احترام خاتون محدثہ ڈاکٹر جمیلہ شوکت نے ان کو ایڈٹ کیا ہے،وہ ایک عرصہ تک پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ اسلامیات کی چیئر پرسن رہی ہیں۔اسلامی نظریاتی کونسل میں ہم دونوں رکن کی حیثیت سے کولیگ رہے ہیں۔انہوں نے مسند عائشہؓ کے نام سے کتاب مرتب کی ہے،جو چھپی ہوئی موجود ہے۔میرے خیال میں یہ کہنا درست نہیں کہ خواتین کا ذکر نہیں ہے۔خواتین کا ذکر ملتا ہے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: آپ نے علم رجال کے تین گروہ بتائے تھے،متشددین،معتدلین اور......

جواب: تیسرا گروپ تھا متساہلین کا،جو تساہل سے کام لیتے ہیں،جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اگر کسی کو عادل قرار دیں تو وہ تساہل سے کام لیتے ہیں اس لئے اس میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔ان میں سے ایک امام ترمذی ہیں اور ایک امام حاکم ہیں جو مستدرک کے مصنف ہیں۔امام حاکم اگر کسی راوی کو عادل قرار دیں تو اس کے بارے میں عام اصول یہ ہے کہ دوسری کتابوں سے بھی اس کو چیک کرنا چاہئے۔اگر دوسرے ائمہ جرح وتعدیل بھی اس راوی کو عادل قرار دے رہے ہیں تو پھر واقعی وہ راوی عادل ہے اور اگر دوسرے ائمہ نے اس کو عادل قرار نہیں دیا تو پھر امام حاکم یا امام ترمذی کی تعدیل پر زیادہ بھروسہ نہیں کرنا چاہئے۔یہ تیسرے گروہ یعنی متساہلین کے گروہ سے مثالیں ہیں۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: ہمیں بتایا گیا ہے کہ مرغ کی آواز پر کوئی دعا نہیں،لیکن 'پیارے رسولؐ کی پیاری دعائیں' میں یہ دعا موجود ہے۔

جواب: مجھ سے غلطی ہوگئی،جہاں تک مجھے یاد ہے وہ یہی ہے کہ مرغ کی بانگ اور دعا کے بارے جتنی احادیث ہیں وہ ساری کی ساری ضعیف ہیں۔لیکن اگر یہ روایت موجود ہے تو صحیح ہوگی میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے اس خاص روایت کی تحقیق نہیں۔لیکن میں نے موضوعات کی کسی کتاب میں اس کو پڑھا تھا،کہ مرغ کو دیکھنے اور دعا کرنے کے بارے میں جتنی احادیث ہیں وہ ساری کی ساری ضعیف ہیں۔میں دوبارہ چیک کروں گا ممکن ہے میری یادداشت سے غلطی ہوئی ہو۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: احادیث تو بہت سے صحابہ کرام سے روایت ہوئیں لیکن کیا وجہ ہے کہ منکرین حدیث زیادہ تر حضرت ابو ہریرہؓ کو نشانہ بناتے ہیں۔

جواب: ہمارے منکرین حدیث میں بہت زیادہ اوریجنلیٹی نہیں ہے۔ وہ تمام باتیں مغربی لوگوں کی ہی دہراتے رہتے ہیں۔ ہمارا کوئی منکر حدیث ایسا نہیں ہے جس نے کوئی نئی بات اپنی طرف سے نکالی ہو۔ جرمنی کا ایک شخص تھا جو پچھلی صدی کے اواخر میں اور موجودہ صدی کے اوائل میں تھا گولڈتسہیر، سب سے پہلے اس نے حدیث پر کام کا آغاز کیا تھا۔ اور اس کا ایک شاگرد تھا جوزف شخت، یہ جرمن تھا، دونوں یہودی اور دونوں جرمن تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے حدیث کے بارے میں بدگمانی پھیلائی۔ ایک بدگمانی یہ پھیلائی کہ حضرت ابو ہریرۃؓ نے تو سن سات ہجری میں اسلام قبول کیا، اور سات ہجری کے بعد گویا صرف تین سال ان کو حضورؐ اکرم کے ساتھ رہنے کا موقع ملا، ان سے جو روایات ہیں وہ ساڑھے پانچ ہزار بتائی جاتی ہیں اور ان صحابہ کی روایات تھوڑی ہیں جو طویل عرصہ حضورؐ کے ساتھ رہے۔ جو آدمی صرف تین سال ساتھ رہا اس نے تو ساڑھے پانچ ہزار روایات بیان کیں اور جو بیس بیس، پچیس پچیس سال اور پوری زندگی ساتھ رہے ان سے مروی احادیث بہت تھوڑی ہیں۔ یہ گویا اس بات کا ثبوت ہے کہ حضرت ابو ہریرۃؓ نعوذ باللہ غلط بیانی کیا کرتے تھے۔ انہی الزامات کو ان لوگوں نے دہرایا۔ ہمارے لوگوں نے بھی انہی کو دہرایا۔

ہمارے ایک اور دوست ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں برکت دے، بڑے فاضل انسان ہیں، علم حدیث پر انہوں نے بہت کام کیا ہے۔ وہ بھی مدینہ منورہ کے رہنے والے ہیں، اور مصطفیٰ اعظمی کی طرح اعظمی ہیں لیکن ان کا نام ہے ضیاء الرحمٰن اعظمی۔ ان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ پندرہ سال کی عمر تک ہندو تھے اور پھر اسلام میں داخل ہوئے تو ان کے رشتہ داروں نے ان پر غیر معمولی مظالم ڈھائے اور اتنے مظالم کئے کہ ان کی تفصیل سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کے باوجود نہ صرف اسلام پر قائم رہے، بلکہ علم دین حاصل کیا، علم حدیث میں تخصص پیدا کیا۔ سعودی عرب چلے گئے اور اب گزشتہ تقریباً پچیس تیس سال سے مدینہ منورہ میں قیام پذیر ہیں۔ سعودی عرب کی شہریت ان کو ملی ہوئی ہیں۔ مدینہ منورہ میں جامعہ اسلامیہ میں حدیث کے استاد ہیں اور حدیث پر انہوں نے بہت سی کتابیں لکھیں۔ انہوں نے علم حدیث پر جو کام کیا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ انہوں نے حضرت ابو ہریرۃؓ کی احادیث پر کام کیا۔

حضرت ابو ہریرۃؓ کی احادیث پر جو اعتراضات جوزف شخت اور گولڈتسہیر نے اٹھائے تھے وہی اعتراضات مصر کے ایک منکر حدیث محمود ابوریہ نے بھی اٹھائے ہیں۔ محمود ابوریہ نے ایک کتاب لکھی 'ابو هريرةؓ و مرویاته'، ابو ہریرہ اور ان کی روایات، اور اس میں وہی باتیں دہرائیں جو وہ لوگ کہتے تھے۔ ہمارے ہاں بھی کچھ لوگوں نے یہی باتیں بار بار دہرائیں۔ ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی نے کمپیوٹر کی مدد سے حضرت ابو ہریرۃؓ کی ساری روایات کو جمع کیا۔ ان کے تمام طرق کو جمع کیا اور یہ ثابت کیا کہ جو متون ہیں وہ کل پندرہ سو کے قریب ہیں، باقی سارے طرق ہیں۔ پندرہ سو متون کا ایسے آدمی کے لئے یاد رکھنا جو لکھتا بھی ہو تین سال میں کوئی مشکل بات نہیں۔ روزانہ اوسطاً دو تین حدیثیں بھی نہیں بنتیں۔ تو ایک آدمی تین چار پانچ احادیث تو روزانہ لکھ سکتا ہے اور یاد بھی کر سکتا ہے اس میں ایسی کوئی بڑی بات نہیں۔ یہ ضیاء الرحمٰن اعظمی کی کتاب میں تمام تفصیل موجود ہے۔ اس کتاب کا نام بھی 'ابو هريرة و مرویاته' ہے۔ مستشرقین اور منکرین حدیث کو چونکہ حضرت ابو ہریرۃؓ کے راستہ سے حدیث پر اعتراض کا موقع ملتا ہے اس لئے حضرت ابو ہریرۃؓ کو زیادہ نشانہ بناتے ہیں۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: کیا احادیث کے ضعف کے بھی درجے ہوتے ہیں؟

جواب: یقیناً ہوتے ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ضعیف احادیث کی بیالیس قسمیں ہیں جن میں سے چند میں پہلے عرض کر چکا ہوں ان سب کے الگ الگ درجات ہیں۔ ضعیف احادیث کو بالکل مسترد نہیں کیا جاتا۔ بعض شرائط کے ساتھ قبول کیا جاتا ہے لیکن اس قبولیت کا دارومدار ضعف پر ہے۔ زیادہ ضعف ہو تو قبول نہیں کی جاتی، جو کم ضعف والی ہو اس کو پہلے دیکھا جاتا ہے کہ آیا دوسری ضعیف احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے؟ اگر دوسری ضعیف احادیث سے تائید ہوتی ہو تو بعض معاملات میں ضعف کے باوجود اس کو قبول کر لیا جاتا ہے، بعض معاملات میں قبول نہیں کیا جاتا۔ احکام اور عقائد میں ضعیف حدیث کو قبول نہیں کیا جاتا۔ فضائل میں قبول کر لیا جاتا ہے۔ مثلاً حدیث میں آیا ہو کہ فلاں دن کا روزہ رکھنا افضل ہے تو روزہ رکھنا ویسے بھی افضل ہے۔ اگر دو تین ضعیف احادیث سے ایک بات کا پتہ چلتا ہو تو عمل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ محدثین کی بڑی تعداد کی رائے ہے۔ بعض لوگوں کی رائے یہ بھی ہے کہ اسے حضورؐ سے منسوب نہیں کرنا چاہئے اور اس پر عمل نہیں کرنا چاہئے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: کہتے ہیں شب برات کی فضیلت میں چالیس ضعیف احادیث ہیں؟

جواب: بھئی شب برات کو چھوڑ دیجئے، جو آپ کا جی چاہے وہ کر لیجئے۔ایک اصولی بات میں عرض کر دیتا ہوں اس کو آئندہ بھی یاد رکھیں میں نے عرض کیا تھا کہ کچھ احادیث ہیں جو قطعی الثبوت ہیں۔کچھ احادیث ظنی الثبوت ہیں۔ظنی الثبوت وہ ہیں جن کے حدیث صحیح ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں اختلاف ہوسکتا ہے۔وہ اکثر خبر واحد یا اخبار آحاد ہیں۔ان میں شروع سے علماء اور محدثین کے درمیان اختلاف رہا ہے۔ایک محدث ایک حدیث کو ثابت شدہ مانتے ہیں،ان کی نظر میں وہ صحیح ہے۔ دوسرے محدث اپنی تحقیق میں اس کو ضعیف مانتے ہیں۔ان کی نظر میں وہ ضعیف ہے۔جو ضعیف مانتے ہیں وہ اس پر عمل نہیں کرتے، کیونکہ ان کی تحقیق کے مطابق وہ ضعیف ہے۔جو اپنی تحقیق میں اس کو صحیح سمجھتے ہیں وہ اس پر عمل کرتے ہیں۔اس لئے اگر کوئی کسی ضعیف حدیث پر عمل کر رہا ہے تو یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ اور جو کوئی اس پر عمل نہیں کر رہا ہے تو یہ بھی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔

اعتراض یا نکیر صرف وہاں کرنا چاہئے جہاں شریعت کے کسی واضح، قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت حکم کی خلاف ورزی ہو رہی ہو۔اس لئے اگر کوئی شب برات کی احادیث پر عمل کرتا ہے تو آپ کا کیا لیتا ہے، کرنے دیجئے۔اگر آپ کی تحقیق میں وہ احادیث کمزور ہیں یا ان لوگوں کی تحقیق میں کمزور ہیں جن کے علم پر آپ کو اعتماد ہے تو آپ ان پر عمل نہ کیجئے۔لیکن اگر کچھ اور لوگ ایسے ہیں جن کی تحقیق پر آپ کو اعتماد نہیں ہے لیکن وہ ان احادیث کو ثابت شدہ سمجھ کر ان پر عمل کر رہے ہیں تو آپ ان پر اعتراض مت کیجئے۔یہ ایک جزوی سی چیز ہے اس پر زیادہ بحث اور اختلاف کی ضرورت نہیں ہے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: حضرت ابو ہریرہؓ کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے کہا کہ مجھے نبی کریم ﷺ نے وہ بتایا کہ اگر میں اس وقت باہر نکل کر لوگوں کے سامنے سچ کہہ دوں تو میرا قتل مسلمانوں پر واجب ہو جاتا اور وہ مجھے قتل کر دیتے۔

جواب: یہ نہیں کہا کہ میرا قتل مسلمانوں پر واجب ہو جاتا۔وہ یہ کہتے ہیں کہ بہت سی چیزیں میرے علم میں ایسی ہیں کہ اگر میں ان کو کھلم کھلا بیان کروں تو شاید لوگ مجھے قتل کر دیں۔وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جب علم حدیث یا علم دین بیان کیا جائے تو تدریج اور ترتیب کے ساتھ بیان کیا جائے۔اس طرح بیان نہ کیا جائے کہ سننے والے لوگ پہلے ہی مرحلے میں اس کا انکار کر دیں۔آپ پہلے اسلام کے عقائد پھر اخلاق پھر تربیت اور تعلیم اور پھر احکام بتائیں۔یہ وہی چیز ہے جو حضرت عائشہؓ نے فرمائی کہ رسول اللہ ﷺ اگر پہلے ہی دن یہ کہتے کہ شراب نوشی چھوڑ دو تو شاید عرب میں بہت کم لوگ آپؐ کی بات مانتے۔آپ نے تدریج کے ساتھ پہلے ان کو مکارم اخلاق سکھائے، پھر نماز سکھائی پھر ایک ایک کر کے باقی چیزیں سکھائیں۔آخر میں کہا کہ شراب نوشی اور فلاں فلاں قسم کے گناہ چھوڑ دو تو لوگوں نے چھوڑ دیئے کیونکہ تربیت ہو چکی تھی۔یہی بات حضرت ابو ہریرہؓ نے کہی کہ میں ایسا علم بھی رکھتا ہوں کہ اگر میں بیان کروں تو شاید لوگ مجھے قتل کر دیں اس لئے کہ ابھی ان کی وہ تربیت نہیں ہوئی اور شاید وہ ان کو سننے کے لئے تیار نہ ہوں۔اس کے علاوہ اس کا کوئی اور مطلب نہیں ہے اور منکرین حدیث اس سے جو مطلب نکالنا چاہتے ہیں وہ درست نہیں ہے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: حضرت ابو ہریرہؓ کے بارے میں یہ اعتراض ہے کہ حضرت عمرؓ کے دور میں کسی وجہ سے ان کو جیل میں بند کر دیا گیا تھا۔

جواب: یہ بات میرے علم میں نہیں ہے، میں نہیں جانتا کہ حضرت عمرؓ کے دور میں حضرت ابو ہریرہؓ کو جیل میں بند کر دیا گیا تھا یا گورنری سے معطل کر دیا گیا تھا۔میرے علم میں نہیں ہے۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں تو لوگ گورنری سے معطل ہوتے رہتے تھے۔ایک صاحب آج مقرر ہوئے ہیں کل دوسرے ہوں گے۔حضرت مغیرہ بن شعبہؓ بصرہ کے گورنر تھے، بعد میں وہاں سے ہٹا دیئے گئے۔حضرت عمرو بن العاصؓ مصر کے گورنر تھے،ان کو بھی بعد میں ہٹا دیا گیا۔حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کمانڈر انچیف تھے ان کو بھی ہٹا دیا گیا۔یہ تو انتظامی معاملات ہوتے ہیں ان کا کوئی تعلق حدیث کی روایت سے نہیں ہے۔مجھے نہیں معلوم کہ حضرت ابو ہریرہؓ گورنر تھے کہ نہیں تھے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: حضرت ابوبکرؓ حضورﷺ کے بہت قریب تھے اور ہر وقت ساتھ رہتے تھے پھران سے اتنی کم روایات کیوں ہیں؟

جواب: یہ بڑا اچھا سوال ہے۔ بات یہ ہے کہ روایات کی ضرورت اس وقت محسوس کی گئی جب صحابہ کرامؓ کی تعداد کم ہوتی گئی۔ چونکہ عام طور پر صحابہ کرامؓ کو معلوم تھا کہ فلاں معاملہ میں حضورﷺ کا فیصلہ کیا تھا اس لئے صحابہ کو آپس میں حدیث بیان کرنے کی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ حدیثیں بیان کرنے کی ضرورت اس وقت پیش آئی جب تابعین کا دور آیا اور تابعین کو رہنمائی کی ضرورت پیش آئی۔ صحابہ کرامؓ نے ان سے بیان کیا کہ کس معاملہ میں حضورﷺ کی رہنمائی اور تعلیم کیا تھی۔ جب تک رہنمائی کی ضرورت پیش نہیں آئی تو صحابہ کرام نے روایات بیان نہیں کیں۔ ان حالات میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کس سے روایات کو بیان کرتے۔ اس لئے جو صحابیؓ جتنے متقدم ہیں یعنی جن کا زمانہ جتنا قدیم ہے ان سے روایات اتنی ہی کم ہیں۔ اور جن صحابہ کا زمانہ جتنا بعد کا ہے ان سے روایات اتنی ہی زیادہ ہیں۔ آپ دیکھیں کہ زیادہ روایات کرنے والے صحابہ وہ ہیں جن کی وفات سن اسّی، پچاسی، نوے ہجری یا اس کے بعد ہوئی، اس لئے کہ ان کو زیادہ ضرورت پڑی، لوگوں نے زیادہ رجوع کیا۔ حضرت ابوبکرؓ سے اسی لئے روایات کم ہیں۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: کیا جرح و تعدیل کے بھی درجات ہیں؟

جواب: جی ہاں جرح و تعدیل کے بھی درجات اور طبقات ہیں۔ جن بارہ طبقات کا میں نے حوالہ دیا وہ مراتب رواۃ کہلاتے ہیں۔ ان میں پہلے چھ طبقات تو مقبول راویوں کے ہیں اور بقیہ چھ طبقات کمزور راویوں کے ہیں جن میں سے آخری چار متروک راوی ہیں اور ان کی روایت قبول نہیں کی جاتی۔ یہ خلاصہ آپ علامہ حافظ ابن حجر کی تقریب التہذیب کے مقدمہ میں دیکھ لیں اس میں لکھا ہوا ہے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: حدیث میں مرغے کے بولنے کے وقت کی دعا کیوں سکھائی گئی ہے؟

جواب: میرے خیال میں یہ جو دعا سکھائی گئی ہے یہ بھی ایک ضعیف یا موضوع حدیث ہے۔ مجھے اس کی تحقیق نہیں ہے اس لئے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: کیا آج حدیث کی جو کتابیں شائع کی جاتی ہیں ان میں اتنی ہی احتیاط کی جاتی ہے جتنی پہلے کی جاتی تھی؟

جواب: میرے علم کی حد تک واقعی اتنی ہی احتیاط کی جاتی ہے جتنی ہونی چاہئے۔ اتنی احتیاط کی جاتی ہے کہ صحیح بخاری کا جو نسخہ اس وقت ہندوستان اور پاکستان میں رائج ہے اس کی پروف ریڈنگ مولانا احمد سہارنپوری جیسے جید اور بالغ النظر عالم نے کی تھی، جو اپنے زمانہ کے صف اول کے محدثین میں سے تھے۔ برصغیر کے محدثین، وہ اہل حدیث مسلک سے تعلق رکھتے ہوں یا علماء دیوبند کے مسلک سے یا کسی اور مسلک سے، لیکن ان میں بہت سے بالواسطہ یا بلا واسطہ مولانا احمد علی سہارنپوری کے شاگرد ہیں۔ انہوں نے صحیح بخاری کی پروف ریڈنگ کی تھی۔ اسی طرح سے ہمارے ایک دوست ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی، وہ تقریباً بیس سال سے ابن ماجہ کے متن پر کام کر رہے تھے اور ابن ماجہ کا متن اب انہوں نے شائع کر دیا ہے اور تصحیح کا جو زیادہ سے زیادہ امکان ہوسکتا ہے اس امکان کی حد تک انہوں نے کام کیا ہے۔ اسی طرح سے بعض کتابوں پر، جن میں ابوداؤد اور غالباً ابن ماجہ اور ترمذی شامل ہیں اور شاید باقی بھی ہوں گی ان پر علامہ ناصر الدین البانی نے طویل عرصہ تک کام کیا ہے اور بہت عرصہ تک کام کرنے کے بعد اب انہوں نے ان کتابوں کے صحیح ایڈیشن چھپوائے ہیں۔ ان سب کتابوں پر کم و بیش بارہ سو سال سے مسلسل تحقیق کا کام ہو رہا ہے۔ اس لئے آپ اعتماد کے ساتھ ان کتابوں پر بھروسہ کر سکتی ہیں۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: بخاری کی احادیث کے عنوانات میں کوئی خاص جوڑ نظر نہیں آتا......

جواب: یہ بات بظاہر صحیح معلوم ہوتی ہے۔مثلاً حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث ہے'اوصانی خلیلِ بثلاث'۔اس کو بخاری میں دو عنوانات کے تحت بیان کیا گیا ہے باقی کہیں بیان نہیں کیا گیا۔یہ بڑی غور وخوض کی بات ہے۔اس موضوع پر لوگوں نے الگ سے کتابیں لکھی ہیں۔امام بخاری جب کوئی عنوان بیان کرتے ہیں تو وہ عنوان بڑی گہری بصیرت پر دلالت کرتا ہے۔بعض اوقات حدیث کے الفاظ میں وہ چیز نہیں ہوتی،لیکن حدیث کے معانی پر غور کریں تو وہ چیز سامنے آجاتی ہے۔مثلاً میں نے صحیح بخاری کی آخری حدیث پڑھی تھی جس کا عنوان امام بخاری نے دیا ہے'باب قول اللہ عزو جل ونفغ موازین القسط لیوم القیامۃ وان اعمال بنی آدم توزن'۔یہ اس باب کا عنوان ہے، کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے باب میں کہ ہم روز قیامت برابر کا ایک ترازو رکھیں گے اور اس اعلان میں کہ بنی آدم کے اعمال تولے جائیں گے، یہ عنوان ہے اور حدیث ہے کلمتان خفیفتان علی اللسان حبیبتان الی الرحمن ثقیلتان فی المیزان سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم، گویا وہ زبان سے نکلنے والا عمل میزان میں بھاری کیسے ہوگا؟ یہ ہلکا سا جملہ جو زبان سے نکلا تو اس کو کیسے تولا جائے گا۔کیا اس کے تولے جانے کی بھی یقیناً کوئی نہ کوئی شکل ممکن ہے۔جب اعمال کے تولے جانے کا ذکر ہے تو موازین قسط کے معنی معلوم ہوگئے۔اس طرح سے امام بخاری بالواسطہ طور پر بتاتے ہیں کہ ان کی مراد کیا ہے۔صحیح بخاری کے عنوانات پر لوگوں نے الگ سے کتابیں لکھی ہیں اور درجنوں جلدوں میں،بعض اوقات بیس بیس جلدوں میں کتابیں لکھی گئی ہیں اور بخاری کے ترجمۃ الباب کی تفسیر کی گئی ہے۔مولانا محمد ادریس کاندھلوی لاہور کے ایک مشہور محدث تھے،انہوں نے 'تحفۃ القاری فی حل تراجم البخاری' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو ابھی تک چھپی نہیں ہے،لیکن ان کے صاحبزادگان،جن کے پاس وہ کتاب ہے،ان کا کہنا ہے کہ اگر وہ چھپے گی تو پچیس تیس جلدوں میں آئے گی۔اس میں صرف بخاری کے عنوانات کی تشریح ہے۔اصل کتاب کی تشریح نہیں بلکہ صرف عنوانات کی تشریح ہے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: کیا وحی چوبیس ہزار مرتبہ نازل ہوئی؟

جواب: یہ جو چوبیس ہزار مرتبہ کا ذکر ہے یہ کئی کتابوں میں آیا ہے۔علامہ سیوطی نے الاتقان میں بھی لکھا ہے اور علامہ زرکشی نے البرہان میں بھی لکھا ہے اور جہاں جہاں وحی سے متعلق مباحث مفسرین قرآن نے بیان کئے ہیں وہاں چوبیس ہزار مرتبہ کا ذکر آیا ہے۔اس لئے چوبیس ہزار مرتبہ کا ذکر اگر درست ہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ سنت بھی وحی کے ذریعے نازل ہوئی ہے اور یقیناً وحی کے ذریعے نازل ہوئی ہے،لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ سنت وحی کے کس خاص طریقے سے نازل ہوئی؟ کیا اس طریقہ سے جس سے قرآن پاک نازل ہوا؟ اس بارہ میں ہمارے لئے قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا دشوار ہے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: روایت میں ہے کہ حضورؐ نے قوم حمیر کی تعریف کی......

جواب: میں نے تعریف کا لفظ نہیں کہا تھا۔میں نے کہا تھا کہ اگر کسی روایت میں کسی قوم کی برائی ہوئی ہے تو وہ روایت صحیح نہیں،اس لئے کہ کسی فرد یا گروہ کی برائی حضورؐ نے نہیں کی،تعریفیں تو بہت سوں کی کی ہے۔انصار کی تعریف کی ہے۔یمنیوں کی تعریف کی ہے۔الایمان یمان والحکمۃ یمانیۃ،قریش کی تعریف بھی کی ہے،تعریفیں بہت سوں کی کی ہیں۔لیکن اگر برائی کسی قوم کی کی ہو کہ فلاں قبیلہ کے لوگ بڑے برے ہیں،فلاں قوم کے لوگ بڑے چور ہوتے ہیں یا حبشی بڑے لالچی ہوتے ہیں،اس طرح کی بات کبھی حضورؐ نے نہیں کی ہے۔البتہ تعریفیں بہت سوں کی کی ہیں۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: موطا صحاح ستہ میں کیوں شامل نہیں؟

جواب: موطا امام مالکؒ کے بارے میں ابھی تو میں نے اتنی تفصیل سے عرض کیا ہے۔ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس میں احادیث کے علاوہ بہت سی اور چیزیں بھی شامل ہیں جو احادیث نہیں ہیں۔اس میں امام مالکؒ کے اپنے فرمودات اور فتاویٰ بھی شامل ہیں جو احادیث کا موضوع نہیں ہے۔چونکہ موطا خالص احادیث کا مجموعہ نہیں ہے اس

لئے بہت سے لوگوں نے اس کو احادیث کے مجموعوں میں شامل نہیں کیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس میں جو مرفوع احادیث آئی ہے وہ ساری کی ساری صحیح بخاری اور مسلم میں آ گئیں، اس لئے جب صحیح بخاری اور مسلم کو صحیحین قرار دیا گیا تو امام مالکؒ کی موطا کی احادیث خود بخود صحاح میں شامل ہو گئیں۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: ہم بخاری شریف کیوں پڑھتے ہیں؟ جبکہ موطا اور صحیح مسلم اتنی اچھی کتابیں ہیں۔ نیز یہ بتائیں کہ موطا کو موطا کیوں کہا جاتا ہے؟

جواب: آپ ضرور پڑھئے، کون کہتا ہے کہ آپ موطا نہ پڑھیں۔ موطا کے معنی ہے Beaten Track، اس کا مطلب ہے وہ راستہ جو زیادہ استعمال سے زیادہ کشادہ ہو جائے۔ امام مالکؒ نے چونکہ اپنے زمانے کی سنت کو جمع کیا تھا۔ گویا Beaten Track جس پر حضورؐ اور صحابہ کے زمانے سے عمل ہو رہا ہے اور لوگوں کے لئے ایک راستہ فراہم ہو گیا۔ بخاری مسلم سب پڑھنی چاہئے۔ لیکن اگر کہیں کورس میں یا نصاب میں کوئی ایک کتاب اختیار کی گئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی مصلحت سے اختیار کی گئی ہے۔ اگر آپ کے نصاب میں صحیح بخاری ہے تو اچھی بات ہے۔ آپ کے پاس جتنا وقت ہوگا اس کے حساب سے بقیہ کتابیں بھی شامل ہوں گی۔ اس کا دارومدار تو وقت اور صلاحیت پر ہے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: مودبانہ گزارش ہے کہ آپ اس بات کو واضح کریں کہ اخباروں اور ٹیلی ویژن پر موضوع احادیث کو جو نشر کیا جاتا ہے تو کیا علماء کی جماعت بیٹھ کر اس کی تحقیق کرتی ہے یا ایسے ہی بیان کر دی جاتی ہیں۔

جواب: ریڈیو اور ٹی وی وغیرہ پر جو احادیث نشر کی جاتی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حدیث تو وہ ہے جو خبر نامہ سے پہلے اسکرین پر لکھی ہوئی آتی ہے یا اور مواقع پر آتی ہے۔ وہ میں نے ہی دو سال پہلے ڈھائی تین سو احادیث کا اردو ترجمہ کر کے حوالوں کے ساتھ لکھ کر انہیں دیا تھا اور انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اسی مجموعہ میں سے انتخاب کر کے بیان کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ مستند ہیں۔ لیکن اگر کوئی صاحب علم تقریر کرنے ٹی وی پر آئے ہیں اور اپنے طور پر حدیث بیان کرتے ہیں تو وہ اپنی تحقیق کے مطابق بیان کرتے ہیں اور وہی اس کے ذمہ دار ہیں، اس کا ٹیلی ویژن والے یا کوئی اور ذمہ نہیں لے سکتا۔ اس لئے کہ پہلے سے تو معلوم نہیں ہوتا کہ کوئی شخص کونسی حدیث بیان کرے گا۔ اس لئے اس بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: حضرت امیر معاویہؓ کے بیٹے حضرت یزید کے بارے میں جو حدیث ہے کہ میری امت کی وہ جماعت جو قسطنطنیہ یعنی موجودہ استنبول کو فتح کرے گی وہ جماعت جنت میں جائے اور اس جماعت کے سپہ سالار یزید تھے، تو کیا یہ حدیث صحیح ہے؟ کیونکہ آپ نے ایک خاص جماعت کو اس میں تعظیم دی ہے۔

جواب: اس موضوع پر مسند احمد میں دو حدیثیں آتی ہیں۔ پہلی حدیث میں استنبول کی فتح کا عمومی ذکر ہے۔ اس میں یزید میرے خیال میں شامل نہیں ہیں۔ میں حدیث کے الفاظ بیان کر دیتا ہوں: لتفتتحن مدینة قیصر، کہ تم ضرور بالضرور قیصر کے شہر کو فتح کرو گے، جو قسطنطنیہ کے نام سے مشہور تھا، فلنعم الامیر امیر ھا ونعم الجیش ذالک الجیش۔ وہ امیر کتنا ہی اچھا امیر ہوگا اور وہ لشکر کتنا ہی اچھا لشکر ہوگا۔ قسطنطنیہ کی فتح 1492ء میں ہوئی تھی۔ بہت سے لوگ قسطنطنیہ پر حملہ کرنے جاتے رہے ہیں کہ شاید ان کے ہاتھوں فتح ہو جائے اور وہ اس بشارت کے مصداق بن جائیں۔ یزید نے بھی کوشش کی لیکن یہ فتح یزید کے مقدر میں نہیں تھی، بلکہ محمد الفاتح کے ہاتھوں مقدر تھی جو عثمانی حکومت کا ایک بادشاہ تھا اور اسی لئے اس کو فاتح کہا جاتا ہے کیونکہ اس نے استنبول فتح کیا تھا۔ فتح کے بارے میں ایک روایت تو یہ ہے۔

مسند احمد ہی کی ایک دوسری روایت ہے جس میں ہے کہ اول جیش یغز و مدینة قیصر مغفور لھم، یا اس طرح کے کچھ الفاظ ہیں، کہ وہ پہلا لشکر جو قیصر کے شہر پر حملہ کرے گا وہ مغفور لہم ہوگا۔ اب اس میں یــغـــزو کا لفظ ہے، کیا اس سے مراد محض حملہ کرنا ہے یا فتح کر لینا مراد ہے تو پہلا حملہ جس لشکر نے کیا اس کی سربراہی یزید کے ہاتھ میں تھی اور اس میں بڑے بڑے صحابہ کرامؓ بھی شامل تھے۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ اسی سال کی عمر میں اسی لئے تشریف لے گئے تھے کہ اس

بشارت کے مصداق بن سکیں۔ چنانچہ دوران محاصرہ وہیں ان کا انتقال ہوا اور وہیں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ استنبول میں ان کا مزار آج بھی ہے۔ اور آپ میں سے جو وہاں گئے ہیں انہوں نے دیکھا ہوگا، میں نے بھی کئی بار اس کی زیارت کی ہے۔ اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہاں یغزو سے مراد کیا ہے، محض حملہ یا مکمل فتح۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے کہ کس کو اس کا مصداق قرار دیتا ہے اور کس کو نہیں۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: آپ نے کہا ہے کہ حضورؐ نے اپنے بعد آنے والے کسی شخص کا نام لے کر کوئی بات نہیں فرمائی لیکن قیامت کی نشانیوں میں امام مہدی کا نام ملتا ہے؟

جواب: امام مہدی کے بارے میں جو احادیث ہیں ان کے بارے میں بڑی تفصیل سے بحث ہوئی ہے۔ اس میں وہی تواتر والی بات یاد رکھیں۔ یہ احادیث صحابہ کرام کی بڑی تعداد سے مروی ہیں اور صحابہ کے بعد بھی بڑی تعداد میں لوگوں سے مروی ہیں۔ اگرچہ انفرادی طور پر یہ ساری احادیث اخبار آحاد ہیں لیکن ان میں کچھ باتیں قدر مشترک ہیں جن کو ہم تواتر قدر مشترک قرار دے سکتے ہیں۔ ان میں قدر مشترک کسی کا نام نہیں ہے۔ قدر مشترک یہ ہے کہ میرے بعد آخری زمانہ سے پہلے ایک ایسا قائد، ایک ایسا متدین اور ہدایت یافتہ امام مسلمانوں کو ملے گا جو میرے طریقے کو دوبارہ زندہ کردے گا۔ تواتر قدر مشترک کے اصول پر اتنی بات مشترک ہے۔ باقی کوئی چیز قدر مشترک نہیں ہے۔ ان روایات میں بہت سی ضعیف بھی ہیں، بلکہ کچھ روایات ان میں سے موضوع ہیں اور جو لوگ ان کو موضوع نہیں سمجھتے ان کے نزدیک وہ احادیث سب کی سب ضعیف یا زیادہ سے زیادہ حسن لغیرہ ہیں۔ اس لئے یہ اصول کہ نام کے ساتھ جو روایات آئی ہیں وہ قابل قبول نہیں ہیں، یہ اصول باقی رہتا ہے اور مہدی کی روایت سے ٹوٹتا نہیں ہے۔ مہدی کی احادیث تواتر قدر مشترک سے ثابت ہیں۔ ان میں نام والی احادیث کا وہ درجہ نہیں ہے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: اخبارات میں شب برات کی رات کو عبادت کی فضیلت کے بارے میں احادیث چھپتی ہیں، اس بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟

جواب: نصف شعبان کے بارے میں ایک حدیث آئی ہے جو کہ میرے خیال میں بہت ضعیف ہے اور ضعیف کے بھی بہت نچلے درجہ پر ہے۔ پندرہویں شعبان کی کوئی فضیلت حدیث کی مستند کتابوں میں نہیں آئی۔ اور قرآن پاک کی جس آیت کا لوگ حوالہ دیتے ہیں اس سے مراد کوئی اور رات نہیں ہے، بلکہ لیلۃ القدر ہے اور لیلۃ القدر ہی کا نام لیلۃ البرأۃ ہے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: کیا صحیح بخاری میں سب صحیح احادیث ہیں؟ کوئی ضعیف حدیث نہیں ہے؟

جواب: صحیح بخاری کے اندر کوئی ضعیف حدیث موجود نہیں ہے۔ محدثین کے معیارات کی رو سے اس کی تمام احادیث صحیح احادیث ہیں۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: جو منکرین حدیث نماز کو ہی دعا کا نام دیتے ہیں ان کو کیسے بتایا جائے، وہ کہتے ہیں کہ قرآن ایک مکمل کتاب ہے اور اس میں اگر وضو اور تیمّم کا طریقہ بتایا جاسکتا ہے تو نماز کا طریقہ کیوں نہیں بتایا گیا؟ وہ لوگ الصلوۃ کا مطلب دعا کرتے ہیں کیونکہ یہ لفظ قرآن ہی میں دعا کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

جواب: میں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ قرآن مجید یقیناً ایک مکمل کتاب ہے، لیکن اگر قرآن مجید کے ساتھ ایک معلم بھی بھیجا گیا ہے، شارع بھی ساتھ بھیجا گیا ہے تو شارع اور معلم کا ساتھ بھیجا جانا قرآن کے مکمل ہونے سے متعارض نہیں ہے۔ قرآن شارع کی موجودگی میں بھی مکمل ہوسکتا ہے اور ایک معلم کی موجودگی میں بھی مکمل ہو سکتا ہے۔ اس کی تکمیل میں کوئی فرق نہیں آتا۔ مکمل اس اعتبار سے ہے کہ انسان کی اس دنیا اور آخرت میں کامیابی کے لئے، ایک اخلاقی اور روحانی کامرانی اور خوف خدا رکھنے والے انسان کے طور پر کامیابی کے جو تمام اصول ہیں وہ سارے کے سارے اس کتاب میں سمو دیئے گئے ہیں اور اس کتاب کے باہر اب کوئی بھی ایسا اصول نہیں ملتا جس پر انسان کی اخروی کامیابی کا دارومدار ہو اور وہ اس کتاب میں موجود نہ ہو۔ لیکن کسی اصول کی تشریح یا وضاحت اگر کی جائے تو اس سے کتاب کی کاملیت

پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: تعلیقات کو دوبارہ بیان کر دیجئے؟

جواب: 'تعلیقات' تعلیق کی جمع ہے۔ اس کے لغوی اور لفظی معنی ہیں معلق یعنی لٹکا ہوا کر دینا۔ معلق اس حدیث یا روایت کو کہتے ہیں کہ جس میں راوی کے اور جس کی روایت ہے اس کے درمیان کچھ واسطے کٹ گئے ہوں۔ امام بخاری بہت سی معلق روایات صحیح بخاری میں لائے ہیں، اس لئے کہ وہ ان کو بطور استدلال کے یا کسی چیز کے شواہد کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں براہ راست حدیث کے طور پر پیش کرنا ان کا مقصد نہیں ہے۔ اب چونکہ تعلیقات کتاب کے اصل ڈھانچہ کا حصہ نہیں ہے۔ لہٰذا ان معلق روایات کا وہ درجہ نہیں ہے جو کتاب کی اصل روایات کا ہے۔ بلکہ کسی خاص روایت کی کسی خاص بات کی وضاحت کے لئے انہوں نے ضمناً کوئی روایت نقل کر دی ہے، اس کو تعلیق کہتے ہیں جیسے چلتے چلتے ذہن میں کوئی بات آ جائے اور آدمی اس کو بیان کر دے۔ اس مقصد کے لئے امام بخاری نے یہ چیزیں شامل کی ہیں۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بخاری میں ضعیف احادیث بھی ہیں وہ ایسا کیوں کہتے ہیں؟

جواب: یہ انہی سے پوچھیے کہ وہ کیوں کہتے ہیں۔ محدثین جو اس فن کے ماہر ہیں جو ہمیشہ سے اس پر غور کرتے آ رہے ہیں ان کا کہنا یہ ہے کہ بخاری میں کوئی ضعیف حدیث شامل نہیں ہے۔ صحیح بخاری میں جتنی بھی احادیث ہیں وہ ساری کی ساری صحیح ہیں۔ لیکن یہ یاد رکھیے کہ صحیح احادیث میں بھی بعض احادیث ہیں کہ ان پر عمل کرنے کے لئے کچھ شرائط پیش نظر رکھنی پڑتی ہیں، کن حالات میں ان پر کس طرح عمل کیا جائے گا، یہ ایک لمبی اور تفصیلی بحث ہے۔ اس میں صرف لفظ 'صحیح' کو یاد کر کے کوئی فیصلہ کرنا غیر مخصص کے لئے درست نہیں ہے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: تلقی بالقبول کی صورت میں حدیث کو درست یا صحیح قرار دینا، کیا یہ طریقہ آج بھی درست ہوگا؟

جواب: نہیں آج تلقی بالقبول کی بنیاد پر کسی ضعیف حدیث کو قابل قبول قرار دینا درست نہیں ہوگا۔ اگر کسی حدیث کو متقدمین نے بالاتفاق ضعیف یا کمزور یا ناقابل قبول قرار دیا ہے تو آج تلقی بالقبول کی وجہ سے وہ قابل قبول نہیں ہو جائے گی۔ تلقی بالقبول ان لوگوں کے درمیان مانا جاتا ہے جو علم حدیث کے امام تھے۔ ہمارے اور آپ کے درمیان تلقی بالقبول کی کوئی حیثیت نہیں۔ ہم اور آپ تو کسی شمار قطار میں نہیں آتے، جو حدیث کے ائمہ ہیں، علماء ہیں، جنہوں نے زندگیاں اس میں کھپائی تھیں ان میں دیکھا جائے گا کہ کسی حدیث کو تلقی بالقبول حاصل تھی کہ نہیں تھی۔ مثال کے طور پر ایک چیز عرض کرتا ہوں۔ تلقی بالقبول کے بھی قواعد ہیں۔ مثلاً ایک حدیث ہے 'لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق'۔ کسی مخلوق کی اطاعت اس وقت نہیں کی جاسکتی جب اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو رہی ہو۔ ماں باپ کی اطاعت نہیں ہوسکتی اگر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو رہی ہو۔ عدالت کی فرمانبرداری نہیں ہوسکتی اگر اللہ کے حکم کی خلاف ورزی ہو رہی ہو، حکومتوں کے احکام کی پابندی نہیں ہوسکتی اگر اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی ہو رہی ہو۔ لیکن یہ حدیث ان الفاظ میں بہت ضعیف ہے۔ پتہ نہیں کسی بہت غیر مستند کتاب آئی ہوگی۔ لیکن معناً درست ہے اور اس سے کوئی اختلاف نہیں کر سکتا۔ دوسرے الفاظ میں کسی اور عبارت میں یہی اصول قرآن پاک میں بھی آیا ہے حدیث میں بھی آیا ہے۔ چونکہ ان الفاظ کو تلقی بالقبول حاصل ہے اس لئے ہم اس کو کہیں گے کہ درست ہے۔ تلقی بالقبول تبع تابعین کے زمانے ہی تک درست ہے۔ یعنی تابعین، تبع تابعینؒ اور ائمہ محدثین کے زمانے تک۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: کیا حدیث کی کتابیں آج بھی ویسی ہی ہیں جیسے لکھی گئیں تھیں؟

جواب: حدیث کی کتابوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ الحمدللہ وہ ویسی کی ویسی موجود ہیں اور آج تک موجود ہیں۔ اب اس میں کسی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں ہے کیونکہ لاکھوں کی تعداد میں چھپی ہوئی ہیں۔ حدیث کے ہزاروں حافظ آج بھی موجود ہیں۔ میں نے دیکھا ہے ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنی یادداشت سے پوری صحیح بخاری سنا سکتے ہیں اور ایک نقطہ کا فرق نہیں ہوتا۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: جو لوگ حدیث اور سنت میں فرق کرتے ہیں وہ اس کی واضح تعریف کیا بتاتے ہیں؟

جواب: جو لوگ حدیث اور سنت میں فرق کرتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ حدیث سے مراد تو وہ روایت ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کے کسی قول، فعل یا حالت کی نشاندہی ہو۔ مثال کے طور پر صحیح بخاری کی پہلی حدیث ہے انما الاعمال بالنیات۔ یہ رسول اللہ ﷺ کا ایک ارشاد گرامی ہے۔ لیکن سنت سے مراد وہ طریقہ متبعہ، جس کی آپ نے لوگوں کو تعلیم دی ہو اور جس کو آپ نے لوگوں کو سکھایا ہو۔ مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ نے یہ سکھایا کہ جب رمضان کا مہینہ آتا ہے تو کیسا طرز عمل اختیار کیا جاتا ہے۔ جب مسلمان پانچ وقت کی نماز ادا کرتے ہیں تو کیا کرتے ہیں۔ یہ جو مجموعی طور پر نماز کی ادائیگی کا حکم ہے یہ سنت ہے اور اس حکم کی تشریح اور توضیح کے لئے اگر کوئی انفرادی روایت آئی ہے تو وہ حدیث ہے۔ گویا حدیث تو وہ روایت یا رپورٹ ہے اور اس کے نتیجے میں جو طرز عمل سامنے آیا ہے وہ سنت ہے۔ یہ ان لوگوں کی رائے ہے جو حدیث اور سنت کو الگ الگ قرار دیتے ہیں۔

میرے ذاتی خیال میں وہ رائے زیادہ درست ہے، ممکن ہے میں غلطی پر ہوں، مجھے اپنی رائے پر زیادہ اصرار نہیں لیکن میرے خیال میں وہ رائے زیادہ درست ہے جس کے مطابق علم حدیث ایک عام لفظ ہے۔ اس میں سنت سمیت وہ ساری چیزیں شامل ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی ذات سے منسوب ہوں۔ ان میں وہ چیز بھی شامل ہے جو ثابت اور طے شدہ ہے۔ جس کے بارے میں تمام امت کا اتفاق ہے کہ حضور اکرمؐ سے اس کا انتساب درست ہے، جس کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں اور جس سے امت کے طرز عمل کی تشکیل ہوتی ہے وہ سنت ہے۔ جب کہ حدیث میں کچھ چیزیں ایسی بھی شامل سمجھی جاتی ہیں جو سنت میں شامل نہیں ہیں مثلاً ضعیف احادیث۔ محدثین نے کہا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ حضورؐ سے اس کی نسبت کمزور ہے۔ حدیث تو یہ بھی ہے۔ کیونکہ اسے حدیث کہا گیا ہے، اگرچہ ضعیف ہونے کی وجہ سے وہ سنت میں شامل نہیں ہے۔ اس لئے حدیث عام ہے سنت خاص ہے۔ یہ میری ذاتی رائے ہے ممکن ہے کہ یہ غلط ہو۔ لیکن حدیث اور سنت کے فرق کے بارے میں یہ تین نقطہ ہائے نظر ہیں۔ آپ کا جو چاہے اختیار کیجئے۔ اصطلاح کی بات ہے اور اصطلاح میں کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہئے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: خبر کے کیا معنی ہیں؟

جواب: خبر کے لفظی معنی تو ہیں اطلاع یا رپورٹ۔ اردو میں بھی خبر کے یہی معنی ہیں۔ آپ نے سنا ہوگا نیوز News کے لئے خبر کا لفظ بولا جاتا ہے۔ لیکن علم حدیث کی اصطلاح میں خبر حدیث کے مترادف کے طور پر استعمال ہوتا ہے، یعنی ہر وہ روایت جو رسول اللہ ﷺ کے کسی قول، فعل یا عمل کو بیان کرتی ہو، وہ اصطلاحاً خبر کہلاتی ہے۔ اس لحاظ سے خبر اور حدیث مترادف الفاظ ہیں۔ خبر رسول اللہ ﷺ کے قول کے بارے میں ہو مثلاً انما لاعمال بالنیات، یا آپ کے کسی فعل کے بارے میں ہو جیسے آپؐ نے نماز میں طویل رکوع کیا۔ یہ عمل کی روایت ہے۔ حدیث بھی ہے خبر بھی ہے۔ حدیث اور خبر قریب قریب مترادف الفاظ ہیں اور ایک معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: بری سنت یا بری ریت نکالنا غلط ہے یہ سمجھائیے کہ کیا اچھی سنت جاری کرنا کیا سنت سے بڑھ کر یا بدعت سے مختلف ہے؟

جواب: پہلے یہ سمجھ لیں کہ بدعت کس کو کہتے ہیں؟ ہم جن معاملات میں شریعت کی رہنمائی میں کام کرتے ہیں وہ تین بنیادی چیزیں ہیں۔ایک میدان عقائد کا ہے۔ یہ وہ بنیادی اصول ہیں جن کا ماننا ہم سب کے لئے لازمی ہے، گویا جن چیزوں کا ماننا ضروری ہے ان کو عقائد کہتے ہیں۔ایک میدان عبادات کا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جاتی ہے نماز، روزہ، حج، تلاوت قرآن، نوافل، صدقہ وغیرہ۔ایک میدان معاملات کا ہے جسے ہر انسان انجام دیتا ہے چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم۔کھاتا پیتا ہے، سواری کرتا ہے، کپڑے پہنتا ہے، کاروبار کرتا ہے، تجارت کرتا ہے۔ جہاں تک بدعت کی بات ہے تو اس کا تعلق پہلی دو چیزوں سے ہے۔معاملات یا عادات میں بدعت نہیں ہوتی۔اگر دین کے عقائد میں آج میں کوئی ایسا عقیدہ نکال لوں یا کوئی شخص نکال لے جس کی رسول ﷺ نے تعلیم نہیں دی، یا رسول اللہ ﷺ (کی دی ہوئی تعلیم) کے لئے جس چیز کی ضرورت نہیں ہے وہ بدعت ہے۔اللہ کی عبادت کرنے کا کوئی ایسا طریقہ اگر ایجاد کر لیا جائے جس کی حضورؐ نے تعلیم نہیں دی یا حضورؐ کے تعلیم دیئے ہوئے طریقہ کے لئے جس چیز کی ضرورت نہ ہو وہ بدعت ہے۔

مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ نے الہدیٰ نہیں بنایا تھا۔اس طرح کے ڈیسک نہیں لگائے تھے جس طرح کہ آپ نے لگائے ہیں۔ایسا روسٹرم نہیں بنایا تھا۔لیکن ان میں سے کوئی چیز بدعت نہیں ہے۔اس لئے کہ یہ چیز دین کی تعلیم کے لئے آج کل کے ماحول اور زمانہ میں مفید یا ضروری ہے۔جو اسباب اور وسائل کی نوعیت کی ہو اور دین کی خدمت کے لئے ضروری یا مفید ہو وہ بدعت نہیں ہے۔جس کی ضرورت نہ ہو اور جس کی حضورؐ نے تعلیم نہ دی ہو۔لیکن عبادات اور عقائد سے تعلق ہو وہ بدعت ہے۔جو چیز حرام نہیں ہے وہ آپ کے لئے بالکل جائز ہے، آپ جتنی مرضی ہو اس میدان میں نئی نئی چیزیں لائیے۔مکان بنانے کے نئے نئے طریقے ایجاد کریں۔ کاروبار کرنے کے نئے نئے طریقے ایجاد کریں۔کپڑا اچھے سے اچھا بنوائیں گھر کو اچھے سے اچھے طریقے سے ڈیکوریٹ کریں۔اگر وہ حرام چیز نہیں ہے تو جائز ہے۔گھر میں سونے کے برتن نہ رکھیں۔اچھے سے اچھے برتن رکھنا جائز ہے۔مردوں کے لئے ریشم نہ ہو تو اچھے سے اچھا کپڑا پہنیں جائز ہے۔مرد سونے چاندی کا زیور نہ پہنے، ریشم استعمال نہ کرے، کسی کے مذہبی شعائر کی پیروی نہ کرے، اس کے علاوہ ہر چیز جائز ہے۔یعنی معاملات میں صرف حلال وحرام کی قید ہے۔جو حرام ہے اس سے بچیں، باقی جتنا مرضی رزق حلال کمائیں، جو مرضی کریں۔

لیکن عقائد اور عبادات میں صرف اس حد تک رہیں جس حد تک رسول اللہ ﷺ اور شریعت نے اجازت دی ہے۔اس سے آگے جانا وہاں جائز ہے جہاں جانا تعلیم پر موثر عمل درآمد اس کے لئے ناگزیر ہو جو حضورؐ نے سکھائی ہے۔مثلاً حج کی تعلیم دی، حج فرض ہے۔لیکن حج کے لئے اگر آپ جانا چاہیں تو آج ویزا لینا ناگزیر ہے، بغیر ویزا کے آپ حج پر نہیں جا سکتے۔ویزا کے لئے پاسپورٹ ضروری ہے، پاسپورٹ کے لئے تصویر بنوانا ضروری ہے۔تو یہ چیزیں عارضی طور پر ضروری ہو جائیں گی۔اس لئے کہ ان چیزوں کے بغیر یہ عبادت ادا نہیں ہو سکتی۔اگر ان سب کے بغیر حج کے حکم پر عمل ہو سکے تو پھر نہ پاسپورٹ بنوانا ضروری ہو گا نہ تصویر بنوانا نہ ویزا لینا۔یہ چیزیں بدعت نہیں کہلائیں گی۔اگرچہ خالص عبادات سے تعلق رکھتی ہیں، لیکن بدعت نہیں ہیں اس لئے کہ عبادات کے لئے ناگزیر ہیں۔عقائد اور عبادات سے متعلق جو چیز نہ ناگزیر ہو نہ حضورؐ نے اس کی تعلیم دی ہو، وہ بدعت ہے۔مثلاً اگر میں آپ سے کہوں کہ کل ساڑھے نو بجے کھڑے ہو کر چھ رکعات نماز پڑھیں جماعت کے ساتھ، اور روزانہ پہلی رکعت میں فلاں سورۃ پڑھیں، دوسری میں فلاں سورۃ پڑھیں اور سجدے میں یہ دعا کریں اور ایسا کرنا سب کے لئے لازمی ہے، تو یہ بدعت ہو جائے گی، یہ بدعت ہے اس لئے مجھے ایسا کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میں آپ کو کسی خاص نماز کی تلقین جو حضورؐ نے نہیں سکھائی۔یا میں کہوں کہ چونکہ میں ۱۸ ستمبر کو پیدا ہوا تھا اس لئے آپ میری پیدائش کی خوشی میں اٹھارہ ستمبر کا روزہ رکھا کریں۔یہ بدعت ہے اس لئے کہ حضورؐ نے ایسے کسی روزے کی تعلیم نہیں دی۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: معاشرہ میں منکرین حدیث کی تعداد بڑھ رہی ہے۔عموماً لوگ ان سے متاثر نظر آتے ہیں، ایک سیدھا سادا انسان ان کے پروپیگنڈہ سے کس طرح بچ سکتا ہے؟

جواب: اس طرح بچ سکتا ہے کہ لوگوں کو علم حدیث کی تعلیم دی جائے جیسے کہ آپ یہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔لوگوں تک علم حدیث کے ذخائر اور رہنمائی پہنچائی جائے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: جن لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ ہم سنت کو صحیح مانیں تو ہم اللہ کو نعوذ باللہ جھوٹا کہہ رہے ہیں، اللہ کہتا ہے کہ میں نے کھول کھول کر بیان کر دیا ہے اور لوگ نماز کا طریقہ

قرآن سے ثابت کرتے ہیں۔

جواب: ایک جملہ حضرت علیؓ نے ارشاد فرماتھا۔ جملہ بڑا زبردست ہے اور بہت سے معاملات پر صادق آتا ہے۔ جب خوارج نے آپ کے خلاف بغاوت کا فیصلہ کیا، تو یہ عنوان اختیار کیا کہ قرآن پاک میں آیا ہے کہ ان الحکم الا للہ فیصلہ کرنے کا اختیار صرف اللہ کو ہے اور آپ نے دو ثالث مقرر کر دیئے، تو آپ نے قرآن پاک کی آیت کی خلاف ورزی کی۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ کلمة حق ارید بها الباطل، یہ جملہ تو حق ہے لیکن مراد اس سے باطل ہے۔ نیت اور عزائم برے ہیں جملہ درست ہے۔ تو یہ جملہ تو درست ہے کہ قرآن پاک میں ہر چیز کو کھول کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔ لیکن نیت اس سے باطل ہے۔ قرآن پاک کوئی نظری یا مجرد یا Abstract کتاب نہیں ہے کہ کسی خلا میں نازل ہوئی ہو۔ بلکہ قرآن مجید ایک کتاب ہدایت اور ایک دستور العمل ہے جس کے ساتھ اس کا پڑھانے والا بھی بھیجا گیا تھا۔ خود قرآن مجید میں یہ لکھا ہوا ہے، کل اس پر بات کریں گے اور یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ اعتراض بے بنیاد ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ لتبین للناس مانزل الیهم، آپ پر یہ کتاب اس لئے نازل کی گئی ہے کہ آپ اس کتاب کو ان لوگوں کے سامنے بیان کر دیں جن کے لئے یہ اتاری گئی ہے۔ بیان سے کیا مراد ہے؟ اگر بیان انہی آیات کا دہرانا ہے تو یہ ایک بے کار عمل ہے جس کے لئے نبی کو بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بیان سے مراد کیا تھی؟ کیا رسول اللہ ﷺ صرف آیات کے دہرانے پر اکتفا فرماتے تھے یا اس کی وضاحت بھی فرماتے تھے؟ اگر صرف آیات دہرانے پر اکتفا فرماتے تھے تو تحصیل لاحاصل ہے۔ سننے والا کسی سے بھی سن لے۔ میں آج قرآن پاک پڑھ لوں وہ کافی ہے، اور اگر آپ آیات قرآنی کی وضاحت بھی فرماتے تھے تو اسی وضاحت کا نام سنت ہے۔ پھر قرآن مجید میں ایک جگہ آیا ہے کہ نبی کے چار کام ہیں۔ یتلوا علیهم اٰیاته، اس کی آیات تلاوت کرتے ہیں، ویزکیهم، لوگوں کا تزکیہ دیتے ہیں، گویا ان کو اندر سے ستھرا کرتے ہیں، ویعلمهم الکتاب اور کتاب کی تعلیم دیتے ہیں، والحکمة، اور دانائی سکھاتے ہیں تو یہ باقی تین چیزیں جو ہیں وہ ان میں شامل ہیں کہ نہیں۔ یتلوا علیهم اٰیاته میں تو وہ چیز شامل ہوگئی جو منکرین حدیث بتاتے ہیں۔ اگر قرآن بغیر حضورؐ کی تشریح کے واضح تھا تو یتلوا علیهم اٰیاته کافی تھا، یہ یزکیهم حضورؐ کیسے کرتے تھے؟ کوئی ہدایات دیتے تھے؟ زبان مبارک سے کچھ ارشاد فرماتے تھے یا خاموش رہتے تھے؟ تو وہ جو ہدایات تھیں وہ کیا ہیں؟ وہ قرآن پاک کے اس تزکیہ کی وضاحت ہیں یا نہیں ہیں؟ اور ویعلمهم الکتاب، تعلیم کتاب کیا ہے؟ وہ تلاوت آیات سے مختلف چیز ہے۔ اگر وہ تلاوت آیات سے کوئی مختلف چیز ہے تو یہ قرآن پاک کی تفسیر ہے جو حدیث میں آئی ہے، اور حکمت سکھاتے ہیں تو یہ تو کتاب کی تشریح سے بھی الگ چیز ہے۔ تو گویا خود قرآن پاک میں درجنوں آیات ہیں جن سے سنت کا شارح قرآن ہونا ثابت ہوتا ہے۔ جو لوگ ایک آیت لے کر باقی کا انکار کرتے ہیں وہ قرآن کے بھی منکر ہیں۔ وہ صرف سنت کے منکر نہیں، وہ قرآن کے بھی منکر ہیں۔ اور قرآن بھی ان کے لئے قابل قبول نہیں۔ غالباً قرآن کو توڑ نا مروڑ نا آسان ہے، سنت کو توڑ نا مروڑ نا دشوار ہے، اس لئے سنت کا انکار کرتے ہیں تا کہ پھر اسلام سے جان چھوٹ جائے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: (کتب حدیث کی) فقہی ترتیب سے کیا مراد ہے؟

جواب: فقہی ترتیب سے مراد ہے کہ فقہ کی کتابوں میں مضامین کو بیان کرنے کا ایک خاص انداز ہوتا ہے۔ سب سے پہلے اس میں طہارت کے احکام ہوتے ہیں۔ پھر نماز کے احکام ہوتے ہیں۔ پھر زکوٰۃ اور روزہ کے احکام ہوتے ہیں۔ پھر حج کے احکام ہوتے ہیں۔ پھر نکاح وطلاق کے احکام ہوتے ہیں۔ پھر وراثت ووصیت، پھر معاملات اور خرید وفروخت لین دین، یہ ترتیب فقہ کی سب کتابوں میں رائج ہے اور امام مالکؒ کے زمانہ سے رائج ہے۔ احادیث کی وہ کتابیں جو اس ترتیب سے ہوں جن میں سب سے پہلے طہارت، نماز، روزے کے احکام ہوں وہ سنن کہلاتی ہیں، جن میں یہ ترتیب نہ ہو وہ سنن نہیں کہلاتیں۔ مثلاً صحیح بخاری میں یہ ترتیب نہیں ہے۔ صحیح بخاری میں جو پہلا باب ہے وہ ہے باب کیف کان بدء الوحی علیٰ رسول اللہ ﷺ۔ کہ رسول اللہ ﷺ پر وحی کا آغاز کیسے ہوا۔ سب سے پہلے یہ باب ہے پھر ایمان کا باب ہے پھر علم کا باب ہے۔ سنن ابن ماجہ میں پہلے علم کا باب ہے پھر بقیہ ابواب ہیں۔ ہر مصنف کی ترتیب الگ الگ ہے۔

(محاضراتِ حدیث)

سوال: شرح کی تعریف بتا دیجئے۔

جواب: جس طرح قانون کی کمینٹری ہوتی ہے اسی طرح سے مختلف متون کی کمنٹریز لکھی گئی۔ ان میں الفاظ کی تشریح کی گئی اور ان کو elaborate کیا گیا۔ اس کی مثالیں دی گئی، کیونکہ بریف عبارت بہت پریسائز تھی اس لئے ان کی تشریح کی ضرورت محسوس کی گئی۔

(قرآن)

سوال: قرآن پاک کےتیس پاروں کی تقسیم صحابہ کرام کے دور میں ہوئی یا بعد میں ہوئی ؟

جواب: قرآن کےتیس پاروں کی تقسیم بعد میں ہوئی ہے۔ شروع میں صحابہ کرام کی تربیت یہ تھی کہ وہ تین یا سات دن میں قرآن پاک کی تلاوت مکمل کیا کرتے تھے۔ حضرت عثمان غنیؓ کا معمول یہ تھا کہ وہ سات دنوں میں پورے قرآن کی تلاوت مکمل کیا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے سات منزلیں پڑ گئیں جواب بھی مشہور و معروف ہیں اور اکثر قرآن پاک کے نسخوں میں ان کی علامات موجود ہیں۔ بعد میں جب کچھ تساہل پیدا ہوتو لوگ تیس دن میں قرآن پاک کی تلاوت مکمل کرنے لگے۔ اس وقت لوگوں کی سہولت کی خاطر یہ تیس پارے تجویز کئے گئے۔ یہ بعد کی بات ہے۔ محض تلاوت کی سہولت اس کا مقصد ہےاور قرآن پاک کے مضامین اور مطالب کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: کل کی نشست میں یہ بات سامنے آئی تھی کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عثمانؓ کے دور میں تدوین قرآن کی جو بات ہوئی تھی، ان دونوں میں کیا فرق تھا۔ اور جو مکتوب پہلے سے تھا اس کو جلایا گیا تھا یا نہیں؟

جواب: ان دونوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور میں ایک نسخہ جامع ترتیب کے ساتھ سرکاری طور پر لکھوایا گیا اور مسجد نبوی میں خلیفہ کی نگرانی میں موجود رہا۔ حکم یہ تھا کہ جس کو ترتیب کے بارے میں کوئی تامل ہو یا کسی کی یادداشت میں کمی ہو، وہ اس نسخہ کے مطابق چیک کرکے اس کو درست کرلے۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں یہ ہوا کہ اسی نسخہ کی مزید کاپیاں کرا کر بھیج دی گئیں اور سابقہ نسخوں کو رکھنے کی ممانعت کردی گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عثمانؓ کے دور میں اسلامی ریاست کی حدود آرمینیا سے لے کر مراکش تک اور ترکی سے لے کر سوڈان کے جنوب تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس پورے علاقے میں آج بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ قرآن مجید کے ایک ایک ذاتی نسخہ کا جائزہ لے کر چیک کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اس کی ترتیب وغیرہ درست ہے کہ نہیں۔ اگر ایسا آج بھی ممکن نہیں تو اس دور میں کیسے یہ ممکن ہوسکتا تھا۔ اس لئے حضرت عثمانؓ نے حکم دیا کہ ان سب نسخوں کو ضائع کردیا جائے۔ جو نسخے چمڑے اور پتھر پر لکھے ہوئے تھے ان کو دھو دیا گیا اور دھونے کے بعد دوسرے کام میں لایا گیا۔ اور جو دھوئے نہیں جاسکتے تھے ان کو جلوا دیا گیا اور جلانے کے بعد ان کو احترام کے ساتھ کہیں محفوظ یا دفن کردیا گیا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: کیا حضورﷺ کے پاس گھر میں یا آپ کی نگرانی میں قرآن تیار ہورہا تھا؟

جواب: میں تو بہت پہلے بیان کرچکا ہوں کہ حضورﷺ ہر ہفتہ دس دن بعد، جب بھی ضرورت محسوس کرتے، تمام صحابہ کرام کو بلاتے تھے اور جس صحابی کے پاس جو تحریری ذخیرہ یا نوشتہ ہوتا تھا اس کی آپ سماعت فرمایا کرتے تھے۔ اس میں اگر کوئی غلطی ہوتی تو آپﷺ اس کی اصلاح فرمادیتے۔ متفرق آیات ہوتیں تو آپﷺ ان کی ترتیب بیان فرمادیتے تھے۔ جب کوئی سورۃ مکمل ہوجاتی تھی اس کو بھی بیان فرمادیا کرتے تھے۔ یہ وہ چیز ہے جس کے بارے میں بخاری میں حضرت زید بن ثابت کی روایت آئی ہے: **کنا نولّف القرآن من الرقاع فی حضرۃ رسول اللہﷺ**، یعنی حضورﷺ کی موجودگی میں ہم قرآن پاک کو پرچیوں اور چمڑے کے ٹکڑوں سے جمع کیا کرتے تھے۔ مخالفین نے انہی اجتماعات کو دیکھ کر الزام لگایا تھا کہ یہ **اساطیر الاولین** ہیں۔ جو انہوں نے لوگوں سے لکھوا رکھی ہیں۔ لہٰذا یہ بات واضح ہے کہ یہ کام خود حضورﷺ کی نگرانی میں تسلسل کے ساتھ ہورہا تھا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: حضرت زید بن ثابت نے رسول اللہﷺ کے دور میں قرآن پاک لکھنے کا فریضہ انجام دیا، لیکن حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے دور میں ان سے مزید دو مرتبہ

لکھوایا گیا۔ کیا انہوں نے پہلے جو لکھا تھا تو کیا اس میں کوئی کمی بیشی تھی یا بعد کے نسخے پہلے والے نسخے کی توسیع تھی؟

جواب: حضرت زیدؓ بن ثابت کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حکم دیا تھا کہ قرآن پاک کا ایک نسخہ ایسا تیار کر دیں جو اسی ترتیب کے مطابق ہو جس ترتیب کے مطابق رسول اللہ ﷺ پڑھا کرتے تھے۔ اور اس کو ایک جگہ کتابی شکل میں مصحف کی شکل میں مرتب کر دیا جائے۔ حضرت زیدؓ بن ثابت نے وہ نسخہ مرتب کر دیا اور وہ کتابی شکل میں موجود رہا۔ بعد میں اسی نسخہ کی انہوں نے سات، پانچ یا گیارہ نقلیں کروائیں۔ بعض روایات میں پانچ کا ذکر ہے، بعض میں سات کا اور بعض میں گیارہ کا ذکر ہے۔ انہوں نے اپنے ہی نسخہ کی نقلیں تیار کیں۔ اپنے ہاتھ کے خط سے، اسی hand writing میں، اسی ہجا کے ساتھ۔ یہ نقلیں مختلف علاقوں میں بھیجی گئیں جن میں سے چار نقلیں آج بھی موجود ہیں۔ الحمدللہ مجھے چاروں کی زیارت کا موقع ملا ہے۔ ایک لندن کے برٹش میوزیم میں ہے، دوسرا ازبکستان کے دارالحکومت تاشقند میں ہے، تیسرا استنبول کے عجائب گھر توپ کاپی سرائے میں ہے اور چوتھا قاہرہ میں موجود ہے۔ تاشقند والے نسخہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ وہ نسخہ ہے کہ سیدنا عثمان غنی اپنی شہادت کے وقت اس کی تلاوت کر رہے تھے۔ اس نسخے پر خون کے دھبے بھی بتائے جاتے ہیں، ممکن ہے وہی نسخہ ہو۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: آپ نے فرمایا کہ بعض صحابہ کو یہ خوف تھا کہ حفاظ صحابہ کی شہادت سے قرآنی سورتوں کی ترتیب کہیں بدل نہ جائے جب کہ حضرت حذیفہ بن الیمان کو خوف تھا کہ حفاظ کی شہادت سے قرآن کہیں ضائع نہ ہو جائے۔

جواب: ترتیب کا گڑبڑ ہو جانا بھی قرآن کی اضاعت کے مترادف ہے۔ اگر قرآن اپنی اصلی شکل میں متفق علیہ موجود نہ ہو تو یہ بھی اضاعت کی ایک شکل ہے۔ قرآن کے متن کی اضاعت کا الحمدللہ کوئی امکان نہیں تھا۔ بڑی تعداد میں صحابہ کرام کو پورے کا پورا قرآن پاک زبانی یاد تھا۔ جس چیز کا خدشہ تھا وہ ترتیب ہی کے بارے میں ہو سکتا تھا۔ آج بائبل کے درجنوں ورژن ملتے ہیں۔ مزید ورژن بھی دریافت ہو رہے ہیں۔ ابھی یہودا کا ورژن دریافت ہوا ہے۔ اس کے بارے میں آج کل بڑے مضامین آرہے ہیں۔ لوگ قرآن پاک کے بھی اس طرح کے ورژن نکال سکتے تھے۔ الحمدللہ صحابہ کرام کے بروقت اقدام سے ایسی کوئی بات نہیں ہوئی اور یہ خطرہ ٹل گیا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ایک نسخہ کے علاوہ باقی سب نسخے جب ضائع کئے گئے تو اس کا طریقہ کیا تھا۔ کیا ان کو جلا دیا گیا یا دریا میں بہا دیئے گئے؟

جواب: حضرت عثمانؓ کے دور میں یہ بہت آسان تھا کیونکہ قرآن مجید یا جو بھی تحریریں عرب میں لکھی جاتی تھیں وہ اکثر و بیشتر پارچمنٹ پر یا ورق پر لکھی جاتی تھی۔ یہ جانوروں کی کھال کی جھلی ہوتی تھی۔ اس کو پروسیس کر کے کاغذ کی شکل میں بنا دیا جاتا تھا۔ آج کل بھی اس پر کافی کتابیں کتب خانوں میں موجود ہیں۔ یہ تقریباً اس طرح کا کاغذ ہوتا تھا جس طرح کا آج کل پیکنگ یا ریپنگ کا موٹا کاغذ ہوتا ہے۔ یہ بڑا مضبوط ہوتا تھا اور اس کو دھویا بھی جا سکتا تھا۔ جب حضرت عثمانؓ نے حکم دیا تو بہت سے صحابہ کرام نے اس کو دھو دیا اور دھونے کے بعد اس مواد کو کسی اور مقصد کے لئے استعمال کیا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی ری سائکلنگ کر کے دوسرے کاموں کے لئے استعمال کیا گیا۔ لیکن جہاں یہ ممکن نہیں تھا وہاں قدیم نوشتے نذر آتش کر دئے گئے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: جب ہزاروں صحابہ کرام کو قرآن یاد تھا تو 'لقد جاء کم رسول من انفسکم' کی ایک سند کیوں نہیں ملی جب کہ ہر آیت کے لئے دو اسناد ضروری تھیں۔

جواب: یہ بات آپ نے شاید جزوی طور پر سنی ہے۔ اگر تفصیل جاننا چاہیں تو میری کتاب 'محاضرات قرآنی' میں قرآن کی تدوین پر ایک الگ خطبہ ہے جس میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ میں پوری تفصیل یہاں بیان کروں گا تو بہت وقت لگے گا۔ ہوا یہ تھا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جو طریقہ کار وضع کیا تھا وہ یہ تھا کہ سات ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی۔ اس کے ساتوں ارکان کو ہر آیت یاد ہونی چاہئے اور ان ساتوں ارکان کے وہ تحریری ذخائر جو رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کئے گئے، ان میں بھی ہر آیت موجود ہونی چاہئے۔ پھر ہر آیت کے دو دو گواہ لئے جائیں جو حلفیہ بیان کے ساتھ یہ گواہی دیں کہ ہم نے یہ آیت حضور کو پڑھ کر سنائی تھی اور حضور

نے اس کی تصدیق فرمائی تھی۔ پھر ہر گواہ کے ساتھ دو دستاویزی ثبوت بھی آئیں جس میں ہر دستاویز کے حق میں دو عدد گواہی دینے والے ہوں جو اس بات کی گواہی دیں کہ یہ دستاویز رسول اللہ ﷺ کے حضور پیش کی گئی تھی اور آپ ﷺ نے اس کی سماعت فرما کر اس کو درست قرار دیا تھا۔ اس آیت کے بارہ میں ایک دستاویز ایسی تھی جس کا صرف ایک گواہ تھا۔ باقی سب شہادتیں مکمل تھیں۔ یہ آیت سب صحابہ کو زبانی یاد تھی۔ سب لوگوں کے علم میں تھا کہ یہ آیت سورۃ التوبہ کے آخری حصہ میں شامل ہے۔ لیکن چونکہ خلیفہ وقت نے ایک طریقہ کار مقرر کیا تھا اس لئے اس کے حق میں دو دستاویزی ثبوتوں میں سے ایک ہی گواہ تھا اور دوسرا نہیں تھا۔ یہ بات انہوں نے اس حدیث کی روشنی میں جو آپ کے علم میں ہے طے کر لی اور، اس دستاویز کو قبول کر لیا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: ایک دن آپ نے کہا تھا کہ قرآن تمام کا تمام قطعی الثبوت ہے لیکن دوسرے دن ایک سوال کے جواب میں آپ نے کہا کہ قرآن کی بعض آیات ایسی ہیں جن کا ایک سے زیادہ مفہوم نکل سکتا ہے۔

جواب: نہیں، آپ کو سمجھنے میں غلطی ہو رہی ہے۔ جہاں کسی ایک لفظ میں ایک سے زیادہ مفہوم نکل رہے ہوں، وہ ظنی الدلالت کہلاتے ہیں۔ میں نے دو چیزیں بتائی تھیں ایک یہ کہ قرآن پاک سارا کا سارا قطعی الثبوت ہے اور اس کا قرآن ہونا ثابت ہے، اس باب میں تو پورا قرآن الحمد سے لے کر والناس تک ایک ایک حرف، ایک ایک شوشہ اور ایک ایک زبر زیر قطعی الثبوت ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ لیکن قرآن مجید کی بعض آیات ہیں جن کا ایک سے زیادہ مفہوم نکل سکتا ہے، وہ ظنی الدلالت ہیں، یعنی جن کے مفہوم میں ایک سے زائد معانی اور مطالب کی گنجائش ہے اور علماء حدیث یا علماء تفسیر نے ان کے ایک سے زائد مطلب قرار دیئے ہیں۔ وہ سارے مطالب ظنی الدلالت ہیں۔ ان میں سے ہر مطلب بیک وقت صحیح ہو سکتا ہے، اس لئے میں نے ظنی الدلالت لفظ بولا تھا، ظنی الثبوت کا نہیں بولا تھا۔ قرآن پاک پورے کا پورا قطعی الثبوت ہے۔

(محاضراتِ حدیث)

(سیرتؐ)

سوال: سیرت کے حوالہ سے ابلاغ عامہ پر کام کس طرح ممکن ہے؟

جواب: سیرت کے حوالہ سے ابلاغ عامہ تو بہت کچھ کر سکتا ہے۔ آپ سیرت پر دستاویزی فلمیں بھی دکھا سکتے ہیں۔ اہم کتب سیرت کا تعارف بھی کروا سکتے ہیں۔ اہم مورخین سیرت کے بارے میں پروگرام ہو سکتے ہیں۔ لیکچرز ہو سکتے ہیں۔ اہم مقامات سیرت کے بارے میں دستاویزات تیار ہو سکتی ہیں۔ جنگوں کے مقامات کے بارے میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی کتاب ہے عہد نبوی کے میدان جنگ۔ ان پر آپ ایک سیریز شروع کر سکتے ہیں۔ جنرل اکبر خان کی کتاب پر ایک سیریز آسکتی ہے۔ جنرل محمود شیث خطاب کی کتابوں پر ایک سیریز آسکتی ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: سیرت پر جدید کام کے سلسلہ میں مصر میں ایک فلم الرسالہ بنائی گئی ہے۔ سنا ہے مصری فقہا نے اس کی اجازت دی ہے۔ اس طرح کے کام کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب: یہ فلم مصر میں نہیں لیبیا میں بنی تھی اور کرنل معمر قذافی نے بنوائی تھی۔ شروع میں مصر کے علمائے کرام نے اس کو ناجائز قرار دیا تھا۔ یہ بنی بھی 76-1975 وغیرہ میں تھی۔ اب انہوں نے اگر کوئی نئی بات کہی ہے تو میرے علم میں نہیں۔ لیکن عام طور پر علمائے کرام کہتے ہیں کہ سیرت کو فلموں کا موضوع بنانا احتیاط اور تقدس کے خلاف ہے۔ اس رائے کا احترام ہونا چاہئے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: سیرت کے حوالے سے جو کام ہوا ہے کیا مستقبل میں اس سے بہتر کام ہو سکتا ہے؟

جواب: یقیناً ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صرف نبوت کا دروازہ بند کیا ہے۔ باقی کوئی دروازہ بند نہیں کیا۔ آنے والے پچھلوں سے بہترین کام کر سکتے ہیں۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: نبی کریم ﷺ کے غزوات کے تناظر میں آپ نے مقتولین کی تعداد 550 بتاتے ہوئے اشارہ کیا تھا کہ بنو قریظہ کے بارے میں اہم نکتہ کی وضاحت بعد میں کروں گا لیکن نکتہ تشنہ رہ گیا۔

جواب: وہ نکتہ یہ تھا کہ بنو قریظہ ایک اہم یہودی قبیلہ تھا جو مدینہ منورہ سے کچھ فاصلے پر رہتا تھا۔ یہودیوں کے قبائل میں مسجد نبوی سے سب سے بعید مسافت پر یہی تھا۔ ان سے مسلمانوں کا معاہدہ تھا کہ یہ بیرونی دشمن کے مقابلہ میں مسلمانوں کا ساتھ دیں گے۔ اور ان کو وہ تمام حقوق اور مراعات حاصل ہوں گے جو مدینہ کے شہریوں کو حاصل ہوں گے۔ لیکن جب غزوہ خندق ہوا اور کفار مکہ نے دیگر کفار سے مل کر بڑی تعداد میں لشکر بنا کر مسلمانوں پر حملہ کیا تو بنی قریظہ کے یہودیوں نے اندر سے ان کے ساتھ مل کر سازش کی اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی تدبیر اور اللہ تعالیٰ کی مشیت تھی جس کی وجہ سے یہ سازش کامیاب نہیں ہوئی۔ جتنی فوجیں آئی تھیں وہ بغیر کسی کامیابی کے واپس چلی گئیں۔

اس پر رسول اللہ ﷺ نے بنی قریظہ کے یہودیوں کو سبق سکھانے کا اور سزا دینے کا فیصلہ کیا۔ آپ نے ان کا محاصرہ کرنے کا حکم کیا۔ بنو قریظہ کے یہودی پندرہ دن تک محاصرہ کی مزاحمت کرتے رہے۔ پندرہ دن کے محاصرہ کے بعد انہوں نے پیغام دیا کہ وہ کسی حکم کے فیصلہ پر surrender کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ان کے اپنے مطالبہ پر حضرت سعد بن معاذ کو جو اوس قبائل کے سربراہ تھے، حکم بنایا گیا۔ حضرت سعد بن معاذ بیماری کی حالت میں مدینہ سے تشریف لائے اور تورات کے حکم کے مطابق یہ فیصلہ دیا کہ ان کے قابل جنگ مردوں کو قتل کر دیا جائے۔ عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جائے۔ یہ حکم آج بھی تورات میں لکھا ہوا ہے۔

بقیہ روایات میں یہ ہے کہ ان کی جو جائدادیں تھیں وہ فاتحین میں تقسیم کر دی گئیں۔ ان کے قابل جنگ مردوں کو قتل کر دیا گیا۔ بعض روایات میں تو یہ آتا ہے۔ لیکن

بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ ان کے 43 سرداروں کو قتل کر دیا گیا۔ بعض میں آتا ہے کہ ان کے 200 آدمیوں کو قتل کر دیا گیا۔ بعض روایات کے مطابق ان کے 400 آدمیوں کو قتل کر دیا گیا۔ ان کی تعداد کے بارے میں سیرت نگاروں کے ہاں اتفاق رائے نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بہت سی کتابوں میں آیا ہے کہ اس قبیلہ کے بعض مرد بعد میں بھی مدینہ منورہ میں رہے۔ وہ یہودی تھے اوراس کے باوجود مدینہ میں رہے۔ ان میں سے بعض نے بعد میں اسلام قبول کرلیا۔ اگر ان کے سارے مردوں کو قتل کیا گیا ہوتا تو مدینہ میں پھر قرظی یہودیوں کا موجود ہونا محل نظر معلوم ہوتا ہے۔

اس بنیاد پر بعض لوگوں نے تحقیق کی ہے جن میں سے ایک صاحب کے کام کا میں نے حوالہ دیا تھا، یعنی جناب ابوالبرکات احمد۔ یہ صاحب مسلکاً قادیانی ہیں لیکن انہوں نے Muhammad and the Jews of Madinah کے نام سے ایک اچھی اور محققانہ کتاب لکھی تھی۔ اس میں انہوں نے یہ کہا ہے اور شواہد بھی دیئے ہیں کہ بنی قریظہ کے صرف جنگی مجرموں کو سزا دی گئی۔ ان کی تعداد تیس اور چالیس کے درمیان تھی۔ بقیہ لوگوں کو سزا نہیں دی گئی۔ ممکن ہے یہ بات درست ہو۔ اس لئے اس پر ابھی مزید غور ہونا باقی ہے۔ قدیم سیرت نگاروں نے اس کو خاص تحقیق کے قابل نہیں سمجھا۔ تحقیق تو تب ہوتی جب کسی مسئلہ پر سوال اٹھایا جائے۔ بقیہ روایتیں جو چلی آ رہی تھیں لوگ اس کو بیان کرتے رہے اور کسی نے ان پر غور کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ لیکن اب چونکہ ایک صاحب نے یہ سوال اٹھایا ہے اور اس کے مضبوط شواہد بھی دیئے ہیں اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس پر از سر نو تحقیق کی جائے۔

ایک مزید اہم بات جو بظاہر توجہ مبذول کراتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن پاک میں بہت سے غزوات پر بڑی تفصیل کے ساتھ تبصرے کئے گئے ہیں، وہاں غزوہ بدر میں جو 70 مکی مارے گئے ان پر تبصرہ بہت تفصیل کے ساتھ ہے۔ احد میں شہید ہونے والے 70 صحابہ کا تذکرہ بھی بڑی تفصیل کے ساتھ ہے۔ اگر بنی قریظہ کے آدمی اتنی بڑی تعداد میں مارے گئے ہوتے تو قرآن پاک میں تفصیل سے ان کا تذکرہ ہوتا۔ لیکن قرآن پاک میں صرف ایک ہی جملہ ہے کہ 'تقتلون فریقا وتاسرون فریقاً' تم نے ان میں سے بعض کو قتل کر دیا اور بعض کو قید کرلیا۔ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ قتل کی وہ نوعیت نہیں تھی جو بعض روایات میں بیان کی گئی ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: رسول اللہ ﷺ کی نماز جنازہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: ایک تاریخی واقعہ کے بارے میں میری یا کسی اور کی رائے کا کیا تعلق۔ رسول اللہ ﷺ کی نماز جنازہ صحابہ کرام نے انفرادی طور پر پڑھی۔ آپؐ کی نماز جنازہ باجماعت نہیں ہوئی تھی۔ صحابہ کرام تین تین اور چار چار کی تعداد میں حجرہ مبارکہ میں داخل ہوتے تھے اور نماز جنازہ پڑھ کر واپس آجاتے تھے۔ حضور ﷺ کی نماز جنازہ جماعت سے نہیں ہوئی۔ حضور ﷺ کی میت مبارکہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹائی گئی۔ اسی کمرے میں رہے جس میں انتقال ہوا تھا۔ جس بستر پر انتقال ہوا اسی کی جگہ پر قبر مبارک بنائی گئی۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: سر ولیم کے چند بڑے بڑے اعتراضات جو انہوں نے حضور ﷺ کے بارے میں کئے ہیں ان میں سے چند ایک کی وضاحت کر دیں

جواب: اس نے چار جلدوں میں کتاب لکھی ہے اور حضور ﷺ کے بارے میں ہر چیز کو منفی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ تین چار اعتراضات کا میں نے اپنی گفتگو میں ذکر کر دیا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس نے یہ دعویٰ کیا کہ رسول اللہ ﷺ کا تعلق بنی اسماعیل سے نہیں تھا۔ بلکہ جزیرہ عرب میں آباد قبیلہ قریش کا بھی بنی اسماعیل سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کی سرسید نے تردید کی ہے اور جواب دیا ہے۔ ایک اعتراض یہ تھا کہ کعبہ حضرت ابراہیمؑ کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ اس پر بھی سرسید نے مفید کلام کیا ہے۔ مزید یہ کہ جس فاران کا ذکر تورات میں ہے وہ حجاز کا فاران نہیں بلکہ شام میں کوئی علاقہ ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ رسول اللہ ﷺ کا خاندان عرب میں نعوذ باللہ معمولی خاندان سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح کے دوسرے اعتراضات ہیں۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: بابا رتن ہندی کون تھے؟ کیا انہوں نے سیرت پر کوئی کام کیا ہے؟

جواب: بابارتن ہندی کے نام سے ساتویں صدی ہجری میں ایک شخص جنوبی ہندوستان کے کسی علاقے غالباً مدراس وغیرہ کا رہنے والا تھا۔اس نے یہ دعویٰ کیا کہ اس کی عمر سات سو سال ہے اور اس نے اپنی نوجوانی میں عرب جا کر رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی تھی۔اس لئے وہ صحابی ہے۔ ہمارے ہندوستان کے بہت سے خوش گمان اور خوش عقیدہ لوگ اس شخص کے عقیدت مند ہو گئے۔علامہ اقبال نے ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں لکھا ہے کہ۔

تاویل کا پھندا کوئی صیاد لگادے

یہ شاخ نشیمن سے اترتا ہے بہت جلد

جب بابارتن ہندی نے یہ دعویٰ کیا تو بہت سے لوگ اس کے عقیدت مند ہو گئے۔اس نے بہت سی ایسی باتیں بھی بیان کرنی شروع کر دیں جو لغویات کے زمرے میں آتی ہیں۔لیکن محدثین نے ان سب لغویات کی تردید کی اور سب اہل علم نے بالاتفاق کہا کہ یہ شخص جھوٹا ہے اور غلط بیانی کر رہا ہے۔اس کا کوئی تعلق رسول اللہ ﷺ کی سیرت مبارکہ یا صحابیت سے نہیں ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: قرآن مجید کی ایک آیت کا مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ جو کچھ اپنی زبان سے کہتے ہیں وہ ہماری طرف سے وحی کی جاتی ہے۔لیکن بعض مواقع پر آپ ﷺ نے اپنی رائے کو پس پشت ڈال کر کسی صحابی کی رائے کو ترجیح دی، کیا اس طرح کے اقوال جو آپ سے منسوب ہیں وہ بھی وحی تصور کئے جائیں گے؟

جواب: قرآن پاک کی یہ آیت کہ 'وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحیی یوحیٰ'، یہ آیت بنیادی طور پر قرآن پاک کے بارے میں ہے کہ قرآن پاک کے نام سے حضور ﷺ جو کچھ بیان کر رہے ہیں یہ اپنی مرضی سے نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ ہماری طرف سے وحی ہے۔اپنے عام ارشادات کے بارے میں تو حضور ﷺ نے خود فرمایا کہ میں ایک انسان ہوں اور جو بات کہتا ہوں وہ تمہاری مصلحت کے لئے ہوتی ہے۔اپنے دنیاوی معاملات کو تم بہتر جانتے ہو۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: ہند بنت عتبہ کا آپ نے ذکر کیا۔کیا یہ وہی ہند ہیں جنہوں نے حضرت حمزہ کا کلیجہ چبایا تھا؟

جواب: یہ وہی ہند ہیں جن سے یہ منسوب ہے کہ انہوں نے حضرت حمزہ کا کلیجہ چبایا تھا۔بعض مورخین نے یہ بات لکھی ہے۔اور سب سے پہلے جن مورخ نے یہ بات لکھی ہے ان کے بارے میں محدثین بہت متردد اور متامل ہیں اور محدثین کو ان کے بیانات کی صحت کے بارہ میں بڑے تحفظات ہیں۔یعنی واقدی نے یہ بات کی ہے۔یہ بڑی عجیب بات ہے کہ واقدی کی اس روایت کو تو لوگوں نے بڑے زور وشور سے بیان کیا ہے لیکن ویسے جب واقدی کا نام آتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ واقدی کے بارے میں محدثین نے یہ کہا ہے۔محدثین نے اگر تامل کا اظہار کیا ہے تو اس بات پر بھی تامل کا اظہار کیا ہوتا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: کسی مصلحت کے پیش نظر حاکم وقت جب فیصلہ کرتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے خانہ کعبہ کو موجودہ صورت حال پر برقرار رکھا حالانکہ آپ کی خواہش تھی کہ حضرت ابراہیم کے طریقے کے مطابق بنایا جائے جب کہ اس سے پہلے تحویل قبلہ ہوا۔اعتراض موجود تھا۔مسلمان دنیا پر قابض بھی ہو گئے۔پھر بھی قبلہ موجود ہے؟

جواب: میں آپ کے اس سوال کو صحیح طرح سے سمجھا نہیں۔غالباً آپ یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ جب مسلمان دنیا کے حاکم ہو گئے اور یہ خطرہ ختم ہو گیا کہ لوگ اسلام سے برگشتہ ہو جائیں گے تو بعد کے حکمرانوں نے بیت اللہ کو اس بنیاد پر کیوں نہیں بنایا جس طرح حضور ﷺ بنانا چاہتے تھے۔اگر یہ سوال ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جو کام رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا وہ خلفائے راشدین نے بھی نہیں کیا۔خلافت راشدہ کا پورا زمانہ گزر گیا۔بنی امیہ کے ابتدائی خلفاء نے بھی نہیں کیا، کیونکہ خلفائے راشدین نے نہیں کیا تھا۔جب حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی حکومت حجاز میں کچھ دن کے لئے قائم ہوئی تو انہوں نے بیت اللہ کو اس بنیاد پر بنایا جو حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں تھی اور موجودہ حطیم کو بیت اللہ میں شامل کر دیا۔لیکن جب حضرت عبداللہ بن زبیر کی فوجوں کو شکست ہوئی اور وہ شہید ہو گئے اور بنو امیہ کا اقتدار دوبارہ بحال ہو گیا تو

عبدالملک بن مروان نے کچھ فقہائے کرام کے مشورہ سے یہ طے کیا کہ حضرت عبداللہ بن زبیر کا یہ عمل ٹھیک نہیں تھا۔اس لئے کہ یہ کام اگر اتنا ہی ضروری ہوتا تو خود رسول اللہ ﷺ یا خلفائے راشدین کرتے۔اس لئے عبدالملک نے دوبارہ بیت اللہ کو حضور ﷺ کے دور کی صورت میں بحال کر دیا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: نہ صرف مستشرقین نے بلکہ اب تو تمام اہل مغرب نے اسلام کے نظریہ جہاد کو بڑے شدومد کے ساتھ اپنے شبہات اور اعتراضات کا ہدف بنایا ہے اور اس کو اسلام کے خلاف پروپیگنڈے کے طور پر استعمال کرنا شروع کیا ہے۔کیا یہ بھی کلامیات سیرت کا ایک اہم مبحث ہے؟

جواب: یقیناً یہ کلامیات سیرت کا ایک اہم مبحث ہے۔اس پر بات ہونی چاہئے لیکن مختصر وقت میں بات کرنا دشوار ہے۔جہاد اسلام کا ایک حکم ہے۔ایک حدیث میں اس کو ذروۃ سنام الاسلام یعنی اسلامی کی عمارت کا سب سے اونچا برج قرار دیا گیا ہے۔عمارت کا برج اس کی خوبصورتی اور اس کی تعمیر کی تکمیلی شان کا اظہار کرتا ہے۔ جہاد سے اسلام کی تکمیلی شان کا اظہار ہوتا ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے کہ وہ دین اور شریعت انتہائی مکمل ہے جس میں جہاد کے احکام بھی دیئے گئے ہوں۔پھر انہوں نے عقلی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ اسلامی شریعت کس طرح اور کیوں مکمل ہے۔اس لئے جہاد پر تو گفتگو ہونی چاہئے۔اگر آپ پہلے توجہ دلاتے تو میں جہاد پر نسبتاً زیادہ تفصیل سے بات کرتا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: نبی ﷺ نے بہت سی پیشین گوئیاں فرمائیں جو ہر بار درست ثابت ہوئیں۔کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ غیب کا علم رکھتے تھے؟

جواب: جس اور جتنے غیب کا علم اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا تھا وہ آپ رکھتے تھے۔اللہ تعالیٰ نے غیب کا کتنا علم حضور ﷺ کو دیا تھا یہ اللہ بہتر جانتا ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: واقعہ معراج کے بارے میں حضرت عائشہ کی روایت کی تفصیل سے یہ سمجھ نہیں سکے کہ کیا واقعی معراج روحانی واقعہ تھا؟

جواب: مسلمانوں کا عام نقطہ نظر یہ ہے کہ معراج جسمانی تھی۔حضرت عائشہؓ کا ارشاد یہ ہے کہ معراج روحانی تھی۔روحانی کے معنی بھی یہ نہیں ہیں کہ نیند یا خواب تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول پاک ﷺ کی روح مبارک کو لے جایا گیا اور حضور ﷺ کی روح مبارک سارے آسمانوں کی سیر کر کے آ گئی۔حضور ﷺ نے تقریباً اسی طرح physically چیزوں کو دیکھا جس طرح انسان اپنے سر اور جسم کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: علامہ شبلی نعمانی کے نزدیک ازواج مطہرات کی تعداد بیس سے زائد ہے لیکن آپ نے نو ارشاد فرمائی ہے۔

جواب: بیس سے زائد تو بہرحال نہیں ہے۔لیکن میں نے جن نو کا ذکر کیا تو یہ اس وقت کی بات ہے جب آپ کے نکاح میں نو ازواج مطہرات موجود تھیں۔اس وقت حضرت خدیجہؓ، زینبؓ بنت خزیمہ اور غالباً ایک دو اور کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔اس وقت حضور ﷺ کے نکاح میں نو ازواج مطہرات تھیں۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: معجزے نبیؐ کی طرف بھی منسوب ہیں اور باقی انبیا کی طرف بھی۔ان میں کس حد تک فرق کیا جا سکتا ہے؟

جواب: ایک بڑا فرق تو یہ ہے کہ بقیہ انبیا کے معجزے جو قرآن پاک میں بیان ہوئے ہیں وہ حسی یعنی physical معجزے تھے۔حضور ﷺ کا معجزہ قرآن کریم کی صورت میں ایک intellectual اور معنوی معجزہ ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: واقعہ اسرا میں مسجد اقصیٰ کا ذکر ہے۔ کیا کوئی اشارہ قرآن پاک میں آسمان کی سیر کا بھی ہے؟

جواب: قرآن پاک میں آسمان کی سیر کے بالواسطہ اور لطیف اشارے ہیں، قرآن پاک میں اس کی صراحت نہیں ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: واقعہ معراج کے وقت مسجد اقصیٰ کی صورت کیا تھا؟

جواب: مسجد اقصیٰ کی جو موجودہ عمارت ہے یہ بنوامیہ کے زمانے میں بنی ہے۔ واقعہ معراج کے وقت یروشلم میں یہ یا کوئی اور مسجد موجود نہیں تھی۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: کلامیات سیرت کی ضرورت تو جب پڑے گی جب مسلمانوں پر لازم ہو کہ غیر مسلموں کو اپنے دلائل سے مطمئن کریں۔ حالانکہ مسلمان پر ایسا کرنا واجب نہیں ہے۔

جواب: میرے خیال میں تو واجب ہے۔ مسلمانوں کا یہ دینی فریضہ ہے اور ان کے لئے دینی اعتبار سے ضروری ہے کہ غیر مسلموں کو مطمئن کریں۔ یہ ہمارا دعوتی اور تبلیغی فریضہ ہے۔ اسلام کے عقائد اور تعلیمات کی صداقت کے بارہ میں مسلمانوں اور غیر مسلم دونوں کو مطمئن کرنا ضروری ہے۔ خود مسلمانوں میں بہت سے لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے مغربی انداز کے دلائل دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے آپ کو یہ دلائل دینے پڑیں گے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: جو امور صرف نبی ﷺ کی ذات سے متعلق تھے وہ قرآن پاک میں کیوں ذکر کئے گئے؟

جواب: اس لئے ذکر کئے گئے کہ اگر نبی ﷺ کو اپنے فرائض منصبی انجام دینے کے لئے کسی خاص امتیاز کی ضرورت ہے تو لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ امتیاز قرآن پاک نے آپ کو دیا ہے۔ اور آپؐ نے اپنی ذات کے لئے خود کوئی امتیاز حاصل نہیں کیا۔ اللہ نے جو چیز حضور ﷺ کو دی تو وہ قرآن میں لکھ دی گئی۔ تاکہ آئندہ کسی غلط فہمی یا بدگمانی کا امکان نہ رہے۔ اس لئے قرآن پاک میں ان چیزوں کو بیان کیا گیا ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: آپؐ کی بعثت کے وقت دنیا میں کتنے ادیان تھے اور دین ابراہیمی کا کیا مقام تھا؟ قریش میں عبداللہ کا نام کثرت سے ملتا ہے یہاں اللہ سے کیا مراد تھا؟

جواب: قریش کے اکثر لوگ دین ابراہیمی کے قائل تھے اور اپنے آپ کو ملت ابراہیمی پر کاربند کہتے تھے۔ عرب میں ملت ابراہیمی کی بہت سی چیزیں مشہور و معروف تھیں۔ خود قرآن پاک سے پتہ چلتا ہے کہ بیشتر عرب اللہ تعالیٰ کے خالق حقیقی ہونے کے قائل تھے قرآن میں آیا ہے کہ ان سے پوچھو کہ زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ اس لئے ملت ابراہیمی کی بہت ساری باتوں کو وہ تسلیم کرتے تھے۔ ان میں بعض گمراہیاں پیدا ہو گئی تھیں جن کو پیدا کرنے کا بڑا ذریعہ ایک شخص عمرو بن لحی تھا جو حضور ﷺ سے کئی سو سال پہلے پیدا ہوا تھا۔ اس نے بہت سی گمراہیاں پھیلائیں۔ اس کی وجہ سے لوگ ملت ابراہیمی کے بہت سے طریقے بھول گئے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس مضمون کو بہت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ عرب میں ملت ابراہیمی کی کون کون سی باتیں رائج تھیں اور کن کن باتوں کو لوگوں نے بھلا دیا تھا۔ اس لئے وہ لوگ اللہ کے وجود کے قائل تھے۔ عبداللہ سے ان کی مراد وہی ہوتی تھی جو ہمارے اور آپ کے ہاں ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: حضور ﷺ کے زمانے میں کونسی زبان بولی جاتی تھی؟

جواب: حضور ﷺ کے زمانے میں عربی بولی جاتی تھی۔ وہی زبان جس میں ابھی ایک بچے نے سوال کیا ہے۔ بالکل یہی زبان بولی جاتی تھی۔ مدینہ منورہ میں بھی عربی

بولی جاتی تھی۔حضورﷺ کے زمانہ سے تقریباً ساڑھے تین چارسو سال پہلے سے وہاں عربی زبان بولی جاتی تھی۔حضورﷺ کی ولادت مبارکہ سے ساڑھے تین سو سال پہلے تک کے اشعار محفوظ ہیں۔لبنان کے ایک صاحب علم نے آج سے دس بارہ سال پہلے ایک کتاب لکھی تھی جس میں انہوں نے قدیم ترین عربی اشعار کا نمونہ جمع کیا تھا۔اس میں قدیم ترین اشعار حضورﷺ کی ولادت مبارکہ سے تین ساڑھے تین سو سال پہلے کے ہیں۔غالباً 240 عیسوی کے اشعار ہیں۔ان میں سے ایک شعر ہے۔

اذا الجوزاء اردفت الثریا

ظننت بآل فاطمۃ الظنونا

یہ جوزا اور ثریا برجوں اور ستاروں کے نام ہیں۔ ہر ہفتہ کو اخبارات میں یہ شرکیات چھپی ہوتی ہیں کہ آپ کا ہفتہ کیسے گزرے گا۔اس میں جوزا اور ثریا کے نام بھی ہوتے ہیں۔فاطمہ نام بھی بہت عام ہے۔یہی زبان بولی جاتی تھی۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: حضورﷺ کے دور میں یہودیوں کا موجودہ دور کے یہودیوں سے موازنہ کیا جائے تو کیا مماثلت پائی جاتی ہے؟

جواب: یہی مماثلت اور موافقت پائی جاتی ہے کہ جو حرکتیں وہ حضورﷺ کے دور میں کرتے تھے آج بھی کرتے ہیں۔مسلمانوں سے دشمنی اور ان کے خلاف منفی عزائم اس وقت بھی رکھتے تھے اور آج بھی رکھتے ہیں۔مسلمانوں کو اپنے تسلط میں رکھنا چاہتے ہیں۔سازشی لوگ ہیں۔ یہ ہر زمانے میں سازشیں کرتے آئے ہیں۔آج بھی یہی کچھ کر رہے ہیں۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: شراب پر پابندی کے باعث لوگ اس کو ترک کرتے گئے اور یہودیوں کو خسارہ کے باعث اس کاروبار کو ترک کرنا پڑا۔کیا حضورﷺ نے شراب کشید کرنے والوں کو از خود نہیں روکا؟

جواب: اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو شراب رکھنے اور پینے کی اجازت ہے۔وہ شراب بنا بھی سکتے ہیں۔آپس میں اس کا لین دین بھی کر سکتے ہیں۔اسلام اس کی ممانعت نہیں کرتا۔اس لئے رسول اللہﷺ نے یہودیوں کو جن میں شراب بنانے والے کم تھے،لیکن آپؐ نے ان کو بھی شراب بنانے سے نہیں روکا۔جب انہوں نے دیکھا کہ مارکیٹ ختم ہوگئی تو ان کا کاروبار بھی ختم ہوگیا۔لیکن مدینہ منورہ سے باہر جہاں یہودی اور عیسائی آبادیاں تھیں،عیسائیوں میں زیادہ اور یہودیوں میں کم شراب کا کاروبار جاری تھا۔وہ شراب رکھ سکتے تھے، پی سکتے تھے اور بیچ بھی سکتے تھے۔آج بھی رکھ سکتے ہیں۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: عرب معاشروں میں بت پرستی کیوں رواج پائی؟

جواب: میں نے عرض کیا ہے کہ عرب معاشرہ طویل عرصہ تک ملت ابراہیمی پر قائم رہا۔ بعد میں عمرو بن لحی نام کے ایک شخص نے مکہ مکرمہ میں بت پرستی کو رواج دیا اور پھر ایک ایک کر کے بت پرستی وہاں آتی گئی اور ملت ابراہیمی کے آثار ایک ایک کر کے ختم ہوتے گئے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: کیا نبیﷺ نے یہ وصیت کی تھی کہ مدینہ کی آبادی بڑھ جائے تو اس کے قریب نئے شہر بسانا؟

جواب: یہ میں نے سنا ہے لیکن حدیث کی کسی کتاب میں یہ حوالہ نہیں پڑھا۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ حوالہ میں نے علامہ اقبال کی سوانح عمری میں پڑھا ہے جس میں لکھا ہے کہ جب علامہ اقبال مسولینی سے ملنے تشریف لے گئے تو گفتگو کے دوران انہوں نے مسولینی سے یہ حدیث بیان کی اور کہا کہ جب آبادی ایک حد سے بڑھ جائے مثلاً 25 ہزار، تو نیا شہر بسانا۔مسولینی یہ سن کر اچھل پڑا تھا اور علامہ اقبال سے پوچھا تھا کہ کیا یہ سچ ہے۔

علامہ اقبال نے اس بات کو بطور حدیث کہیں پڑھا ہوگا۔ میرے علم میں نہیں۔ میں نے حضرت عمر فاروقؓ کے حوالہ سے پڑھا ہے۔ جب کوفہ اور بصرہ نئے شہر آباد کئے گئے تو انہوں نے کہا تھا کہ جب یہ آبادی 25 ہزار سے بڑھ جائے تو پھر مزید لوگوں کو وہاں نہ بسایا جائے بلکہ نیا شہر آباد کیا جائے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: سرکار دو عالم ﷺ کی انفرادی معیشت کا سوال جو گزشتہ نشست میں اٹھایا گیا تھا۔ اس کا جواب عنایت فرمائیں۔

جواب: رسول اللہ ﷺ کی معاشی زندگی کے تین پہلو ہیں۔ بلکہ زیادہ بہتر الفاظ میں تین دور ہیں۔ ایک وہ دور جو نبوت سے پہلے یعنی آپ کی عمر مبارک کے چالیس سال ہونے تک تھا۔ دوسرا دور وہ تھا جب آپؐ نبوت ملنے کے بعد مکہ مکرمہ میں قیام فرما تھے۔ تیسرا دور وہ تھا جب آپ مدینہ تشریف لے آئے۔

حضور ﷺ اپنی نوجوانی میں مکہ مکرمہ کے ایک نہایت دیانت دار تاجر کے طور پر مشہور و معروف تھے۔ الصادق الامین آپ کا لقب تھا۔ لوگ حضور ﷺ کے ساتھ مل کر کاروبار کرنا پسند کرتے تھے۔ بہت سے صحابہ اور دوسرے لوگوں نے بعد میں بیان کیا کہ وہ حضور ﷺ کے کاروبار میں شریک تھے۔ کئی لوگوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد گواہی دی کہ ہم حضور ﷺ کے کاروبار میں شریک تھے۔ اور جو دیانتداری انہوں نے آپؐ میں دیکھی وہ بے مثال تھی۔

تجارت اور کاروبار کے سلسلہ میں رسول اللہ نے عرب کے مختلف مقامات کا سفر کیا۔ تجارت اور کاروبار کے لئے مختلف علاقوں میں تشریف لے گئے۔ حضرت خدیجہؓ کے سامان تجارت کے ساتھ بھی حضور ﷺ نے مضاربت فرمائی۔ حضرت خدیجہؓ اپنا سامان لوگوں کو تجارت کے لئے دیا کرتی تھی۔ ان کا پیسہ لے کر لوگ تجارت کے لئے جایا کرتے تھے اور نفع میں شامل ہوتے تھے۔

حضرت خدیجہؓ نے جب حضور ﷺ کی دیانت داری اور مہارت کا شہرہ سنا تو خود درخواست کی کہ میرا سامان بھی آپ لے جائیں۔ اپنے غلام میسرہ کو بھی ساتھ بھیجا۔ میسرہ نے جب حضور ﷺ کی مزید خوبیاں بیان کیں تو سیدۃ خدیجہؓ الکبریٰ نے شادی کی خواہش ظاہر کی۔ شادی کی یہ تجویز ان کی طرف سے آئی تھی۔ اس کے بعد حضور ﷺ ان کے کاروبار کی بھی نگرانی کرتے اور اپنے کاروبار کی بھی۔ حضور ﷺ نے کپڑے کا کاروبار بھی کیا ہے۔ حضور ﷺ کے چچا ابو طالب کی مکہ مکرمہ میں دکان تھی جس میں کپڑا اور عطر دو چیزیں بکتی تھی۔ حضور ﷺ نے ان کی دکان کی نگرانی بھی کی۔ یہ سارا سلسلہ نبوت تک جاری رہا۔ نبوت کے بعد حضور ﷺ نے کاروبار کی اکثریت ذمہ داری حضرت زید بن حارثہؓ اور اپنے دو اور ملازمین یا غلاموں کے سپرد کر دی۔ حضور ﷺ کا بیشتر وقت دعوت و تبلیغ کے کاموں میں صرف ہوتا تھا اور وہ لوگ حضور ﷺ کے کاروبار کی دیکھ بھال کرتے تھے۔

ایسی مثالیں بھی اکا دکا ملتی ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حضور ﷺ کو اس کو کاروبار کی کبھی کبھی نگرانی کرنے کا موقع بھی ملتا تھا۔ یہ حضرات انتہائی دیانت داری کے ساتھ حضور ﷺ کے اس کام کی نگرانی کیا کرتے تھے۔ جب حضور ﷺ مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو اپنا سارا کاروبار، مکان، گھر اور حضرت خدیجہ الکبریٰ کا مکان ساری چیزیں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ جو مکہ مکرمہ میں لوگوں نے قبضہ میں لے لیں۔ حضرت عقیلؓ بن ابی طالب کے بارہ میں وضاحت ملتی ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ کی ساری جائیداد اور مکانات پر قبضہ کر لیا۔ اور یہ چیزیں دوسروں کے ہاتھ بیچ ڈالیں۔ فتح مکہ کے موقعہ پر جب رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو صحابہ نے پوچھا: رسول اللہ ﷺ، آپ اپنے مکان میں ٹھہریں گے یا فوج کے ساتھ خیمے میں ٹھہریں گے۔ تو آپ نے مسکرا کر فرمایا کہ عقیل نے ہمارے لئے مکان چھوڑا کہاں ہے جو ہم وہاں جا کر ٹھہریں۔ تو حضور ﷺ اپنے ساتھیوں کے ساتھ خیمے میں ہی قیام فرما رہے۔ کبھی کبھی اپنے چچا کے گھر والوں سے ملنے ان کے مکان میں تشریف لے جاتے۔ ایک آدھ مرتبہ دوپہر کے وقت وہاں آرام بھی فرمایا۔ لیکن عام طور پر حضور ﷺ کا قیام خیمہ ہی میں رہا۔

مکہ مکرمہ سے ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لے جانے کے بعد ابتدائی ایک دو سال تک حضور ﷺ کا کوئی مستقل بالذات کاروبار نہیں تھا۔ غالباً مکہ مکرمہ سے سیدنا علی بن ابی طالب آتے وقت کچھ نقد رقم ساتھ لائے تھے، جو حضور ﷺ نے ان کے سپرد کی تھی اور فرمایا تھا کہ امانتداروں کی امانتیں ادا کرکے بقیہ رقم ساتھ لے آئیں۔ اس کے باوجود یہ ایک دو سال نسبتاً مشکل اور مشقت کے تھے۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کے پاس مناسب بندوبست ہو گیا۔ جس میں سب سے پہلے بنو نضیر کی جو زمین فتح ہوئی تھی، قرآن پاک کی سورۃ حشر میں اس کے احکام دیئے گئے ہیں اور یہ بتایا گیا ہے کہ اس زمین کا پانچواں حصہ سربراہ ریاست کے طور پر رسول اللہ ﷺ کے تصرف میں آئے گا۔ چنانچہ حضور ﷺ نے اس جائداد کے پانچ حصے کرکے چار حصے بیت المال کے قرار دیئے۔ پانچواں حصہ حضور ﷺ کے ذاتی استعمال کا

حصہ قرار پایا جس سے رسول اللہ ﷺ کے ذاتی مصارف پورے ہوتے رہے۔

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ ازواج مطہرات اور اپنے خاندان کے لوگوں کو اس کی آمدنی سے پورے سال کے اخراجات دے دیا کرتے تھے اور وہ اخراجات ازواج مطہرات اپنے صوابدید سے خرچ کیا کرتیں تھیں۔ بعض ازواج مطہرات کا ہاتھ کھلا تھا، وہ بہت جلدی صدقہ وخیرات میں اپنا ذخیرہ سال پورا ہونے سے بہت پہلے ختم کر دیا کرتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو انفاق فی سبیل اللہ کا ایک عجیب وغریب جذبہ دیا تھا۔ البتہ حضور ﷺ کی طرف سے پورا بندوبست موجود تھا۔ سن دو ہجری کے اواخر یا تین ہجری کے اوائل میں یہ بندوبست قائم ہو گیا تھا۔

شروع کے دو سال جس طرح کہ باقی صحابہ کرامؓ نے تنگی سے گزارے، حضور ﷺ نے بھی گزارے۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ طریقہ نہیں تھا کہ اپنے لئے کوئی خصوصی انتظام کر لیں اور باقی صحابہ کے لئے انتظام نہ کریں۔ ایک ہنگامی انتظام جو حضور ﷺ کی ذات کے لئے ہوا تھا، وہی انتظام باقی صحابہ کے لئے بھی ہوا تھا۔ اس کی تفصیلات سے ہم سب واقف ہیں۔

یہ تاثر کہ حضور ﷺ کی پوری زندگی لوگوں کے عطیات پر بسر ہوئی، یہ بالکل غلط اور بے بنیاد بات ہے کہ حضور ﷺ سے دوسروں سے لے کر زندگی گزاری۔ یہ کہنا درست نہیں ہے۔ جن لوگوں نے حضور ﷺ کی معاشی زندگی پر تحقیق کی ہے انہوں نے یہ بات ثابت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کبھی کسی پر بوجھ نہیں بنے۔ حضور ﷺ کسی پر بوجھ بننے کے لئے تو آئے ہی نہیں تھے۔ آپ ؐ تو دینے کے لئے آئے تھے۔ دنیا کو دے کر ہی تشریف لے گئے۔ آپ ؐ لینے کے لئے نہ آئے تھے نہ کسی سے کچھ لے کر گئے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: خیبر کے یہودی حضرت عمرؓ کے زمانے میں جلاوطن ہوئے نہ کہ رسول اکرم ﷺ کے زمانے میں۔ اس حدیث کی بنیاد پر کہ عرب میں دو دین نہیں رہ سکتے۔

جواب: خیبر کے یہودیوں میں سے کچھ یہودی جلاوطن ہو گئے تھے۔ کچھ یہودی انہی زمینوں پر رہے۔ جو رسول اللہ ﷺ نے ان سے مزارعت کی بنیاد پر معاملہ کر لیا۔ فدک کے بھی کچھ لوگ جلاوطن ہو گئے اور کچھ موجود رہے۔ پھر جو بچ گئے تھے ان کو حضرت عمر فاروقؓ نے جلاوطن کر دیا تھا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: حلف النضول کی بنیادی باتیں کیا تھیں؟

جواب: حلف الفضول کے دو بنیادی مدیں تھیں کہ کسی پر ظلم نہیں ہوگا اور مظلوم کی مدد کی جائے گی۔ اس حلف کو آپ نے برابر قائم رکھا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: جبرئیل امین جب غار حرا میں آپ کے پاس آئے اور کہا کہ پڑھو، اس کے نام سے جس نے تخلیق کی۔ ہمارے علم کے مطابق تو آپ ؐ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے پھر اس جملہ سے کیا مراد ہے؟

جواب: اس جملہ کی وضاحت کے بارے میں ایک دلچسپ لیکن نسبتاً کم مستند روایت آئی ہے۔ یہ غالباً واقدی کی روایت ہے۔ واقدی کی روایت یہ ہے کہ جب جبرئیل امین غار حرا میں آئے تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو ایک ریشمی کپڑے پر لکھی ہوئی عبارت دیتے ہوئے کہا کہ پڑھو۔ اس پر آپ ؐ نے فرمایا کہ ما انا بقاری۔ میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ پھر جبرئیل امین نے دوبارہ یہی کہا تو آپ نے یہی جواب دیا۔ تیسری مرتبہ بھی یہی فرمایا۔ چوتھی مرتبہ جبرئیل امین نے پڑھنا شروع کیا تو آپ نے بھی ساتھ ساتھ پڑھا۔ بظاہر اس روایت کو ماننے میں کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا۔ حضور نے جو جواب ارشاد فرمایا تھا وہ تقاضا کرتا ہے کہ کوئی تحریر سامنے رکھی گئی تھی۔ آپ کے سامنے کوئی شخص کسی ایسی زبان کی تحریر لے آئے جو آپ نہیں جانتے تو آپ کہیں گے کہ یہ زبان تو میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ یا یہ تحریر تو میں نہیں جانتا۔ لیکن کوئی آپ کے سامنے کچھ الفاظ دہرا کر کہے کہ ان کو پڑھو تو شاید آپ یہ جواب نہیں دیں گے، بلکہ آپ پڑھنے کے لئے آمادہ ہو جائیں۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: آپ نے نزدیک میثاق مدینہ دنیا کا پہلا تحریری دستور ہے، حالانکہ اس سے پہلے جسٹینین کوڈ موجود تھا۔

جواب: آپ نے پتہ نہیں جسٹینین کوڈ پڑھا ہے کہ نہیں۔ وہ ایک ملک کا داخلی قانون ہے کوئی آئین اور دستور نہیں ہے۔ جسٹینین کے کوڈ میں بادشاہ کے حقوق نہیں لکھے گئے۔ شہریوں کے حقوق نہیں لکھے گئے۔ Constitution فرد اور ریاست کے درمیان تعلق کو منضبط کرنے کو کہتے ہیں۔ قانون افراد کے درمیان تعلق کو منضبط کرنے کو کہتے ہیں۔ جسٹینین کوڈ چھپا ہوا موجود ہے اس میں افراد کے درمیان کے باہمی تعلق یعنی آپس کے لین دین، شادی بیاہ اور تجارت وغیرہ کو مربوط کیا گیا ہے اور اس میں ریاست اور فرد کے تعلقات کو منضبط نہیں کیا گیا۔ اس لئے آپ اس کو دستور نہیں کہہ سکتے۔ وہ خود اس کوڈ کو دستور نہیں کہتے۔ رومن بھی اپنے اس کوڈ کو پہلا دستور نہیں کہتے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: آپ نے رسول اللہ ﷺ کا ایک قول نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ قبائل سے کہا کرتے تھے کہ تمہارے حکمراں تم میں سے ہی ہوں گے۔ کیا آج ایسا کرنا ضروری نہیں؟

جواب: آپ نے میری پوری بات نہیں سنی۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ حضور ﷺ جن قبائل کو دعوت دیا کرتے تھے تو ان سے یہ کہا کرتے تھے۔ بلکہ بعض قبائل کو حضور ﷺ نے جو چارٹر لکھ کر دیا تو اس میں یہ لکھا کہ تمہارے امیر تم میں سے ہوں گے۔ یہ سب کے ساتھ نہیں ہوا۔ جہاں یہ خیال ہوا کہ کسی خاص قبیلے میں اس پر ردعمل ہوگا یا وہ زیادہ حساس تھے تو آپ نے ان کو یہ یقین دہانی کرا دی۔ جہاں ایسا نہیں تھا وہاں ایسا نہیں ہوا۔ یہ حضور ﷺ کا اختیار تھا۔

حضور ﷺ کی سنت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اگر کسی قبیلہ کے لوگ کسی معاملہ میں حساس ہوں تو ان کے جائز احساسات کا خیال رکھنا چاہئے۔ اسی طرح اگر کچھ لوگ یا باہر والوں کو قبول کرنے میں تامل کرتے ہوں وہاں باہر والوں کو نہیں بھیجنا چاہئے۔ یہ ان معاہدات سے ثابت ہو جاتا ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: رسول اللہ ﷺ اپنے سفیروں کو کس طرح کی ہدایاء عطا فرماتے تھے؟

جواب: حضور ﷺ جو ہدایا دیتے تھے ان میں کپڑا بھی ہوتا تھا، کھجوریں بھی ہوتی تھیں، خوشبو بھی ہوتی تھی۔ اس میں جانور یا تلواریں بھی ہوتی تھیں۔ جس شخص کو جس طرح کا ہدیہ مناسب یا موزوں ہوا کرتا تھا وہ آپ دیا کرتے تھے۔

عبداللہ بن ابئ کا تعلق میری معلومات کے مطابق خزرج کے قبیلے سے تھا۔ میں نے تحقیق نہیں کی لیکن میرا خیال ہے کہ وہ خزرج سے تھا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: کیا مقاصد شریعت کا حصول ریاست کے بغیر بھی ممکن ہے؟

جواب: بعض مقاصد شریعت کا حصول ریاست کے بغیر ممکن ہے، بعض کا ممکن تو ہے لیکن مشکل ہے، بعض کا ممکن نہیں ہے۔ شریعت اور ریاست لازم وملزوم نہیں ہیں۔ ریاست شریعت کی ضرورت ہے۔ کیا امریکہ میں جو مسلمان رہتے ہیں وہ شریعت پر عمل نہیں کر رہے؟ کیا مکہ میں فتح مکہ سے پہلے رہنے والے مسلمان شریعت پر عمل نہیں کرتے تھے؟ بالکل کرتے تھے۔ کیا حبشہ میں جو مسلمان ہجرت کر کے گئے تھے وہاں شریعت پر عمل نہیں کر رہے تھے۔ حالانکہ وہاں ریاست نہیں تھی۔ شریعت پر عمل ریاست کے بغیر بھی ہو سکتا ہے۔ ریاست نہ ہو تو شریعت کی ریاستی ذمہ داریاں پوری نہیں ہو سکیں گی البتہ فرد اپنی ذمہ داریاں ریاست کے بغیر بھی انجام دے سکتا ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: میثاق مدینہ اور دستور مدینہ میں کیا فرق ہے؟

جواب: میثاق مدینہ ہی کو دستور مدینہ کہتے ہیں۔ اس کے لئے حضور ﷺ نے 'کتاب' کی اصطلاح استعمال کی، ہذا کتاب من محمد عبداللہ رسولہ۔ کتاب کا لفظی معنی چارٹر ہو سکتا ہے۔ بعض لوگوں نے اس کو دستور کہا ہے۔ بعض نے معاہدہ کہا ہے۔ یہ محض تعبیرات ہیں۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: حضورﷺ نے زمانہ جاہلیت کی جو باتیں اسلام میں رائج ہونے کی اجازت دے دی تھی وہ کون سی باتیں تھیں؟

جواب: حضورﷺ نے دور جاہلیت کی ہر اچھی بات، ہر اچھا اخلاق اسلام میں رائج رہنے کی اجازت دی تھی۔ کاروبار کے تمام جائز طریقے مثلاً مشارکہ، مضاربہ، حضورﷺ نے ان کی اجازت دی۔ شادی بیاہ کے بہت سے طریقے تھے۔ ان میں سے جو طریقے اسلام کے مزاج کے مطابق تھے اس کی حضورﷺ نے اجازت دی۔ اس طرح کے جائز امور کی فہرست تو بہت لمبی ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: آپ نے فرمایا کہ نبیﷺ کے عہد میں خاندانوں میں عہدے تقسیم کئے جاتے تھے۔ خاندانوں کی اہلیت کس بنیاد پر طے کی جاتی تھیں؟

جواب: اسلام سے بہت پہلے، حضورﷺ کے جدامجد جناب قصی کے زمانے سے یہ تقسیم شروع ہوئی تھی۔ قبیلے کا سربراہ اپنی شخصی اور ذاتی صلاحیتوں کی وجہ سے چنا جاتا تھا۔ اس میں اس کا تجربہ، سنیارٹی، علم، فہم اور سمجھ یہ ساری چیزیں شامل ہوتی تھیں۔ اس کی مثال آپ حضرت عمر فاروقؓ، حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت خالد بن ولیدؓ کی شخصیتوں میں ملے گی۔ ان حضرات کی خوبیوں سے اندازہ کرلیں کہ وہ کس شان کے لوگ تھے۔ یہ سب اسلام لائے تو اپنے اپنے قبیلے کے سربراہ تھے۔ ابوجہل اپنے خاندان کا سربراہ تھا اور ایسی شخصی صفات اور صلاحیتوں کا حامل تھا کہ حضورﷺ نے اس کے قبول اسلام کی دعا مانگی تھی۔ اگر اسلام لانا اس کی قسمت میں ہوتا تو شاید حضرت عمر فاروقؓ کے مقام اور مرتبے کا حامل ہوتا۔ یہ طریقہ تھا سربراہ چننے کا۔ جو قبیلے کا سربراہ ہوتا تھا وہ اس قبیلے کو حاصل روایتی منصب کا حامل بھی ہوتا تھا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: بیت اللہ کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ ابھی تک یہ اسی خاندان کے پاس چلی آرہی ہے۔ کیا آپؐ نے یہ فرمایا تھا کہ یہ چابی نسل در نسل منتقل ہوگی؟

جواب: آپؐ نے فرمایا تھا کہ یہ چابی تمہارے خاندان میں رہے گی 'خالدةً تالدةً'، اسی لئے یہ چابی اسی خاندان میں چلی آرہی ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: حضورﷺ کے مقرر کردہ نقیب اور عریف کی ریاستی ذمہ داریوں میں کیا فرق تھا؟

جواب: نقیب اور عریف تو مختلف سطحیں تھیں۔ عریف دس آدمیوں کا سردار تھا۔ نقیب دس عریفوں کا سردار تھا۔ نقیب کی ذمہ داری عریف کی نگرانی تھی اور عریف کا کام یہ تھا کہ اپنے قبیلہ کے دس آدمیوں کا دستہ تیار رکھے۔ ان کی ضروریات کی نگرانی کرے، ان کی تربیت کرے، ان کے اور قبائلی سرداروں کے درمیان واسطہ بنے، جب حکومت کو کسی بارے میں کوئی رائے درکار ہو تو اپنے لوگوں کے ساتھ مشورہ کر کے حکومت تک ان کی رائے پہنچا دے۔ یہ ایک طرح سے ایک بالواسطہ الیکٹورل کالج بھی تھا۔ ایک طرح سے لوکل گورنمنٹ سسٹم کا حصہ تھا اور ایک اعتبار سے قبائل سسٹم کو زیادہ بہتر بنانے کا ایک طریقہ تھا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: مسلم سیرت نگاروں اور غیر مسلم سیرت نگاروں میں اگر کوئی فرق ہو تو واضح فرمادیں۔

جواب: غیر مسلم سیرت نگار اجنبیت کی نظر سے اور غیریت کے ساتھ لکھتا ہے جب کہ مسلمان ظاہر ہے عقیدت اور محبت سے لکھتا ہے۔ اپنے اور پرائے کی نظر میں فرق ہوتا ہے۔ بچے کی طرف اپنی ماں جس نظر سے دیکھتی ہے پرائی عورت اس نظر سے نہیں دیکھتی۔ جس عقیدت اور احترام سے بیٹا باپ کو اور مشرقی ماحول میں شاگرد استاد کو دیکھتا ہے وہ کسی غیر سے توقع کیسے کی جاسکتی ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: آپ نے فرمایا کہ صحابہ کرام نے بھی سیرت رسول کو بیان فرمایا؟ اس کی ذرا وضاحت کر دیں؟

جواب: آپ نے شاید میری پچھلی گزارشات نہیں سنیں۔ صحابہ کرام میں متعدد وہ حضرات تھے جو رسول اللہ ﷺ کی احادیث اور ارشادات کو قلم بند کیا کرتے تھے۔ ان میں سے بعض بزرگوں نے سیرت کے واقعات کو بھی قلم بند فرمایا۔ ان میں سے کئی کا میں نے تذکرہ کیا ہے۔ ان میں سے ایک حضرت براء بن عازبؓ تھے۔ ایک حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ تھے۔ حضرت ابو ہریرہؓ اور دیگر کئی حضرات تھے۔

(محاضراتِ سیرت)

Q: Can you please repeat the name of the author of the book which focus on the Prophet Muhammad as a politicion and diplomat.

جواب: رسول اللہ ﷺ کو سیاستدان کہنا میرے خیال میں ادب کے خلاف ہے۔ سیاستدان کا ایک خاص مفہوم ہے۔ رسول اللہ نبی اور رسول تھے اور نبی آخر الزمان تھے۔ آپؐ نے زندگی کے ہر شعبہ کے لئے ہدایات اور رہنمائی چھوڑی۔ سیاست دانوں اور سفارت کاروں کے لئے بھی رہنمائی چھوڑی۔ تاجروں اور دوسرے لوگوں کے بھی رہنمائی عطا فرمائی۔ ان میں سے ہر پہلو پر الگ سے کئی کتابیں لکھی گئیں ہیں۔ ایک کتاب جو بڑی جامع کتاب ہے۔ اس کا تذکرہ آگے چل کر ہوگا۔ ایک صاحب افضال الرحمٰن کے نام سے ہیں۔ انگلینڈ میں رہتے ہیں۔ انہوں نے دس بارہ جلدوں میں انسائکلو پیڈیا آف سیرت کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ اس میں ایک پوری اور بڑی ضخیم جلد رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے سیاسی اور سفارتی پہلوؤں سے بحث کرتی ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: ایک سابقہ نشست میں جناب خالد مسعود صاحب نے فرمایا تھا کہ لفظ امی کا عرف عام میں جو معنیٰ کیا جاتا ہے وہ درست نہیں؟

جواب: یہ سوال تو آپ ڈاکٹر خالد مسعود صاحب سے ہی پوچھتے تو بہتر تھا۔ میں ان کی طرف سے کیا کہہ سکتا ہوں۔ امی کے بارے میں عام طور پر مفسرین اور سیرت نگاروں نے دو مفہوم بیان کئے ہیں۔ ایک تو امی کا وہی مفہوم ہے جو عام طور پر مشہور ہے یعنی جس نے مکتب میں تعلیم حاصل نہ کی ہو۔ دوسرا مفہوم جو بعض لوگوں نے بیان کیا ہے اس کے مطابق امی سے مراد وہ لوگ ہیں جو ام القریٰ (مکہ معظّمہ) کے رہنے والے ہیں۔ ام القریٰ کے باشندوں کے لئے بھی بعض جگہ یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: یہ بہت عجیب بات ہے کہ حضور ﷺ نے ایک ہی حج کیا اور اس کی تعین میں بھی صحابہ کرام کو اختلاف ہے کہ وہ کس قسم کا حج تھا؟

جواب: میرے خیال میں شریعت اور احادیث میں حج کی تین قسمیں بیان ہوئی ہیں۔ جن صحابہ نے حضور ﷺ کے حج کو دیکھا انہوں نے اپنی فہم کے مطابق اس کی وضاحت کی۔ یہ بات کہ صحابہ کرام نے حضور ﷺ کے حج کو تینوں قسم کا سمجھا شاید یہ ہمارے لئے بڑا مفید ثابت ہوا ہو۔ اب آپ جس قسم کی حج کریں گے اور آپ کو اعتماد ہوگا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی سنت سے ثابت ہے۔ اگر حضور ﷺ نے جو حج کیا اس کے بارہ میں قطعیت کے ساتھ ایک ہی رائے ہوتی تو ہمارے اور آپ کے لئے تنوع کم ہو جاتا۔ حج تمتع نسبتاً آسان ہے۔ ہم جیسے سہل انگاروں کے لئے تمتع کرنا آسان ہے۔ اگر مجھے یہ یقین ہوتا کہ حضور ﷺ نے تمتع کا حج نہیں کیا تو مجھے تمتع کا حج کرنے میں تامل ہوتا۔ اب جو بھی حج کروں گا مجھے یقین ہے کہ کچھ محققین کی نظر میں یہ سنت کے مطابق ہے۔ شاید ہمارے لئے اس میں آسانی ہے مشکل نہیں۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: امام سیوطی نے لکھا ہے کہ 'الجرح مقدم علی التعدیل'۔ ابن اسحاق پر جو جرح کی گئی وہ تعدیل پر مقدم ہے لہٰذا ابن اسحاق کو معتبر سمجھنا جائز نہیں۔

لیکن ہم سے اور آپ سے بڑے بڑے علماء نے ابن اسحاق کو معتبر سمجھا ہے۔ ان کے سامنے بھی یہ اصول تھا کہ جرح تعدیل پر مقدم ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مطلقاً ایسا نہیں ہے۔ بلکہ جرح مفسر تعدیل مفسر پر مقدم ہے، جرح غیر مفسر تعدیل مفسر پر مقدم نہیں ہے۔ جرح و تعدیل پر ہمارے برصغیر کے ایک بڑے عالم کی ایک بہت اچھی

کتاب 'الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل' ہے۔ آپ اس کو پڑھیں۔ اس میں انہوں نے یہ اصول بیان کیا ہے۔ خود امام ابوحاتم رازی کی کتاب جرح وتعدیل پر ہے جو کئی جلدوں میں چھپی ہے۔ اس کی پہلی جلد میں انہوں نے یہ اصول بیان کیا ہے۔ لہٰذا جن لوگوں نے ابن اسحاق پر جرح کی، مثلاً امام مالک کی جو جرح ابھی ایک دوست نے منسوب کی، پتہ نہیں یہ جرح ان کی ہے بھی کہ نہیں، لیکن امام مالک ابن اسحاق سے متفق نہیں تھے۔

جواب: جہاں تک میرے علم میں ہے امام مالک سے کوئی وجہ منقول نہیں ہے کہ انہوں نے ابن اسحاق پر کیوں جرح کی۔ جن لوگوں نے ابن اسحاق کی تعدیل کی ہے وہ اپنی اس رائے کی وجہ بیان کرتے ہیں۔ لہٰذا تعدیل مفسر جرح غیر مفسر پر ترجیح رکھتی ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: متکلمانہ اسلوب سے کیا مراد ہے؟ مزید یہ فرمایئے کہ شیخ محمد جعفر کتانی کی کتاب کا نام کیا ہے؟

جواب: متکلمانہ اسلوب سے مراد یہ ہے کہ وہ بنیادی مسائل جو اسلامی عقائد کی تائید سے متعلق ہیں، یا ان عقائد کی مخالفت، تردید یا تشکیک کے بارے میں دوسرے مذاہب کے لوگوں نے جو باتیں کی ہیں، عقلی دلائل سے ان کا جواب دیا جائے۔ متکلمانہ انداز میں سیرت کے موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں یا وہ انداز جس میں رسول اللہ ﷺ کی نبوت اور رسالت کے تصدیق کرنے والے شواہد اور روایات کو جمع کیا گیا۔ خاص طور پر معجزات کی بحث سامنے لائی گئی اور جو چیزیں حضور ﷺ کے خصائص سے متعلق ہیں ان کو ایک خاص اندز سے مرتب کیا جانے لگا۔ متکلمانہ اسلوب سے کتابیں لکھے جانے کا رجحان چوتھی یا پانچویں صدی ہجری میں شروع ہوا۔ اس کی ضرورت غالباً اس لئے پیش آئی کہ مسلم معاشرہ تیزی سے پھیل رہا تھا۔ نئی نئی اقوام اسلام میں داخل ہو رہی تھیں اور مسلمانوں کا سابقہ بہت سی غیر مسلم اقوام سے پڑ رہا تھا جن میں یہودی، عیسائی، ایران کے آتش پرست، ہندوستان کے بت پرست اور افغانستان کے بدھ مت کے پیروکار بھی تھے۔ یہ سب لوگ طرح طرح کے سوالات کرتے ہوں گے، طرح طرح کے اعتراضات اٹھاتے ہوں گے۔ مسلمان علماء سیرت اور قرآن پاک کے حوالہ سے ان کا جواب دیتے ہوں گے۔ ان مسائل کے پس منظر میں اور ایسے ماحول میں ضرورت پیش آئی ہوگی کہ سیرت کے اس مواد کو الگ سے بھی مرتب کیا جائے تا کہ زیادہ بہتر طریقہ سے متکلمانہ انداز میں ان مسائل کا جواب دیا جا سکے۔ یہ وہ کتابیں ہیں جن کو متکلمانہ اسلوب کی کتابیں کہا جاتا ہے۔

شیخ جعفر الکتانی کی کتاب کا نام ہے 'التراتیب الاداریہ فی نظام الحکومۃ النبویہ'۔ اس کا اردو خلاصہ بھی موجود ہے جس کے بارے میں میں نہیں کہہ سکتا کہ کتنا مستند ہے، لیکن کراچی میں شائع ہوا ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: استیعاب اور استقصاء سے کیا مراد ہے؟

جواب: استیعاب سے مراد ہے comprehensive coverage یعنی ایک چیز کا مکمل طور پر فراہم کر دینا، یا مکمل سروے کر لینا۔ استقصاء سے مراد ہے exhaustively کسی چیز کو جمع کر لینا۔ یعنی ایک زمانہ تھا جب معلومات کو exhaust کرنے اور ان کا مکمل سروے کر کے فراہم کرنے کا کام ہی اصل اور بنیادی اہمیت رکھتا تھا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: آپ نے ابن اسحاق کا ذکر کیا ہے، ان کے بارے میں امام سہیلی نقل فرماتے ہیں کہ 'کان دجالا من الدجاجلہ'، آپ اس کو کس تناظر سے دیکھتے ہیں؟

جواب: میں نے صاف طور پر عرض کیا ہے کہ ابن اسحاق کے بارے میں محدثین میں دو رائیں پائی جاتی ہیں۔ ابن اسحاق کو بعض محدث قابل قبول اور معتمد سمجھتے ہیں اور ان کی رائے اور بیانات کو قبول کرتے ہیں جب کہ بعض محدثین قبول نہیں کرتے۔ امام مالک بھی ان محدثین میں شامل تھے جو ابن اسحاق کے بارے میں تامل رکھتے تھے۔ یہ لفظ انہوں نے کہا یا نہیں، میں نہیں جانتا۔ لیکن امام مالک ان لوگوں میں سے تھے جو ابن اسحاق کی روایات کو قبول کرنے میں تامل کرتے تھے۔ بہت سے لوگ

تامل نہیں کرتے تھے جن میں سے بعض کے اقوال میں نے بیان کئے۔ امام مالک کی رائے سر آنکھوں پر۔ لیکن ایسے حضرات بھی ہیں جو ابن اسحاق کی رائے کو قبول کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض کی میں نے مثالیں دی ہیں۔ پھر ابن اسحاق نے جو کچھ تفصیلات جمع کی ہیں اور جو ابن ہشام کی شکل میں ہمارے سامنے آئی ہیں، ان میں سے کوئی ایسی بات نہیں ہے جو بقیہ کتب حدیث سے بنیادی طور پر مختلف ہو۔ تفصیلات اور جزئیات میں ابن اسحاق نے کچھ چیزوں کا اضافہ کیا ہے۔ اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: کیا اصول حدیث کی طرح سیرت نگاری کے بھی کچھ اصول بیان کئے جا سکتے ہیں۔ ممکن ہو تو خدوخال بیان کیجئے۔

جواب: سیرت نگاری کے اصول بیان کئے جا سکتے ہیں اور لوگوں نے بیان بھی کئے ہیں۔ سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ کوئی ایسا واقعہ یا روایت قبول نہیں کرنی چاہئے جو قرآن پاک کی نص قطعی کے خلاف ہو۔ جو احادیث صحیح اور صحابہ کرام کے مقام و مرتبہ کے خلاف ہو۔ جو شان رسالت سے ہم آہنگ نہ ہو۔ جو عربی زبان وادب اور اس کے معیار فصاحت کے خلاف ہو۔ جو مورخین اور ارباب سیرت کے متفقہ نقطہ نظر کے خلاف ہو۔ یہ اصول ہیں جن کی بنیاد پر بہت سے اہل علم نے سیرت کی کتابیں لکھی ہیں۔ بہت سے لوگوں سے ان اصولوں کے بارے میں کوتاہیاں بھی ہوئیں ہیں۔ بعض لوگوں نے ایسی چیزیں سیرت کے نام سے منسوب کر دی ہیں جس کی وجہ سے مستشرقین کو اعتراضات کا موقع ملتا ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: سیرت کا وہ کون سا پہلو یا کون سا مطالعہ ہے جو سیرت کلچر کی تشکیل وترتیب کو واضح کرتا ہے؟ معاشرہ کا وہ پہلو جس میں تفریح اور آرٹ کی اہمیت ہے، سیرت میں اس تذکرہ کس عنوان کے تحت کرنا چاہئے؟

جواب: سیرت میں اجتماعیات کی جو عام باتیں ہوں گی اس میں تفریح کا تذکرہ بھی آئے گا۔ محدثین نے تذکرہ کیا ہے کہ صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تفریح میں حصہ لیا کرتے تھے۔ حضور ﷺ نے گھوڑ دوڑ کی بھی سرپرستی فرمائی ہے۔ کشتی کے مقابلے بھی دیکھے ہیں۔ اس زمانے کے عام رواج کے مطابق صحابہ شعر وشاعری کا ذکر کر رہے ہوتے تھے تو حضور ﷺ اس میں بھی شامل ہو جاتے تھے۔ صحابہ پرانے واقعات بیان کر رہے ہوتے تھے تو حضور ﷺ اس میں بھی شامل ہو جاتے تھے۔ اس لئے یہ چیز اسلام کے خلاف نہیں ہے۔ اگر کوئی مفید بات یا اچھی چیز کسی علاقہ میں رائج ہے اور شریعت کے خلاف نہیں ہے تو اس میں حصہ لینا شریعت کے خلاف نہیں ہے۔ اس لئے مقامی ثقافتوں کی وہ تمام چیزیں جن میں شریعت کی خلاف ورزی نہ ہو ان کو اختیار کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ جن چیزوں کو شریعت سے متعارض سمجھا گیا ہو، یا ان کا تعلق یا رشتہ کسی غیر اسلامی روایت سے ملتا ہو، جیسے ہمارے ہاں ہندوانہ روایات کی کئی چیزیں مروج ہو گئی ہیں، ان سے احتراز کرنا چاہئے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: آپ نے اپنے خطاب میں بعض دستاویزات کا حضور ﷺ سے غلط منسوب ہونے کا ذکر کیا ہے۔ اس طرح بعض نوادرات بھی حضور ﷺ سے منسوب ہیں۔ مثلاً لاہور کی بادشاہی مسجد میں حضور ﷺ کے نعلین مبارک یا موئے مبارک۔ ان کی نسبت کس حد تک درست ہے؟

جواب: لاہور کے نعلین مبارک کی تاریخی حیثیت کے بارے میں تو مجھے علم نہیں۔ غالباً وہ چوری بھی ہو گئے تھے جو ابھی تک بازیاب نہیں ہوئے۔ لیکن موئے مبارک کے اکثر نمونے صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے اور تمام محدثین نے لکھا ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر جب رسول اللہ ﷺ نے خط بنوایا تو دور دراز سے آنے والے صحابہ کرام نے آپ کے موئے مبارک آپس میں بانٹ لئے تھے۔ جب حضور ﷺ نے صحابہ کی دلچسپی دیکھی تو خود بھی موئے مبارک صحابہ کرام کو عطا فرمائے۔ جب نائی نے حضور ﷺ کے سر مبارک کے ایک طرف استرا پھیرا تو حضور ﷺ نے دست مبارک میں بھر کر اس طرف کے لوگوں کو موئے مبارک عطا فرما دئے اور جب نائی نے دوسری طرف سے کاٹا تو دوسری طرف کے لوگوں کو عطا فرما دیئے۔ جب اتنے لوگوں کو موئے مبارک عطا فرمائے گئے تو ظاہر ہے کہ موئے مبارک بہت سے لوگوں کے پاس ہوں گے۔ یہ بھی ظاہر بات ہے کہ جس کے پاس حضور ﷺ کا موئے مبارک ہوگا تو اس نے ضائع نہیں کیا ہوگا۔ مسلمانوں میں آثار رسول ﷺ کی اتنی

بے توقیری کبھی بھی نہیں ہوئی کہ کسی خاندان میں موئے مبارک ہو اور اس نے ضائع کر دیا ہو۔ اس لئے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ جہاں جہاں موئے مبارک پائے جاتے ہیں وہ سب صحیح ہیں۔

دوسرے تبرکات اور آثار نبوی ﷺ کو تاریخی طور پر ثابت کرنا بڑا دشوار ہے۔ اس لئے کہ ان کا وہ استناد تو نہیں ہے جو قرآن پاک یا احادیث کا ہے۔ لیکن حضور ﷺ سے جو چیز منسوب ہے اس سے محبت اور احترام کا تعلق رکھنا چاہئے۔ اگر کوئی چیز واقعی حضور ﷺ کی ہے تو پھر تو واجب الاحترام ہے ہی، لیکن اگر نہیں ہے تو بھی حضور ﷺ سے منسوب ہونے کی وجہ سے اس کا احترام ہونا چاہئے۔ توہین اور بے اعتنائی کا رویہ میرے خیال میں ادب کے خلاف ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: آپ نے ازرقی کی اخبار مکہ کا ذکر کیا ہے اور ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب خانہ کعبہ میں بتوں کو گرا رہے تھے اور وہاں سے تصویروں کو مٹا رہے تھے تو حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جو تصویریں وہاں پر کندہ یا آویزاں تھیں، آپؐ نے صحابہ کو ان کے مٹانے سے منع کر دیا۔ ڈاکٹر حمید اللہ لکھتے ہیں کہ میں نے استنبول میں ازرقی کا اصل نسخہ دیکھا ہے اس میں روایت موجود ہے۔ اس روایت کے بارے میں بتائیں کہ اس کی کیا حیثیت ہے؟

دوسری گزارش یہ ہے کہ علم الانساب کی کتابوں کا انگریزی زبان میں ترجمہ کروایا جائے کیونکہ اہل مغرب کے ہاں اس طرح کا مستند ذخیرہ بائبل کے بارے میں بھی نہیں ہے۔

جواب: انساب کی کتابوں کو انگریزی زبان میں ترجمہ کرنے کی میری ناچیز رائے میں کوئی خاص ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ مغرب کے جو اہل علم سیرت میں دلچسپی رکھتے ہیں وہ عربی جانتے ہیں۔ خود انہوں نے عربی کی بہت سی کتابیں ایڈٹ کی ہیں۔ اس لئے ایسی چیزیں ان کو پہلے ہی سے دستیاب ہیں اور وہ ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ انساب کی کتابوں کا انگریزی ترجمہ عام لوگوں کے لئے شاید مفید نہ ہو، اس لئے کہ علم انساب کی کتابوں کا اسلوب عام قارئین کی دلچسپی کی چیز نہیں ہے۔ وہ متخصصین کی دلچسپی کی چیز ہے۔

ازرقی کی اس روایت کے بارے میں میں نے کوئی تحقیق نہیں کی اس لئے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بعض لوگ سختی سے اس کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ نہیں ازرقی نے صحیح لکھا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ حضور ﷺ نے واقعی ایسا کیا یا نہیں کیا۔ لیکن ایک بات واضح ہے اور وہ یہ کہ تصویر کشی اور مجسمہ سازی اسلام کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں اور مسلمانوں کے دور عروج میں کبھی بھی اس فن کی عام حوصلہ افزائی نہیں کی گئی۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: سیرت نگاروں کا ایک اسلوب یہ ہے کہ وہ حضور ﷺ کا دوسرے انبیاء کے ساتھ تقابل کر کے حضور ﷺ کی برتری ثابت کرتے ہیں۔ اس بارے میں بعض مفکرین کی رائے یہ ہے کہ یہ عمل ناپسندیدہ ہے۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔

جواب: واقعی عمل تو یہ ناپسندیدہ ہی ہے۔ حضور ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ صحابہ کرام میں سے بعض نے حضرت یونسؑ بن متیٰؑ پر حضور ﷺ کو فضیلت دی تھی تو آپ نے منع فرما دیا تھا اور ایسا کرنے کی حوصلہ شکنی کی تھی۔ اس لئے صحابہ کرام اس طرح کے موازنے نہیں کیا کرتے تھے۔ ہمیں بھی ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ البتہ حضور ﷺ کی وہ صفات جو قرآن پاک یا مستند احادیث میں آئی ہیں ان کو بیان کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اس سے اگر بالواسطہ طور پر دوسرے انبیاء کے مقابلہ میں آپ کی فضیلت ثابت ہو جاتی ہے تو غالباً اس میں کوئی قباحت نہ ہوگی۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: آپ نے اپنے خطاب میں ارشاد فرمایا کہ حضور ﷺ خواتین سے خطاب فرمایا کرتے تھے۔ اس کا طریقہ کار کیا ہوتا تھا؟ کیا حضور ﷺ عورتوں کے سامنے آکر خطاب فرمایا کرتے تھے یا کوئی اور انداز تھا؟

جواب: حضور ﷺ خود خواتین کے سامنے آکر خطاب فرمایا کرتے تھے۔ خواتین مسجد نبوی میں بھی تشریف لایا کرتی تھیں اور خواتین کا الگ اجتماع بھی حضور منعقد فرمایا

کرتے تھے اور وہاں جا کر خواتین کے سامنے ضروری امور پر خطاب فرمایا کرتے تھے۔ان میں سے تقریباً سب حجاب کے اسلامی آداب کی پابندی کے ساتھ ہی آتی تھیں۔صحابہ کرام کے زمانہ سے ہی یہ بات محل اختلاف ہے کہ خواتین کے لئے چہرے کا پردہ لازمی ہے کہ نہیں۔بعض صحابہ کرام کا خیال تھا کہ چہرہ کا پردہ لازمی ہے اور بعض کا خیال تھا کہ چہرے کا پردہ لازمی نہیں ہے۔ان دونوں کا مستند اور مستدل وہی واقعات ہیں جو حضور ﷺ کے زمانے میں پیش آئے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: سیرت طیبہ پر کتابیں مختلف ادوار میں لکھی گئیں۔تاریخ اسلام میں بادشاہوں اور حکمرانوں نے اپنے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر سیرت کی کتابیں لکھوائیں تاکہ عوام پر حکمرانی میں آسانی ہو۔خلفائے راشدین کے بعد اسلامی تاریخ بادشاہوں سے بھری پڑی ہے جس میں یہ سب کچھ ہوا۔آج کے دور میں بھی سرکاری مولوی موجود ہیں جو بادشاہوں کی مرضی کے مطابق سیرت النبی کی وضاحت کرتے ہیں۔ایسی صورت حال میں ایک شخص سیرت النبی کو کس طرح سمجھ سکتا ہے؟

جواب: کم از کم میں نے سیرت کی جن کتب کا مطالعہ کیا ہے ان میں کوئی کتاب ایسی نہیں تھی جس میں مصنف نے بادشاہوں کے مفادات کے مطابق کچھ لکھا ہو۔ حضرت عروہ بن زبیرؓ حضرت عائشہ کے بھانجے تھے۔حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نواسے تھے۔سیرت پر پہلا کام انہوں نے کیا اور مجھے یقین ہے کہ انہوں نے کسی بادشاہ کے مفاد کی خاطر سیرت کی تفصیلات مرتب نہیں کیں۔سیرت پر قدیم ترین کتاب ابن ہشام کی لکھی ہوئی ہے۔ابن ہشام بنی عباس کے دور میں یہ کتاب لکھ رہے ہیں۔ بنی عباس کی کمزوریاں انہوں نے بیان کردی ہیں۔ان کو چھپایا نہیں۔ طبری نے بھی بنو عباس کے دور میں کتاب لکھی اور یہ بھی لکھا کہ بنو عباس کے جد امجد غزوہ بدر میں مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے آئے تھے۔گرفتار ہو گئے تھے۔ان کو باندھا گیا تھا اور باندھنے والوں نے اتنا کس کر باندھا کہ وہ کراہ رہے تھے اور حضور ﷺ کو ان کے کراہنے سے تکلیف ہو رہی تھی اور آپ ﷺ کو ساری رات نیند نہیں آئی۔یہ باتیں بنو عباس کے دور میں لکھی گئیں۔

میرے خیال میں یہ محض مغربی پروپیگنڈہ ہے۔وہ تو حدیث، سنت اور فقہ کے بارے میں بھی کہتے ہیں کہ بادشاہوں نے مرتب کروائی۔آج تک کوئی بھی یہ وضاحت نہ کر سکا کہ فقہ کا کونسا حکم کسی بادشاہ کے مفاد کی خاطر لکھا گیا۔جن فقہا نے فقہ کو مرتب کیا ان کا تو کسی حکومت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔انہوں نے تو سرکاری عہدے ٹھکرائے۔امام ابوحنیفہ نے کوئی سرکاری عہدہ قبول نہیں کیا۔امام مالک،امام شافعی،امام احمد اور امام جعفر صادق پانچوں بڑے فقہا تھے اور آج ان سب کی فقہوں کی پیروی ہو رہی ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی سرکاری عہدہ نہیں رکھتا تھا۔ان میں سے کس فقیہ نے سرکاری عہدے کے لئے فقہ کے مسائل گھڑے؟

سیرت کے باب میں بھی ایسا ہی ہوا کہ یہ حکمرانوں اور حکومتوں سے بالکل آزاد ماحول میں لکھی گئی۔میرے خیال میں یہ بات کہ سیرت النبی پر کتابیں حکمرانوں نے اپنے مفاد کی خاطر لکھوائیں، بالکل غلط ہے اور یہ مغربی مصنفین کا پروپیگنڈہ ہے۔وہ سیرت کے روشن پہلوؤں سے اتنے مرعوب ہیں کہ وہ نہیں چاہتے کہ مسلمانوں کے پاس یہ فخر موجود رہے۔پہلے پہل انہوں نے قرآن کا انکار کیا۔جب پچاسوں سال کی کوششوں کے باوجود قرآن کو غلط ثابت نہ کر سکے تو حدیث کی کمزوریاں تلاش کرنے کی مہم لگ گئے۔حدیث کو جھوٹ ثابت کرنے کی کوششیں شروع کیں اور لکھا کہ یہ تو حضور ﷺ کے ڈھائی تین چار سو سال بعد کے لوگوں نے کہانیاں سن کر جمع کیں۔جب دلائل سے یہ بات غلط ثابت ہوگئی تو فقہ کے پیچھے پڑ گئے کہ فقہ یا تو رومن لاء سے ماخوذ ہے، ورنہ جعلی ہے۔لیکن جب یہ بات بھی غلط ثابت ہوگئی تو دوسری چیزوں کے پیچھے پڑ گئے۔سیرت کے بارے میں بھی ہزار برس سے کہہ رہے ہیں اور ہر سو دو سو سال بعد ان کے بیان میں تبدیلی آجاتی ہے۔

مثال کے طور پر این میری شمل نے کتاب لکھی ہے Muhammad: The Messanger of Allah، یہ کتاب کوئی بیس پچیس سال پہلے شائع ہوئی ہے۔اگر آپ ولیم میور کی کتاب سے اس کا تقابلی مطالعہ کریں جو آج سے 120 سال پہلے لکھی گئی تھی، تو آپ کو زمین اور آسمان کا فرق نظر آئے گا۔آخر این میری شمل بھی مسلمان نہیں تھیں، عیسائی تھیں۔لیکن اسلامی مصادر و مآخذ کے غیر جانبدارانہ مطالعہ کے نتیجہ میں اتنی بڑی تبدیلی اور بہتری آئی۔شمل کی کتاب میں کوئی بات بھی بظاہر قابل اعتراض نظر نہیں آتی۔یہ تو ہو سکتا ہے کہ اسلوب کے بارہ میں آپ بات کریں کہ ایسا ہونا چاہئے اور ایسا نہیں ہونا چاہئے۔لیکن ان کی اس کتاب کے مندرجات میں ایسی کوئی غلط بات نہیں ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: مطالعہ سیرت کی اہمیت قابل عمل اور آسان ہونے کے حوالہ سے کوئی مثال بیان فرمائیں؟

جواب: سیرت کا یقیناً یہ ایک اہم پہلو ہے کہ حضورﷺ کی سیرت قابل عمل بھی ہے اور آسان بھی ہے۔آپؐ نے اپنی شریعت کے بارے میں ایک بار فرمایا تھا کہ میں ایک آسان اور سیدھی شریعت لے کر آیا ہوں۔ اس پر عمل درآمد کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ابھی ایک دوست ڈاکٹر سجاد صاحب نے ایک مثال یاد دلائی کہ حضورﷺ سے پہلے جتنے مذاہب تھے ان میں اللہ کی عبادت کے لئے یہ ضروری ہوتا تھا کہ کسی گرجا، کنیسہ یا عبادت گاہ میں جا کر ہی عبادت کی جائے۔اب بھی مختلف اقوام میں عبادت کے لئے عبادت گاہ کا ہونا لازمی ہے اور جب تک خاص rituals نہ ہوں اللہ کی عبادت نہیں ہوسکتی۔اسلام نے اس طرح کی کوئی قید یا شرط نہیں رکھی۔پوری روئے زمین کو مسجد قرار دے دیا گیا ہے۔آپ کہیں بھی نماز پڑھ سکتے ہیں۔یہ اس حقیقت کی ایک مثال ہے کہ اسلام ایک آسان دین ہے اور حضورﷺ کی سیرت پر عمل کرنا بہت آسان ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: سیرت النبی پر بات کرنے والے ہجرت مدینہ سے شروع کرتے ہیں۔آپ نے بھی انہی کے قدموں پر چلتے ہوئے ابتدا کی۔سوال یہ ہے کہ حیات نبی کا جو حصہ مکہ میں گزرا ہے اس کو مکی دور سے موسوم کیا جا سکتا ہے اور اسی سے ابتدا ہونی چاہئے۔

جواب: یہ واضح کر دوں کہ خطبات کے اس سلسلہ میں عام سیرت پر گفتگو ہو گی۔اس لئے میں تاریخی ترتیب سے سیرت کے واقعات کو اس طرح بیان نہیں کروں گا جس طرح سیرت کی کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں۔میں نے اپنی گفتگو کے آغاز میں یہ عرض کیا تھا کہ یہ گفتگو سیرت پر نہیں بلکہ علم سیرت پر ہے۔سیرت کے اس علم پر گفتگو مقصود ہے جس کو مسلمانوں نے مدون کیا اور ہم تک پہنچایا۔میں یہ فرض کر کے یہ گفتگو کر رہا ہوں کہ سیرت کے عمومی واقعات سے سب حاضرین وسامعین واقف ہیں اس لئے ان پر گفتگو کرنا مقصود نہیں ہے۔

یہ بات بالکل درست ہے کہ سیرت کا ایک اہم حصہ حضورﷺ کی مکی زندگی ہے۔لیکن مکی زندگی دراصل مدنی زندگی کے لئے تیاری تھی۔مدنی زندگی ہی شریعت، معاشرت، حکومت، تہذیب اور ہر چیز کی اساس ہے۔مکی زندگی کی حیثیت بنیاد کی ہے جب کہ مدنی زندگی کی حیثیت عمارت کی ہے۔عمارت بنیاد کے بغیر نہیں بنتی۔لیکن جب بن جاتی ہے تو بنیاد نظروں کے سامنے نہیں ہوتی۔عمارت سامنے ہوتی ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: آپ نے خالص مذہبی تعلیم کو پہلے نقطہ نظر کے طور پر پیش کیا۔پھر اخلاقی تعلیم پھر تہذیب اور پھر ان سب کی حفاظت کے لئے ریاست۔ہم بہ حیثیت خواتین اپنے گھروں میں اس ترتیب کو کس طرح نافذ کر سکتی ہیں؟

جواب: آپ اس ترتیب کو اس طرح نافذ کریں کہ آپ اپنے بچوں، اپنے قرب وجوار اور جہاں جہاں آپ کے اثرات ہیں وہاں دینی تعلیم دیں۔جب آپ اپنے حلقہ اثر میں لوگوں کو دینی تعلیم دیں گی تو اس کے نتائج اور اثرات ان کے اخلاق پر ہوں گے، پھر اخلاق کے نتیجے میں معاشرت وجود میں آئے گی۔جب معاشرت وجود میں آئے گی تو تہذیب وجود میں آئے گی اور جب تہذیب وجود میں آئے تو ریاست اور حکومت پر اس کے اثرات پیدا ہوں گے۔یوں مسلمانوں کے دیرینہ خواب کی تعبیر خود بخود وجود میں آئے گی۔

(محاضراتِ سیرت)

(اسلام اور مغرب)

سوال: آپ نے فرمایا کہ مغربی حلقوں میں اسلام کے خلاف موجود پرانی عصبیتیں کمزور پڑ رہی ہیں۔ اس کی کچھ مزید وضاحت فرمائیں گے؟

جواب: اگر آپ اس کا جائزہ لیں کہ مغربی مصنفین نے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کیا کیا کہا ہے اور اس سارے لٹریچر کا تاریخی اعتبار سے جائزہ لیں تو وہ بات واضح ہو جائے گی جو میں کہنا چاہتا ہوں۔ مغربی مصنفین آج سے چھ سات سو سال پہلے رسول اللہ ﷺ کی شان مبارک میں انتہائی گستاخانہ کلمات بولا کرتے تھے۔ ایسے کلمات جن کو میں آپ کے سامنے دہرا نہیں سکتا۔ سبّ وشتم کا یہ نامبارک مشغلہ کئی سو سال تک جاری رہا۔ اس کے بعد انیسویں صدی کے اوائل میں ایک ایسا زمانہ آیا کہ یورپ میں سیرت کے مآخذ چھپنے شروع ہوئے۔ ان میں ایسے لوگ سامنے آئے جنہوں نے اسلام کے اساسی مآخذ کا مطالعہ کیا تھا، اس کے بعد انہوں نے غیر اخلاقی انداز کو تو چھوڑ دیا لیکن رسول اللہ ﷺ کو ایک سیاسی (نعوذ باللہ) موقع پرست کے طور پر پیش کرنا شروع کیا اور یہ بتایا کہ آپ کا مقصد اپنی قوم کو سیاسی اقتدار دلانا تھا۔ مسلمانوں نے اس کا بھی جواب دیا اور خود سیرت کے لٹریچر سے بھی اس کی تردید ہو گئی۔ پھر انہوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ حضور ﷺ نبی تو تھے لیکن صرف عرب کے لئے تھے پوری دنیا کے لئے نہیں تھے۔

پھر آہستہ آہستہ یہ ہوا کہ اسلام کے حق میں اور مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی تائید میں کتابیں آنے لگیں۔ مثلاً آج سے سو پچاس سال پہلے مغرب میں اسلامی نقطۂ نظر کی تائید میں کوئی کتاب نہیں لکھی جاتی تھی۔ پہلی کتاب سید امیر علی نے لکھی۔ اس کے علاوہ کوئی کتاب تائید میں نہیں لکھی گئی۔ لیکن آج خود مغربی اور عیسائی مصنفین اور دوسرے لوگ سیرت پر ایسی کتابیں لکھ رہے ہیں جو مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے اتنی قابل اعتراض نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کتابوں میں سو فیصد مسلمانوں کا نقطہ نظر بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اب اتنا ہو گیا ہے کہ ہمارے نقطۂ نظر سے ایسی قابل قبول چیزیں آنی شروع ہو گئی ہیں جن کی تعداد درجنوں میں نہیں بلکہ سینکڑوں میں ہے۔

ایک خاتون جو امریکی یا برطانوی ہیں، مجھے ملک کا نام یاد نہیں، لیکن وہ کافی عرصہ ایران میں رہیں، اس نے مغرب میں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں Perceptions کی ایک ہزار سالہ تاریخ پر ایک کتاب لکھی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ مغربی تحریروں میں حضور ﷺ کا تصور کیا رہا ہے۔ اس نے یہ ساری تفصیل بتائی ہے اور آخر میں کہا کہ اب مغربی مصنفین میں ایک ہمدردانہ رویہ پیدا ہوا ہے جو اتنا زہر آلود نہیں ہے جتنا پہلے ہوا کرتا تھا۔

(محاضراتِ سیرت)

(تصوف)

سوال: کیا وجہ ہے کہ برصغیر میں مسلمانوں کی ہزار سالہ حکومت کے باوجود آبادی کا پندرہ فیصد ہی مسلمان ہو سکا۔ بعض آرا یہ ہیں کہ اس کی وجہ ہے کہ یہاں اسلام براہ راست صحابہ کرام کی توسط سے نہیں پہنچا۔ بلکہ صوفیائے کرام اور مبلغ اس کا سبب بنے۔

جواب: اس کا جواب دینا تو بڑا دشوار ہے کہ یہاں مسلمانوں کی آبادی پندرہ فیصد سے کیوں نہ بڑھ سکی۔ واقعہ یہ ہے کہ صحابہ کرام جہاں جہاں تشریف لے گئے وہاں وہاں آج تک مسلمان آبادی سو فیصد ہے۔ جہاں صحابہ کرام تشریف نہیں لے جا سکے وہاں مسلمان آبادیاں کہیں سو فیصد ہیں اور کہیں نہیں ہیں۔ ممکن ہے یہی وجہ ہو۔ لیکن یہ بات درست ہے کہ مسلمان مبلغین نے اس معاملہ میں کوتاہی کی اور تبلیغ کا فریضہ خاص طور پر جنوب میں انجام نہیں دیا۔ محمد خان تغلق نے جو جنوب میں تبلیغ کا کام کرنا چاہتا تھا۔ اس معاملہ پر توجہ دی تھی اور وہ بہت سے کام کرنا چاہتا تھا۔ یاد نہیں شہر کا نام کیا تھا، وہ دارالحکومت بھی وہاں منتقل کرنا چاہتا تھا۔ محمد تغلق نے بعض علما اور صوفیا کو بھی وہاں بھیجا۔ لیکن دینی حلقوں میں اس کو ناپسند کیا گیا اور اس کے انتقال کے بعد یہ کوشش ناکام ہو گئی۔ اگر کامیاب ہو جاتی تو ممکن ہے آج حالات مختلف ہوتے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: بیعت اسلام اور بیعت جہاد کا ذکر تو احادیث سے ملتا ہے۔ کیا صوفیا کے ہاں مروجہ بیعت طریقت کا بھی کوئی ذکر قرآن وحدیث میں آتا ہے؟

جواب: قرآن وحدیث میں براہ راست تو ایسا کوئی حکم نہیں۔ لیکن ایسا ذکر آتا ہے کہ صحابہ کرام نے ایک دوسرے کے ہاتھ پر بیعت کی۔ بیعت کے معنی کسی وعدے یا عہد نامہ کے ہیں۔ آپ کسی نیک اور بزرگ انسان کے ساتھ یہ وعدہ کریں کہ آپ شریعت کے مطابق فلاں کام کریں گے۔ اس کو بیعت کہتے ہیں۔ بیعت کا زیادہ رواج اسلام، جہاد اور دعوت وتبلیغ کے کاموں میں ہوتا تھا۔ اگر کوئی کسی بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کر کے یہ کہے کہ میں شریعت کی پابندی کروں گا اور آپ جو تربیت کریں گے اس کے مطابق اپنی زندگی سنواروں گا تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: تصوف کیا ہے؟ کیا صوفی کے لئے مسلمان ہونا ضروری ہے؟

جواب: تصوف جو میں سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ اللہ کو حاضر وناظر جان کر اس کی شریعت پر عمل کیا جائے۔ اللہ کی شریعت پر اس کی پوری جزئیات اور باریکیوں کے ساتھ عمل کیا جائے۔ قرآن کو سمجھ کر پڑھا جائے۔ اللہ سے محبت کی جائے۔ رسول کی عقیدت سے انسان سرشار ہو۔ اللہ کے حضور جوابدہی کا احساس ہو۔ وہ کیفیت ہو جو حدیث میں بیان ہوئی ہے۔ حضور ﷺ سے پوچھا گیا کہ احسان کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ **الاحسان ان تعبداللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک** احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ اسی کا نام تصوف ہے۔ اس کے لئے مسلمان ہونا ضروری ہے۔

(محاضراتِ سیرت)

سوال: آپ نے سلاسل تصوف کی سند کو نبی کریم ﷺ تک متصل کیا ہے اس کی مزید وضاحت فرمادیں؟

جواب: جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ صحابہ کرام میں روحانی اعتبار سے ہر صحابی حضور ﷺ کا خلیفہ بلافصل ہے اس میں تو کسی سند کی ضرورت نہیں۔ ایک صحابی کی صحابیت اس بات کے لئے کافی ہے کہ وہ تعلیم دین اور تزکیہ نفوس میں حضور ﷺ کا جانشین ہو۔ ساری کتب حدیث اس بات کی دلیل ہیں کہ صحابہ کرام نے حضور ﷺ کی رہنمائی کو آگے دوسروں تک پہنچایا اور حضور کی تربیت کے نتائج کو آنے والی نسلوں تک منتقل کیا۔

جہاں تک صوفیانہ سلسلوں کے تاریخی طور پر مستند ہونے کا تعلق ہے تو یہ واقعی ایک محل نظر بات ہے اور اس پر ماضی میں بھی گفتگو ہوتی رہی ہے۔ بعض حضرات بڑے

شدومد سے اس کے منکر ہیں۔اوراس انکار کے لئے وزنی تاریخی دلائل رکھتے ہیں۔ان حضرات میں بیشتر وہ لوگ ہیں جوسرے سے تصوف کے بھی منکر ہیں اس لئے ان کے انکار کا وزن ذرا کم ہوجاتا ہے۔بعض دیگر حضرات بڑے شدومد کے ساتھ اس کے قائل ہیں کہ یہ سب سلسلے براہ راست رسول اللہ ﷺ سے متصل ہیں۔ان قائلین میں بیشتر وہ ہیں جوتصوف کی تمام روایات کو بلا ردوقدح قبول کرتے ہیں۔یوں ان کی تائید بھی ہلکی قرار پاتی ہے۔متوازن رائے دنوں کے درمیان ہوسکتی ہے۔ میں کوئی خاص رائے نہیں دینا چاہتا۔لیکن یہ بات میں ضرورعرض کرنا چاہتا ہوں کہ جوحضرات تصوف کے سلسلوں سے وابستہ رہے ہیں وہ امت کے انتہائی قابل احترام اورمعتمدترین حضرات تھے۔وہ ایسے بلند پایہ لوگ تھے جن کا نام سن کرسر کواحتراماً خم کرنا پڑتا ہے۔کون سا مسلمان ہے جومجددالف ثانی، شیخ احمد سرہندی اوران کے پائے کے دوسرے بزرگوں کے احترام میں کسی سے پیچھے رہنا گوارا کرے گا۔

وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

علامہ اقبال نے ان کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے کہ

He was the greatest religious genius of Muslim India.

برصغیر کے امیرالمؤمنین فی الحدیث حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بھی تصوف کے سلسلوں سے وابستہ تھے۔یہ بڑے بڑے حضرات جوان سلسلوں کی سند کومستند مانتے ہیں تو یقیناً اس کی کوئی بنیاد ہوگی۔میں نے خودکوئی تحقیق نہیں کی اس لئے میں خودان سلسلوں کی سند کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

(محاضراتِ سیرت)